خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ
خواتین ڈائجسٹ
جون 2013
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
www.paksociety.com

MEMBER APNS CPNE

رکن آل پاکستان نیوز پیپر سوسائٹی

رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپر ایڈیٹرز

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ---- 600 روپے

ایشیا، افریقہ، یورپ ---- 5000 روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ---- 6000 روپے

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اُردو بازار، کراچی۔

پبلشر آذر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com

خواتین ڈائجسٹ جون کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

ایک نیا سورج ابھرنے کی نوید ہے۔ ایک نئی سحر کے آثار نمودار ہو رہے ہیں۔ یہ سراب ہے یا حقیقت۔ جو دعوے اور وعدے کیے جا رہے ہیں پورے بھی ہوں گے، وقت ہی سچائی ثابت کرے گا کہ عمل ہی سب سے بڑی کسوٹی ہے۔ انسان کے عمل سے بہتر اس کی ذات کی صداقت کی عکاسی کوئی اور چیز نہیں کر سکتی۔

زندگی ایک سفر مسلسل۔ اور ہر قدم اگلے قدم کی بنیاد۔ کل جو تھا اس کی تعبیر ہم آج کی شکل میں دیکھ رہے ہیں۔ یہ آج ہے جو آنے والے زمانوں کی بنیاد ہوگا۔

ہمیں آج کا یہ لمحہ تھام لینا ہے۔ آگے بڑھنا ہے۔ یہ لمحہ اپنے دامن میں لامحدود امکانات سمیٹے ہوئے ہے۔ بات صرف ترجیحات اور سوچ کی ہے۔ آنے والے زمانوں کی بہتری کے لیے آج کچھ کڑوے گھونٹ بھی پینے ہوں گے۔ ایک نسل قربانی دیتی ہے تو اگلی کئی نسلوں کا مقدر سنور جاتا ہے۔ توانائی کا بحران جو پچھلے پانچ سالوں میں انتہائی شدت اختیار کر چکا ہے اور امن وامان کا مسئلہ جو پچھلے دو عشروں سے ہمارے لیے امتحان بنا ہوا ہے۔ ان دو بنیادی مسائل سے ترجیحی بنیادوں پر نمٹنا ہوگا تب ہی ہم آگے بڑھ سکیں گے۔

سائرہ رضا کا مکمل ناول۔ سیدھی سڑک،

سائرہ رضا کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ انتہائی نازک مسائل پر بھی بڑی خوبی اور خوبصورتی سے لکھتی ہیں۔ اس ماہ ان کا مکمل ناول سیدھی سڑک شامل ہے جس میں انہوں نے ایک اہم مسئلہ کی نشان دہی کی ہے۔ سائرہ رضا اس موضوع سے کس حد تک انصاف کر پائی ہیں اور قارئین اس بارے میں کیا نقطۂ نظر رکھتی ہیں ہمیں اس ناول کے بارے میں اپنی رائے ضرور لکھیں۔

اس شمارے میں،

- نگہت سیما کا مکمل ناول۔ زمین کے آنسو،
- ثمرہ بخاری، آمنہ ریاض اور فرحین اظفر کے ناولٹ،
- سمیرا حمید، ریحانہ اسلم، مصباح خادم اور فرحی نعیم کے افسانے،
- عنیزہ سید اور نگہت عبداللہ کے ناول،
- ٹی وی فنکارہ اور ماڈل عائشہ گل سے ملاقات،
- باتیں اریج فاطمہ سے،
- میری خاموشی کو بیاں ملے۔ قارئین سے تعارف کا سلسلہ،
- کرن کرن روشنی۔ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ،
- خط آپ کے، خبریں ویریں، نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور عدنان کے مشورے شامل ہیں۔

ہمارا انتخاب آپ کو کس حد تک پسند آیا، اپنی رائے ضرور لکھیے گا۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے، اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

چالیس سال پہلے

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے

کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"حضرت آدمؑ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی آپس میں بحث ہو گئی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔

"اے آدم! آپ ہمارے والد ہیں، آپ نے ہمیں محرومی کا شکار کر دیا اور گناہ کا ارتکاب کر کے ہمیں جنت سے نکلوا دیا۔"

آدم علیہ السلام نے ان سے فرمایا۔ "اے موسیٰ! اللہ نے آپ کو شرف ہم کلامی کے لیے منتخب فرمایا اور آپ کو اپنے ہاتھ سے لکھ کر تورات دی، کیا آپ مجھے اس بات پر ملامت کرتے ہیں جو اللہ نے مجھے پیدا کرنے سے چالیس سال پہلے میری قسمت میں لکھ دی تھی؟ چنانچہ بحث میں آدم علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام پر غالب آ گئے۔ آدم علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام پر غالب آ گئے، آدم علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام پر غالب آ گئے۔" (تین مرتبہ آپ نے فرمایا۔) (بخاری)

فوائد ومسائل :

1۔ حضرت آدم اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یہ ملاقات، ممکن ہے جنت میں ہوئی ہو، ممکن ہے عالم ارواح میں۔ واللہ اعلم۔

2۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مقصد حضرت آدم علیہ السلام کو یہ طعنہ دینا نہیں کہ انہوں نے غلطی کیوں کی کیونکہ وہ غلطی تو اللہ تعالیٰ نے معاف فرما دی تھی۔ ارشاد ربانی ہے۔

"پھر انہیں ان کے رب نے نوازا، ان کی توبہ قبول فرمائی اور ان کی رہنمائی کی۔" ان کا مقصد یہ تھا کہ آپ کی وجہ سے تمام انسانوں کو دنیا کی مشکلات وہ مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ حضرت آدم علیہ السلام نے اس کے جواب میں وضاحت فرما دی کہ یہ مصائب تو پہلے ہی

تقدیر میں لکھے جاچکے تھے اور ان کا فیصلہ بہت پہلے ہو چکا تھا۔

3۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین بار فرمایا۔ "آدم علیہ السلام غالب آگئے۔" یہ تکرار تاکید کے لیے تھی تاکہ بخوبی علم ہو جائے کہ آدم علیہ السلام سے جو کچھ ہوا وہ تقدیر الٰہی اور مشیت الٰہی کا اجر تھا۔

تقدیر پر بحث کرنا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا۔

"قریش کے مشرک تقدیر کے مسئلہ میں بحث کرنے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے' تو یہ آیت نازل ہو گئی۔

ترجمہ :

"جس دن انہیں چہروں کے بل آگ میں گھسیٹا جائے گا (اور ان سے کہا جائے گا) تم دوزخ کی آگ لگنے کا مزا چکھو۔ بے شک ہم نے ہر چیز ایک اندازے کے مطابق پیدا کی ہے۔" القمر۔

فوائد و مسائل :

1۔ اس آیت اور حدیث سے بھی تقدیر کا ثبوت ملتا ہے۔

2۔ کفار کے لیے جہنم کا سخت عذاب مقدر ہے۔

3۔ واضح اور قطعی مسئلے میں اختلاف اور بحث کرنا اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں۔

تقدیر پر بحث

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا' ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باہر صحابہ کے پاس تشریف لائے تو وہ تقدیر کے بارے میں بحث کر رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مبارک غصے سے اس قدر سرخ ہو گیا گویا اس پر انار کے دانے نچوڑ دیے گئے ہیں۔ (تب) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"کیا تمہیں اس بات کا حکم دیا گیا ہے؟ یا کیا تمہیں اس کام کے لیے پیدا کیا گیا ہے؟ تم قرآن کی آیات کو ایک دوسرے سے ٹکرا رہے ہو۔ تم سے پہلی امتیں اسی وجہ سے تباہ ہوئی تھیں۔" (مسند احمد)

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ نے فرمایا "مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی مجلس سے غیر حاضر رہنے پر خوشی نہیں ہوئی جس طرح اس مجلس میں موجود نہ ہونے پر خوشی ہوئی۔

فوائد و مسائل :

1۔ تقدیر اسرار الٰہی میں سے ایک راز ہے' اس پر مجمل ایمان لانا کافی ہے' اسی طرح دوسرے غیبی امور کے بارے میں بھی جس قدر بتا دیا گیا' اسے مان لینا کافی ہے اور جس چیز کی وضاحت نہیں کی گئی' اس کی تفصیل معلوم کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔

2۔ قرآن و حدیث کی نصوص کی وضاحت اس انداز سے کرنی چاہیے کہ ان میں ٹکراؤ پیدا نہ ہو' ورنہ امت میں اختلاف و افتراق پیدا ہوتا ہے اور قرآن و حدیث پر ایمان میں فرق آنے کا اندیشہ ہے۔

3۔ قرآن و حدیث کے مطالعے کا اصل مقصد اخلاق و عمل کی اصلاح ہے۔ اگر کوئی شخص محض زور خطابت کے اظہار کے لیے یا اپنے علم و فضل کا رعب جمانے کے لیے پیچیدہ مسائل میں مشغول ہوتا ہے' تو یہ اصل مقصد کے خلاف اور اللہ تعالیٰ کی ناراضی کا باعث ہے۔

4۔ نصیحت کرتے ہوئے موقع محل کی مناسبت سے بعض اوقات غصے کا اظہار بھی کیا جا سکتا ہے "مخصوصاً" جب کہ نصیحت کرنے والا قابل احترام شخصیت کا حامل ہو اور سامعین پر اس کے غصے کا منفی اثر پڑنے کا اندیشہ نہ ہو۔

5۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ اس مجلس میں موجود نہیں تھے۔ کسی دوسرے صحابی نے انہیں یہ واقعہ سنایا' تاہم محدثین کے اصول کے مطابق یہ حدیث "صحیح" ہے کیونکہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث براہ راست سننے والے صحابی کا نام نہ بھی لیا جائے لیکن اس سے سن کر روایت کرنے والا بھی صحابی ہو تو ایسی حدیث بالاتفاق صحیح ہوتی ہے کیونکہ تمام صحابہ "عادل" (قابل قبول اور قابل اعتماد) ہیں۔

6۔ صحابی کو اس مجلس سے غیر حاضری پر اس لیے خوشی ہوئی کہ حاضرین پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خفگی کا اظہار فرمایا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ مومن کو اگر نیکی کی توفیق مل جائے یا وہ کسی گناہ سے بچ جائے تو اس پر خوشی کا اظہار کرنا فخر و ریا میں شامل نہیں بلکہ نیکی کی محبت اور گناہ سے نفرت کی علامت ہے جو ایمان کا ایک حصہ ہے۔

بد شگونی

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"بیماری ایک سے دوسرے کو نہیں لگتی' بد شگونی کی کوئی حقیقت نہیں' نہ الو کوئی چیز ہے۔"

ایک اعرابی اٹھ کر آپ کے قریب آیا اور کہا۔

"اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! دیکھیے نا' ایک اونٹ کو خارش کی بیماری ہوتی ہے' وہ تمام اونٹوں کو خارش میں مبتلا کر دیتا ہے۔"

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"یہ تقدیر ہے' پہلے اونٹ کو خارش کس سے لگی؟"

فوائد و مسائل : 1۔ عام طور پر تصور کیا جاتا ہے کہ اگر کسی بیمار کے پاس کوئی تندرست آدمی اٹھتا بیٹھتا ہے یا اس کے ساتھ کھاتا پیتا ہے یا اس کا لباس استعمال کرتا ہے تو اسے بھی وہی بیماری لگ جاتی ہے جو مریض کو تھی۔ عرف عام میں ایسی بیماریوں کو متعدی بیماریاں کہا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بیماری اس طرح ایک سے دوسرے کو نہیں لگتی' البتہ ایسا ہو سکتا ہے کہ جس وجہ سے پہلے آدمی کے جسم میں مرض پیدا ہوا ہے' وہی وجہ کسی اور شخص میں بھی پائی جائے اور وہ بھی بیمار ہو جائے۔ جدید طب میں جراثیم کا نظریہ بہت مقبول ہے لیکن یہ جراثیم بھی بحکم الٰہی اثر انداز ہوتے ہیں' گویا دوسرے مریض کے بیمار ہونے کی اصل وجہ حکم باری تعالیٰ ہے نہ کہ مریض کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا۔ اس کے علاوہ ہومیو پیتھک نظریہ علاج جراثیم کو امراض کا سبب ہی تسلیم نہیں کرتا' اس لیے اس نظریے کے مطابق بھی مرض کا ایک شخص سے دوسرے کو منتقل ہونا ایک غلط تصور ہے۔

2۔ عرب لوگ پرندوں اور جنگلی جانوروں کے گزرنے سے شگون لیتے تھے۔ کوئی شخص کوئی کام کرنا چاہتا تو کسی بیٹھے ہوئے پرندے یا ہرن وغیرہ کو پتھر مار کر بھگاتا' اگر وہ دائیں جانب جاتا تو سمجھا جاتا کہ کام صحیح ہو جائے گا' اگر بائیں طرف جاتا تو سمجھا جاتا کہ کامیابی نہیں ہوگی۔ اس طرح کے کام محض توہم پرستی کا مظہر ہیں' جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ آج کل بھی اس طرح کے توہمات پائے جاتے ہیں' "مثلاً" کسی لنگڑے یا یک چشم انسان سے ملاقات ہو جائے تو اسے نحوست کا باعث قرار دینا۔ کالی بلی راستہ کاٹ جائے تو سمجھنا کہ کام نہیں ہو گا یا کسی خاص عدد (مثلاً "تیرہ کا عدد) یا کسی خاص دن (مثلاً "منگل) یا کسی خاص مہینہ (مثلاً "ماہ صفر یا شوال) کو نامبارک قرار دینا بھی اسی میں شامل ہے۔ کوئی نقش بنا کر اس کے خانوں میں انگلی رکھنا یا اس قسم کے فال ناموں سے قسمت معلوم کرنے کی کوشش کرنا سب ایمان کی کمزوری کی علامت ہے۔

3۔ مشرکین عرب میں ایک غلط تصور یہ بھی پایا جاتا تھا کہ اگر مقتول کا بدلہ نہ لیا جائے تو اس کی روح الو کی شکل اختیار کر کے بھٹکتی اور چیختی پھرتی ہے اور انتقام کا مطالبہ کرتی ہے۔ اس غلط تصور کی وجہ سے ان لوگوں میں نسل در نسل انتقام اور قتل و غارت کا سلسلہ جاری رہتا تھا' حالانکہ اس کی کوئی حقیقت نہیں تھی' اسی طرح الو کو منحوس تصور کرنا غلط ہے۔ وہ بھی دوسری مخلوقات کی طرح اللہ کی ایک مخلوق ہے۔ جس کا انسانوں

کی قسمت سے کوئی تعلق نہیں۔

دل کی مثال

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"دل کی مثال ایک پر کی سی ہے جسے ہوائیں چٹیل میدان میں الٹاتی پلٹاتی رہتی ہیں۔"

فوائد و مسائل :

1۔ پرندے کا اکھڑا ہوا ایک پر بہت ہلکی چیز ہوتا ہے جسے معمولی ہوا بھی سیدھے سے الٹا اور الٹے سے سیدھا کر سکتی ہے۔ اگر وہ کسی کھلے میدان میں ہو تو ظاہر ہے ہوا اس پر زیادہ اثر انداز ہوگی کیونکہ وہاں ہوا کے اثر کو کم کرنے والی کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی۔ اور وہ بڑی تیزی سے الٹ پلٹ ہوتا ادھر سے ادھر اور یہاں سے وہاں اڑتا پھرے گا' انسان کے دل کی بھی یہی حالت ہے۔ اس پر مختلف جذبات و احساسات تیزی سے اثر انداز ہوتے ہیں جس کی وجہ سے وہ کبھی نیکی کی طرف مائل ہوتا ہے' کبھی گناہ کی طرف' کبھی اس میں محبت کے لطیف جذبات موجزن ہوتے ہیں' کبھی نفرت کی آندھی چڑھ آتی ہے۔ دل کی اس کیفیت سے فائدہ اٹھا کر شیطان اسے گناہوں میں ملوث کر دیتا ہے' لہٰذا کسی کو نیکی کی راہ پر گامزن دیکھ کر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ ضرور جنت میں جائے گا اور نہ کسی کو گناہوں میں غرق دیکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ لازماً "جہنمی ہے" اس لیے نیکی کی توفیق ملے تو اللہ سے استقامت کی دعا کرنی چاہیے اور گناہ ہو جائے تو اشک ندامت کا نذرانہ لے کر اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر ہو جانا چاہیے ایسا نہ ہو کہ گناہوں کی آندھی اسے رحمت سے بہت دور لے جائے۔

2۔ چونکہ دل کی کیفیات کسی بھی لمحے تبدیل ہو سکتی ہیں' اس لیے انسان اپنے انجام کے بارے میں مطمئن نہیں ہو سکتا۔ ضروری ہے کہ ایمان پر وفات کی دعا کی جائے اور ہر قدم پر اللہ تعالیٰ سے ہدایت و رہنمائی کی درخواست کی جائے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوں دعا کرتے تھے۔

"اے دلوں کو پھیرنے والے! میرا دل اپنی اطاعت و فرمانبرداری پر ثابت رکھ۔"

عمر میں اضافہ

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"صرف نیکی ہی عمر میں اضافے کا باعث ہوتی ہے اور تقدیر کو محض دعا ہی ٹالتی ہے' بلاشبہ انسان کو بعض اوقات ایک گناہ کے ارتکاب کی وجہ سے رزق سے محروم کر دیا جاتا ہے۔"

فوائد و مسائل :

1۔ یہ روایت بعض محققین کے نزدیک حسن درجے کی ہے جو البتہ اس حدیث کا آخری حصہ "انسان اپنے برے عمل کی وجہ سے رزق سے محروم ہو جاتا ہے۔" کسی معتبر سند سے ثابت نہیں بلکہ شیخ البانی رحمتہ اللہ اس کی بابت لکھتے ہیں کہ یہ موضوع ہے۔

2۔ نیکی کا ثواب جس طرح آخرت میں بلندی درجات اور ابدی نعمتوں کا باعث ہوتا ہے' اسی طرح نیکی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ دنیا میں بھی نعمت' عزت اور مزید نیکی کی توفیق۔ سے نوازتا ہے' اسی طرح برے عمل کی سزا دنیا اور آخرت دونوں میں ملتی ہے' الا یہ کہ اللہ تعالیٰ معاف فرما دے۔

3۔ عمر میں اضافے کے مختلف مفہوم بیان کیے گئے ہیں۔ (ا) یعنی عمر میں برکت ہوتی ہے اور وہ اچھے کاموں میں صرف ہوتی اور ضائع ہونے سے بچ جاتی ہے۔ (ب) نیکیوں کی توفیق ملتی ہے جس کی وجہ سے مرنے کے بعد بھی ثواب پہنچتا رہتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ "باقی رہنے والی نیکیاں تیرے رب کے ہاں ثواب کے لحاظ سے بہتر ہیں اور امید کے اعتبار سے اچھی ہیں۔"

(ج) فرشتوں کو یا ملک الموت کو اس کی جو عمر معلوم تھی' اس میں اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ یہ فرشتوں کے لحاظ سے اضافہ ہے' اللہ تعالیٰ کو پہلے سے علم تھا کہ یہ شخص فلاں نیکی کرے گا جس کے انعام کے طور پر اس کی عمر میں اس قدر اضافہ کر دیا جائے گا۔

تقدیر بدلنے کا مطلب یہ ہے کہ جس مصیبت سے انسان ڈرتا ہے' دعا کی برکت سے رک جاتی ہے اور آئی ہوئی مصیبت رفع ہو جاتی ہے۔ جس طرح حضرت یونس علیہ السلام کو دعا کی وجہ سے مچھلی کے پیٹ سے نجات مل گئی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"اگر وہ (اللہ کی) پاکیزگی بیان کرنے والوں میں سے نہ ہو جاتے' تو لوگوں کے اٹھائے جانے کے دن تک اس (مچھلی) کے پیٹ ہی میں رہتے۔" الصفت 143-144

یہاں بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ تبدیلی فرشتوں کے علم کے مطابق تبدیلی ہے اللہ کے علم میں تبدیلی نہیں۔ اللہ تعالیٰ کو پہلے سے علم تھا کہ فلاں شخص دعا کرے گا' پھر اس کی مشکل حل ہو جائے گی۔

5۔ اس میں دعا کی ترغیب پائی جاتی ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دعا بھی جائز اسباب میں سے ہے جسے اختیار کرنا توکل کے منافی نہیں بلکہ عین توکل ہے۔

عمل

حضرت سراقہ بن جعشم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا۔ میں نے عرض کیا۔

"اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! کیا عمل ان امور میں شامل ہے جنہیں لکھ کر قلم خشک ہو گیا اور اس کے بارے میں تقدیر کا فیصلہ ہو چکا یا اس کا تعلق آئندہ (فیصلہ ہونے والے معاملات) سے ہے۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"بلکہ وہ ان امور میں شامل ہے جن کو لکھ کر قلم خشک ہو گیا اور اس کا اندازہ ہو چکا اور ہر ایک کے لیے وہ کام آسان ہو جاتا ہے' جس کے لیے وہ پیدا کیا گیا۔"

فائدہ : انسان کے نیک اور بد ہونے کا تعلق بھی تقدیر سے ہے لیکن بندے کو اس کا علم نہیں۔ وہ شریعت کے مطابق عمل کرنے کا مکلف ہے۔

مومن

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"مومن ہمیشہ اپنے دین کے بارے میں کشادگی میں رہتا ہے جب تک وہ حرام خون (بہانے کا ارتکاب) نہ کرے۔" (بخاری)

فائدہ :

اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ مومن جب تک کسی کا ناحق خون نہیں بہاتا' اسے دین پر عمل کرنے کی توفیق ملتی رہتی ہے اور دوسرا مفہوم ہے کہ اللہ کی رحمت اس کے لیے کشادہ رہتی ہے' مآل (انجام) دونوں کا ایک ہی ہے کہ وہ اللہ کی رحمت کا زیادہ مستحق اور امیدوار ہوتا ہے اور جوں ہی وہ قتل ناحق کا ارتکاب کرتا ہے تو اللہ کی رحمت کی امید کا دروازہ اس پر بند ہو جاتا ہے اور وہ ناامیدوں میں سے ہو جاتا ہے۔

ناجائز لینا

حضرت خولہ بنت ثامر انصاریہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے اور یہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی اہلیہ ہیں' وہ فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔

"بلاشبہ کچھ لوگ اللہ کے مال (بیت المال) میں ناجائز تصرف کرتے ہیں۔ چنانچہ ایسے لوگوں کے لیے قیامت والے دن جہنم کی آگ ہے۔" (بخاری)

فائدہ :

قومی خزانے میں ناجائز تصرف اور اسے مصالح عامہ کے بجائے مصالح خاصہ کے لیے استعمال کرنا کبیرہ گناہ ہے جس پر اسے جہنم کی سزا ہو سکتی ہے' اگر اس نے مرنے سے قبل خالص توبہ نہ کی۔

ڈگریاں بڑی نعمت ہیں

انشا جی

لاہور کے ایک اخبار میں ایک وکیل صاحب کے متعلق یہ خبر مشتہر ہوئی ہے کہ کوئی عالم دین کا سرمایہ علم و فضل اور دولت صبر و قرار اور آلات کاروبار لوٹ لے گیا ہے۔ تفصیل مال مسروقہ کی یہ ہے۔

ڈگری بی اے کی ایک ایل ایل بی کی ایک کریکٹر سرٹیفکیٹ بدیں مضمون کہ حامل سرٹیفکیٹ ہذا کبھی جیل نہیں گیا۔ اس پر ہر قسم کے مقدمے چلے لیکن یہ ہمیشہ بری ہوا۔ وکیل صاحب نے اعلان کیا ہے کہ یہ صاحب غلطی سے میری الماری کا تالا توڑ کر یہ سرٹیفکیٹ لے گئے ہوں یا سہوا" خود ان کے پاس چلے گئے ہوں۔ وہ براہ کرم واپس کردیں۔ ان کو کچھ نہیں کہا جائے گا۔ اگر کوئی اور صاحب اس نابکار چور کو پکڑ کر لائیں تو خرچہ آمدورفت بھی پیش کیا جائے گا۔ حلیہ یہ ہے۔ چور کا نہیں، سرٹیفکیٹوں کا کہ ان پر بندے کا نام لکھا ہے۔ گلشن علی ثمرقندی، سابق سوداگر شکر قندی۔ مقیم گوالمنڈی۔ بعض کم فہم ظاہر بین کہیں گے کہ ڈگری سے کیا ہوتا ہے وکیل صاحب! شوق سے کاروبار جاری رکھیں۔ وکالت علم و عقل بلکہ زبان سے کی جاتی ہے۔ ڈگری کوئی تعویذ تھوڑا ہی ہے کہ جس کے بازو پر باندھا وہ گونگا بھی ہے تو پٹ پٹ بولنے لگا۔ فصاحت کے بتاشے کھولنے لگا۔ لیکن ہماری سنیے تو ڈگری اور عہدہ دونوں کام کی چیزیں ہیں۔ بلکہ علم اور لیاقت کا نعم البدل ہیں۔

آناں را کہ ایں دہند   ان نہ دہند

تم نے منصب دار لوگوں کو دیکھا ہوگا کہ بظاہر بے علم معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن وقت آنے پر ادب اور آرٹ کے اسرار و غوامض پر ایسی مدبرانہ گفتگو کرتے ہیں کہ داناں اندراں حیراں بماند۔ جتنا بڑا عہدہ دار ہوگا۔ اتنی ہی اونچی بات کرے گا۔ نیچے والوں کو خاطر میں نہ لائے گا۔ ڈگری کو بھی ہم نے اسی طرح لوگوں کے سرچڑھ کر بولتے دیکھا۔

ایک ہمارے مہربان ہیں اردو زبان و ادب کے پروفیسر۔ ایک روز دست نگر کو دست نگر پڑھ رہے تھے اور استفادہ حاصل کرنا بول رہے تھے ہم نے بڑے ادب سے ٹوکا۔ لیکن وہ بکھر گئے اور پوچھنے لگے۔

"کتنا پڑھے لکھے ہو تم؟"

ہم نے کہا "کچھ بھی نہیں، بس حرف شناس ہیں۔ الف بے آتی ہے۔ گنتی بھی لکھ لیتے ہیں۔" اس پر وہ اندر سے فریم شدہ چوکھٹے اٹھا لائے۔ ان پر ایک ڈگری ایم اے کی تھی۔ دوسری پی ایچ ڈی کی۔ بولے۔ "اب کہو تمہارا کہا سند ہے یا ہمارا فرمایا ہوا؟" اس دن پہلی بار ہمیں اپنی غلطی معلوم ہوئی۔ اب ہم بھی ریڈیو اور ٹیلی ویژن والوں کی طرح دست نگر، چشم دیدہ دم زدن اور استفادہ حاصل کرتے ہی بولتے اور لکھتے ہیں۔

ڈگری اور سرٹیفکیٹ کا چلن پرانے زمانے میں اتنا نہ تھا جیسا آج کل ہے۔ اس زمانے کے لوگ بیمار بھی سرٹیفکیٹ کے بغیر ہو جایا کرتے تھے اور بعض اوقات تو شدت مرض سے مر بھی جایا کرتے تھے۔ اب کسی کی علالت کو خواہ سامنے پڑا ایڑیاں رگڑ رہا ہو۔ بلا سرٹیفکیٹ کے ماننا قانون کے خلاف ہے۔ پرانے زمانے میں لوگوں کے اخلاق بھی بلا سرٹیفکیٹ کے شائستہ ہوا کرتے تھے۔ اب جس کے پاس کریکٹر سرٹیفکیٹ نہیں، سمجھو کہ اس کا کچھ اخلاق نہیں۔ اس کی نیک چلنی مشتبہ۔ اب تو مرنے جینے کا انحصار بھی سرٹیفکیٹ پر ہے، سانس کی آمد و شد پر نہیں۔ آپ نے اس شخص کا قصہ سنا ہوگا۔ جو خزانے سے پنشن لینے گیا تھا۔ جون کی پنشن تو اسے مل گئی۔ کیونکہ اس ماہ کے متعلق اس کے پاس بقید حیات ہونے کا سرٹیفکیٹ تھا۔ لیکن مئی کی پنشن روک لی گئی کہ جب مئی میں زندہ ہونے کا سرٹیفکیٹ لاؤ گے، تب ادا کی جائے گی۔ اصول، اصول ہے۔ اس منطق سے تھوڑا ہی توڑا جا سکتا ہے کہ، جو شخص جون میں زندہ ہے۔ اس کے مئی میں بھی زندہ ہونے کا غالب امکان ہے۔ باقاعدہ سرٹیفکیٹ ہونا چاہیے۔

عشق کاریست کہ بے آہ و فغاں نیز کنند۔۔۔

وکیلوں کے لیے بے شک ڈگری کی پابندی ہے۔ اسی لیے وہ ڈگریاں چوری ہو جانے پر پریشان اور بے بس ہو جاتے ہیں۔ لیکن موکلوں اور گواہوں کو ان کے بغیر ہی ایسی لیاقت پیدا کرتے دیکھا ہے کہ ڈگری والا تیری قدرت کا تماشا دیکھے۔ آپ نے ان میر صاحب کا ذکر سنا ہے۔ جو ہاتھ میں چھری لیے پھندنے دار ٹوپی پہنے ۔۔۔ بغل میں بستہ مارے کچہری کے احاطے میں گھومتے رہتے تھے کہ اگر لکھوائے کوئی ان کو خط تو ہم سے لکھوائے یعنی۔۔۔ مناسب معاوضے پر گواہی دے کر حاجت مندوں کے آڑے وقت کام آتے تھے۔

ایک روز کی بات ہے کہ کوئی جائیداد کا مقدمہ عدالت میں تھا۔ مدعی کا وکیل تیار نہ تھا۔ اسے پوری امید تھی کہ آتے ہی تاریخ لے لے گا۔ لیکن مجسٹریٹ نے جانے کیوں اصرار کیا کہ سماعت آج ہی ہوگی۔ گواہ پیش کیے جائیں۔ ورنہ یک طرفہ ڈگری دیتا ہوں۔ وکیل صاحب بوکھلائے ہوئے باہر نکلے کہ میر صاحب دکھائی دیے۔ ان کی جان میں جان آئی۔ فورا" انہیں بازو سے پکڑ کر اندر لے گئے۔ مقدمہ سمجھنے سمجھانے کا تو وقت ہی نہ تھا۔ بس اتنی بھنک کان میں پڑی کہ کوئی خان بہادر رضا علی مر گئے ہیں۔ ان کی جائیداد کا قصہ ہے۔ یہ کون تھے۔۔۔ کیا تھے۔۔۔ جھگڑا کیا ہے۔۔۔ کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ بہرحال پیش ہو گئے اور حلف اٹھا کٹہرے میں کھڑے ہو گئے۔ وکیل مخالف کو معلوم تھا کہ۔۔۔ یہ بھاڑے کے ٹٹو ہیں۔ ابھی ان کے قدم اکھاڑ دوں گا۔ جرح۔۔۔ شروع کر دی۔

"میر صاحب۔۔۔ آپ خان بہادر رضا علی مرحوم کو جانتے تھے؟"

میر صاحب نے فرمایا۔ "اجی جاننا کیا معنی۔۔۔ دانت کاٹی روٹی تھی۔ بڑی خوبیوں کے آدمی تھے۔ خدا مغفرت کرے۔ ان کی صورت ہمہ وقت آنکھوں کے آگے پھرتی ہے۔"

"کیا عمر تھی ان کی؟"

"بس چالیس اور اسی کے درمیان ہوں گے۔ بدن چور تھے اسی لیے صحیح اندازہ آج تک کوئی نہیں لگا سکا۔"

"اچھا یہ بتائیے کہ وہ لانبے تھے یا ناٹے۔"

میر صاحب نے کہا "خوب لانبا قد تھا۔ لیکن از راہ خاکساری جھک کے چلتے تھے۔ اس لیے ناٹے معلوم ہوتے تھے۔"

وکیل نے دوسرا سوال داغا۔۔۔ "ان کی رنگت تو آپ بتا ہی سکتے ہیں۔ گورے تھے یا کالے؟"

میر صاحب نے کہا۔ "خوب سرخ و سفید رنگت تھی۔ لیکن بیماری کے باعث جلد سنولا جاتی تھی تو کالے نظر آنے لگتے تھے۔"

وکیل نے ایک اور وار کیا۔ "یہ بتائیے کہ داڑھی مونچھ رکھتے تھے یا صفا چٹ تھے۔"

میر صاحب ہنسے اور کہا۔ "مرحوم کی طبیعت عجب باغ و بہار تھی۔ کبھی جی میں آیا تو مونچھیں رکھ لیں۔ وہ بھی کبھی پتلی، کبھی گچھے دار۔ داڑھی بھی چھوڑ دیتے تھے، خشخشی کبھی یک مشت۔ کبھی یہ لمبی ناف تک اور پھر ترنگ آئی تو سب کچھ منڈا صفا چٹ ہو جاتے تھے۔"

"اچھا داڑھی آپ نے ان کی دیکھی ہوگی۔ سفید سفید ہوتی تھی یا کالی۔"

میر صاحب نے کہا۔ ویسے تو سفید ہی ہوتی تھی لیکن جب خضاب لگا لیتے تھے تو بالکل کالی نظر آتی تھی۔ ان کی طبیعت ایک رنگ پر نہیں تھی۔ وکیل صاحب! کہہ دیا نا کہ باغ و بہار آدمی تھے۔"

وکیل صاحب نے کہا۔ "اچھا یہ فرمائیے کہ ان کا انتقال کس مرض میں ہوا۔"

میر صاحب نے ایک لمبی آہ بھری اور کہا۔ "رونا تو یہی ہے کہ آخر تک کچھ تحقیق نہ ہوئی۔ ڈاکٹر کچھ کہتے تھے۔ حکیم کچھ۔۔۔ مرگ چو آید طبیب ابلہ شود۔ ہم۔۔۔ تو یہی کہیں گے کہ ان کو مرض الموت تھا۔ ہائے! کیسی نورانی صورت تھی ہمارے خان بہادر صاحب کی۔ ان کی یاد آتی ہے تو سینے میں تیر سا لگتا ہے۔" یہ کہہ کر وہ ڈس ڈس رونے بھی لگے۔

مجسٹریٹ نے کہا۔ "اچھا، اب دوسرے مقدمے کی باری ہے۔ اگلی بدھ کو دوسرے گواہان پیش ہوں۔"

ڈرامہ سیریل "پاگل سی" ایک لڑکی کا اہم کردار

باتیں اریبہ فاطمہ سے

شاہین رشید

1 اصلی نام؟

اریبہ فاطمہ جعفری۔

2 پیار کا نام؟

بیا۔

3 تاریخ پیدائش/شہر یا ملک؟

7نومبر1989ء/یو ایس اے۔

4 قد/ستارہ؟

5فٹ7انچ/اسکارپیو۔

5 بہن بھائی/آپ کا نمبر؟

دو بھائی/میں بیچ کی ہوں یعنی دوسرے نمبر پر۔

6 تعلیم؟

بیچلرز ان سائیکولوجی۔

7 شادی؟

میری بات پکی ہو چکی ہے اور اریج ہے۔ ابو کی پسند سے ہے۔

8 پہلا کمرشل/پہلا ڈراما؟

زونگ/ہزاروں سال۔

9 وجہ شہرت؟

کمرشل سے ملی اور ڈراما سیریل "مرجائیں بھی تو کیا"

10 شوبز کی بڑی برائی؟

سینئرز جونیئرز کو آگے بڑھنے یا پروف کرنے کا موقع نہیں دیتے۔

11 صبح کب ہوتی ہے؟

میں تقریباً" آٹھ بجے تک اٹھ جاتی ہوں۔

12 صبح اٹھتے ہی کیا دل چاہتا ہے؟

سیریل اور سریلیک کھانے کو دل چاہتا ہے۔

13 گھر والوں کی کون سی بات بری لگتی ہے؟

کوئی بات بری نہیں لگتی۔

14 تہوار جوش و شوق سے مناتی ہیں؟

پہلے نہیں مناتی تھی مگر جب سے پاکستان آئی ہوں' عید اور چاند رات منانے کا مزا آتا ہے۔

15 جسمانی ساخت میں کیا تبدیلی چاہتی ہیں؟

یہی کہ مجھے اپنا وزن بڑھانا چاہیے۔ بہت دبلی ہوں میں۔

16 شدید بھوک میں آپ کی کیفیت؟

بہت چڑچڑی ہو جاتی ہوں۔

17 پاکستان میں کون سی تبدیلی ضروری ہے؟

سیکیورٹی کی۔

18 کس دن کا بے چینی سے انتظار ہوتا ہے؟

جمعہ کا۔ اس دن سب تیار ہو رہے ہوتے ہیں نماز کے لیے اور سب کا موڈ بہت اچھا ہوتا ہے۔

19 شدید تھکن کے باوجود کہاں جانے کے لیے ہمیشہ تیار رہتی ہیں؟

بازار۔ شاپنگ کے لیے۔

20 خوشی کا اظہار کس طرح کرتی ہیں؟

تحفے دیکھ کر اور شاپنگ کرکے۔

21 بیرون ملک کن باتوں سے متاثر ہوتی ہیں؟

وہاں تو اپنا گھر ہے۔ لیکن مجھے پاکستان میں رہنا اچھا لگتا ہے۔

22 دماغ کب گھومتا ہے؟

جھوٹ بولے اگر کوئی اور مجھے پتا ہو کہ یہ جھوٹ بول رہا ہے۔

23 طبیعت میں ضد ہے؟

صرف اپنوں کے آگے۔

24 غصے میں کیا ردعمل ہوتا ہے؟

کچھ نہیں' بس رونا آتا ہے۔

25 مردوں میں کیا بات اچھی لگتی ہے؟

مرد دو ٹائپ کے ہوتے ہیں' جو اچھے ہوتے ہیں۔ ان میں فیملی سے قربت اور فیملی سے کیئر اچھی لگتی ہے اور جو ایسے نہیں ہوتے وہ اچھے نہیں لگتے۔

26 کوئی لڑکا اگر مسلسل گھورے تو؟

میں ایسی نوبت ہی نہیں آنے دیتی کہ وہ مجھے گھورے۔

27 پرائز بانڈ نکلنے کی خواہش ہے؟

نہیں بالکل بھی نہیں' کیونکہ خریدنے کا بھی شوق نہیں ہے۔

28 گھر میں کس کے غصے سے ڈر لگتا ہے؟

چاچو کے غصے سے۔

29 کوئی چیز جو وقت سے پہلے مل گئی ہو؟

شہرت۔

30 جوائنٹ اکاؤنٹ بہتر ہوتا ہے یا سنگل؟

سنگل اکاؤنٹ۔

31 محبت کا اظہار کس طرح کرتی ہیں؟

لکھ کر۔۔۔ اور اسی لیے منگیتر سے بھی زیادہ تر ایس ایم ایس پہ ہی بات ہوتی ہے۔

32 شاپنگ کے لیے جاتی ہیں تو سب سے پہلے کیا خریدتی ہیں؟

کپڑے۔

33 آپ کے دنیا میں آنے کا کیا مقصد ہے؟

میں لوگوں کی مدد کرنا چاہتی ہوں۔ یتیم خانہ کھول کر۔

34 پیسہ خرچ کرتے وقت کیا سوچتی ہیں؟

ساری برائیاں ذہن میں آجاتی ہیں کہ اگر میرے پاس پیسہ نہ رہا تو۔

35 کبھی کرائسز میں وقت گزرا؟

نہیں' الحمد للہ۔

36 بہترین تحفہ آپ کی نظر میں؟

ایک انگوٹھی۔

37 کون سی بات موڈ پر اچھا اثر ڈالتی ہے؟
دوستوں سے بات چیت کرنا۔

38 پسندیدہ پروفیشن؟
ڈاکٹر (میڈیسن)

39 ایک تعریف جو کبھی نہیں بھولوں گی؟
ایک ڈائریکٹر نے کہا تھا کہ ایک ڈیڑھ سال میں تم پاکستان کی مشہور فنکارہ بن جاؤ گی۔

40 مخلص کون ہوتا ہے اپنے یا پرائے؟
اپنے۔ ہر حال میں۔

41 چھٹی کا دن کیسے گزارتی ہیں؟
سو کر اور بالوں میں تیل لگا کر۔

42 پسندیدہ لباس؟
چوڑی دار پاجامہ۔

43 گھر کے کس کونے میں سکون ملتا ہے؟
بستر پر۔

44 ایک آرٹسٹ جن کے ساتھ کام کرنے کی خواہش ہے؟
انور مقصود۔

45 کس کے ایس ایم ایس کے جواب فوراً دیتی ہیں؟
کلائینٹ کے۔

46 بوریت دور کرنے کے لیے کیا کرتی ہیں؟
مطالعہ، کتاب پڑھتی ہوں۔

47 ایک کردار جو کرنا چاہتی ہیں؟
"ساس" کا۔

48 ایک کردار جو کر کے پچھتائیں؟
شروع شروع کے کردار ایسے تھے۔

49 کسی کو فون نمبر دے کر پچھتائیں؟
ایک بیکری والے کو..... پرانک کیا تھا اس نے۔

50 مہمانوں کی اچانک آمد کیسی لگتی ہے؟
اچھی لگتی ہے۔ مجھے خوشی ہوتی ہے سب کی خاطر مدارات کر کے۔

51 اگر آپ پاور میں آگئیں تو کیا کریں گی؟
پاکستان کی بہت ساری برائیوں کو ختم کروں گی۔

52 کیا چیزیں جمع کرنے کا شوق ہے؟
پرفیومز۔

53 نصیحت جو بری لگتی ہے؟
ان لوگوں کی نصیحت بری لگتی ہے جو خود تو غلطیاں کرتے ہیں مگر دوسروں کو ان کی غلطی پر ٹوکتے ہیں۔

54 وقت کی پابندی کرتی ہیں؟
بالکل کرتی ہوں۔ شوٹ پر ایک گھنٹہ پہلے پہنچ کر دروازہ میں ہی کھلواتی ہوں۔

55 کن لوگوں پر دل کھول کر خرچ کرتی ہیں؟
غریبوں پر۔

56 اپنی کمائی سے سب سے قیمتی چیز کیا خریدی؟
ابھی تک نہیں خریدی۔

57 کھانے کے لیے بہترین جگہ ڈائننگ ٹیبل یا چٹائی؟
چٹائی۔

58 ایک ریسٹورنٹ جہاں کھانا کھانا پسند کرتی ہیں؟
دہلی ریسٹورنٹ کی کڑاہی۔

59 اگر آپ کے علاوہ ساری دنیا سو جائے تو آپ کیا لینا چاہیں گی؟
بہت ساری چاکلیٹس۔

60 ڈراموں کے کردار آپ کی شخصیت کے کتنے قریب ہوتے ہیں؟
کافی قریب ہوتے ہیں۔

61 انٹرنیٹ اور فیس بک سے آپ کی دلچسپی؟
بہت زیادہ۔

62 ایک کھانا جو آپ بہت اچھا پکا لیتی ہیں؟
قیمہ۔

63 عورت نرم دل ہوتی ہے یا مرد؟
مرد نرم دل ہوتے ہیں۔

64 اگر آپ کو کوئی اغوا کرے تو گھر والوں کا کیا رد عمل ہو گا؟
پورا پاکستان سر پر اٹھا لیں گے۔

65 کن کیڑوں سے ڈر لگتا ہے؟
چھپکلی سے۔

66 خودکشی کرنے والا بہادر ہوتا ہے یا بزدل؟
بزدل ہوتا ہے۔

67 کس قسم کے رویے دکھ کا باعث بنتے ہیں؟
بلاوجہ کا غصہ، بلاوجہ کا جھوٹ۔

68 شادی کی رسومات میں پسندیدہ رسم؟
کھیر چٹائی۔

69 ناشتا اور کھانا کس کے ہاتھ کا پکا ہوا پسند ہے؟
اپنی میڈ کا۔

70 اپنا فون نمبر کتنی مرتبہ تبدیل کر چکی ہیں؟
تقریباً چھ بار۔

71 کن چیزوں کو لیے بغیر گھر سے نہیں نکلتیں؟
سیل فون، والٹ اور پرفیوم۔

72 لوگ حیران ہوتے ہیں؟
مجھے دیکھ کر کہ اسکرین پر بڑی نظر آتی ہوں۔

73 اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتی ہیں؟
بالکل کر لیتی ہوں۔ ویسے بھی مجھے سوری کہنے کا شوق ہے۔

74 اپنی کوئی اچھی اور بری عادت بتائیں؟
میں بہت جلدی لوگوں پر بھروسا کر لیتی ہوں۔ یہ بری عادت ہے میری اور اچھی یہ ہے کہ ہر ایک کو ایک ہی لیول سے ٹریٹ کرتی ہوں۔

75 قلم ہاتھ میں آجائے تو کیا لکھتی ہیں؟
ڈرائنگ کرتی ہوں۔

76 کب منہ سے گالیاں نکلتی ہیں؟
اچھی بچی ہوں، گالیاں نہیں دیتی۔

77 کبھی غصے میں کھانا پینا چھوڑا؟
ہاں چھوڑا۔ مما کے غصے سے بھوک ہڑتال پہ چلی جاتی ہوں۔

78 شہرت کب مسئلہ بنتی ہے؟
کبھی بھی نہیں۔ میں لوگوں میں گھل مل جاتی ہوں۔

79 مارننگ شو کے لیے آپ کے تاثرات؟
مجھے اچھے نہیں لگتے۔

80 بستر پر لیٹتے ہی نیند آجاتی ہے یا کروٹیں بدلتی ہیں؟
کروٹیں بدلتی ہوں۔ ذرا مشکل سے نیند آتی ہے۔

81 بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پہ کیا کیا رکھتی ہیں؟
سیل فون کا چارجر، سیل فون، لیپ ٹاپ۔

82 اس دنیا میں خدا کی حسین تخلیق؟
یہ ساری دنیا ہی بہت خوب صورت ہے۔

83 زندگی کب بدلی؟
ایک ڈیڑھ سال پہلے جب میں اس فیلڈ میں آئی۔

84 کوئی گہری نیند سے اٹھا دے تو؟
تو بہت بڑبڑ کرتی ہوں اور پتا ہی نہیں چلتا کہ کیا کیا بول رہی ہوں۔

85 جھوٹ کب بولتی ہیں؟
کسی کو بچانے کے لیے۔

86 دن کے کس حصے میں اپنے آپ کو فریش محسوس کرتی ہیں؟
دوپہر کو۔

87 گھر آکر پہلی خواہش؟
میک اپ صاف کرنے کی۔

88 جس دن موبائل سروس بند ہوتی ہے، کیسا لگتا ہے؟
بہت ڈری ہوئی ہوتی ہوں کہ کس طرح رابطہ ہو گا۔ امی ابو بھی بہت ڈرے ہوئے ہوتے ہیں۔ پھر سارا دن نیوز دیکھتی ہوں۔

89 فقیر کو کم سے کم کتنا دیتی ہیں؟
سو روپے۔

90 کچھ یاد ہے کہ جب موبائل فون پہلی بار استعمال کیا تھا تو سب سے پہلی کال کس کو کی؟
ابو کو۔

91 سی این جی کی لائن میں لگنا کیسا لگتا ہے؟
میں نہیں لگتی۔ میرا ڈرائیور یہ کام کرتا ہے۔

اگر آپ کی شہرت کو زوال آجائے تو؟
تو کوئی بات نہیں۔ اس میں اللہ کی مرضی اور بہتری شامل ہو گی۔

☆

ٹی وی فنکارہ اور ماڈل

عائشہ گل سے ملاقات

شاہین رشید

خوب صورت اور باصلاحیت عائشہ گل نے بہت کم وقت میں فنِ اداکاری میں اپنا مقام بنایا ہے۔ پڑھی لکھی سلجھی ہوئی اور باوقار سی عائشہ کی شخصیت کی جھلک ان کے کرداروں میں بھی نظر آتی ہے۔ آج ہم آپ کی ملاقات عائشہ گل سے کرا رہے ہیں۔

"کیسی ہو عائشہ... کیا ہو رہا ہے آج کل اور فیملی لائف کیسی گزر رہی ہے؟"

"آپ کی دعا سے بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں اور کام ہو رہا ہے بڑے زور و شور کے ساتھ اور الحمد اللہ فیملی لائف بہت اچھی گزر رہی ہے۔"

"زور و شور سے کیا ہو رہا ہے؟ ڈاکٹری یا اداکاری؟"

"اداکاری جناب... ڈاکٹری تو بس پڑھی ہے۔ پریکٹس نہیں کی۔"

"کیوں بھئی... یہ تم لوگ اداکاری کی فیلڈ میں آکر اس خوب صورت پروفیشن کو خیرباد کیوں کہہ دیتے ہو؟"

"بس آپا...! دل لگنے کی بات ہے۔ ویسے تو میں جنرل فزیشن ہوں اور میرا ارادہ سرجن بننے کا تھا۔ مگر جب اداکاری کی فیلڈ میں آئی تو یہاں ایسا دل لگا کہ پھر میڈیسن کی پریکٹس کرنے کو دل ہی نہیں چاہا... ویسے میں نے کچھ عرصہ پریکٹس بھی کی تھی۔"

"کیا اداکاری میڈیسن سے زیادہ اچھا پروفیشن ہے؟"

"ایسی بات نہیں ہے۔ میڈیسن بہت خوب صورت پروفیشن ہے۔ مگر اداکاری کرکے دل کو زیادہ سکون ملتا ہے اور آپ یہ بھی تو دیکھیں کہ دنیا میں کتنے لوگ ایسے ہیں جو ڈگری تو کسی اور فیلڈ کی حاصل کرتے ہیں اور جاب کسی اور فیلڈ میں کر رہے ہوتے ہیں۔ تو بس یہی حال میرا بھی ہے۔ جناب! ڈگری تو میرے پاس ہے۔ جب کبھی اداکاری کو خیرباد کہا تو اپنی میڈیسن کی فیلڈ میں واپس آجاؤں گی۔"

"ویسے میڈیسن کی تعلیم زور زبردستی میں کی یا شوق سے کی؟"

"شوق سے کی۔ مجھے ہمیشہ سے ہی ڈاکٹر بننے کا شوق تھا۔ مگر ساتھ ساتھ اداکاری کا بھی شوق تھا تو میں نے دونوں کو ساتھ ساتھ رکھا اور تعلیم مکمل ہونے کے بعد فیصلہ یہ کیا کہ مجھے میڈیسن کی فیلڈ میں نہیں، بلکہ میڈیا کی فیلڈ میں رہنا ہے۔"

"مجھے یاد ہے کہ جب آپ اس فیلڈ میں آئیں تو آپ کا نام "زویا" تھا۔ چونکہ نئے نئے چینلز کھلے تھے۔ تو وہ فنکاروں کے نام بھی بڑے واضح کرکے دیا کرتے تھے۔ اب آپ نے عائشہ گل رکھ لیا ہے تو اس کی کیا وجہ ہے؟"

"سلام کرتی ہوں آپ کی یادداشت کو۔ میں اس فیلڈ میں تقریباً" 2005ء میں آئی تھی۔ اس وقت میں نے محسوس کیا کہ اس فیلڈ میں عائشہ نام کی کافی لڑکیاں ہیں تو سوچا کہ لوگوں کو پہچاننے میں مشکل ہوگی۔ اس لیے نام بدل لوں۔ تو کافی عرصہ "زویا" کے نام سے آتی رہی۔ مگر پھر سوچا کہ نہیں۔ پہچان تو اپنے نام سے ہی اچھی لگتی ہے۔ اس لیے میں نے اپنا ہی نام استعمال کرنا شروع کر دیا اور زویا کو خدا حافظ کہہ دیا۔"

قہقہہ۔

"کیا بات ہے کہ اچانک اسکرین پہ آنے لگتی ہو اور اچانک غائب ہو جاتی ہو۔ یہ آنکھ مچولی کیسی ہے؟"

"اب ایسا نہیں ہوگا۔ اب میں آپ کو اسکرین پہ نظر آتی رہوں گی اور کام کرتی رہوں گی۔ غائب ہونے کی وجہ صرف اور صرف میری پڑھائی تھی۔ آپ کو پتا ہے کہ ایک تو میڈیکل میں داخلہ مشکل سے ملتا ہے۔ اتنی محنت سے میں نے ایک سیٹ حاصل کی تو پھر اس سیٹ کا حق بھی تو ادا کرنا تھا۔ پھر پڑھنا بھی بہت زیادہ پڑتا ہے۔ ڈاکٹر بننا کب بھلا اتنا آسان ہوتا ہے۔ اب اللہ کا شکر ہے کہ لائف سیٹل ہو گئی ہے تو اب جی بھر کے کام کروں گی۔"

"اب تک کیا کیا کر چکی ہیں؟"

"یہ پوچھیں کہ کیا، کیا نہیں کیا۔ میں آپ کو تفصیل سے بتاتی ہوں۔ میں ماڈلنگ بھی کرتی ہوں۔ آج کل میرے جو کمرشلز چل رہے ہیں آپ دیکھ ہی رہی ہوں گی۔ میں نے میگزین ماڈلنگ بھی کی اور کر رہی ہوں۔ کیٹ واک بھی کی۔ مگر اب نہیں کر رہی۔ کیونکہ اداکاری کی فیلڈ میں مصروفیات کافی بڑھ گئی ہیں اور اداکاری کے بارے میں تو آپ کو پتا ہی ہے کہ میری جان ہے اس میں... اور ہاں یہ تو بتانا بھول ہی گئی کہ میں ایک فلم میں بھی کام کر چکی ہوں اور وہ بھی جاوید شیخ کے ساتھ۔"

"اچھا؟ وہ کیسے؟"

"وہ ایسے کہ جاوید شیخ کی بہن سفینہ کے ساتھ میری خاصی اچھی دعا سلام تھی اور اکثر ملنا ملانا بھی رہتا تھا۔ ایک دن جاوید شیخ صاحب سے ملاقات ہوئی تو انہیں میرا چہرہ کچھ جانا پہچانا لگا۔ کہنے لگے کہ "آپ کو کہیں دیکھا ہے۔" میں نے کہا کہ "جی! آپ نے مجھے ڈراموں میں دیکھا ہوگا۔" کہنے لگے "بالکل! آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔" ان دنوں جاوید شیخ "یہ دل آپ کا ہوا" بنا رہے تھے تو انہوں نے مجھے کام کرنے کی آفر دی جو کہ میں نے قبول کر لی۔"

"گڈ... کیا رول تھا آپ کا؟"

"جی میرا رول ایک بہو اور بھابھی کا تھا۔ بہت خوب صورت رول تھا اور مجھے بہت اچھا لگا تھا، جاوید صاحب کی فلم میں کام کرکے۔ دلچسپ بات بتاؤں کہ یہ فلم

زیادہ تر ملک سے باہر یعنی اسپین اور سوئٹزرلینڈ میں شوٹ ہوئی تھی' تو ملک سے باہر جانے کا بھی موقع مل گیا تھا۔ بہت مزا آیا تھا۔ بہت یادگار دن تھے وہ۔"

"پھر مزید آفرز نہیں آئیں یا خود ہی نہیں کیا کام؟"

"نہیں! خود ہی کام نہیں کیا۔ کیونکہ یہ تو ایک بہو کا رول تھا۔۔۔ جو کہ سوبر تھا۔ اس لیے کرلیا۔ باقی جو رول ہوتے ہیں ہمارے یہاں' وہ میں کرنا نہیں چاہتی۔ ہاں اگر اچھا اور سنجیدہ اور سوبر رول ملا تو پھر ضرور کروں گی۔ مگر سچی بات ہے کہ فلم میں کام کرنے کا کچھ زیادہ موڈ نہیں ہے۔ کیونکہ میں ایک ڈاکٹر ہوں اور ڈاکٹر کی بیوی بھی۔ تو جو میرا امیج ہے' اسی کے مطابق کام کروں گی۔ خواہ وہ ٹی وی کا میڈیا ہی کیوں نہ ہو۔"

"آپ کہہ رہی ہیں کہ سوبر کردار کروں گی تو یہ کیٹ واک اور ماڈلنگ سوبر ہوتی ہیں؟"

"کیٹ واک تو میں نے بہت زمانہ ہوا چھوڑ دی ہے اور جہاں تک کمرشلز کی بات ہے تو میرے جتنے بھی کمرشلز ہیں بہت سوبر ہیں اور میگزین کے لیے جو ماڈلنگ میں کرتی ہوں' وہ کپڑوں کی ہوتی ہے۔ جیسے لان کے پرنٹ وغیرہ۔"

"شہرت میں بڑی کشش ہے۔ لوگ تو پہچان لیتے ہوں گے؟"

"جی! بالکل پہچان لیتے ہیں۔ بڑے پیار سے ملتے ہیں۔ تعریف کرتے ہیں۔ یا پھر کوئی اشارے سے کہہ دے کہ وہ دیکھو! عائشہ گل کو یا وہ دیکھو! جو فلاں ڈرامے میں آرہی ہیں۔ فلاں کمرشل میں آرہی ہے۔ تو سچ میں آپا! اپنے آپ پر بہت فخر محسوس ہوتا ہے۔"

"ہوں۔۔۔ تو مزا آرہا ہے۔ وقت کی کتنی قدر ہے آپ کے دل میں؟"

"بہت زیادہ۔۔۔ میں سمجھتی ہوں کہ ہمارے بہت سے مسائل وقت کی پابندی نہ کرنے کی وجہ سے ہی جنم لیتے ہیں۔ ملک سے باہر وقت کی بہت قدر کی جاتی ہے۔ ہر کام وقت پر ہوتا ہے۔ اس لیے وہ لوگ ترقی بھی کرتے ہیں۔ جبکہ ہم وقت کی قدر نہیں کرتے۔ یہاں تو وقت پر پہنچنے والے اور وقت کی پابندی کرنے والے کو بے وقوف سمجھا جاتا ہے۔"

"آپ کو بھی پھر لوگ بے وقوف سمجھتے ہوں گے؟"

"ہاں۔۔۔ سمجھتے ہیں تو سمجھتے رہیں۔ مگر اپنی عادت بدلنے کو تیار نہیں۔ میں تو وقت پر پہنچ جاتی ہوں۔ بڑے اطمینان کے ساتھ میک اپ کرواتی ہوں اور اپنا اسکرپٹ پڑھتی ہوں۔ اس طرح مزید اچھی تیاری ہوجاتی ہے میری۔"

"باتیں تو ہوتی ہی رہیں گی۔ کچھ اپنے اور اپنی فیملی کے بارے میں بھی بتائیں؟"

"میں خوجہ فیملی (اسماعیلی فرقے) سے تعلق رکھتی ہوں۔ میں پشاور میں پیدا ہوئی۔ ابتدائی تعلیم بھی پشاور سے ہی حاصل کی۔ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہوں۔ والدین حیات نہیں ہیں۔ میرے والد انجینئر اور والدہ ڈاکٹر تھیں۔ اس لیے ان کی خواہش تھی کہ یا تو میں انجینئر بنوں یا پھر ڈاکٹر۔۔۔ سو امی کی خواہش پوری ہوگئی اور میں ڈاکٹر بن گئی۔"

"ہوں۔۔۔ گڈ۔۔۔ خاندان کی پہلی ڈاکٹر ہیں آپ؟"

"ارے نہیں' میرا خاندان تو بھرا پڑا ہے ڈاکٹروں سے۔ مثلاً" میرے تایا' میرے چاچا' میری پھوپھی اور دیگر کئی لوگ۔۔۔ اور پھر میری شادی بھی ایک ڈاکٹر سے ہوئی ہے۔"

"ایم بی بی ایس کی تعلیم پاکستان سے ہی حاصل کی؟"

"جی! اور جنرل فریشن بننے کے لیے میں روس گئی۔ وہاں رہ کر نہ صرف میں نے اعلا تعلیم حاصل کی۔ بلکہ اکیلے رہنا اور دنیا کو جج کرنا بھی سیکھا۔ میں سمجھتی ہوں کہ اکیلے رہ کر انسان' بہت اچھے طریقے سے سیکھتا ہے اور اس کو دنیا کے نشیب و فراز سے آگاہی ہوتی ہے۔"

"ساری ذمہ داری اپنے اوپر جو آجاتی ہے؟"

"جی بالکل! باہر رہ کر خود سے سارے کام کرنے کی اتنی عادت ہوگئی کہ میں آج تک سارے کام خود کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔ حالانکہ گھر کے ملازم کہتے ہیں کہ باجی! آپ آرام کریں۔ مگر مجھے تو آرام کا لفظ ہی پسند نہیں ہے' تو میں آرام کیسے کرسکتی ہوں اور میں آپ کو بتاؤں کہ میں کافی عرصہ دبئی میں بھی رہی ہوں۔"

"تو پھر پاکستان اداکاری کے شوق میں آئیں؟"

"جی! اداکاری کے شوق میں بھی اور پھر میرے میاں صاحب کی جاب بھی یہیں ہے۔"

"اچھا۔۔۔ گڈ۔۔۔ کب ہوئی شادی اور کون سے ڈاکٹر ہیں آپ کے میاں صاحب؟"

"شادی کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ بس تقریباً" ڈھائی سال ہوئے ہیں۔ میرے میاں کا نام محمد امین پراچہ ہے اور وہ ٹراما سرجن ہیں۔ میری ایک نند' دو دیورانیاں اور میرا ایک دیور بھی ڈاکٹر ہے۔"

"آپ دونوں ہی مصروف رہتے ہیں۔ گھر کی دیکھ بھال کون کرتا ہے؟"

"ایک وقت میں دونوں گھر سے باہر نہیں ہوتے۔ میرا کام دن بھر کا ہوتا ہے اور ان کی رات کی ڈیوٹی ہوتی ہے۔ یوں گھر میں کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔"

"آپ صبح غائب' وہ رات کو غائب۔۔۔ دونوں کی ملاقات کب ہوتی ہے؟"

قہقہہ۔۔۔ "بھئی ملاقات بھی ہوجاتی ہے۔ جب یہ آرہے ہوتے ہیں تو میں جارہی ہوتی ہوں۔ تو بس ملاقات ہوجاتی ہے۔ انسان کو اس پہ صبر و شکر کرنا چاہیے۔ ورنہ تو ایک دوسرے دیکھ کر بور ہوجائیں گے۔"

"سسرال والے آپ کی فیلڈ کو اور خاص طور پر آپ کی پرفارمنس کو پسند کرتے ہیں؟"

"سسرال میں میری ساس میرے ڈرامے بہت شوق سے دیکھتی ہیں اور بہت پسند بھی کرتی ہیں۔ باقاعدہ تعریف و تنقید بھی کرتی ہیں۔ میرے میاں صاحب بھی میرے کام کو بہت زیادہ پسند کرتے ہیں۔ جب میں اسکرپٹ لے کر گھر آتی ہوں تو باقاعدہ ڈسکس بھی کرتے ہیں۔"

"پیسے سوچ سمجھ کر خرچ کرتی ہیں یا ہاتھ کا میل سمجھ کر اڑا دیتی ہیں؟"

"میں تو پیسہ ہاتھ کا میل سمجھ کر اڑا دیتی ہوں اور میری یہ سوچ ہے کہ خرچ کرنے سے ہی پیسے میں اضافہ ہوتا ہے' تو جناب! میں تو خاصی فضول خرچ ہوں اور میرے میاں صاحب نے کبھی روک ٹوک بھی نہیں کی اس معاملے میں کہ کیوں اتنا خرچ کرتی ہو۔"

"شاپنگ مل کر کرتے ہیں آپ دونوں۔۔۔ یا اس کی بھی فرصت نہیں ہے؟"

"نہیں' نہیں! ایسی بات بھی نہیں ہے۔ شاپنگ کے لیے ہم دونوں کے پاس وقت ہوتا ہے اور مل کر شاپنگ کرتے ہیں۔ جب ہم مشترکہ شاپنگ کرتے ہیں تو اپنے لیے نہیں' بلکہ اپنے گھر کی تزئین و آرائش کی چیزیں ہی خریدتے ہیں۔"

"کھانا گھر پہ کھاتے ہیں یا گھر سے باہر؟ پہلی ترجیح کیا ہے؟"

"پہلی ترجیح تو گھر میں ہے۔ میرے میاں صاحب بھی بہت اچھے کک ہیں۔ کبھی موڈ میں ہوتے ہیں تو کچھ نہ کچھ پکا لیتے ہیں۔ ورنہ میں تو پکاتی ہی ہوں اور گھر سے باہر جب کھانے کا موڈ ہوتا ہے تو ہم دونوں پورٹ گرینڈ چلے جاتے ہیں اور بہت انجوائے کرتے ہیں۔"

"مزاجاً" کیسی ہیں آپ؟"

"آپ کو کیا لگتا ہے؟ میں ہوں نا خوش مزاج۔۔۔ ہمیشہ ہنستی مسکراتی رہتی ہوں۔ غصہ کبھی آتا بھی ہے تو جلدی ٹھنڈا ہوجاتا ہے۔"

"لوگوں کی کون سی عادت بری لگتی ہے؟"

"جھوٹ بولنے کی۔ میں کہتی ہوں کہ آخر لوگ جھوٹ کیوں بولتے ہیں۔ میرے نزدیک لڑائی جھگڑے اور دوریوں کی بنیادی وجہ جھوٹ ہی ہوتا ہے۔ اس لیے ہمیشہ اس سے بچ کر رہنا چاہیے۔"

"فرصت کے وقت میں کیا مشغلے ہوتے ہیں؟"

"کوکنگ اور گھر کی دیکھ بھال' سجاوٹ' سیٹنگ چینج کرتی ہوں یا پھر مطالعہ کرتی ہوں۔"

☆

خامشی کو بیاں ملے

امت الصبور

فائزہ محمود..... بہاول پور

1۔ تایا جی نے بڑے پیار سے میرا نام فائزہ رکھا تھا۔ جو کہ مجھے بہت پسند ہے۔ انٹر کے ایگزامز دیے ہیں۔ اب یونیورسٹی میں ایڈمیشن لینا ہے (ان شاء اللہ) کالج کے دنوں میں تو یہ ہوتا تھا کہ صبح جلدی اٹھ کر کالج جانا پھر آرام اور شام کو پڑھائی وغیرہ کرنا۔ مگر جب فارغ ہوئی ہوں تو روٹین خاصی مزے دار ہوتی ہے۔ صبح دیر سے سو کر اٹھنا۔ چائے وغیرہ پی کر ہلکے پھلکے کام 'پھر سارا دن ناولز' چائے اور میوزک وغیرہ میں گزار دیتی ہوں۔ میں نے توتے پال رکھے ہیں جو کہ مجھے بہت عزیز ہیں۔ کسی جادوگر کی طرح میری جان ان میں قید ہے۔ میں پینٹنگ بھی کرتی ہوں۔ خیر! کافی مزے دار لائف گزار رہی ہوں۔

2 میں 13 اگست کو پیدا ہوئی تھی۔ اس لیے لیو (Leo) اسٹار والی ساری خامیاں اور خوبیاں مجھ میں موجود ہیں۔ میں پہلے اچھی عادتیں بتاتی ہوں۔ میں نے کسی سے نہیں پوچھا کہ میری اچھی اور بری عادتیں بتاؤ۔ دوسروں کو تو میری اچھی عادت بھی بری لگے گی اور ویسے بھی میں خود کو دوسروں سے زیادہ بہتر جانتی ہوں۔

جیسی بھی ہوں اچھی ہوں بری میں اپنے لیے ہوں
میں خود کو نہیں دیکھتی ں اوروں کی نگاہ سے

میں بہت زندہ دل 'ہنس مکھ طبیعت کی مالک ہوں' اندر سے بہت زیادہ حساس ہوں 'چھوٹی چھوٹی باتوں کو محسوس کرتی ہوں۔ میں دوسروں کا بہت خیال رکھتی ہوں۔ مگر میں اظہار زیادہ نہیں کر سکتی۔ بہت کھلے دل و دماغ کی مالک ہوں 'یعنی روشن خیال۔ مجھے مطالعے کا بہت شوق ہے اور سب سے اچھی بات یہ ہے کہ میں اپنے دل کی بات بتا دیتی ہوں۔ دل میں میل نہیں رکھتی وغیرہ۔ بہت کھرا کھرا بولتی ہوں 'غصے کی تیز ہوں۔

اب خامیاں 'غصہ جب آتا ہے تو بہت شدید آتا ہے 'میں بہت زیادہ فضول خرچ ہوں 'میرے ہاتھ میں پیسہ نہیں ٹھہرتا 'میں چائے 'کافی بہت پیتی ہوں 'اپنی ڈائٹ (Diet) کا خیال نہیں رکھتی۔

3 میں ڈائجسٹ کی تو دشمن ہوں۔ جہاں دیکھتی ہوں 'اٹھا لیتی ہوں۔ 2007ء میں پڑھنے شروع کیے میں سب ڈائجسٹ اپنے پاس محفوظ رکھتی ہوں۔ ان سب کو ترتیب سے رکھتی ہوں اور کسی کو ہاتھ نہیں لگانے دیتی۔ مجھے حیرت ہوتی ہے 'ان لوگوں پر جو پرانے رسالے دے کر نئے خرید آتے ہیں۔ میں تو پرانی کہانیاں بڑے مزے سے پڑھتی ہوں۔ بھائی لڑتا ہے کہ کیوں پڑھتی ہو؟ تو میں کہتی ہوں تم جو ڈرامے دیکھتے ہو 'میں وہی پڑھتی ہوں۔ اس میں ہے کوئی حرج؟ تو وہ لاجواب ہو جاتا ہے۔ بہت ناول پڑھے ہیں۔ مگر جو ناقابل فراموش ہیں 'ان میں بشریٰ سعید کا "سفال گر" ہے۔ میں نے اتنا اچھوتا اور لازوال ناول پہلے کبھی نہیں پڑھا۔ عمیرہ احمد بھی ہیں۔ ان کا اپنا اسٹائل ہے۔ جیسے "شہرذات" فرحت اشتیاق کا "ہم سفر" عنیزہ سید کا "حرف سادہ کو عنایت ہوا اعجاز کا رنگ" رخسانہ نگار کا "محبت خواب سفر" عمیرہ احمد کی "دربار دل 'لاحاصل 'ایمان 'امید 'محبت 'سب کے سب لاجواب ہیں۔ اب میں تعریف کے لیے ایسے لفظ کہاں سے ڈھونڈ کے لاؤں جو آج تک کسی نے کہے نہ سنے ہوں۔

4۔ اپنی سالگرہ کا دن میں بہت اچھے طریقے سے مناتی ہوں۔ رات کو بارہ بجے سے ہی لوگ میسج کرنا شروع کر دیتے ہیں اور بہت لوگوں کو میری سالگرہ یاد ہوتی ہے۔ بہت لوگ وش کرتے ہیں۔ مجھے تحفے بھی بہت خوب صورت ملتے ہیں۔ میری فرینڈز جمع ہوتی ہیں۔ میرے گھر پہ پارٹی ہوتی ہے۔ اتنی مبارک بادیں ملتی ہیں کہ میں حیران رہ جاتی ہوں کہ ان کو بھی میری برتھ ڈے یاد ہے؟ گفٹس سب ہی بہت پیار سے دیتے ہیں جو کہ میرے لیے بہت خاص ہوتے ہیں۔

5 میرا پسندیدہ شعر ہے۔

کبھی موسموں کے سراب میں 'کبھی بام و در کے عذاب میں
وہاں عمر میں نے گزار دی 'جہاں سانس لینا محال تھا
تمہارے بعد کوئی ملا نہیں 'جو یہ حال دیکھ کے پوچھتا
مجھے کس کی آگ جھلسا گئی 'میرے دل کو کس کا ملال تھا

اس سال میں نے بہت سی کتابیں پڑھی ہیں۔ ویسے جو میرے موسٹ فیورٹ ہیں 'وہ نسیم حجازی ہیں۔ ان کی کتابیں بہت زبردست ہوتی ہیں۔ جیسے "شاہین" "تلوار ٹوٹ گئی 'محمد بن قاسم 'خاک اور خون 'یوسف بن تاشفین" سب سے اچھی مجھے "شاہین" اور "محمد بن قاسم" لگیں ان شاء اللہ ان کی باقی تمام کتابیں بھی بہت جلد پڑھوں گی اور اپنے پاس محفوظ رکھوں گی۔ مجھے "پیر کامل" بھی بہت زبردست لگتی ہے۔ عمیرہ احمد بھی لاجواب لکھتی ہیں۔ نسیم حجازی اور عمیرہ احمد کی کتابیں پڑھ کر ایمان تازہ ہو جاتا ہے۔ روح سرشار ہو جاتی ہے۔ میرا دل مسلمانوں کے ماضی کے حالات و واقعات پڑھ کر قطرہ قطرہ موم کی طرح پگھلتا ہے۔ میں جذباتی بھی بہت ہوں۔ میں ناول پڑھ کر بہت روتی ہوں۔ "محمد بن قاسم" پڑھ کر اتنا روئی کہ مجھے لگا جیسے یہ سب ابھی ہوا ہے۔ آپ بھی امت مسلمہ کے عروج و زوال کی یہ اچھوتی داستانیں پڑھیے گا 'جو دلوں پر ان مٹ نقش چھوڑ جاتی ہیں۔

حمیرا عروش..... کراچی

1 میرا نام حمیرا عروش ہے۔ میں نے 4 ستمبر 1995ء کو پنجاب میں جنم لیا۔ بڑوں نے میرا نام حمیرا اور ایک دوسرا نام کمبائن کر کے رکھ دیا 'جو کہ مجھے پسند نہیں آیا 'سو حذف کر دیا۔ میٹرک میں آ کر اپنا نام "عروش" رکھ لیا تو تمام فرینڈز نے عروش کے نام سے میرا نمبر سیو کر لیا۔ اس طرح اس نام سے رجسٹری ہو گئی۔ اس پر بھائیوں نے میرا کافی مذاق بنایا۔ مگر میں نے پروا نہ کی اور اپنے نئے نام کو ترک کرنا مناسب نہ سمجھا۔ پھر جب لکھنے کا آغاز کیا تو دونوں ناموں کو مشترک کر کے "حمیرا عروش" رکھ لیا۔ یہ تھی میرے نام کی کہانی۔

خیر! فرڈ ایئر کی اسٹوڈنٹ ہوں۔ روٹین کافی ٹف ہے۔ میری مختصر سی دنیا گھر 'پڑھائی 'میگزینز اور فرینڈز تک محدود ہے۔ دیگر مشاغل میں چیٹنگ شامل ہے۔

2 خوبیوں اور خامیوں کے لیے میں نے صدف سے رابطہ کیا۔ لڑکا پارٹی یعنی بھائیوں کی طرف جانے سے گریز کیا۔ کیونکہ ان کی نظر میں سست 'غائب دماغ بقول احمد کے "بھولی" ہوں لہٰذا میں نے وہاں کا رخ کیا جہاں سے اچھائیوں کی زیادہ امید تھی۔

ایک خامی تو یہ ہے کہ جو لوگ مجھے اچھے لگتے ہیں ان کی بات پر فوراً "ایمان لے آتی ہوں۔ صدف کے خیال سے مجھ میں کوئی خامی نہیں۔ شرارتی بہت ہوں۔ شدت پسند نہیں ہوں۔ ہر کام حد میں رہ کر کرتی ہوں۔ تیز بھی ہوں 'معصوم بھی۔ گویا ہر رنگ ہے مجھ میں۔

3۔ "خواتین" میں اس وقت سے اپنے گھر میں دیکھ رہی ہوں۔ جب سے ہوش سنبھالا ہے۔ شعاع میں "رابعہ کی کہانی" پڑھی تھی۔ متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکی۔ نعیمہ نے بہت خوب لکھا۔ ویل ڈن!

"ایک محبت ہی تو کی تھی۔ وہ بھی بہت احتیاط 'بہت خیال کے ساتھ۔ پھر میرے ساتھ ایسا کیوں ہوا؟ خوابوں کی تتلی کے پیچھے دوڑنے کا عمل اتنا بھیانک تجربہ نکلا کہ سیدھی غلاظت کے ڈھیر میں جا گری۔ احساس ذلت پیچھا نہیں چھوڑتا۔ رواں رواں جیسے کسی ان دیکھی آگ میں جل رہا ہے۔ اذیت ہی اذیت جس سے چھٹکارا پانے کا کوئی سامان نہیں۔ آنسو ہی آنسو 'درد ہی درد 'کیسی ہوتی ہے محبت اور کیسی ہو جاتی

ہے زندگی۔

یا پھر شاید محبت، ہم جیسے لوگوں کے لیے نہیں ہوتی وہ بہار سے خوشنما لوگ اور ہی ہوتے ہیں۔ جو محبت کرتے ہیں جن سے محبت کی جاتی ہے۔ ہم تو خزاں رسیدہ پتوں جیسے لوگ ہیں، جن کے مقدر میں قدموں تلے چر مرانا لکھا ہے۔

بس زندگی خاموش ہے تو خاموش ہی سہی۔
زندگی تنہا ہے تو تنہا ہی سہی۔"

4۔ برتھ ڈے سیلیبریٹ کرنے کا خیال کبھی نہیں آیا۔ بھئی! جب کوئی ہمیں گفٹ نہیں دیتا تو ہم کیک کیوں کھلائیں۔ وشنگ میسیجز ضرور آتے ہیں۔ امی تحفتاً" کتاب دیا کرتی تھیں۔

5 مجھے اپنے سلیبس کے علاوہ ہر کتاب کے مطالعے کا شوق ہے۔ قرآن مجید ترجمے کے ساتھ پڑھ کر نہ صرف سکون ملتا ہے۔ بلکہ روح کے اندر عاجزی بھرتی چلی جاتی ہے۔

6 شعروشاعری میں دلچسپی نہ ہونے کے برابر ہے۔ مجھے بے ہنگم میوزک پسند ہے، تیز میوزک والا، جس میں لڑکا اور لڑکی دونوں کی آواز شامل ہو (ہاہاہا) اکیلی لڑکی ہو تب بھی سن لیتی ہوں مگر خالص مردانہ آواز والے گانے مجھے زہر لگتے ہیں۔ اور اب اجازت؟ مغرب کی اذانیں ہو رہی ہیں۔ نماز ادا کر لیتی ہوں اور اب ایک خوب صورت نصیحت کہ "نماز پڑھیے! قبل اس کے کہ آپ کی نماز پڑھی جائے۔" اپنا اور خود سے وابستہ ہر چاہت بھرے رشتے کا خیال رکھیے گا۔

مجھ سے ملنا کیسا لگا؟ ضرور بتایئے گا۔

نوال افضل گھمن ...... گجرات

1۔ میرا پیارا نام نوال افضل گھمن ہے۔ ہم جٹ فیملی زمین دار گھرانے سے بلونگ کرتے ہیں.... ہم چار بہن بھائی ہیں.... مجھ سمیت تین سسٹرز ایک چاند جیسا بھیا ہم 15 جنوری کو دنیا میں تشریف لائے اور ہمارا اسٹار کیپری کورن ہے۔ تعلیمی قابلیت ماسٹرز انگلش لٹریچر پارٹ 2 اور بی ایڈ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے جاری ہے۔ مشاغل میں اچھا میوزک.... کوکنگ.... اور دنیا جہان کی پرانی نئی بکس کا مطالعہ....

2۔ خامیاں، جی جناب اسٹریٹ فارورڈ (صاف گو) ہوں جو اچھا لگا تو صاف کہہ دیا برا لگا تو فوراً "ری ایکٹ" (رد عمل ظاہر) کر دیا خوش اخلاقی میں سب سے آگے کہ ہمارے اعمال میں سب سے بھاری عمل اخلاص کا اعلا ہونا ہی ہوتا ہے.... فقیری لائن سے دلچسپی ہے۔

فقیروں سے لگاؤ ہے۔ ہرے رنگ کا چوغہ بڑا ہانٹ کرتا ہے۔ دوستی کرنا اور نبھانا ہم خوب جانتے ہیں.... زندگی میں فضل رب کریم سے، بہت اچھے اور نیک لوگوں کی صحبت نصیب ہوئی ہے۔

3۔ خواتین ڈائجسٹ سے وابستگی بارہ برس اور چار ماہ پرانی ہے پہلا رسالہ کراچی شہر کے علاقہ پٹیل پاڑہ سے خریدا تھا.... بہت سی تحریریں ہیں جو دل پر نقش ہیں۔ سرفہرست سفال گر، بشریٰ سعید جی، عمیرہ جی، عنیزہ جی، فرحت اشتیاق جی، رخسانہ نگار جی، مرگ برگ اور دل من مسافر من۔

4۔ سالگرہ 15 جنوری کو ہوتی ہے۔ سب سے پیارا انداز میری بیسٹ فرینڈ ناہید مزمل بٹ کا ہوتا ہے وش کرنے کا اور پھر ماریہ اعجاز گھمن کا.... تحائف لینے سے زیادہ ہم دینے کو ترجیح دیتے ہیں کہ تحائف سے دلوں میں محبت بڑھتی نہیں بلکہ محبت کا پودا درخت بن کر اپنی جڑیں مضبوط کرتا ہے۔

5۔ کتابیں بہت سی پڑھیں بلکہ پڑھ رہے ہیں زندگی میں کتابوں کے علاوہ رکھا ہی کیا ہے کتاب بہترین ساتھی ہے کتنی جامع حقیقت ہے اس فقرے میں....

6۔ پسندیدہ شعر

زندگی سے بس یہی گلہ ہے مجھے
تو بڑی دیر سے ملا ہے مجھے

عنیزہ سید

جو رکے تو کوہِ گراں تھے ہم

ماہ نور اپنے چاچا سردار خان کے گاؤں گئی تو وہاں بندر کا تماشا دیکھ کر اس کے دل میں یہ فن سیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس نے بندر کا تماشا دکھانے والے شخص سے اس خواہش کا اظہار کیا' لیکن اس کے کزنز اسے زبردستی وہاں سے لے گئے۔ وہ کئی دن تک بندر والے کے بارے میں سوچتی رہی۔ اسے بندر والے کی شخصیت میں عجیب کشش محسوس ہوئی تھی وہ اس کے دوبارہ آنے کا انتظار کرنے لگی۔

سعد بلال کو فنون لطیفہ اور دیگر فنون سے گہرا شغف ہے تاہم اس کے والد کو یہ بات پسند نہیں ہے۔ ان کے خیال میں بلال کو یہ دلچسپی اپنی ماں سے ورثے میں ملی ہے' کیونکہ وہ ایک گلوکارہ تھیں۔ بلال کی خواہش ہے کہ سعد سنجیدگی سے کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹائے۔

سارہ خان سرکس میں کرتب دکھایا کرتی تھی۔ ایک حادثے میں وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئی۔ سعد اس کا بہت خیال رکھتا ہے' کیونکہ وہ سعد کو بہت عزیز ہے۔

ماہ نور گاؤں میں بابے منگو کے میلے میں گئی تو اسے وہاں ایک لوک فنکار کی آواز نے مسحور کر دیا۔ وہ اس سے ملنے گئی۔ تو اسے لگا جیسے وہ فنکار وہی بندر والا ہو۔ اس نے بھی ماہ نور کو شناسا نظروں سے دیکھا۔

خدیجہ اور فاطمہ' ماہ نور کی خالہ ہیں۔ ماہ نور ان سے ملنے گئی تو وہ دونوں "مشہناز" نامی ایک رشتے دار خاتون کو یاد کر رہی تھیں' جس نے گلوکاری کے شوق میں گھر والوں سے بغاوت کی تھی۔ اور پھر شادی کے بعد اس کے قتل کی خبر ہی ملی تھی۔

سعد کی نیٹ پر اپنی بہن نادیہ سے بات ہوئی' جو پڑھائی کے سلسلے میں بیرون ملک مقیم ہے۔

پندرہویں قسط

ایک' دو' تین' چار' پانچ... پانچ کے بعد رک کر وہ دوبارہ سے گنتی شروع کردیتی تھی۔ اس لیے اسے اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا کہ اس نے کتنی بار سعد کے نمبر پر کال کی تھی اور کتنی بار جواب میں اسے "آپ کا مطلوبہ نمبر فی الحال بند ہے۔ برائے مہربانی کچھ دیر بعد کال کیجیے" کا پیغام موصول ہوا تھا۔

اس کا دل نجانے کیوں کچھ انہونی ہو جانے کے خدشے کے خوف سے لرز رہا تھا۔ باہر گرد آلود آندھی اپنے پورے زور پر چلتے ہوئے چیزوں کو ادھر سے ادھر اڑائے پھر رہی تھی۔ ماہ نور نے کبھی آندھی میں اٹھتے' بنتے' مٹتے بگولوں کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا تھا' مگر سعد کی گاڑی کے پیچھے بے ارادہ بھاگتے ہوئے آنکھوں میں پڑتی دھول اور ریت کی چبھن کی پروا نہ کرتے ہوئے وہ جس وقت گیٹ کی طرف جا رہی تھی۔ اس نے فارم ہاؤس کے کھلے حصے میں آندھی میں اٹھتے بگولے دیکھے تھے۔

اس نے پل بھر کو آنکھوں میں ذرہ برابر کنکروں کی طرح چبھتی ریت کو آنکھوں سے مل کر باہر نکالنے کی خاطر انہیں باری باری شہادت کی انگلی سے رگڑا تھا' اس اثناء میں سعد کی گاڑی تیزی سے گیٹ سے باہر نکل گئی تھی۔ آنکھوں میں چبھن مسلے جانے سے اور بھی زیادہ بڑھ گئی تھی۔ اس نے وحشت زدہ انداز میں پیچھے مڑ کر دیکھا۔ تیز آندھی کے ناچتے بگولے جیسے "ہو ہو ہا ہا" کرتے اس کو ڈرانے کی کوشش کرنے لگے تھے۔

"باجی اندر چلو۔ اندر..." گیٹ پر کھڑے دو تین لوگوں میں سے ایک نے بازو زور سے ہلاتے ہوئے اسے اشارہ کیا اور بلند آواز میں اسے اندر جانے کی ہدایت دینے لگا۔

"اندر کہاں جاؤں؟" اس نے غائب دماغی کی کیفیت میں خود سے سوال کیا تھا۔ تیز اور گرد آلود ہوا اس کے منہ پر طمانچے رسید کر رہی تھی۔ اس کے پاؤں گرد آلود ہوا کی زد میں آکر مٹی مٹی ہو رہے تھے۔

"اندر تو سخت اندھیرا ہے۔ ایسا اندھیرا جس میں ہاتھ کو ہاتھ نہ سجھائی دے۔" وہ بڑبڑائی۔

"آئے ہائے ماہ نور بی بی! آپ نے خود کو مٹی مٹی کر لیا ہے۔"

اندرونی عمارت کا دروازہ کھول کر ایک عورت سرپٹ دوڑتی اس کی طرف آئی۔ ماہ نور کو وہ عورت آندھی کے بگولے سے نکلی کوئی چڑیل لگ رہی تھی۔ تیز گردباد میں اس کے بال اڑ کر بکھر رہے تھے۔ جس کی آنکھیں باہر کو ابلی ہوئی تھیں اور زبان باہر کو نکلی لپلپا رہی تھی۔

وہ خوف زدہ ہو کر دو قدم پیچھے کو ہٹی۔ مگر اس چڑیل نما عورت نے اسے آن دبوچا۔ اور اسے اپنے ساتھ لگائے اندر کی طرف گھسیٹنے لگی۔ ماہ نور کا دل خود کو اس کی گرفت سے چھڑا کر فارم ہاؤس سے باہر جانے کو چاہ رہا تھا۔ فارم ہاؤس میں قیام کا کوئی جواز باقی نہیں رہا تھا۔ جو جواز تھا' وہ تو گاڑی کو اڑن قالین بنائے چشم زدن میں آنکھ سے اوجھل ہو گیا تھا۔ بے یقینی' صدمے اور ناقابل تردید حقیقت نے اس پر سکتہ طاری کر دیا۔ وہ اس عورت کے ساتھ گھسٹ رہی تھی۔ اندرونی عمارت کے تمام دروازے اور کھڑکیاں بند کر دی گئی تھیں۔ آندھی کے تھپیڑوں پہ کھڑکیاں اور دروازے لرزتے اور پھر ساکت ہو جاتے۔

اس عورت نے ماہ نور کے نیم بے ہوش وجود کو لٹایا۔ فارم ہاؤس کی دیگر خواتین ملازمین اس کے ارد گرد جمع ہو گئیں اور اس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارنے لگیں۔ اس کے جوتے اتار کر پاؤں کے تلوے سہلانے لگی تو کوئی دائیں بائیں شکست خوردہ سپاہی کی طرح لٹکے بازو' اوپر رکھ کے ان کو دبانے لگی' اس کے منہ میں خوشبو میں بسا شربت ٹپکایا جا رہا تھا' اس کی حسیات ایک ایک جنبش کو محسوس کر رہی تھیں۔ اس کی بند آنکھوں پر مندھی اس کی پلکیں ہلکے سے ارتعاش میں تھیں۔

"واورولا پھر گیا اے مہ نور باجی تے۔" (آندھی کا بگولا ماہ نور باجی کے اوپر پھر گیا ہے) ان خواتین میں سے کوئی کہہ رہی تھیں۔

"آندھیوں میں جنات چھپ کر اڑتے ہیں۔ جیسے ہی کسی اکیلے بندے کو دیکھتے ہیں' اس پر عاشق ہو جاتے ہیں۔"

"چلو! یہاں سے بھاگو سب۔ کیا گھیرا ڈال کر بیٹھ گئی ہو بی بی کے ارد گرد؟ کچھ نہیں ہوا ماہ نور بی بی کو۔ بس طوفان بڑا تیز تھا۔ جس میں یہ باہر نکل گئی' منہ اور آنکھوں میں مٹی اور ریت پڑنے سے یہ حال ہوا ہے۔" ماسی جنت نے ماہ نور کا ہاتھ پکڑ کر اسے سیدھا کر کے بٹھاتے ہوئے کہا۔

"جاؤ پروین! باورچی خانے والے بڑے فریزر سے جوس کے ٹن نکال کر لاؤ۔ اور خبردار! جو کسی نے ادھر ادھر رولا ڈالا کہ ماہ نور باجی بے ہوش ہو گئی۔ چوہدری صاحب اور چوہدرانی کے کان میں پڑ گئی تو تم سب کی خیر نہیں۔" اس نے سب کو خبردار بھی کر دیا۔

"ٹھو ماہ نور بی بی! اٹھ کر نہاؤ دھوؤ اور کپڑے بدلو۔ مٹی گھٹا اتر جائے گا تو آپ کو ہوش آئے گا۔" سب عورتوں کے وہاں سے چلے جانے کے بعد جنت نے ماہ نور کو ہوشیار کرنے کی سعی کرتے ہوئے کہا۔

ماہ نور نے آنکھیں کھولیں اور خالی خالی نظروں سے اپنے ارد گرد دیکھنے لگی۔ سامان سے بھرا فارم ہاؤس' اس کے سجے بنے' در و دیوار ایک دم خالی اور ڈھنڈار نظر آنے لگے تھے۔ سائیں سائیں کرتے' خاموش اور ویران۔

"یہ فون باہر پھینک آئی تھیں ماہ نور باجی۔" اس ابدی سناٹے میں اٹھتی پہلی آدم کی آواز پر اس نے چونک کر آواز کی سمت کی طرف دیکھا۔ اور جھپٹ کر ماسی جنت کے پکڑنے سے پہلے ہی سیل فون اس شخص سے لے لیا۔

کچھ دیر پہلے اسے یوں محسوس ہو رہا تھا' جیسے وہ جنت سے براہ راست بے آباد' بے آب و گیاہ' چٹیل اور خاردار زمین پر پھینک دی گئی تھی۔ لیکن اس سیل فون کے ہاتھ میں آتے ہی جیسے اس کو رہا کر دیا گیا۔ زمین سے اپنا تعلق یاد آگیا اور پہلی چیز جو اس کے ذہن کی سلیٹ پر ابھری' وہ سعد کا سیل نمبر تھا۔ اس سیل نمبر کا ایک ایک عدد اسے درست ترتیب کے ساتھ یاد تھا۔ اس کانٹیکٹس میں سے نمبر ملانے کے بجائے اپنے حافظے میں محفوظ اعداد کو دبایا اور بے تابی سے کان سے لگا لیا۔

ایک بار' دو بار' تین بار' چار بار' پانچ بار... پانچ کے بعد رک کر وہ دوبارہ سے گنتی شروع کر رہی تھی۔ یوں اس نے کتنی بار جنونیوں کی طرح وہ نمبر ملایا تھا۔ ماسی جنت منہ پر ڈوپٹا رکھے حیرت سے اس کی مجنونانہ کاوشوں کو ایک ٹک تکے جا رہی تھیں۔

کبھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں
تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

طوفان کے باعث متاثر ہوئی برقی رو بحال ہونے پر بالائی منزل کے گراموفون پر ایاز قوال پھر سے دہائی دینے لگا تھا۔ اس نے وحشت زدہ نظروں سے چھت کی طرف دیکھا اور بھاگتے قدموں سے اس ہال نما کمرے کے آخری کونے سے اوپر جاتی سیڑھیاں چڑھ کر بالائی منزل پر چلی آئی۔ یہ بالائی منزل کا مردانہ مہمان خانہ تھا۔ سامنے ایک گیسٹ بیڈ کا دروازہ کھلا دیکھ کر وہ تیزی سے اس کے اندر چلی آئی۔ کمرے کے بیڈ پر بچھی چادر پر شکنیں یوں پڑی تھیں جیسے کوئی ابھی ابھی اٹھ کر وہاں سے گیا ہو۔ کمرے کی کھڑکی پر لٹکتے پردے سائیڈوں پر لپٹے ہوئے تھے۔ کمرے سے ملحقہ ڈریسنگ اور باتھ روم کے دروازے پر رکھے باتھ روم سلیپرز کے روئیں یوں مسلے ہوئے اور بے ترتیب تھے جیسے ہلکے نم ہوں۔

ماہ نور نے بے اختیار ڈریسنگ روم کا بند دروازہ ہینڈل گھما کر پیچھے کو دھکیلا۔ مردانہ پرفیوم' شیونگ کریم' آفٹر شیو لوشن' باتھ سوپ اور شیمپو کی باتھ روم میں بند خوشبو دروازہ کھلنے پر آئی۔

ڈریسنگ روم کی دیوار پر لکڑی کے منقش فریم میں جڑے شیشے کی شیلف پر پرفیوم کی دو شیشیاں اور ایک مردانہ

رول آن رکھا تھا۔ شیشے کے قریب رکھی کرسی پر ہلکا نم ہاتھ روب رکھا تھا۔ ماہ نور نے بے اختیار آگے بڑھ کر ہاتھ روب کو ہاتھ کی مٹھی میں پکڑ کر نرمی سے مسلا۔ ایک مانوس سا احساس اس کے اندر جاگا۔ جس سے گھبرا کر وہ تیزی سے پلٹ کر کمرے کی طرف آئی۔ وہ خالی تھا اور اپنے مکین کے وہاں موجود نہ ہونے کا پیغام دے رہا تھا۔

سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں
تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

ایاز قوال کے الفاظ ایک بار پھر اس کے کان سے ٹکرائے۔ وہ تیزی سے خود کو اس بیڈ روم سے نکال کر اس کے ساتھ والے سٹنگ روم میں لے آئی۔ گراموفون ریکارڈ کی سوئی آہستہ آہستہ اپنی سطح سے جڑے کالے ریکارڈ پر گھوم رہی تھی۔ سٹنگ روم کے بڑے صوفے پر کسی کے بیٹھنے سے پڑا دباؤ ابھی بھی موجود تھا۔ سامنے رکھی میز پر سوفٹ ڈرنک کا ٹن الٹا پڑا تھا اور اس میں بھورا مائل سیاہ سیال میز کی سطح پر ایک لکیر کی شکل میں بہہ رہا تھا۔

جو چشم سوزن چوذرہ حیران
ہمیشہ گریاں بہ عشق آمد
(کسی حیران ومر تعش شمع کی مانند
میں آتش عشق میں گریہ کرتی بھٹکتی پھر رہی ہوں)

گراموفون سے قوال کی آواز ابھر رہی تھی اور ماہ نور کی سمجھ نہیں آرہا تھا کہ آنسو کیوں بھل بھل اس کی آنکھوں سے بہتے چلے جارہے ہیں۔

☼ ☼ ☼

تیز جھکڑ کی شکل میں چلتی گرد آلود ہوا سامنے کا سارا منظر نظروں کے سامنے ہلا رہی تھی۔ یہ طوفان اچانک آیا تھا اور ایسا تھا کہ اس کی مضبوط انجن اور باڈی والی بیش قیمت گاڑی بھی سڑک پر ڈولتی ہوئی چل رہی تھی۔ ہوا گرد کے طوفان کو ونڈ اسکرین کے سامنے اڑا کر بکھیرتی اور حد نظر کو صفر تک پہنچا دیتی۔ دو مرتبہ اس کی گاڑی سامنے سے آتی گاڑی سے ٹکراتے ٹکراتے بچی تھی۔

اس نے گاڑی کو سڑک کے انتہائی بائیں کنارے پر لا کر اس کی رفتار کم کردی۔

طوفان کی شدت سے درخت جڑوں سے اکھڑ گئے تھے۔ اونچے نیچے درختوں کی شاخیں اور پتے بکھر رہے تھے۔ مگر اس کی توجہ اس طوفان کے بگولوں پر نہیں تھی۔

اس کا ذہن اس سے بھی بڑے طوفان کی زد میں تھا۔ اس کے دماغ میں اس سے بھی زیادہ تیز رفتار جھکڑ چل رہے تھے۔ اسے کہاں پہنچنے کی جلدی تھی۔ اسے کس کیفیت نے پل بھر میں چوہدری سردار کے فارم ہاؤس سے اٹھا کر مسافر بنا دیا تھا۔

دل و دماغ میں اٹھتے طوفان کے سامنے اپنے اکھڑتے پاؤں سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے وہ خالی خالی نظریں طوفان میں مٹی مٹی ہوتی سڑک پر جمائے گاڑی کا کنٹرول سنبھالے بس آگے' آگے اور آگے بڑھتا جارہا تھا۔ وہ کس منزل کی طرف جانے والے فاصلے کم کرنے کی کوشش میں تھا' یہ وہ نہیں جانتا تھا۔۔۔ اور اس لاعلمی میں وہ سیدھے راستے سے بھٹک کر کسی بالکل انجان راستے پر جا پہنچا تھا۔

☼ ☼ ☼

"ارے! ہماری بیٹی یہاں کیا کر رہی ہے؟" کتنی ہی دیر گم صم کھڑے بظاہر بے وجہ آنسو بہاتے رہنے کی کیفیت سے اسے سردار چاچا کی آواز نے چونکا کر باہر نکالا تھا۔ اس غائب دماغی کی کیفیت میں بھی اسے نجانے یہ خیال کیسے

آگیا تھا کہ سردار چاچا کی طرف مڑنے سے پہلے اپنے آنسو پونچھ لے۔

"ارے! کیا ہوا ماہ نور؟" وہ بھول گئی تھی کہ اس کا وحشت زدہ حلیہ' سرخ ناک اور آنکھیں سردار چاچا کو چونکانے کے لیے کافی ہوں گی۔ سردار چاچا فطری رد عمل کے تحت آگے بڑھے اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اس کا چہرہ اونچا کرکے غور سے دیکھنے لگے۔

"کسی نے کچھ کہہ دیا کیا؟" ماہ نور نے نفی میں سر ہلایا اور یوں سر ہلاتے ہوئے بھی نجانے کیوں اس کی آنکھوں سے آنسو دوبارہ بہہ نکلے۔

"ارے' ارے' ارے گڑیا!" سردار چاچا بالکل بوکھلا گئے۔ "ادھر بیٹھو۔" انہوں نے اسے بازو سے پکڑ کر صوفے پر بٹھا دیا۔ "کیا ہوا ہے؟ جلدی بتاؤ!" وہ گھبرائی ہوئی آواز میں بولے۔۔۔۔

"کچھ نہیں۔" وہ سر جھکا کر گھٹی ہوئی آواز میں بولی۔

"ضرور کوئی بات ہوئی ہے" سردار چاچا اٹھ کر کھڑے ہوئے۔ "میں پوچھتا ہوں ان سب سے۔۔۔ اور یہ سعد کہاں ہے؟ محمد بخش کے آنے پر مجھے نیچے جانا پڑا۔ وہ یہیں تھا۔"

"مجھے کچھ نہیں ہوا چاچا جی!" اس سے پہلے کہ سردار چاچا اس کی اس حالت کے بارے میں بازپرس کرنے کو کسی کو بلاتے اور سعد کا پتا کروانے لگتے اس نے اس کا بازو پکڑ کر بمشکل الفاظ حلق سے نکالے۔

"پھر؟" وہ سرعت سے اس کی طرف مڑے "پھر کیا ہوا ہے تمہیں؟" انہوں نے پوچھا۔

"اس قوال کی آواز اور اس کے الفاظ کو سن کر میرا دل بھر آیا تھا۔" اس نے گراموفون کی طرف اشارہ کیا' جو دیر تک بج بج کر اب خاموش ہو چکا تھا۔

"او! یہ بات ہے۔" سردار چاچا مسکرا اٹھے۔ "جھلی ہو تم بھی۔" ان کے لہجے کی تشویش یکایک دور ہوگئی۔ "ہاں مجھے بھی بہت پسند ہے یہ قوالی۔" وہ اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولے۔ "مگر بھئی! ایسا بھی کیا متاثر ہونا کہ انسان رو رو کر آنکھیں سجا لے۔ میں تو ڈر ہی گیا تھا۔"

"ہاں!" وہ گھٹی گھٹی آواز میں بولی۔ "کبھی کبھی کوئی چیز ایسی دل کو لگتی ہے کہ انسان کو خود پر اختیار نہیں رہتا۔"

سردار چاچا نے ماہ نور کی اس بات پر پہلو بدل کر اس کی طرف غور سے دیکھا۔

"ہاں! شاید کوئی وقت ہی ایسا ہوتا ہے۔" پھر انہوں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"اب سعد کہاں گیا؟"

"میرا خیال ہے چاچا جی! سعد واپس چلا گیا ہے۔" اس نے ٹھہرتے ہوئے لہجے میں کہا۔ اس کی تمام تر حیرتیں اور وحشتیں جیسے سکون کی طرف مائل ہوگئی تھیں۔ اس کے سر کا بھاری پن بھی جیسے یکایک ہوا ہو گیا تھا۔

"واپس چلا گیا؟" چوہدری سردار کے لہجے میں حیرت اتری۔ یوں اچانک بغیر بتائے کیسے واپس جا سکتا ہے وہ؟"

"پتا نہیں' میرا اندازہ ہے کہ وہ واپس چلا گیا ہے۔ میں نے اسے اپنا سامان گاڑی میں رکھ کر جاتے ہوئے دیکھا تھا۔" وہ پرسکون آواز میں بولی۔ "اس نے تمہیں بھی نہیں بتایا کہ کہاں اور کیوں جارہا ہے؟" سردار چاچا کا تعجب بجا تھا۔

"نہیں۔" اس نے سر ہلایا۔

"کمال ہے۔" سردار چاچا نے جیب سے اپنا سیل فون نکالتے ہوئے کہا۔ "ابھی کچھ دیر پہلے تو یہاں بیٹھا مجھ سے کھاری کی کہانی سن رہا تھا۔" وہ سیل فون پر سعد کا نمبر ملاتے ہوئے بولے۔

"کھاری کی کہانی۔" ماہ نور نے چونک کر سردار چاچا کی طرف دیکھا۔ اسے معلوم تھا کہ سردار چاچا کو اپنی کال پر کوئی جواب نہیں ملنے والا تھا۔ اسے اس بات میں دلچسپی تھی کہ سردار چاچا نے سعد کو کھاری کی کیا کہانی سنائی

تھی۔

☼ ☼ ☼

اس نے چلتے وقت گاڑی کا فیول گیج نہیں دیکھا تھا۔ طوفان کی زد میں جڑ سے اکھڑے درخت سڑک پر جا بجا گرے پڑے تھے۔ ان درختوں سے بچتے بچاتے ایک بڑے درخت کے قریب پہنچ کر جو عین سڑک کے بیچوں بیچ لمبا لیٹا ہوا تھا' اسے مجبوراً بریک لگانا پڑی' اور اس بریک کے ساتھ ہی گاڑی بند ہو گئی تھی۔

وہ درخت سے بچ کر گاڑی کچے راستے پر لے جانا چاہ رہا تھا۔ مگر گاڑی اس درخت کے ساتھ جڑی ایسی رکی تھی کہ کسی طرح بھی دوبارہ اسٹارٹ ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ اب بھی بغیر فیول گیج کو دیکھے' وہ گاڑی کو بار بار لمبی ریس دے کر اسٹارٹ کرنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ مگر گاڑی مشینی اڑیل گھوڑا بن چکی تھی۔ وہ سر جھکائے گاڑی کو ریس دینے میں مشغول تھا۔ جب اسے ڈرائیور سیٹ کے دروازے کے شیشے پر دستک سنائی دی اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ایک کالی بھجنگ' سیدھی' لمبی' دیہاتی عورت شیشے سے اندر جھانکتے ہوئے مسکرا رہی تھی۔

سعد گاڑی اسٹارٹ نہ ہونے پر جھنجلایا ہوا تھا۔ اس پر اس عورت کی مسکراہٹ نے اسے بے وجہ طیش دلا دیا۔

"ہاں جی! کیا بات ہے؟" اس نے شیشہ نیچے کر کے کھولتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"مجھے یہ بتانا تھا کہ خوشی محمد بندوں کو بلانے گیا ہے۔ وہ ابھی آتے ہیں۔ اس کو اٹھا کر دور پھینکتے ہیں۔" اس نے سڑک کے درمیان گرے درخت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"میں کیا کروں؟" اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کا لہجہ کافی درشت تھا۔ لیکن شاید اس وقت اسے کسی بات کی پروا نہیں تھی۔

"پھر۔" وہ مسکرائی۔ سعد نے دیکھا۔ اس کے دانتوں کی ساخت اونچی تھی۔ اسی لیے ذرا سا مسکرانے پر بھی دانت نمایاں نظر آنے لگتے تھے۔

"گڈی سے باہر اتر آؤ۔ گڈی ابھی اگے نئیں جانی۔"

"فکر مت کرو۔ میں گاڑی نکال لوں گا۔" سعد نے شیشہ اوپر کرتے ہوئے کہا اور دوبارہ گاڑی اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی۔ شیشے پر دوبارہ دستک ہوئی اس نے جھنجلا کر شیشہ ایک بار پھر نیچے کیا۔

"اب کیا مسئلہ ہے تمہیں؟" وہ کاٹ کھانے کے سے انداز میں بولا۔

"گڈی کی سوئی تو دیکھ۔ تیل ختم ہو چکا اے۔" اب کی بار سفید دانت کچھ زیادہ ہی باہر نکل آئے۔ پہلی بار سعد نے فیول گیج پر نظر ڈالی اور اسے اپنی حماقت اور غائب دماغی پر بری طرح طیش آیا۔

"باہر نکل آؤ۔" اس عورت نے جیسے سعد کے غصے سے سرخ پڑتے چہرے پر تمسخرانہ نظر ڈالی۔

"ادھر ساڈی کلی (جھونپڑی) ہے۔ خوشی محمد آجائے تو تیل کا بندوبست کر دے گا۔" اس نے سڑک کے کنارے میل ہا میل تک پھیلے کھیتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

سعد نے ایک نظر گاڑی کے اندرونی حصے پر ڈالی اور سامنے دور تک پھیلی سڑک کو دیکھا۔

"اس سڑک پر آج کسی اور کو نہیں آنا' سوچ کیا رہا ہے میرا ویر! شاباش باہر آجا۔ میں تجھے میٹھی لسی بنا کر پلاتی ہوں۔" اس نے اصرار کیا۔

"ہیڈ لک۔" اس نے ہاتھ مار کر چابی اگنیشن سے نکالی اور بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے گاڑی کا دروازہ کھول کر

باہر آگیا۔

"آجا! آجا شاباش۔" سعد کے باہر آنے پر اس عورت نے ایک بار پھر پورے دانتوں کی نمائش کی اور سڑک کے درمیان چلتی کچے راستے پر اتر گئی۔ سعد نے تذبذب سے دائیں بائیں دیکھا اور گاڑی لاک کر کے اس عورت کے پیچھے چل دیا۔

☼ ☼ ☼

"چاچا جی! آپ نے سعد کو کھاری کے بارے میں کیا بتایا تھا؟" ماہ نور نے یہ بات سردار چاچا سے اتنی تیزی سے پوچھی تھی کہ اس تیزی میں پوشیدہ بے قراری واضح طور پر محسوس کی جا سکتی تھی۔

"کچھ خاص نہیں۔" چوہدری سردار نے ذرا سے توقف کے بعد ٹھہرے ہوئے اور پرسکون لہجے میں جواب دیا۔ "سعد مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ میں نے کھاری کی شادی ایسے کیوں کی جیسے متوسط طبقے کا کوئی باپ اپنے سگے بیٹے کی کرتا ہے۔"

"پھر؟" ماہ نور کے لہجے میں مزید بے چینی اتری۔

"پھر کیا؟" وہ ہلکا سا مسکرائے۔ "تم تو جانتی ہو کہ کھاری مجھے ہمیشہ سے کتنا عزیز ہے۔"

"ہاں!" ماہ نور نے بغیر سمجھے سر ہلایا۔

"سعد نہیں جانتا تھا۔ حیران ہوا اور بولا کہ کم ہی ایسا ہوتا ہے کہ کسی بے نشاں بچے کو اتنی محبت سے کوئی پالے جبکہ میں نے اسے باقاعدہ گود تو لیا نہیں تھا۔ حادثاتی طور پر یہ بے چارہ ادھر آگیا۔"

"پھر؟" ماہ نور کے لہجے میں مزید بے چینی اتری۔

"پھر۔" چوہدری سردار نے اس حد تک واضح بے قراری اور بے چینی پر لحہ بھر کو غور کیا اور پرسکون انداز میں مسکرائے۔ "پھر بس' اتنی ہی بات ہوئی تھی کہ مجھے محمد بخش ملاقاتی کی آمد کی اطلاع ملی اور میں اٹھ کر نیچے چلا گیا۔ مگر یہ لڑکا گیا کہاں؟" انہیں پھر سعد کے غائب ہونے والی بات یاد آگئی اور وہ اپنا سیل فون ہاتھ میں پکڑے اٹھ کر کمرے سے باہر چلے گئے۔

"بس اتنی بات۔" ماہ نور نے اپنی جھکی ہوئی نظروں کو تیزی سے دائیں بائیں گھماتے ہوئے سوچا۔ "بس اتنی سی بات میں وہ کون سی بات ہے' جو سعد اتنا اچانک اٹھ کر کہیں چلا گیا؟"

"ہو سکتا ہے' وہ یہیں کہیں گیا ہو' قریب کسی جگہ۔"

اگلے لمحے سردار چاچا اندر آکر بولے۔ "کہہ رہا تھا کہ ہیڈ کے آس پاس کے علاقے میں فوٹو گرافی کے لیے جائے گا۔ وہاں مرغابیاں بھی ہوتی ہیں اور گندم کی سنہری بالیں بھی۔ اسے وہ منظر اچھے لگے تھے۔"

ماہ نور نے سردار چاچا کو دیکھا اور سر جھٹک کر سوچا۔

"میری چھٹی حس کبھی بھی اتنی تیز نہیں رہی' کسی کے بھی معاملے میں۔ مگر نجانے کیوں وہ سعد کے معاملے میں جاگنے اور ہوشیار کرنے لگی ہے۔ یہ کہنا اور ایسا سوچنا خام خیالی ہے کہ وہ یہیں کہیں گیا ہوگا اور واپس آجائے گا۔ وہ جس انداز سے گیا ہے۔ وہ انداز بتا رہا تھا کہ وہ ابھی یہاں واپس نہیں آئے گا۔" اس نے دل میں کہا۔

"میں پتا کرتا ہوں رب نواز اور ظہور سے۔ یقیناً" انہیں پتا ہوگا کہ سعد کہاں گیا ہے۔" چوہدری سردار نے کہا اور پھر ہاتھ میں پکڑے سیل فون کی طرف دیکھا "ایک تو فون بھی بند ہے اس کا۔" وہ ایک مرتبہ پھر کمرے سے باہر چلے گئے۔

ماہ نور نے کسی شکست خوردہ سپاہی کی طرح تھکی اور ہاری ہوئی نظروں سے ایک مرتبہ پھر کمرے کا جائزہ لیا۔ وہ

ایک ایک چیز پر نظر ڈالتے ہوئے کمرے کی مغربی دیوار پر سجی پینٹنگز تک پہنچی۔

"سردار چاچا کی فن اور فنکار سے یہ محبت ہی تو ہے۔ جس نے سعد کو اتنے دن سے یہاں روک رکھا تھا۔ اچانک پھر ایسا کیا ہوا کہ وہ سرپٹ بھاگ کھڑا ہوا۔" وہ آہستہ قدموں سے چلتی مغربی دیوار پر سجی پینٹنگز کے قریب آئی۔

"ایبسٹریکٹ آرٹ۔" اس نے پہلی اور دوسری پینٹنگ کو دیکھتے ہوئے سوچا۔ یہ کسی مشہور مصور کی پینٹنگز کی نقول تھیں۔ "اوہ! یہ تو بہت صاف مگر ادھوری پینٹنگ ہے۔" چوتھی پینٹنگ کے قریب پہنچ کر اسے خیال آیا۔ "کس مصور نے ادھوری پینٹنگ بیچی اور سردار چاچا نے کیسے خرید لی؟" اس نے بھورے فریم میں جڑی پینٹنگ کو غور سے دیکھا۔

ڈوبتے چاند کی مدھم روشنی، نیچے بہت نیچے ننگے فرش پر مٹھیاں بھینچے، روتے، چلاتے شیر خوار بچے پر پڑ رہی تھی۔ بچے کی کھلی آنکھیں مدھم روشنی پر ٹکی تھیں۔ مادر زاد برہنہ بچے کی ٹانگیں سکڑ کر گھٹنوں سے جڑی تھیں اور گھٹنے پیٹ سے لگے تھے۔ بچے کے ارد گرد وسیع میدان کا خاکہ ادھورا تھا۔ اس میں کہیں کہیں نوکیلی خار دار جھاڑیاں ایسے نظر آ رہی تھیں۔ جیسے کوئی انہیں بناتے ادھورا چھوڑ گیا ہو۔

"کیسی عجیب سی تصویر اور کیسا دل خراش منظر ہے۔" ماہ نور لاشعوری طور پر ایک قدم پیچھے ہٹی۔ تصویر میں ادھوری نوکیلی جھاڑیوں کے اندر سے ابھرتے مصور کے دستخط بھی نظر آ رہے تھے۔ وہ دستخط بھی کسی خریدی تصویر ہی کی طرح سمجھ میں نہ آنے والی ساخت کے حامل تھے۔

بہت غور سے پڑھنے پر بھی ماہ نور ابتدائی تین حروف سے آگے لکھے حروف پڑھنے میں ناکام رہی۔

اس ناکامی پر الجھ کر اس نے پینٹنگز کے قریب دیوار میں جڑی کھڑکی کھول کر باہر جھانکا۔ نجانے کتنے سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلتا طوفان تھم چکا تھا اور اب فضا میں اس طوفان کے اپنے پیچھے چھوڑے مٹیالے رنگوں مٹیالے بادلوں اور سکوت کے سوا اس کا کوئی نشان باقی نہ تھا، ہاں! زمین اس کے چھوڑے تمام نشانوں کی ایک صاف تصویر نظر آ رہی تھی۔ طوفان کے تھپیڑوں سے بے حال سر نہوڑائے پودے اور پیڑ اپنے قد سے اکھڑے درخت مٹی مٹی ہوتی گھاس گرد آلود در و دیوار ادھر سے ادھر تک بکھرے کاغذ، پتے اور چھوٹی شاخیں۔

"سعد چلا گیا۔" اس منظر کو دیکھتے ہوئے اچانک اس کے دل نے جیسے بلبلا کر کروٹ لی اور اسے یاد آیا کہ ایک طوفان تو اس کے دل و دماغ پر بھی گزر چکا ہے اور اس طوفان کی چھوڑی گرد کے پیچھے کا منظر اتنا غیر نمایاں ہے کہ اسے نجانے کب تک پتا نہ چل سکے گا کہ طوفان کے اٹھنے کی وجہ کیا تھی۔

اس نے اس احساس کی شدت سے گھبرا کر کھڑکی بند کی اور کمرے کے دوسرے کونے میں رکھی میز پر دھرے گراموفون کی طرف دیکھا اور اسی بے دھیانی میں اس نے اس کی سوئی کو سیٹ کیا اور اس کا بٹن دبا دیا۔

یکایک از دل دو چشم جادو
بصد فریبم ببرد تسکین
(اپنی چشم فسوں گر کے طلسم ہزار اثر سے
اس نے یکایک میرے دل و دماغ کا سارا اقرار چھین لیا)

ایاز قوال ایک مرتبہ پھر خسرو کے دل کا حال بیان کرنے لگا تھا۔

ماہ نور کو کمرے میں موجود ہر چیز میں سے صرف ایک ہی شبیہہ کا عکس دکھائی دینے لگا۔

کسے پڑی ہے جو جا سنائے
پیارے پی کو ہماری بتیاں

اب کے ماہ نور کو ایسا لگا۔ جیسے قوال نے اچانک اس کے اپنے دل کی حالت کی ترجمانی شروع کر دی ہو۔

اس نے اپنی آنکھوں میں آنسوؤں کو روکنے کی کوشش میں ہونٹ دانتوں تلے دبائے اور پیچھے مڑ گئی۔ اب ایک بار پھر اس کے سامنے مغربی دیوار اور اس پر سجی پینٹنگز تھیں۔ ایک کے بعد دوسری پھر تیسری پینٹنگ سے ہوتی اس کی نظریں چوتھی تصویر پر جا کر رک گئیں۔ نوکدار ادھوری شاخوں والے میدان کے ادھورے خاکے میں وہ بلبلاتا مکمل بچہ۔ اس کے ذہن نے ایک بار پھر لاشعوری طور پر مصور کے دستخط میں سے سمجھ آنے والے پہلے تین حروف دہرائے اور جیسے اچانک اس کے ذہن میں روشنی کا ایک جھماکا ہوا اور اسے ایک ایسے معمے کا چھوٹا سا سرا ہاتھ آ گیا۔ جس کے بارے میں کچھ دیر پہلے تک وہ فیصلہ کر چکی تھی کہ وہ اسے کبھی سمجھ میں نہیں آ سکتا۔

☼ ☼ ☼

"کیا بات ہے تم اتنے گھبرائے ہوئے کیوں لگ رہے ہو؟" سعدیہ نے ہاتھ میں پکڑے موبائل فون سے کھیلتے ہوئے کھاری کو دیکھا۔ یہ کھاری کا موبائل فون تھا۔ ایک سادہ سا فون سیٹ جس میں جڑا کیمرا، تصویریں کھینچ سکتا تھا۔ سعدیہ کے لیے یہ موبائل فون خود سے قدرے بلند طبقے تک پہنچنے اور اس سے متعلق ہو جانے کا زینہ اول تھا۔ اس موبائل فون کے روابط کے خانے میں سوائے اس کے اباجی کے نمبر کے سب نمبرز اس کے لیے اجنبی تھے۔ مگر پھر بھی یہ موبائل فون سعدیہ کے لیے ہفت اقلیم کا ایک ایسا خزانہ تھا، جو اسے بیگم صاحباؤں کی صف میں کھڑا محسوس کرواتا تھا۔

کھاری کی بیوی بننے کے بعد جو من چاہی آزادی اسے ملی تھی۔ اس کی وجہ سے وہ اس موبائل فون پر ہیڈ فون لگا کر اپنی مرضی کے گانے بھی سن سکتی تھی۔ فارم ہاؤس کے ملازمین کی بیویوں اور بیٹیوں کے ساتھ گھل مل کر اس نے تفریح کے ایسے بہت سے راز جان لیے تھے جو وہ اس ایک موبائل فون کے ذریعے حاصل کر سکتی تھی۔ ایف ایم ریڈیو تو گویا اس کی جان بن چکا تھا۔ کرنے کو کوئی خاص کام نہ ہونے کی وجہ سے وہ دن بھر اسی تفریح میں مگن رہتی تھی اور کھاری اس کو یوں مگن اور خوش دیکھ کر خوش ہوتا رہتا تھا۔ سعدیہ کھاری کو ناز و ادا دکھاتی اور اس سے اپنے نخرے اٹھواتی۔ باقی دنیا سے بالکل بے نیاز دن گزار رہی تھی۔ مگر وہ ایک مختلف دن تھا۔

اس دن کھاری بہانے بہانے سے کام چھوڑ کر اس کے پاس آیا تھا۔ نہ ہی کام سے فارغ ہو کر اس کے پاس آتے ہوئے وہ کسی شاخ پر سجا خوب صورت پھول اس کے لیے لایا تھا۔ اس غیر معمولی صورت حال پر اپنی دنیا میں مگن سعدیہ بھی چونک گئی۔ اس نے کانوں سے ایئر فون نکال کر کھاری کی طرف دیکھا۔ کھاری اسے گھبرایا ہوا نظر آیا۔

"کیا بات ہے تم اتنے گھبرائے ہوئے کیوں لگ رہے ہو؟" سعدیہ نے جانچتی نظروں سے کھاری کو دیکھا۔

"ہوں۔" کھاری نے جیسے کسی گہری سوچ سے چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

"تم ٹھیک تو ہو؟" سعدیہ بیڈ سے ٹانگیں نیچے لٹکاتے ہوئے بولی۔

"ہاں!" کھاری نے سر ہلایا۔ "ہنیری (آندھی) بڑی تیز تھی۔"

"ہاں!" سعدیہ نے سر ہلایا۔ "میں نے دروازے اور کھڑکیوں کی چٹخنیاں چڑھا دی تھیں۔ مگر آندھی اتنی تیز تھی کہ لگتا تھا، چٹخنیاں ٹوٹ جائیں گی اور دروازے کھڑکیاں سب کھل جائیں گے۔" اس نے بتایا۔

"اور تم؟" اس نے تیوریاں چڑھا کر کھاری کو دیکھا۔ "تم کہاں غائب تھے؟ تمہیں میرا خیال تک نہیں آیا۔ اتنا

تیز طوفان آیا۔ میں اکیلی یہاں بیٹھی ڈرتی رہی۔"
وہ ناز سے بولی۔
"طوفان!" کھاری نے عجیب سی نظروں سے سعدیہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "آہو طوفان آیا تھا۔ بڑی تیز ہنیری چلی۔ میرا تے مجھو دل تے دماغ' سارا ہی کج کچھ اس طوفان وچ خوار ہو گیا۔ ہر سال اس طرح کا طوفان واڈیوں (کٹائی کے موسم) میں آتا ہے۔ پر اس سال جو طوفان آیا ہے نا۔ یہ طوفان واورولے (بگولے) کی طرح میری ہستی پر چل گیا ہے۔ سب کج اڑا کے اپنے نال لے گیا ہے۔"
سعدیہ نے ہاتھ میں پکڑا موبائل فون بیڈ پر رکھا اور اٹھ کر کھاری کے نزدیک آگئی۔ طوفان تھمنے کے بعد موسم بہتر ہو گیا تھا اور پنکھے کی ہوا خوشگوار لگ رہی تھی لیکن کھاری کے قریب آنے پر اسے کھاری کے چہرے پر چمکتا پسینہ واضح نظر آرہا تھا۔ کھاری کی نظروں میں عجیب سا تاثر تھا۔
"کیا مطلب ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آئی تمہاری بات۔" اس نے کھاری کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔
"او چھڈو سعدیہ باؤ!" کھاری نے جھٹکے سے اپنا ہاتھ سعدیہ کی گرفت سے نکال لیا۔ "کرنا کیا ہے سمجھ کے۔ بندہ اول تے سمجھ نہیں سکدا۔" اس نے اپنی کنپٹی پر دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی رکھ کر بایاں ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔
"اور اگر سمجھ بھی جائے تو کر کچھ نہیں سکتا۔" دونوں بازو جھٹکتے ہوئے اس نے سر ہلایا۔ "بندہ بے چارہ تو بڑا ہی بے وسا (بے بس) ہے۔"
"پتا نہیں کیسی باتیں کر رہے ہو تم۔" سعدیہ نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے سر ہلایا۔
"ٹھیک ہے۔ سعدیہ باؤ! چنگا ہے۔ سمجھ نہیں آئی تو بڑا چنگا ہے۔ اگر سمجھ آگئی تو چین تے قرار چلا جاتا ہے ہمیشہ واسطے۔"
"اچھا چھوڑو یہ بتاؤ میرے لیے کھانے کو کچھ لائے ہو؟" سعدیہ نے ہلکی سی کوشش کے بعد کھاری کی بات سمجھنے میں ناکام رہنے کے بعد اٹھلاتے ہوئے ایک مرتبہ پھر اس کا بازو پکڑا۔
"نہیں!" کھاری نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔
"اوہ!" سعدیہ نے مایوس ہو کر منہ بنایا۔
"سعدیہ باؤ! کچن میں جا کر اب ماسی جنتے کا ہتھ بٹا لیا کرو۔" کھاری کے لب و لہجے نے اچانک ایک نیا پینترا کھایا۔ "اب ہمیں اپنی روٹی پانی کی فکر آپ کرنی چاہیے۔"
سعدیہ نے دو قدم پیچھے ہٹ کر کھاری کے اس نئے انداز پر غور کیا۔ "لیکن ابھی ہماری شادی کو دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔" اس نے بے اختیار کہا۔
"غریب لوکاں کی شادیاں بس اتنے دن ہی نئی رہتی ہیں سعدیہ باؤ!" کھاری کے لہجے میں طنز کی چبھن اتر آئی۔ "ادھر اپنے کام اپنے ہاتھ سے ہی کرنے پڑیں گے۔"
سعدیہ کو اچانک یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اسے پہاڑی کی اونچائی سے دھکا دے دیا ہو۔ اس نے سہارا لینے کی خاطر اور خود کو گرنے سے بچانے کے لیے ایک بار پھر کھاری کے شانے سے سر ٹکانے کی کوشش کی اور اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔
"کام تو انسان عمر بھر کرتا ہے کھاری!"
"ہاں جی۔۔۔ تے ٹھیک ہے نا۔" کھاری نے دائیں طرف ہٹتے ہوئے کہا اور اپنی قمیص کے کف الٹ کر آستین کہنیوں تک اٹھانے میں مصروف ہوا۔ "جو یہ دن ہیں۔۔۔ یہ بھی اسی عمر میں جمع ہوتے ہیں نا۔" اس نے بے نیازی

سے کہا۔
"میں منہ ہاتھ دھولوں' تسی جا کر ماسی جنتے سے کھانا پکڑ لاؤ۔"
سعدیہ نے آنکھیں سکیڑ کر سوالیہ انداز میں کھاری کی طرف دیکھا۔ اسے گمان ہو رہا تھا شاید اس کے کانوں نے کچھ غلط سنا تھا۔ لیکن کھاری کہہ کر کمرے سے متصل چھوٹے سے باتھ روم میں گھس گیا تھا۔
"ماسی جنتے سے کھانا لینے جاتی ہے میری جوتی۔" سعدیہ نے تازہ تازہ وصول کیے گئے گھمنڈ میں آکر دایاں پاؤں زور سے زمین پر پٹخا۔ "خود ہی لائے گا جا کر کھانا۔" اس نے غصے سے سر جھٹکا اور دوبارہ بیڈ پر نیم دراز ہو کر ایئر فون کانوں میں ٹھونس لیے۔ اب وہ ایف ایم ریڈیو پر ابرار الحق کی آواز میں ایک شوخ سا نغمہ سن رہی تھی۔
"آپ کھانا نہیں لائے ہو سعدیہ باؤ؟" کھاری ہاتھ' منہ دھونے کے بعد باتھ روم سے باہر نکلا اور سعدیہ کو اسی انداز میں موبائل فون میں مگن دیکھ کر ٹھٹک کر بولا۔
سعدیہ نے اس کی بات سنے بغیر ہی بے نیازی سے سر ہلایا۔
کھاری نے کچھ بے یقینی سے سعدیہ کو دیکھا۔ پھر کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ اس کا دل سعدیہ کے اس بے نیازانہ انداز پر بوجھل ہو رہا تھا یا کچھ دیر پہلے سنی آپا رابعہ کی باتوں پر اس نے ماسی جنت کے پاس کچن کی طرف جاتے ہوئے سوچا۔ مگر اسے اپنے اس سوال کا صحیح جواب نہ مل پایا تھا۔"

☼ ☼ ☼

"لے اب تو دونوں ویلے مل رہے ہیں۔ تے خوشی محمد کا کوئی اتا پتا نہیں۔" اس عورت نے جو اسے زبردستی اپنے ساتھ کھیتوں کے عین درمیان بنی مٹی کی اس کچی کوٹھڑی میں لے آئی تھی اور جس نے اپنا نام نور فاطمہ بتایا تھا' نے پتھر کی سیاہ سل پر چھوٹے سیاہ پتھر کی مدد سے ہی کچھ پیستے ہوئے کہا۔
"ٹریکٹر بھی اس کا خراب تھا۔" اس نے اپنا و کھا سا بازو ہوا میں اٹھا کر ہاتھ ہلاتے ہوئے سعد کو بتایا جو روٹھے بچوں کی طرح اس چھوٹے پیڑھے پر بیٹھا فرش پر نظریں گاڑے ہوئے تھا' جو اس کی زبردستی کی میزبان نے اسے پیش کیا تھا۔ "میںوں لگدا ہے ٹریکٹر ٹھیک کرانے بیٹھ گیا ہو گا۔" نور فاطمہ نے جیسے سیانوں کی طرح قیافہ لگانے کے بعد سر ہلایا۔ "چاہے آج رات واپس ہی نہ آئے۔" وہ اپنے اونچے سفید دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے بولی۔
"تو مجھے کاہے کو یہاں روک کر رکھا ہوا ہے۔" سعد نے جھلا کر کہا۔ "مجھے بتاؤ کہ نزدیک ترین پیٹرول پمپ کتنے فاصلے پر ہے یہاں سے' میں جا کر پیٹرول لے آتا ہوں۔"
"پیدل جاؤ گے گا۔" نور فاطمہ نے اس کے بھنائے ہوئے انداز پر جیسے محظوظ ہوتے ہوئے کہا۔
"اور کیا میرے لیے ہیلی کاپٹر ہائر کیا ہے تم نے' جس کو اڑا کر چلا جاؤں۔" سعد کو اس عورت پر سخت جھنجلاہٹ ہو رہی تھی۔
"پیدل جاؤ گے بچو جی' پنڈ بکھراں کے پیٹرول پمپ تک پہنچے دو ڈھائی گھنٹے تک لگ ہی جانے ہیں۔"
"اُفوہ مائی! تم نے میرا اتنا وقت ضائع کیا!" سعد بھنا کر اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "کب سے تم اپنے بیٹے کی واپسی کی کہانیاں سنا رہی ہو اور مجھے یہ کہہ کر یہاں بٹھایا ہوا ہے کہ وہ واپس آکر مجھے پیٹرول لا دے گا۔"
"ہاں تے میں کوئی جھوٹ بولیا۔" نور فاطمہ انگلی سے چٹنی اٹھا کر چیک کی اور اس کی باریکی سے مطمئن ہو کر کوٹھڑی کے ایک کونے میں کیل پر ٹنگی لالٹین اتار کر اسے جلانے لگی۔
اسے لالٹین جلاتے دیکھ کر سعد کو احساس ہوا کہ اندھیرا پھیل رہا تھا۔ اس نے طیش میں آکر اس پیڑھے کو پیر سے ٹھوکر مار کر ایک طرف لڑھکا دیا۔ جس پر وہ بیٹھا تھا اور کوٹھڑی سے باہر نکل آیا۔ شام کے سائے گہرے

ہو رہے تھے۔

کوٹھڑی سے باہر کھیت کے راستے تک کی جگہ کو مٹی ہی سے لیپا پوتا کر، صاف اور پکا کیا گیا ہوا تھا۔ اسی لپے پتے فرش کے ایک جانب ہینڈ پمپ اور چارہ کاٹنے کا ٹوکا نصب تھا۔ اس کے ایک طرف کوٹھڑی کی دیوار کے ساتھ پیپل کے ایک عمر رسیدہ گھنے درخت کے نیچے تین بھینسیں اور دو گائیں بندھی تھیں۔

سعد نے نہ چاہتے ہوئے بھی اس سارے منظر پر نظر ڈالی اور دونوں ہاتھ کمر پر ٹکا کر کھیتوں سے سڑک تک جانے والے راستے کو تکنے لگا۔ اس سڑک پر سیدھے چلتے جائیں' تب دو ڈھائی گھنٹے سفر کے بعد پہلا پیٹرول پمپ آتا ہے۔ وہ نچلا ہونٹ حسب عادت دانتوں تلے دبائے صورت حال پر غور کر رہا تھا۔

"اگر یہ احمق' باتونی عورت مجھے روک کر یہاں بٹھا نہ لیتی اور مجھے سیدھے سیدھے پیٹرول پمپ کا راستہ بتا دیتی تو میں اب تک پیٹرول لے کر واپس آچکا ہوتا۔"

"اب تو اندھیرا ہونے لگا ہے۔ اب پیدل جانے کا تو سوال ہی نہیں ہوتا۔" اسے عقب سے نور فاطمہ کی آواز آئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ نور فاطمہ چولہے میں اپلے سجا کر ان کے درمیان ایک لکڑی سیٹ کر رہی تھی۔

"اب تو سویرے ہی تیل مل سکتا ہے۔ اس راستے پر جانور اور چور ڈاکو سارے ہی راہ روکے کھڑے ہیں۔"

"تو مجھے کیوں یہاں بٹھا رکھا تھا اس وقت سے۔" سعد نے اس کے قریب جا کر تقریباً" چلاتے ہوئے کہا۔ جواب میں وہ اپنے پورے اونچے دانت نکال کر ہنس دی۔ چولہے میں موجود اپلے آگ پکڑ رہے تھے اور ان کی روشنی میں نور فاطمہ کے دانت یوں لگ رہے تھے جیسے کسی ڈائن کے دانت اندھیرے میں چمک رہے ہوں۔ سعد کسی انجانے سے احساس کے تحت پیچھے ہٹ گیا۔ نور فاطمہ کوٹھڑی کے اندر گھس گئی۔ جب وہ کوٹھڑی سے باہر نکلی اس کے ایک ہاتھ میں لالٹین اور دوسرے میں گوندھے ہوا آٹے کی پرات تھی۔

"میں نے تینوں نہیں روکا۔" اس نے چولہے کے پیچھے دیوار کے ساتھ کھڑے توے کو جلتی آگ پر رکھتے ہوئے کہا اور لالٹین چولہے کے ساتھ دیوار پر ذرا اونچائی میں گڑے کیل پر لٹکانے لگی۔

"تم نے نہیں روکا۔" سعد نے دانت پیسے۔ "تو اور کون مجھے گاڑی سے اتار کر یہاں لایا تھا خوشی محمد کی واپسی کا کہہ کر۔"

"نہیں میں نے نہیں روکا۔" وہ چولہے کے پاس تھی۔ وہ پرات میں سے آٹا کھینچ کر اس کا پیڑا بناتے ہوئے سکون بھرے انداز میں بولی۔

"تو میں خود آیا تھا اپنی مرضی سے۔" سعد کو اس کا یہ اطمینان بھرا انداز مزید طیش دلا گیا۔

"جھلیا لوکا' تینوں۔ میں نہیں میرا اللہ یہاں لے آیا ہے۔" نور فاطمہ نے آگ کی تپش سے چہرے پر پھسلتے پسینے کو دوپٹے سے پونچھتے ہوئے کہا۔

"میری کی مجال میں آندھی چلاؤں۔ میرا کی دم میں گاڑی میں تیل ختم کروں۔ میں کون ہوتی ہوں' اونچے لمبے درخت سڑک پر گرا کر لوگوں کے راستے روکنے والی۔" اس نے توے پر دھری روٹی پر دستر خوان رکھ کر اسے توے پر پھراتے ہوئے کہا۔

"میں تو چنگی بھلی بالن کے لیے سوکھی لکڑیاں جمع کر رہی تھی۔ جب میرے دل میں اس نے ڈالا کہ اٹھ نور فاطمہ چل کے اس گڈی والے کو دیکھ جو بار بار گاڑی اشٹارٹ کرتا ہے اور اس کی گاڑی ہی اشٹارٹ نہیں ہو رہی۔ میرے ویر میں نے تو حکم منیا اور گاڑی کول پہنچ گئی۔"

اس کے انداز میں اتنا سکون' اتنا اطمینان تھا۔ سعد کو اس کے سکون اور اطمینان پر ایک لمحے کے لیے رشک سا آگیا۔

"مگر تمہیں اس نے بھیجا تھا تو اس نے یہ بھی کہا ہوگا۔ اس بندے کو سیدھا راستہ دکھاؤ۔ نہ کہ اس کا راستہ کھوٹا کرنے بیٹھ جاؤ۔" اگلے ہی لمحے اس عورت اور اس کی حرکتوں پر اُمڈتا طیش اس کے دل و دماغ پر حاوی ہو گیا۔ وہ کولہوں پر ہاتھ ٹکا کر پھنکارا۔

"سیدھا رستہ ہی تے دکھایا ہے۔" اس نے توے سے روٹی اتار کر چنگیر میں رکھی اور چولہے میں جلتی لکڑی باہر کھینچ لی۔

"خاک سیدھا راستہ دکھایا۔" سعد نے جھلا کر پاؤں پٹخا۔ "اب بتاؤ اس وقت میں کہاں جاؤں۔"

"نلکا چلا کر منہ ہتھ دھو لے۔" اس نے پکی ہوئی روٹیاں رومال میں لپیٹتے ہوئے کہا۔ "پھر یہاں میرے ساتھ بیٹھ کے روٹی کھا۔ میں تجھے بتاتی ہوں کہ میں نے تجھے سیدھا رستہ کیسے دکھایا ہے۔"

سعد نے غصے بھرے نظروں سے اس کو دیکھا اور منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ "مجھے نہیں کھانا تمہارا کھانا۔"

"لے دس بھلا روٹی نال کاہے کی لڑائی۔" وہ اٹھ کر سعد کے قریب آئی۔

"چل میرا ویر! شاباش غصہ تھوک دے اور روٹی کھا لے۔ بھلا دس اس کے ساتھ کوئی لڑائی کر سکتا اے۔ اس پر بندے کا کوئی زور زبردستی نہیں چلتی۔"

سعد نے نظروں اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ کتنی لمبی اور سیدھی تھی۔ اسے خیال آیا۔ اس نے اس سے پہلے صنف نازک میں اتنا سیدھا بے پیچ و خم سراپا کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کے جسم کی ساخت' اس کے ہاتھ اور پاؤں' اس کے چہرے کے خدوخال جس پر ہڈیاں نمایاں تھیں۔ جیسے سخت ہو کر کھچ سی گئی ہوں۔ لکڑی کی کھپچیوں کی طرح رخساروں کی ہڈیاں جو لالٹین کی نیم روشنی میں واضح ہو رہی تھیں۔ اس کا کل سراپا سخت مشقت کے عادی انسان کی جھلک دکھا رہا تھا۔

"اس کے ساتھ کیسی زورا زوری بھلا۔" سعد کو اپنی طرف دیکھتے پا کر اس نے نرمی سے ایک بار پھر اپنی بات دہرائی۔ سعد نے گہرا سانس لیتے ہوئے ہینڈ پمپ کی طرف دیکھا۔

"چل میں نلکا چلاتی ہوں۔ تو ہتھ منہ دھو لے۔" سعد کے اس انداز کو نیم رضامندی جان کر وہ خوش ہو کر تیزی سے بولی اور ہینڈ پمپ کی طرف چل دی۔

"مدتوں بعد ایدھر کوئی مہمان آیا اے۔ ست بسم اللہ! جو وہ کسی مہمان کو ادھر بھیج دے۔" وہ ہینڈ پمپ کو چلاتے ہوئے کہہ رہی تھی اور ہینڈ پمپ کے ٹھنڈے شفاف پانی کے نیچے ہاتھ منہ دھوتے ہوئے سعد کو لگا جیسے ٹھنڈے پانی کے چھینٹے اس کے جلتے' تپتے دل و دماغ پر پڑ رہے ہوں۔

"جو پہلے ہی سمجھ لیتے کہ میرا راستہ اس غریب نور فاطمہ نے نہیں روکا۔ میرا راستہ اس نے خود روکا ہے تو اتنا غصہ تو نہ کھانا پڑتا۔ دو' تین گھنٹوں کے اندر تمہارا رنگ جل کے سیاہ ہو گیا ہے۔"

منہ ہاتھ دھو کر وہ نور فاطمہ کے سامنے پیڑھی پر آ بیٹھا تھا۔

"یہ کیا دے رہی ہو مجھے۔ یہ کیسا کھانا ہے؟" سعد نے دیکھا' وہ سیاہ پتھر کی بھاری سل اندر سے اٹھا کر باہر لے آئی تھی اور اب چنگیر میں رکھی روٹی پر ایک نوالے کی مدد سے اس سل پر پسی چٹنی رکھ کر پھیلا رہی تھی۔

"فکر نہ کر زہر نہیں دینے لگی تینو۔" اس نے ہاتھ روک کر سعد کی طرف دیکھا۔

"لے کھا' اس چٹنی کو روٹی پر اچھی طرح پھیلانے کے بعد اس نے چنگیر سعد کے سامنے رکھی۔

"مگر یہ ہے کیا؟" سعد نے چنگیر کی طرف دیکھ کر کہا۔

"میرے کول سبزی تھی' نہ دال' خوشی محمد آتا تو پکانے کے لیے کچھ لا کر دیتا۔ اس میں میں نے پیاز اور ہری مرچوں میں نمک اور کچی کیریاں ڈال کر پیس لیں۔ اب جو ہے وہی کھانا پڑے گا۔" وہ دانت نکال کر بولی۔

سعد نے ایک بار پھر چنگیر کی طرف دیکھا اور سرہلا کر چنگیر اپنے قریب کرلی۔ اس نے روٹی کو رول کیا اور دانتوں سے پہلا نوالہ توڑا۔ نور فاطمہ اپنے پورے دانت باہر نکالے تجسس اور شوق سے اسے دیکھ رہی تھی۔ جیسے پہلے لقمہ کھا لینے کے بعد اس کی داد کی منتظر ہو۔

"یہ تو بہت مزے کا ہے۔" سعد نے دوسرا نوالہ توڑتے ہوئے کہا۔ نور فاطمہ کے چہرے پر پھیلی مسرت سوا ہوگئی۔ "اس کی ساریاں نعمتیں ہی سوادلیاں ہوتی ہیں۔" وہ یوں خوش ہو کر بولی جیسے اسے کوئی بڑا اعزاز مل گیا ہو۔

"تم یہاں اس ویرانے میں اکیلی رہتی ہو۔ تمہیں ڈر نہیں لگتا۔ یہاں دور دور تک کھلے کھیتوں کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ نہ کوئی گھر ہے' نہ کوئی دوسری عمارت۔"

"اس کے ہوتے ہوئے بندہ اکیلا نہیں ہوتا۔" وہ روٹی کے نوالے کے ساتھ چٹنی لگا کر کھاتے ہوئے بے نیازی سے بولی۔

"اگر کوئی آدھی رات کو آکر تمہارا گلا کاٹ جائے تو۔" سعد نے اس کی بے نیازی سے چڑ کر کہا۔

"میرے کولوں کسی نے کیا لینا ہے۔ جے میرا گلا کاٹ جائے گا۔" اس نے بے نیازی کا مزید مظاہرہ کیا۔

"تمہارے پاس یہ جو جانور ہیں۔ یقیناً" ان کی قیمت لاکھوں میں ہوگی۔" سعد نے پیپل کے درخت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہوئے گی' مینوں کی خبر کیا قیمت اے' جن کے ہیں او نانوں پتا ہوگا۔" اس کی بے نیازی عروج پر پہنچ گئی۔

"اچھا تو یہ تمہارے نہیں ہیں۔" سعد نے ایک بار پھر جانوروں کی طرف دیکھا "اور اگر انہیں کوئی کھول کر لے گیا تو تم کیا کرو گی۔ ذمہ داری تو تمہاری ہے نا۔"

"جن کے ہیں وہ اپنے اپنے جانور کے گلے میں پڑی گھنٹیوں کی آوازیں پہچانتے ہیں۔ جو چور جانوروں کو کھول کر انہیں چلائے گا وہ گھنٹی تو گلے سے نہیں اتارے گا۔ گھنٹیاں بجیں گی تو سب کو ہوشیار کردیں گی۔"

"ہوں۔۔۔" سعد نے سرہلایا۔ "پھر تو تمہارے پاس ایسی کوئی قیمتی چیز بچتی نہیں' جو کوئی لے جانے کی کوشش کرے' سو مزے کرو تم۔"

"نہیں' کیوں نہیں ہیں قیمتی چیزیں۔" برتن سمیٹتے اس کے ہاتھ رکے۔

"اچھا ہیں؟" سعد مسکرایا۔ "کہاں ہیں۔ دکھاؤ تو ذرا۔"

"یہاں تو نہیں ہیں۔" اس نے دانت نکالتے ہوئے ہاتھ ہلایا۔

"کہاں ہیں؟" سعد نے کہا۔

"او پیپل کے پیچھے۔" اس نے درخت کی طرف اشارہ کیا۔

"وہاں تو وہی جانور ہیں جو تم کہتی ہو' تمہارے ہیں ہی نہیں۔" سعد نے درخت کی طرف دیکھنے کے بعد نور فاطمہ کی طرف دیکھا۔

"نہیں وے جھلیا! میری قیمتی چیزیں کسی کو نظر تو نہیں آتیں۔" نور فاطمہ نے سرہلایا اور اپنے ارد گرد بکھری چیزیں سمیٹنے لگی۔ سعد کو لگا نور فاطمہ کے دماغ میں کوئی خلل تھا۔ اس لیے اس نے اس گفتگو کو ادھورا چھوڑ دیا۔

"میں نے تمہارے لیے کوٹھڑی میں چٹائی بچھادی ہے۔ دو گھڑی کے لیے کمر سیدھی کرلو' صبح ویلے تک خوشی محمد آئے گا۔" برتن سمیٹ لینے کے بعد اس نے سعد سے کہا۔ جو اسی پیڑھی پر بیٹھا تاریکی میں کچھ دیکھ رہا تھا۔

"نہیں مجھے نیند نہیں آرہی۔" اس نے نور فاطمہ کی طرف دیکھا۔ جو چولھے کے قریب چٹائی بچھا کر اس پر لیٹ چکی تھی۔

"روٹی توں غصہ ختم کے نیندر پر ٹال دیا ہے کیا؟" وہ دانت نکالتے ہوئے بولی۔ سعد جواب میں خاموش رہا۔

"تو مان کیوں کیوں نہیں لیتا۔ اللہ سوہنے نے تینوں روکا ہے۔"

"اس نے کیوں روکا مجھے؟" سعد نے بے خیالی میں سوال کیا۔

"وہ چاہتا ہوگا کہ یہ میرا بندہ آندھی کے بگولے سے بھی تیز گاڑی چلاتا جہاں جارہا ہے وہاں جاکر آندھی کی ہی طرح کوئی اندھا کام نہ کر بیٹھے۔ اسی لیے اس نے تمہاری گاڑی میں پیٹرول ختم کردیا اور سڑک پر درخت گرا کر تجھے روک لیا کہ آج ذرا نور فاطمہ کا مہمان بن اور رک کر سوچ کیا کرنے چلا تھا۔"

سعد نے چونک کر نور فاطمہ کی طرف دیکھا۔ چاند کی روشنی میں اس کے چہرے کا سیاہ رنگ چمک رہا تھا۔ اس کا میلا سا دوپٹا لیٹنے کے باعث ذرا سا پیچھے ہٹ چکا تھا اور اس کے چاندی کی طرح روپہلے بال نظر آرہے تھے۔

"بڑی آس امید لگا رکھی ہے تم نے تم نے تمام سے۔" اس نے دانستہ بلند آواز میں کہا۔ "ایک بھی نماز پڑھتے تو میں نے تمہیں دیکھا نہیں۔ اس کے جو بندے ہوتے ہیں نا ایمان والے ان کی پہلی پہچان تو نماز ہی ہوتی ہے جس کی وہ پابندی کرتے ہیں۔"

"لے تے میں نے کب کہا۔ میں اس کی بڑی ایمان والی بندی ہوں۔" وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور سر پر دوپٹا سیدھا کرنے لگی۔

"میں نے تو ابھی صرف اتنا ہی راز پایا ہے کہ اس کی مرضی کے بغیر بندہ قدم بھی نہیں اٹھا سکتا۔ اگلیاں گلاں تو ابھی میں نے سیکھنی ہیں۔" اس نے سعد کی طرف دیکھا۔

"پچیس سال ہوگئے مجھے چوہدری انعام اللہ کی چاکری کرتے۔ میرا سائیں چھبیس سال پہلے گزر گیا۔ اس کے بعد میں نے دن دیکھا نہ رات' میرے بچے چھوٹے تھے اور اے خوشی محمد تو گود میں ہی تھا۔ میں نے سردی گرمی دیکھی' برسات پتھر توڑے' مٹی ڈھوئی' بس وقت کے ساتھ بھاگتی رہی' اتنا وقت ہی نہیں' اس ذات کا کوئی راز پا سکتی۔ وہ اور میں تو اتنی دور تھے جیسے زمین سے آسمان۔" سعد خاموشی سے سنتا رہا۔ قصے سننے کے شوقین کو اس عالم کوفت میں بھی سننے کو قصہ مل گیا تھا۔

"جب اس نے دیکھا اے نور فاطمہ تو بس دوڑتی ہی جارہی اے' اسے میرا کوئی خیال کبھی نہیں آیا تو اس نے مجھے ایک جھٹکا دیا۔"

"وہ کیا؟" سعد نے بے اختیار پوچھا۔

"میری نگہت پروین کو بس تن کے دو دن تاپ چڑھا اور وہ مر گئی۔"

"اوہ آئی ایم سوری!" الفاظ سعد کے منہ سے پھسلے۔ "پر میرا دھیان پھر بھی اس کی طرف نہیں گیا۔" نور فاطمہ اپنی دھن میں بول رہی تھی۔

"فیر دو مہینے بعد محمد امین باری کا پانی لگانے کھیتوں میں گیا تو چوہدری انعام اللہ کے بندوں نے چوہدری مشتاق پر فیر کھول دتا' گولی چوہدری مشتاق کے بندوق تک جانے سے پہلے محمد امین کے سینے وچ اتر گئی۔ بیس برس کا جوان پل بھر میں مٹی ہوگیا۔"

"اوہ مائی گاڈ!" سعد کے منہ سے پھسلا۔

"چوہدری انعام نے چوہدری مشتاق پر قتل کا کیس کردیا۔ دونوں طرف کے بندے جیل میں اور پھر دونوں میں صلح ہوگئی۔ پر محمد امین کی قبر پر کسی کو مٹی ڈالنے کی فرصت بھی نہ ملی۔ میں نے پھر بھی اس کی طرف دھیان نہیں لگایا۔ بس اپنا اور اپنے باقی بچوں ہی کا سوچتی رہی۔ اندھوں کی طرح چوہدری انعام کے ساتھ مل کر تھانے کچہری میں بیان اور گواہیاں دیتی رہی۔ میں نے سوچا چوہدری انعام راضی تے سب راضی۔ محمد امین دے خون کا سودا کرلیا

اور راضی خوشی کہتا۔ پینترا اس کو تاپ چڑھ گئی۔" نور فاطمہ نے سر ہلایا۔

"محمد امین کے تین مہینے بعد عفت پروین کو سانپ ڈس گیا۔" "تین دن اور تین راتیں عفت پروین نے تڑپتے گزاریں۔ چوتھے دن نور فجر والے جان دے دی۔ ایک نہیں دو نہیں تین ڈھیریاں ایک سال کے اندر اندر اس پیپل کے نیچے بن گیاں۔"

"وہ اس کا چھپا ہوا خزانہ۔" دفعتاً" سعد کو خیال آیا۔ اس نے پیپل کے درخت کی طرف دیکھا جو کسی جٹادھار جوگی کی طرح اپنی جٹائیں پھیلائے ساکت کھڑا تھا۔

"اس وقت پہلی بار مجھے اس کا خیال آیا۔ میں راتوں کو روتی اور چلاتی تھی۔ میرا بھرا آنگن اجڑ گیا تھا۔ میرے پلے کچھ نہیں رہا تھا۔ میں کہتی کہ میں کس سے اس بربادی کا سبب پوچھوں۔" اس نے سعد کی طرف دیکھا۔

"اس سے صرف اس سے۔ سارے کام اس کے ہیں۔ وہ ہی دیتا اور وہ ہی واپس لیتا ہے۔ اس کی مرضی کے بغیر تو بندہ قدم بھی نہیں اٹھا سکتا۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور احاطے کے نیچے چار دیواری سے باہر نکل کر پیپل کے درخت کے نیچے جا بیٹھی۔

"کوئی نشان نہیں چھوڑا قبروں کا۔" اس نے درخت کے نیچے بیٹھ کر زمین کی ہموار سطح پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "چوہدری انعام نے ہر طرف ہل پھروا دیا' پر میرے پاس نشانیاں ہیں۔ ادھر ہی سب ڈھیریاں موجود ہیں۔" نور فاطمہ پیپل کے درخت کے نیچے زمین کی ہموار سطح پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ سعد اندھیرے اور چاندنی کے ملے جلے امتزاج میں دم بخود نور فاطمہ کو دیکھ رہا تھا۔

"تم چھوڑ کیوں نہیں دیتیں چوہدری انعام کی چاکری؟" اس نے جیسے ٹرانس کی کیفیت میں نور فاطمہ کو مخاطب کیا تھا۔ "وہ جو اتنا پتھر دل ہے کہ نہ تو تمہارے مرے ہوئے بیٹے کے خون کی پروا کرتا ہے' نہ اسے تم پر اتنا ترس آتا ہے کہ تمہارے بچوں کی قبروں کے نشان چھوڑ دیتا' باقی جگہ پر جو مرضی کرتا رہتا۔"

نور فاطمہ اس کی بات کا جواب دیے بغیر زمین پر ہاتھ پھیرنے میں مگن تھی۔ فضا پر سکوت طاری تھا۔ دور کہیں جھاڑیوں میں جگنو چمکتے دکھائی دیتے تھے۔ جو ماحول کی تاریکی کو اپنی ننھی ننھی روشنیوں سے پل بھر کو توڑتے اور غائب ہو جاتے۔

"اٹھ جاؤ' وہاں سے نور فاطمہ! وہاں کیڑے مکوڑے ہوں گے۔ رات کے وقت سبزے کے قریب نہیں جاتے۔" سعد نے نور فاطمہ کو وہاں سے اٹھانے کی ایک اور کمزور سی سعی کی۔ نور فاطمہ زمین میں دفن اپنے خزانوں کے دھیان میں مگن تھی۔ دفعتاً" کہیں قریب سے کسی گیدڑ کے رونے کی آواز ابھری۔ فضا پر ایک عجیب سی الم ناک کیفیت طاری ہونے لگی۔

چاند اپنے سفر کی منزلیں طے کرتے کسی بدلی کے پیچھے جا چھپا تھا۔ آسمان پر ستارے معدوم ہو رہے تھے۔ تاریکی میں منظر کی جزئیات دیکھنے کی کوشش کرتی سعد کی آنکھیں تھکنے لگیں۔ اس نے اپنی بوجھل ہوتی آنکھوں کو سختی سے بند کر لیا۔

"کیا کبھی اس راز پر سے پردہ اٹھ سکتا ہے کہ غم کا پیمانہ کیا ہے۔ کیا انسان کبھی یہ ماننے کو تیار ہو گا کہ کسی دوسرے کا دکھ اس کے دکھ سے بڑا ہے؟ نہیں! ابھی بھی نہیں۔" اس نے خود کو بتایا۔ "غم میں گھرے انسان کو اپنا ہی دکھ سب سے بڑا نظر آ رہا ہوتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے' اس سے زیادہ دکھی تو کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔"

اس کا والٹ اور فون گاڑی ہی میں کہیں رکھا تھا۔ فارم ہاؤس سے چلنے سے پہلے اس نے اپنا فون آف کر کے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر پھینک دیا تھا۔ والٹ بھی یوں ہی کہیں باقی سامان کے ساتھ بے دھیانی میں پھینکا تھا۔ "شاید والٹ کہیں گر گیا ہو اور میں ساتھ لایا بھی نہ ہوں۔" اسے خیال آیا اور فون؟ اسے دوسرا خیال آیا۔ "فون ہی ہے جو کسی کے ساتھ میرے رابطے کا ذریعہ ہو سکتا ہے۔ لیکن اس تاریکی میں میں اسے کہاں ڈھونڈوں۔"

اسے یاد آیا فون اس نے اس خیال سے بند کر کے پھینکا تھا کہ اسے معلوم تھا ماہ نور اور سردار انکل اسے فارم ہاؤس میں نہ پا کر اس سے رابطہ کرنے کی ضرور کوشش کریں گے اور وہ جس ذہنی انتشار بلکہ وحشت کا شکار ہو کر فارم ہاؤس سے نکلا تھا۔ اس میں وہ کسی بھی صورت ان دونوں کی کالز کا جواب نہیں دینا چاہتا تھا۔ اسے یاد آیا اسی ذہنی انتشار کا نتیجہ تھا کہ وہ شہر کو جانے والا سیدھا راستہ بھول کر ایک ذیلی سڑک پر چڑھ گیا اور پیچھے کا راستہ بھول گیا تھا۔ سیدھا راستہ ڈھونڈنے کی خاطر جن بھول بھلیوں جیسے راستوں پر چڑھتا' اترتا وہ اس غیر آباد راستے چڑھ آیا' اس تک آتے آتے گاڑی کا فیول ختم ہو گیا تھا۔

"کیا یہ بے سرو سامانی کی کیفیت ہے؟" اسے خیال آیا۔ "گاڑی میں فیول نہیں۔ والٹ کا پتا نہیں کہ ساتھ ہے بھی یا نہیں۔ سب کیش اور پلاسٹک منی اسی والٹ میں ہے۔ فون جس طرح پھینکا تھا' نہ جانے آن بھی ہوتا ہے دوبارہ کہ نہیں اور یہ ایک دم اجنبی علاقہ ہے۔"

اسے ان سب باتوں کا خیال اچانک آیا تھا اور اس وقت آیا تھا جب اس نے نور فاطمہ کو اپنے بچوں کی قبروں کی مٹی پر ہاتھ پھیرتے دیکھا اور گیدڑوں کو بلند آواز میں روتے سنا تھا۔

"میں اس جگہ پر کچھ نہیں ہوں۔ میں کون ہوں۔ میرا پس منظر کیا ہے۔ یہاں کوئی نہیں جانتا اور میرے پاس جو زاد راہ ہے وہ شاید اس وقت میرے کسی کام نہیں آ سکتا۔ کیا یہ سونے کی اینٹوں کے ڈھیر پر بیٹھے بھوکے شخص والی صورت حال نہیں۔" اس نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے گہرا سانس لیا۔

"اور میں کیا ارادہ لے کر فارم ہاؤس سے نکلا تھا۔" آسمان پر چھائی تاریکی کو دیکھتے ہوئے اس نے یاد کیا۔ "اگر راہ سے بے راہ نہ ہوتا' فیول ختم ہو جانے کا شکار نہ ہوتا' سڑک پر درخت نہ گرا ہوتا اور گاڑی اس جگہ پر جہاں نور فاطمہ کی کوٹھری ہے' کہیں آگے ایسی جگہ پر جا کر رکتی' جہاں دور دور تک کوئی بندہ بشر نظر نہ آتا تو میں کیا کرتا اور بالفرض فیول ختم نہ ہوتا اور میں اس منزل تک پہنچ چکا ہوتا' جہاں کا مقصد کر کے فارم ہاؤس سے نکلا تھا' تو اب تک کیا کر چکا ہوتا۔" اس نے سوچا اور اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔

"اس نے کہا ہو گا کہ یہ میرا بندہ بگولے سے بھی تیز آندھی طوفان کی طرح گاڑی چلاتا جہاں جا رہا ہے' کہیں وہاں جا کر آندھی کی طرح ہی کوئی اندھا کام نہ کر بیٹھے۔ اسی لیے اس نے تمہاری گاڑی کا پیٹرول ختم کر دیا اور سڑک پر درخت گرا کر تمہیں روک لیا اور کہا چلو نوجوان! آج ذرا نور فاطمہ کے مہمان بن جاؤ اور ذرا رک کر سوچو کیا کرنے چلے ہو۔" دفعتاً" اسے نور فاطمہ کی کہی بات یاد آئی۔

"نور فاطمہ! وہاں سے اٹھ جاؤ پلیز۔" اس نے اپنی جگہ پر کھڑے کھڑے نور فاطمہ کو ایک بار پھر آواز دی۔

"ہر کوئی مجھ سے یہی پوچھتا اے' نور فاطمہ! چوہدری انعام کی چاکری چھوڑ کیوں نہیں دیتی؟" جواب میں اسے نور فاطمہ کی بلند آواز سنائی دی۔ یقیناً" اس کا مخاطب سعد تھا۔ کیونکہ آواز سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کے چہرے کا رخ کس طرف تھا۔ کوئی ان سے پوچھے' اللہ کے بندو! جو قرضہ میں چوہدری انعام سے لے چکی ہوں۔ وہ کیا میرا باپ قبر سے اٹھ کر اتارے گا۔"

وہ گیلے سبزے پر دھیان سے قدم رکھتا نور فاطمہ تک پہنچا۔ اس کے قدموں کی دھمک سے چوکنا ہو کر پیپل کے درخت تلے جانور اپنی اپنی جگہوں پر لحہ بھر کے لیے ہلے اور ان کے گلوں میں پڑی گھنٹیاں گونجیں۔ لحہ بھر بعد پھر خاموشی چھا گئی۔

"اٹھو نور فاطمہ! باقی کا نوحہ ادھر بیٹھ کر ہم دونوں مل کر پڑھتے ہیں۔" اس نے احتیاط سے نور فاطمہ کے عقب میں کھڑے ہو کر کہا۔ اسے خوف تھا۔ غلطی سے اس کا قدم نور فاطمہ کے زمین تلے دبے کسی خزانے پر نہ آ جائے۔

"ایک خوشی محمد بچیا اے۔" نور فاطمہ نے کھڑے ہو کر اپنا رخ اس کی طرف پھیرتے ہوئے کہا۔ اس کی آواز مضبوط تھی اور لہجہ انتہا سے زیادہ سنجیدہ۔ "اس کی ڈھیری یہاں مقدر نہیں۔" اس نے کہا۔ "اس کی عمر لمبی اے' میری میت کو کندھا دینا اے اس نے۔ اس کی ڈھیری کے لیے یہاں کوئی جگہ نہیں بچی۔"

سعد نے تاریکی میں سر جھٹکا اور واپس اس چھوٹے سے احاطے کی طرف چل دیا۔ اسے نور فاطمہ کے قدموں کی چاپ اپنے پیچھے آتی سنائی دے رہی تھی۔

باقی کی رات اس چھوٹی کوٹھری کے فرش پر بچھی چٹائی پر لیٹ کر علت اور معلول کے فلسفے پر غور کرتے گزر گئی۔

☼ ☼ ☼
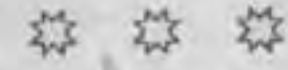
کچن میں کھانے کی ٹرے واپس رکھ کر کچن سے باہر نکلتے کھاری کی نظر ماہ نور پر پڑی' جو اپنا سیل فون ہاتھ میں پکڑے اس پر کوئی نمبر ملاتے ہوئے کچن سے ذرا فاصلے پر اندر جاتے سفید سنگی برآمدے میں ادھر سے ادھر چکر لگا رہی تھی۔ کھاری کو ماہ نور کے انداز میں اضطراب اور بے قراری کا احساس ہوا۔ وہ اپنی جگہ پر کھڑا ماہ نور کو اس کیفیت میں چکر لگاتے کتنی ہی دیر تک دیکھتا رہا۔

"کھاری!" پندرہ منٹ تک اسی طرح چکر لگاتے رہنے اور فون پر کوئی نمبر ملاتے رہنے کے بعد ماہ نور کی نظر اچانک کھاری پر پڑی اور وہ بلند آواز میں اس کا نام پکار کر اس کی طرف بڑھی۔

"تم کہاں غائب ہو اتنی دیر سے؟" اس نے تیزی سے کہا۔

"میں تے ادھر ہی تھا مہ نور باجی! میں کدھر جانا سی۔" کھاری نے شانے پر رکھے کپڑے سے منہ پونچھتے ہوئے کہا۔

"اپنی شادی کے دن سے اب تک تو تم نے شکل تک نہیں دکھائی اور کہہ رہے ہو کہ تم ادھر ہی تھے۔" اس نے یہ بات بھی تیزی سے کہی تھی۔

"اچھا... اس کو چھوڑو۔ مہ نور باجی! یہ بتاؤ کہ باؤ سعد صاحب کہاں ہیں؟" کھاری نے ماہ نور کے شکوے کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"سعد؟" ماہ نور کو لگا جیسے صرف اسے ہی نہیں' ہر کسی کو صرف ایک ہی شخص کی لگن تھی۔

"وہ تو چلا گیا کھاری!" اسے محسوس ہوا جیسے وہ کھاری کو کسی انتہائی الم ناک صورت حال کی خبر دے رہی تھی۔

"ہیں جی!" کھاری نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ "سچی دسو۔"

"ہاں کھاری! سعد تو یہاں سے چلا گیا ہے۔" ماہ نور کو اپنی آواز کسی پاتال سے نکلتی محسوس ہوئی۔

"وہ کدھر چلے گئے مہ نور باجی! میں تو بھین جی کو قول دے کر آیا تھا۔" کھاری کے چہرے پر پریشانی کے آثار ابھرے۔

"بھین جی کو کیا دے کر آئے تھے؟" ماہ نور نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا۔

"قول دے کر آیا تھا۔ میں سعد کو بھین جی کے گھر لے کر جاؤں گا؟" کھاری نے اپنی بات کی وضاحت کی۔

"وہ کیوں؟" ماہ نور کی آنکھوں کی پتلیاں سکڑیں۔

"اوہ!" کھاری کو اچانک احساس ہوا کہ وہ ایک ایسی بات کہہ چکا ہے' جو اسے نہیں کہنی تھی۔

"اوہ!" اس نے کوئی بات بنانے کے لیے ادھر ادھر دیکھا۔ "ہاں او! میں بھین جی سے بوت تعریفاں کی تھیں باؤ سعد کی۔"

"اچھا!" ماہ نور کو ایسا لگا جیسے کھاری نے اپنی بھین جی سے سعد کی نہیں' اس کی تعریف کی ہو۔

"لیکن وہ گئے کہاں؟" ماہ نور کو مطمئن کرنے کے بعد کھاری نے پوچھا۔

"پتا نہیں' وہ کسی کو کچھ بتائے بغیر یہاں سے چلا گیا ہے۔"

"فون کر کے پوچھیں تو سہی..." کھاری نے ماہ نور کے ہاتھ میں پکڑے سیل فون کی طرف اشارہ کیا۔

"اس کا فون بند ہے کھاری!" ماہ نور کے لہجے میں بے چارگی اور بے بسی اتر آئی۔

"اوئے ہوئے۔ ایہہ کی ہو گیا۔" کھاری پوری صورت حال جان کر ایک بار پھر پریشان ہوا۔

"مہ نور باجی! میرا باؤ سعد صاحب سے ملنا بوت ضروری ہے۔" الفاظ ایک دم اس کے منہ سے پھسلے۔

"اچھا... وہ کیوں۔" ماہ نور نے ایک بار پھر تعجب کا اظہار کیا۔

"بس جی یہ میں صرف ان ہی کو بتا سکتا ہوں۔"

"نہیں' میں ایسے تمہیں اس کا نمبر نہیں دوں گی۔" ماہ نور نے سر ہلاتے ہوئے کہا "پہلے تم مجھے بتاؤ' تم کو سعد سے کیا بات کرنی ہے۔"

کھاری نے ذرا کی ذرا ماہ نور کی طرف دیکھا اور... ایک دفعہ پھر اس سے نظریں چرالیں۔

"میں اب چلتا ہوں مہ نور باجی!" اس نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا "آپ باؤ سعد کا نمبر دے دیتے تو اچھا تھا۔"

اس نے کہا اور بائیں جانب مڑ کر آگے چلا گیا۔

"یہ ہو کیا رہا ہے؟" ماہ نور نے اپنے چکر کھاتے ذہن کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے سوچا "تم کیوں ایک ایسا نیوکلیس بن گئے ہو سعد! جس کے گرد سب گھوم رہے ہیں۔"

اس نے تصور میں سعد کو مخاطب کیا اور تھکے ہوئے ذہن کے ساتھ اپنے کمرے کی طرف چل دی۔ اسے اپنا سامان پیک کرنا تھا اور اگلی صبح گھر واپس جانا تھا۔ چچا سردار کا فارم ہاؤس اچانک خالی اور ویران ہو گیا تھا۔

☼ ☼ ☼
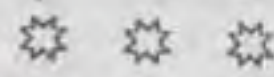
ایک نور کی لکیر نمودار ہونے کی دیر ہوتی ہے اور سارے مسئلے نبڑ جاتے ہیں۔"

اس کی گاڑی کے قریب کھڑی نور فاطمہ نے الوداعی جملے کہے تھے۔

"میں نے کہا تھا نا' خوشی محمد آجاوے گا تو تیل وی آجاوے گا' درخت بھی ہٹ جائے گا' خوشی محمد تینوں سیدھے راستے پر ڈال دے گا۔" وہ اونچے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے بولی۔

"اب راضی ہیں کہ ہن بھی تاپ چڑھا اے۔" اس نے ہاتھ لہراتے ہوئے کہا۔ سعد گاڑی کی سیٹوں اور سامان کے درمیان اپنا والٹ اور فون ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے والٹ ٹریول بیگ کی ایک چھوٹی جیب میں اٹکا ہوا مل گیا تھا مگر فون کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔ اس نے تیزی سے بیگ کھنگالے' ڈیش بورڈ' سیٹیں سب چیک کرلیں۔

"کہاں گیا؟" وہ پیشانی کو ہاتھ سے مسلتے ہوئے بڑبڑایا۔

"کیا ڈھونڈ رہا ہے؟" نور فاطمہ نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

"اس سے پوچھ رہا ہوں' میرا فون کہاں گیا۔" اس نے نور فاطمہ کی طرف دیکھ کر کہا۔

"اچھا!" وہ ہنسی اور اس کے دانت اور بھی زیادہ نمایاں ہوئے "پھر تو مل ہی جائے گا تھوڑا ساہ (دم) لے۔" وہ تیزی سے بولی۔

"واہ بھئی نور فاطمہ! تم اور تمہارے فلسفے' یہاں دن چڑھتے ہی دل و دماغ میں پھر سے آگ تازہ ہو گئی اور تم ساہ

لینے کی باتیں کرتی ہو۔" اس نے بھنا کر سیٹوں کے نیچے ہاتھ مارا' ایک فٹ میٹ پر اس کا ہاتھ پڑا اور وہاں نیچے اسے کسی چیز کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اس نے فٹ میٹ الٹا' نیچے خاموش فون پڑا تھا۔

"اوہ تھینک گاڈ!" وہ بڑبڑایا۔

"مل گیا اے کہ نہیں۔" نور فاطمہ نے اس کے چہرے پر ظاہر ہوتے اطمینان کو محسوس کر کے سر آگے کر کے گاڑی میں جھانکا۔

"میں نہیں جانتا نور فاطمہ! کہ تمہاری تھیوری کتنے فی صد درست ہے' مگر میں تم سے اس حد تک ضرور متفق ہوں کہ کل میں رکا نہیں تھا' روکا گیا تھا۔ مجھے دم لے کر سوچنے کی مہلت دی گئی کہ میں سوچ لوں' میرے اندر جو جنگ چھڑ چکی ہے۔ اس کے اگلے محاذ تک جانے اور یہ دیکھنے کے لیے کہ اس جنگ کو چھیڑنے والی فوج کے سپہ سالار نے چہرے پر جو شیلڈ چڑھا رکھی ہے اس کے کتنے پرت ہیں' میں جتنا بے چین ہوں' کیا یہ بے چینی میرا کام آسان کر دے گی کیا میں' جس حقیقت کو جان لینے کے لیے جگہ بے جگہ بے قرار پھرتا ہوں' اس سپہ سالار کے زرہ بکتر کو نوچ اتارنے سے میری بے قراری دور ہو جائے گی' میری بصارت تیز ہو جائے گی اور میں وہ سب کچھ جان جاؤں گا جو جاننا چاہتا ہوں۔" اس نے گاڑی کے ساتھ پشت ٹکا کر نور فاطمہ کو مخاطب کیا۔

"پتا نہیں کیا بول رہا ہے۔ مجھے تیری بولی سمجھ نہیں آرہی۔" نور فاطمہ ایک مرتبہ پھر دانت نکال کر بولی۔

"یوں سمجھو' اسی لیے اس زبان میں بول رہا ہوں کہ تمہاری سمجھ میں نہ آئے' ورنہ میں تمہاری بولی جانتا بھی ہوں' سمجھتا بھی ہوں اور بول بھی لیتا ہوں۔" اس نے سر ہلایا اور ہونٹ سکیڑ کر آواز نکالی "مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا' اس طرح روکے جانے کا' رات تک' جس آگ کی تپش مدھم پڑ گئی تھی دن نکلتے ہی اس کا الاؤ پھر سے تیز ہو گیا۔ میرا دل' میرا دماغ' میری روح اور میرا جسم بھڑ بھڑ جل رہے ہیں' جل کر سوختہ ہوئے جا رہے ہیں' نور فاطمہ! تم صابر عورت ہو' بہت صابر عورت۔ میرے لیے دعا کرنا' مجھے بھی صبر کی دولت عطا ہو جائے۔"

اس نے نور فاطمہ کی طرف دیکھا جو کچھ نہ سمجھتے ہوئے منہ کھولے اسے دیکھے چلے جا رہی تھی۔

"لے خوشی محمد آگیا!" قریب سے ٹریکٹر کے انجن کی آواز آنے پر اس نے پیچھے دیکھا "اب دونوں بھائی تیل بھر لو گاڑی میں اور پھر تو اللہ بیلی ہو جا تیرا راستہ لمبا ہے اور تجھے منزل تک پہنچتے پہنچتے رات آجائے گی۔"

خوشی محمد ٹریکٹر سے چھلانگ لگا کر اترا اور ہاتھ میں پکڑے جیری کین میں ربڑ کا باریک پائپ ٹکا کر گاڑی کے فیول ٹینک میں کین جوڑنے میں مصروف ہوا۔ نور فاطمہ تیز قدموں سے چلتی اپنی کوٹھڑی کی طرف جا رہی تھی۔ سعد نے خوشی محمد کی مدد کرنا چاہی مگر اس نے منع کر دیا۔ اس نے ایک طرف ہٹ کر اپنا فون آن کیا۔ اضطراب' بے قراری اور بے چینی سے بھرپور بے شمار ٹیکسٹ میسجز اس کے سامنے تھے۔

"ہیلو ہم کہاں گئے ہو؟"

"سعد! تم ایک دم کہاں چلے گئے ہو؟"

"تمہارا فون کیوں بند ہے؟"

"تم بغیر بتائے کہاں چلے گئے ہو؟"

"جواب کیوں نہیں دے رہے؟"

"سعد! میں اور سردار چچا سخت پریشان ہیں۔"

"پلیز جواب دو۔"

پیغامات کی ایک قطار تھی جو ختم ہونے میں نہیں آرہی تھی۔ اس نے فون ایک مرتبہ پھر بند کر دیا۔

"آئی ایم سوری ماہ نور! میں تمام تر دعوؤں کے باوجود کسی کی توقع پر پورا نہ اترنے کا اپنا ہی قائم کیا ہوا ریکارڈ نہیں

توڑ سکا۔" اس نے سوچا اور خوشی محمد کی طرف دیکھا۔

"لو بھائی جی..... اتنا تیل پڑ گیا ہے کہ آپ پٹرول پمپ تک آسانی سے پہنچ جاؤ گے۔" خوشی محمد نے پائپ فیول ٹینک سے الگ کرتے ہوئے کہا۔

"بہت شکریہ خوشی محمد!" وہ آہستہ قدموں سے چلتا خوشی محمد کے قریب آیا۔ "تم لوگوں نے میری بڑی مدد کی۔"

"شرمندہ نہ کرو صاحب جی!" خوشی محمد مسکرایا "بے بے میری جھلی ہے بالکل' میں تو سوچ رہا ہوں پتا نہیں اس نے آپ کی سواد کی سیوا بھی کی کہ نہیں' بولتی بھی بہت ہے' اس کا تا!" اس نے کنپٹی پر انگلی رکھ کر اشارہ کیا "میٹر گھوما ہوا ہے' جو جی میں آئے' بس بولتی ہی جاتی ہے۔"

"نہیں خوشی محمد!" سعد نے اس کا شانہ تھپتھپایا "قدر کیا کرو یار تمہاری بے بے علم کا دریا ہے' اس نے معرفت کی باتیں سیکھی نہیں ہیں' اسے سکھائی گئی ہیں۔ جو لوگ صابر ہوتے ہیں' اللہ ان پر اپنی کچھ نعمتیں یوں ہی انعام کیا کرتا ہے۔" وہ بولتے بولتے ہنس دیا' اس کی ہنسی میں طنز تھا اور چبھن بھی۔

"وہ تو میرے جیسے بدقسمت ہوتے ہیں جن کو اللہ راستہ روک کر ایسے دریاؤں سے سیراب ہونے کا موقع دیتا ہے' پر وہ اپنے بھانبڑ اونچے رکھتے ہیں۔ خود کو ان دریاؤں سے بچا کر بھسم ہو جانے کی راہ پر چل دیتے ہیں۔"

"میں پڑھا لکھا نہیں ہوں باؤ صاحب! میری سمجھ میں آپ کی بات نہیں آتی۔" خوشی محمد نے جھینپتے ہوئے کہا۔

"تمہارے سمجھنے کی ہے بھی نہیں یہ بات۔" سعد نے ایک مرتبہ پھر اس کا شانہ تھپتھپایا۔

"بس بے بے کی قدر کرنا سیکھو۔" اس نے کہا۔ "یہ کچھ رقم ہے۔" اس نے والٹ سے نوٹ نکالتے ہوئے کہا "بدقسمتی سے اس وقت میرے پاس اتنا ہی کیش ہے' یہ رکھ لو بے بے کے لیے اس کی پسند کی چیزیں خرید لینا۔"

"او نا باؤ صاحب!" خوشی محمد بوکھلا کر بولا "ہمیں رقمیں نہیں چاہئیں۔"

"یہ رقمیں نہیں ہیں خوشی محمد؟" سعد نے اس کا ہاتھ بند کرتے ہوئے کہا "یہ محبت ہے' تشکر ہے اور خلوص ہے۔" خوشی محمد نفی میں سر ہلا رہا تھا۔

سعد نے اثبات میں سر ہلا کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور گاڑی کے دروازے کی کھلی کھڑکی سے ہاتھ اندر ڈال کر ہارن بجانے لگا۔ ہارن کی آواز سن کر نور فاطمہ کوٹھری سے باہر نکلی اور ہاتھ سے رک جانے کا اشارہ کرتی ادھر کو لپکی۔

"میں تیرے واسطے کوئی سوغات لینے گئی تھی۔" اس نے سعد کے قریب پہنچ کر ہانپتے ہوئے کہا۔ اس نے ہاتھ کا پنکھا اس کی طرف بڑھایا' جس کے کناروں پر خوش رنگ کپڑا چڑھا کر اس پر کانچ کے موتی لگائے گئے تھے "یہ میں نے اپنے ہاتھ سے بنایا ہے۔" اس نے سعد کی طرف فخر سے دیکھا "اور یہ" اس نے کپڑے کی ایک چھوٹی سی پوٹلی کھول کر اس کے سامنے کی' اس پوٹلی میں دیسی گڑ کی تین بھیلیاں رکھی تھیں پھر اس نے دوپٹے کی تہہ کھول کر کچے بھٹے نکالے اور ایک چنری نکال کر اس کے سامنے کی۔

"یہ سب ماڑیاں (غریبانہ) سوغاتیں ہیں لیکن تو ان کو جب بھی دیکھے گا' تجھے یاد آئے گا کہ تو نور فاطمہ کی کوٹھری کا پروہنا بنا تھا اور یہ چنری اپنی بیوی کو دینا جا کے۔"

سعد کو محسوس ہوا' اس کی آواز گلے میں گھٹ کر رہ گئی تھی "کیا اس خلوص کا بدلہ قیمتی سے قیمتی چیز کے ذریعے بھی اتارا جا سکتا تھا۔" اس نے وہ تینوں چیزیں پورے احترام کے ساتھ نور فاطمہ کے ہاتھ سے لے لیں۔

"میرے لیے ایک دعا ضرور کرنا نور فاطمہ! اللہ مجھے تمہاری طرح صبر عطا کر دے۔" اس نے کہا۔

"کج گنوائے گا اے۔ (جب ہاتھ سے کچھ گنواؤ گے) اس وقت پتا لگ جائے گا صبر کی شے ہوتی ہے۔" نور فاطمہ

نے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا یہ بات کہتے ہوئے اس کے اونچے دانت ایک بار پھر نظر آئے تھے۔

☆ ☆ ☆

"یہ جو اپنے گلے میں طوق تم نے اپنے ہاتھوں ڈال لیا ہے نا' اس کا بوجھ اٹھاتے کہیں ہلکان نہ ہونے لگو' مجھے اس بات کا ڈر ہے۔"

"عشق اور جنگ میں سب سہنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔"

"بڑے دانت نکل رہے ہیں ابھی تو بی بی! آگے دیکھیے ہوتا کیا ہے۔"

"یہ دانت بھی ہاتھی کے دانتوں کی طرح نمائشی ہیں' دکھانے کے ہیں صرف' اصل تو وہ چیز ہے' جو دل میں ہے اور پھوٹی پڑتی ہے۔"

"میری دعا ہے کہ وہ جو پھوٹے پڑ رہے ہیں' بور کے ثابت نہ ہوں آگے چل کے۔"

"چلو ہٹو' منحوس ماری' ناس پٹی' جب سے یہ کام سرانجام پایا ہے' ایک بھی مبارک بات تمہارے منہ سے نہیں نکلی۔"

"کیا کروں' خدا لگتی کہنے کی عادت ہے' لگی لپٹی نہیں آتی مجھے۔"

"خوب جانتی ہوں۔ تمہیں لگی لپٹی آتی ہے یا نہیں' لوگوں کو جھولیاں اٹھا اٹھا کر آشیربادیاں اور مبارکبادیاں دینے والی کو آج لگی لپٹی کہنا بھی بھول گئی' قربان جاؤں میں تمہارے رنگ بدلنے کے۔"

"لوگ لوگ ہیں اور تم تم ہو۔۔۔ میں کیا کروں' مجھے اس بات کو سوچ کر ہول اٹھتے ہیں کہ یہاں کسی کو علم ہو گیا کہ اسلام آباد والے نے ڈولی اٹھالی ہے تو کیا ہو گا۔"

"ڈولی اٹھالی ہے' ارے کم بخت تم تو ایسے بولیں جیسے کسی نے جنازہ اٹھالیا ہو کسی کا اور تمہاری زبان کے آگے تو خندق ہے اللہ کی بندی جو بات منہ سے نکالنے کی نہیں ہوتی وہ تمہارے گلے سے پھٹے ڈھول کی طرح بجتی نکلتی ہے۔"

"تو میں کیا کروں' وہم ہیں نا' کسی بھی رنگ میں سہی زبان سے نکل ہی آتے ہیں۔ تمہیں کس نے کہا تھا اپنے عاشقوں کی فہرست اتنی بڑھالو کہ قدم قدم پر بارود بھری سرنگیں بچھ جائیں۔"

"چلو ہم تو سوائے ڈرانے کے کوئی کام نہیں کر سکتیں' جبکہ میرا تو دل چاہتا ہے چھت پر چڑھ کر بلند آواز میں گاؤں "جب پیار کیا تو ڈرنا کیا۔"

"اف میری مدھوبالا۔ کہیں ترنگ میں آکر ایسا کر نہ دینا' جانتی ہو نا طیفے لاٹر کی چھت تو اس چھت کے ساتھ ہی ملی ہوتی ہے اور کیا ہے کہ اس کے کانوں کے پرت بڑے ہی پتلے ہیں۔"

"چلو بھاگو یہاں سے' باہر دروازے پر مولوانوں کا شاگرد دستک دے رہا ہے۔ اسے کھانا باندھ دو۔ یہاں کھڑی تو محض دل ہی دہلائے چلی جارہی ہو۔"

"جارہی ہوں' جارہی ہوں۔ تم خود کو سچ سننے کے لیے تیار رکھا کرو میری لاڈو! اسلام آباد والے کے چکر میں کافرستان میں آگ لگ گئی تو کیا ہو گا۔ یہ بھی سوچ کر رکھو۔"

☆ ☆ ☆

اس نے اس چھوٹے سے گھر کے گیٹ پر نصب کال بیل کو تیسری مرتبہ دبایا اور جواب کا منتظر ہوا۔ چوتھی بار بیل کرنے سے پہلے وہ سوچ رہا تھا کہ شاید گھر پر کوئی نہیں تھا۔ لیکن چوتھی بار بیل کے جواب میں بیل کے ساتھ نصب انٹرکام پر آواز ابھری۔

"کون؟" اس نے جواب میں آہستہ آواز میں اپنا نام بتایا۔ دس سیکنڈز کے بعد گیٹ کھل گیا۔

"میں معذرت خواہ ہوں' مجھے معلوم ہے کہ یہ وقت کسی کے گھر جانے کے لیے بالکل بھی موزوں نہیں۔" اس نے بغیر تمہید باندھے کہا۔

"کسی کے گھر جانے کے لیے یقیناً" موزوں نہیں' مگر اپنے گھر آنے کا کوئی مخصوص وقت نہیں ہوتا۔" جواب میں اس نے اس چھوٹے سے گھر کی مالکن کو کہتے سنا تھا۔

"اندر آجاؤ' بلا جھجک۔" وہ ایک طرف ہوتے ہوئے بولی۔

"بہت شکریہ۔" وہ گھر کے اندر داخل ہو گیا۔

"کیا سوتے سے اٹھ کر سیدھے چلے آئے ہو' اور تمہارے چہرے پر اتنی وحشت کیوں طاری ہے' ایک عجیب سی خواری ٹپک رہی ہے تمہارے حلیے سے۔" وہ اس سے دو قدم آگے چلتے ہوئے بولی۔

"یوں ہی سمجھ لیں' طویل نیند سے جاگا ہوں اور سیدھا آپ کے پاس آگیا ہوں۔"

"ہوں۔" وہ گھر کے داخلی دروازے میں رکی اور اس کی طرف مڑ کر دیکھنے لگی۔ "لگتا ہے بری طرح ہڑبڑا کر جاگے ہو۔"

"شاید!" وہ زبردستی مسکراتے ہوئے بولا۔

"آرام سے بیٹھو' بے تکلفی سے بغیر جھجکے۔" لاؤنج میں آکر اس نے صوفوں پر رکھے کشن ترتیب سے رکھتے ہوئے کہا۔ وہ اس کی ہدایت کے مطابق ایک لانگ چیئر پر نیم دراز ہو گیا۔

"میں غالباً" بہت تھک گیا ہوں۔" اس نے آنکھیں موندتے ہوئے کہا۔

"ہوں!" اس نے اس کی بڑھی ہوئی شیو' الجھے بالوں اور شکنوں سے بھرپور ٹراؤزر اور شرٹ کو دیکھا' اس نے پیروں میں فلپ فلاپس پہن رکھے تھے' اتنے عمومی حلیے میں وہ کہاں کا سفر کر کے یہاں پہنچا تھا۔ اس کے دل میں یہ سوال کرنے کی خواہش ابھری لیکن اس نے اس سوال کو زبان پر نہ آنے دیا۔

"بھوک بھی لگ رہی ہو گی' کھانا لاؤں۔"

"جی ضرور۔" وہ سیدھا ہو کر بیٹھا "آپ کو زحمت تو نہیں ہو گی؟"

"نہیں ہو گی۔ بے فکر رہو۔" وہ لاؤنج سے منسلک اوپن کچن میں چلی گئی۔

"منہ ہاتھ دھو کر فریش ہو جاؤ تم' یہ ساتھ ہی بیڈ روم ہے اور اس سے اٹیچڈ واش روم۔" اسٹوو پر فرائنگ پین رکھتے کھانے کے لیے کچھ بناتے ہوئے وہ بولی۔

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" وہ اٹھ کر میزبان کے بتائے بیڈ روم میں چلا گیا۔ یہ ایک چھوٹا سا گیسٹ بیڈ روم تھا غالباً" کیونکہ اس میں موجود فرنیچر کو سفید چادروں سے ڈھکا گیا ہوا تھا۔ وہ واش روم میں گیا۔

"صرف دو راتوں کے اندر اندر کیا سے کیا اور کہاں سے کہاں تک دیکھ آیا میں۔"

منہ پر پانی کے چھپاکے مارتے ہوئے اس نے واش بیسن کے اوپر لگے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ اسے اپنے چہرے پر تھکاوٹ کے ساتھ ساتھ اضمحلال بھی نظر آیا۔ اس نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا اور پھر گیلے ہاتھ منتشر بالوں میں پھیر کر انہیں سیدھا کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ دوبارہ اپنی میزبان کے سامنے موجود تھا۔

"آج میں نے اپنے لیے چکن ود چیز بال بنایا تھا' تمہارے لیے جلدی میں یہ سپگیٹھی بنائی ہے' تھوڑے مشرومز پڑے تھے اور چکن پیسز بھی' میری اپنی ریسپی ہے۔ ٹرائی کرو بہت بری نہیں ہو گی' یہ تھوڑے فرائیڈ رائس بچے بھی ہیں۔ چکھو میں بہت بری کک نہیں ہوں۔"

وہ منہ ہاتھ دھونے اور بالوں کو گیلا کر کے سیدھا کرنے کے بعد اوپن کچن میں رکھی چھوٹی سی ڈائننگ ٹیبل کی

طرف آیا تو وہ اس کے سامنے پھرتی سے پلیٹیں اور کانٹے چمچ رکھتی ہوئی بولی۔
"ہاں ایک پیالہ سویٹ اینڈ سار سوپ کا البتہ میں نے انسٹنٹ سوپ کے پیکٹ سے بنایا ہے، پہلے اسے پیو۔ تمہاری تھکن کم کرنے میں مدد دے گا۔"
چوہدری سردار کے پُرتکلف ڈنر اور نور فاطمہ کی روٹی پر رکھے پیاز کیری اور ہری مرچوں کی چٹنی سے لے کر اس انسٹنٹ سوپ اور سپگیٹھی تک کا سفر کتنا طویل ہے، کیسے کیسے تجربوں سے بھرپور اور کتنی تلخیوں کو ساتھ لیے ہوئے۔ اس نے خاموشی اور دلچسپی کے ساتھ کھانا کھایا۔ اسے شدید بھوک لگ رہی تھی اور کھانا واقعی اچھا بنا تھا، اس نے کھانا بنانے والی کے ہاتھ کے ذائقے کا دل ہی دل میں اعتراف کیا۔ وہ بھی اسے خاموشی اور تفصیل سے کھانا کھاتے ہوئے اتنی ہی خاموشی سے دیکھتی رہی تھی۔
"مجھے لگتا ہے میں نے سب ختم کردیا۔ آپ کو اپنے ساتھ کھانے میں شریک ہونے کی دعوت دینا بھی بھول گیا۔ مجھے شدید بھوک لگ رہی تھی۔" پیٹ بھر کر کھانا کھانے کے بعد اس نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔
"میں لنچ نہیں لیتی، اس لیے رات کا کھانا جلد کھا لیتی ہوں۔" اس نے مسکرا کر کہا اور اٹھ کر برتن سمیٹنے لگی۔
"تم لاؤنج میں بیٹھو، میں تمہارے لیے کافی بناتی ہوں۔" اس نے کہا۔
"آپ کے پاس کوئی سوفٹ ڈرنک رکھا ہے تو بتا دیں میں نے زیادہ کھا لیا ہے۔" وہ بے تکلفی سے بولا۔
"فریج میں دیکھو کچھ ٹن رکھے ہیں شاید۔" اس نے اتنی ہی بے تکلفی سے جواب دیا۔ اس نے اٹھ کر فریج کھول کر ایک سوفٹ ڈرنک کا کین نکالا اور لاؤنج میں آکر بیٹھ گیا۔
ڈرنک کا کین کھولتے ہوئے اس کی نظروں کے سامنے ایک منظر گھوم گیا۔
"آپ کا سیل فون یہیں کہیں رکھا ہے یا اندر ہے کہیں، اس میں کریڈٹ تو ہوگا۔" اس نے سر اٹھا کر سامنے کچن میں مصروف میزبان کو دیکھا۔
"کیا بات ہے؟" وہ اس کی طرف گھومی "مجھے یقین ہے، کسی رہزن کے ہاتھ نہیں لگے تم؟"
"رہزن؟" اس نے سوفٹ ڈرنک کا کین صوفے کے بازو سے ہولے ہولے ٹکراتے ہوئے دہرایا "رہزنوں کی بھی تو کئی قسمیں ہوتی ہیں نا۔" اس نے ایک نظر اس کے سیل فون پر ڈالی اور پھر سر ہلایا "چلیں رہنے دیں، آپ کا نمبر دیکھ کر کسی کے ٹھٹک جانے کا اندیشہ ہے۔"
"ہوں!" وہ اپنا بڑھا ہوا ہاتھ پیچھے کھینچتے ہوئے بولی۔ "رہزنوں کی کون سی قسم سے جا ٹکرائے تم؟"
"رہزن سے واسطہ تو شاید کسی اور کا پڑا میں نے تو صرف اس سے تعارف حاصل کیا ہے ابھی۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔
"کس کا واسطہ پڑا رہزن سے؟" وہ چھوٹی سی طشتری میں کافی کے کپ رکھے ادھر آئی اور اس کے سامنے صوفے پر بیٹھ گئی۔
"شاید بہت سوں کا، شاید ہر کسی کا، شاید آپ کا بھی۔" اس نے اپنی میزبان کی طرف غور سے دیکھا۔

☼ ☼ ☼

"باس کی اوپر والی منزل ٹیڑھی ہو رہی ہے لیننگ ٹاور کی طرح۔" رازی نے اس رات ضوفی کو بتایا۔
"وہ تو ظاہر ہی ہے۔" ضوفی نے اطمینان سے جواب دیا۔
"باس کی شخصیت کی فاؤنڈیشن میں گڑبڑ ہے اور تم جانتے ہو فاؤنڈیشن کمزور ہو تو عمارت اتنی ہی کمزور ہوتی ہے جیسا لیننگ ٹاور۔"

"لیننگ ٹاور کے ٹیڑھا ہونے میں بہت سے فیکٹرز انوالوڈ ہیں، باس کے پاس بظاہر ایسا کوئی فیکٹر نہیں ہے۔"
"وہ کائیاں آدمی ہے، اسے پتا ہے کہ کیسے کیا چھپایا جا سکتا ہے فیکٹرز بھی اور ان کے آفٹر میتھس بھی۔ اس جیسوں کے لیے ڈمپ کرنا کوئی مشکل نہیں۔"
"اچھا اب یہ بولو کہ آج ایسا کیا ہوا جو تمہیں یہ خیال آیا۔" ضوفی نے پوچھا۔
"آج اس نے ہر طرف ایک قیامت سی مچائی ہوئی تھی، سعد سلطان کے ویری اباؤٹس نہیں مل رہے تھے کہیں، ان کا فون بند تھا اور وہ کہاں تھا۔ کسی کو کچھ خبر نہیں تھی۔"
"وہ کہاں تھا... یہ تو کئی دن سے کسی کو معلوم نہیں تھا۔"
"میرا خیال ہے کہ دونوں باپ بیٹے نے کوئی ایسا معاہدہ کر رکھا ہے، جس کے تحت سعد سلطان ایک مخصوص وقت کے لیے اپنے ویری اباؤٹس بتائے بغیر غائب رہ سکتا ہے۔"
"تو آج قیامت کا صور کیوں بجایا گیا اگر ایگری منٹ ہے تو۔"
"آج اس معاہدے کے تحت سعد سلطان کو آفس میں موجود ہونا چاہیے تھا مگر وہ نہیں آیا۔"
"اوہ...!" ضوفی نے ہونٹ سکوڑے "پھر...؟"
"پھر بس آخری خبریں آنے تک تلاش جاری تھی، میں تو پینٹری اسٹاک چیک کرنے کے بہانے کھسک آیا، ورنہ ابھی تک اسی سرگرمی میں مبتلا ہوتا۔" ضوفی بے اختیار ہنس دی۔
"لیکن ایک بات ہے، باس واقعی پریشان تھا۔ یوں جیسے اس کا ذہن ماؤف ہو گیا ہو، وہ بہکی بہکی حرکتیں کر رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کیا کرے اور اس کا بس نہیں چل رہا تھا جو سامنے آرہا تھا اس کے ساتھ کیا کر ڈالے۔"

"ہوں انٹرسٹنگ۔" ضوفی نے شانے اچکائے۔ "سعد سلطان بچہ تو نہیں ہے۔"
"باس کے لیے تو ہے۔" رازی نے سر ہلایا۔
"دیکھتے ہیں، صبح تک کیا ہوتا ہے، اگر وہ واپس نہ آیا تو تم نئی پریڈ کے لیے تیار رہنا۔" ضوفی نے جمائی لیتے ہوئے کہا اور کمفورٹر اپنے اوپر کھینچ لیا۔
"اللہ کرے وہ صبح تک آجائے، ورنہ باس نے تو ملک کے کونے کونے میں موجود کنوؤں میں بانس ڈلوا دینے ہیں۔" رازی کا لہجہ پریشانی لیے ہوئے تھا۔
"پھر تم کوشش کرنا کہ باس سے ڈھونڈ کر لے آنے والے کے لیے بڑا سا انعام اعلان کروا دو، کسی کو بانس ڈالنے کا فائدہ بھی ہو۔" ضوفی نے اگلی جمائی روکتے ہوئے منہ پر ہاتھ رکھ کر کہا اور کروٹ بدل کر آنکھیں موند لیں۔
رازی چت لیٹا نائٹ بلب کی روشنی میں چھت کو گھور رہا تھا۔ اسے آنے والے کل سے خوف آرہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"تمہیں میرا پتا کس نے بتایا؟" نادیہ نے اپنے سامنے بیٹھے شخص کے سوال پر اسے مسکرا کر دیکھا۔
"ایک ایسی چیز جس کی موجودگی ماحول کو معطر کر رہی ہو، اس کی سمت کا اس کے پتے کا پوچھنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔"
"یہ ایک ایسا اندازہ ہے جو میرے قد سے بہت بڑا ہے، میں واقعی سنجیدگی سے پوچھ رہا ہوں۔"
"چلیں ہم الفاظ بدل لیتے ہیں۔" نادیہ نے اپنے قریب رکھے کشن کو جو وہ کمر کے پیچھے سے نکال کر سائیڈ پر رکھ چکی تھی گود میں رکھتے ہوئے کہا "ایک ایسی جگہ جہاں ہر طرف تاریکی کا راج ہو، وہاں آنے والی مدھم سی روشنی کی

سمت بھی کسی سے معلوم کرنے کی ضرورت نہیں رہتی نہ ہی اس کے لیے کوئی قطب نما درکار ہے۔"

"مجھے کہنا پڑے گا کہ تمہیں الفاظ کا استعمال اچھا کرنا آتا ہے۔" وہ مسکرائے۔

"نہیں ایسی بات نہیں ہے میں نے تو بہت محدود سی زندگی گزاری ہے اس لیے میرے پاس الفاظ بھی بہت کم ہیں مگر مجھے بھی کہنا پڑے گا کہ آپ کے سامنے بیٹھ کر نجانے کیوں میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں اچھی اچھی باتیں ہی کرتی چلی جاؤں۔" اس نے سنجیدگی سے کہا اور کہتے کہتے تھوڑا توقف کیا۔

"اور میں اس چیز کو اس بات کی علامت کے طور پر لے رہی ہوں کہ میں ٹھیک جگہ پہنچی ہوں۔"

"بات دراصل یہ ہے کہ تمہاری عمر میں جذباتی پن اپنے عروج پر ہوتا ہے اس عمر میں چیزیں عین ویسی ہی دکھائی دیتی ہیں جیسی انسان دیکھنا چاہ رہا ہوتا ہے۔ تم نے بھی ایک بات فرض کرلی ہے کہ آج کل جذبات کی جس یلغار نے تمہارے اندر اودھم مچایا ہوا ہے اس کی تسکین اس کی گتھیوں کا سرا اس کے متعلق راہنمائی تمہیں مجھ سے مل سکتی ہے اسی وجہ سے بغیر جانچے اور پرکھے میں تمہیں مینارۂ نور یا چاہ عطر نظر آرہا ہوں ایک مخلصانہ مشورہ یہ ہے کہ اپنے اندر اودھم مچانے والے انقلاب کو پرکھو سمجھو اس کا تفصیلی جائزہ لو اور فیصلہ کرو کہ یہ کہیں کوئی وقتی ابال تو نہیں اور اگر جان جاؤ کہ ایسا ہی ہے تو اس پر شرمندہ مت ہونا کیونکہ زندگی کے مختلف ادوار میں وقتی انقلاب جن کی نوعیت مختلف ہوتی ہے آتے ہی رہتے ہیں۔"

"میرے اندر کوئی انقلاب نہیں آیا۔" نادیہ نے غیر جذباتی انداز میں کہا۔ "میری زندگی اب تک کچھ زیادہ آسان نہیں گزری جس جذباتی اودھم کی بات آپ کر رہے ہیں ان کا داخلہ اکثر آسودہ زندگیوں میں اور شخصیتوں پر ہوتا ہے۔ میں نے اپنی زندگی اپنی بقا کی جدوجہد کرتے گزاری ہے میرے جیسی زندگیوں میں جذباتی ابال کا گزر بہت ہی کم ہوتا ہوگا۔ میں واقعی کسی راستے کی تلاش میں ہوں میں واقعی کسی منزل کے حصول کو اپنی زندگی کا مقصد بنانا چاہتی ہوں میں واقعی کسی الوہی ہستی سے ہمیشہ کے لیے منسلک ہوجانا چاہتی ہوں اور اسی لیے آپ کے پاس حاضر ہوئی ہوں لیکن۔" وہ ایک بار پھر رکی اور اپنے مخاطب کی طرف دیکھنے لگی۔

"مجھے لگتا ہے۔" لمحہ بھر کے توقف کے بعد اس نے پھر سے کہنا شروع کیا "مجھے لگتا ہے کہ عمر بھر اگرچہ میں نے لاشعوری طور پر "گناہ" سے بچنے کی کوشش کی ہے۔ کچھ گناہ انسان لاشعوری طور پر کرجاتا ہے جو شاید اس کی نظر میں غیر اہم معمولی اور نظر انداز کردیے جانے والے ہوتے ہیں مگر پکڑ ان کی بھی ہوتی ہے شاید ایسے ہی کسی گناہ کی پاداش کے طور پر آپ مجھے اور میری درخواست کو سنجیدگی سے سننے سے انکار کر رہے ہیں۔" اس کی آواز اس کے لہجے کی غیر معمولی سنجیدگی کے باوجود لرز گئی اور شاید بھرا بھی گئی تھی۔

"تمہارا اصل کہاں سے متعلق ہے؟" وہ جیسے ٹھٹک کر بولے تھے۔

"پاکستان سے۔" نادیہ کے لہجے میں تیقن اترا۔

"یہاں کب سے رہ رہی ہو؟" انہوں نے دوسرا سوال کیا۔

"میں یہاں رہتی نہیں آئی ہوں پڑھائی کے دوران چند مہینوں کا وقفہ کرکے میں صرف آپ سے ملنے اور آپ سے باتیں کرنے یہاں آئی ہوں۔"

"ملا کرو آتی رہا کرو۔" انہوں نے اٹھ کر نادیہ کے سر پر ہاتھ رکھا۔

"کیا واقعی۔ کیا آپ کو یقین ہے۔" نادیہ کی آنکھوں میں مسرت اور بے یقینی تھی۔

"یقین کی کچھ منزلیں ہوتی ہیں لیکن ان منزلوں کو طے کرنے کے لیے پہلا قدم تو اٹھانا ہی پڑتا ہے چلو پہلا قدم اٹھاتے ہیں آگے کی طرف دیکھتے ہیں دھند کے اس پار تمہارے لیے کیا رکھا ہے۔" وہ مسکرا کر بولے تھے۔

☼ ☼ ☼
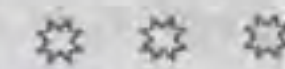
"ماہ نور! کیا تمہیں معلوم ہے کہ سعد کہاں ہے میں نے ایک ضروری کام سے اسے کال کرنے کی کوشش کی لیکن یا تو اس نے نمبر بدل لیا ہے یا پھر نجانے کیا بات ہے کہ اس کے نمبر پر کال نہیں ہو رہی نمبر مسلسل بند جارہا ہے (خدیجہ خالہ)"

ماہ نور نے اپنے سیل فون پر خدیجہ خالہ کا پیغام پڑھا اور سیٹا گئی۔ سردار چاچا کھاری خدیجہ خالہ تین مختلف نوعیت کے لوگ گزرے کل سے اب تک سعد کے متعلق اس سے سوال کر رہے تھے جن میں سے دو کو سعد سے ضروری بات کرنی تھی اور ضروری کام بھی تھا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے۔" اس نے بارہا خود سے سوال کیا اور ایک بار پھر سعد کے نمبر پر کال کی حسب توقع نمبر بند تھا۔

"کیا یہ ضرور تھا کہ تمہیں ہر تھوڑے عرصہ بعد میرے لیے سراب بن جانا تھا تم غائب اور میں تمہاری تلاش میں سرگرداں ایک صحرا ہے جس میں سراب کبھی آب محسوس ہوتا ہے اور پھر دوبارہ سے سراب میں بدل جاتا ہے اور میں ہوں کہ دل پر قابو کھو کر اس صحرا میں ہاتھ پاؤں مارتی بھٹک رہی ہوں۔" اس نے اپنے آنسو ہاتھ کی پشت سے صاف کیے اور اپنے بیگ میں ساتھ لائے کپڑے ترتیب سے رکھنے لگی۔

اسے وہ دن بری طرح یاد آرہے تھے جب اسلام آباد سے لاہور واپس آنے کے بعد اسے اسی طرح سعد کا نمبر بند ملتا تھا اور وہ اس کو کال کرکے ایک مخصوص جواب سنتے نہیں تھکتی تھی۔ اس نے ایک بار پھر سعد کے نمبر پر کال کی اور مایوس ہوتے ہوئے بے دھیانی میں اپنے روابط میں محفوظ ناموں کی لسٹ دیکھنے لگی۔ چیٹر باکس (Chatterbox) سی ایچ سے شروع ہونے والے ناموں میں چچا سردار کے علاوہ صرف یہ ہی ایک نام محفوظ تھا۔

"چیٹر باکس" اس نے زیر لب یہ نام دہرایا "ابراہیم" اس کے ذہن میں جھماکا ہوا۔ اگلے لمحے وہ اس نمبر پر کال کر رہی تھی۔

"ہیلو ابراہیم! یہ میں ہوں ماہ نور۔ تمہیں یاد ہوں کیا میں؟" دوسری طرف سے کال وصول کیے جانے کے بعد اس نے بغیر تمہید کے کہنا شروع کیا۔

"اوہ ماہ نور!" دوسری جانب سے بھی بغیر کسی تعجب کے اظہار کے جواب دیا گیا "ماہ نور کیا تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ سعد کہاں ہے اس وقت۔"

وہ جس سوال کا جواب پانے کے لیے یہ رابطہ کر رہی تھی وہ سوال خود اس کے سامنے لا کھڑا کردیا گیا تھا۔

"کیا تمہیں بھی نہیں معلوم کہ سعد کہاں ہے۔" اس کا آس نراش کی کیفیت میں مبتلا دل بہت اندر کہیں ڈوب گیا۔

"نہیں اور میں اس کے بارے میں خاصا پریشان ہوں۔"

"وہ شاید اسلام آباد واپس گیا تھا۔" ماہ نور نے اٹک اٹک کر کہا۔

"اسلام آباد۔" دوسری طرف سے کہا گیا "اسلام آباد بہت بڑا شہر نہیں ہے ماہ نور! ہم اسے ہر طرف ہر جگہ تلاش کرچکے۔"

"ابراہیم پلیز!" ماہ نور کی آواز شدت غم سے لرزنے لگی "پلیز جیسے ہی اس کا کچھ پتا چلے مجھے فوراً بتانا" پلیز میرا نمبر محفوظ کرلو پلیز پلیز۔"

"ضرور ماہ نور!" دوسری طرف سے متاثر ہوتے ہوئے کہا گیا تھا۔ "میں سعد کے لیے تمہارے جذبات کو سمجھ سکتا ہوں۔"

"اوہ!" ماہ نور نے فون بند کرکے آنکھیں میچیں "دنیا میں کوئی دوسرا ذی روح تو ہے۔ جو اس کے لیے میرے جذبات کو سمجھ سکتا ہے۔" اس نے سوچا تھا۔

(باقی ان شاء اللہ آئندہ ماہ)

ریحانہ اسلم

معاف کردو

"حد ہے ایسا بھی کیا کہ پراٹھے بھی نہ بنا سکو۔ ایسا لگ رہا ہے' دنیا کے نقشے بنا رہی ہو۔ آخر تمہاری ماں نے تمہیں کیا سکھایا ہے۔ صرف پڑھائی تو سب کچھ نہیں ہوتی؟"

عنایہ کی ساس کی زبان قینچی کی طرح چل رہی تھی اس نے گھبرا کر اپنے کمرے کی طرف دوڑ لگانے ہی میں عافیت سمجھی۔ عاشر نے اسے بوکھلا کر کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر بڑے معنی خیز انداز میں گردن ہلائی۔

"شکر ہے! کچھ کہا نہیں۔ ورنہ صبح صبح محاذ کھل جاتا۔"

عنایہ عاشر نے بہترین یونیورسٹی سے ایم بی اے کیا تھا اور ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں اونچے عہدے پر تھی۔ ایک سخت "باس" سمجھی جاتی تھی۔ شوہر پر بھی اپنی حاکمیت کبھی کبھی دکھا لیتی تھی۔ مگر شاید ہر عورت کو گھریلو زندگی میں الجھنوں کا سامنا کرنا ہی پڑتا ہے۔

عنایہ اکلوتی اولاد تھی۔ والدین کا سارا پیار صرف اسی کے لیے تھا۔ پھر بھی اس کی ماں نے اس پر بھرپور توجہ دی تھی۔ آٹھویں کلاس پاس کرتے ہی چھٹیوں میں ثانیہ نے اسے کہا۔

"عنایہ! چھٹیوں میں کوئی نہ کوئی کلاس ضرور لے لینا۔ سلائی' ککنگ یا پکانے کی...یا..." ان کا جملہ ادھورا رہ گیا۔

"اس بار چھٹیاں، ہم سہیلیاں ایک ایک ہفتہ ایک دوسرے کے گھر رہ کر مزے کریں گی بس ماما! ہم ایک دوسرے سے، بہت کچھ سیکھ لیں گے۔ لیجئے ہو گیا مسئلہ حل۔" عنایہ کا جواب تھا۔

یہ تو شکر تھا کہ تمام دوستوں کے والدین کی ایک دوسرے سے اچھی شناسائی تھی۔ اس لیے "نہ" کی گنجائش ہی نہ تھی اور یوں چھٹیاں یادگار طریقے سے گزر گئیں۔ سیکھا۔ کیا خاک... چھوٹے موٹے کام مل کر ہو جاتے۔ ورنہ تو ہر ایک کی ماں نے بہترین میزبان ہونے کا ثبوت دیا تھا۔

او لیول کی چھٹیاں کمپیوٹر کے شوق کی نذر ہو گئیں اور پھر عنایہ کو "اے" لیول میں آکر پتا چلا کہ پڑھائی کیا ہوتی ہے؟ پھر بھی ثانیہ اسے اکثر گھیر ہی لیتیں۔

"عنایہ! ذرا تھوڑی دیر کے لیے کچن میں آجاؤ۔" وہ آواز لگاتیں۔

"جی اچھا... آئی۔" سعادت مندی سے جواب ملتا کچن میں آتی۔ شامی کبابوں کی خوشبو پھیلی ہوتی۔

"واؤ۔" وہ مسکراتی۔

"کیا خدمت کروں آپ کی۔"

"آؤ! باقی کے کباب تم تل دو... اور ذرا سلیقے سے سلاد بنا کر پلیٹ میں رکھو۔" ثانیہ نے پیار سے کہا۔

"اچھا! ذرا پہلے چکھ تو لوں۔" اس نے ایک کباب توڑ کر منہ میں ڈالا۔ گاجر اٹھا کر دھوئی۔

"اوہ! میں ذرا فون سن کر آتی ہوں۔" اور یہ کہہ کر یہ جا اور وہ جا۔

ثانیہ جھلا کر رہ جاتیں۔ عنایہ کو کچھ کام سکھانے کی ان کی ہر کوشش ناکام ہوتی گئی۔ عنایہ پڑھائی اور کھیلوں میں مگن رہتی۔ خوب صورت ہونے کے ساتھ خوب سیرت بھی تھی اور تعلیمی مراحل بے حد کامیابی سے طے کر رہی تھی۔ کھیلوں میں تمغے وصول کر رہی تھی۔ مگر گھر کے کام اور پکانے سے اسے رتی بھر بھی دلچسپی نہ تھی۔

ثانیہ کی ساری کاوشیں بے کار جا رہی تھیں۔ وہ تمام بوائے بنی رہتی۔ ثانیہ اکثر فکر مند ہو جاتیں۔

"عنایہ! سسرال جاؤ گی تو ساس یہی کہیں گی کہ ماں نے کچھ نہ سکھایا۔" وہ اسے موڈ میں دیکھ کر بات کرتیں۔

"ماما! پہلے سے معلوم کر لیجئے گا کہ ان کے گھر خانساماں ضرور ہو۔" وہ انہیں چٹکیوں میں اڑا دیتی۔

"دیکھو! لوگ مجھے الزام دیں گے۔" وہ اسے سمجھاتیں۔

"ماما! ماڈرن دور ہے۔ سب کچھ پکا پکایا مل جاتا ہے' ورنہ یہ سارے ٹی وی چینل ہیں نا! دیکھ کر بنا لیا کروں گی۔" وہ ان کے گلے میں بانہیں ڈال دیتی۔ یوں اس نے گھرداری سیکھنے کی کوشش نہ کی۔

تانیہ نے صبر کرلیا کہ وقت اسے سمجھ دار بنادے گا اور وہ خود سمجھنے لگے گی کہ مرد کے دل کا راستہ معدے سے ہو کر گزرتا ہے۔ مگر ان کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔ عنایہ اپنی دنیا میں مگن رہی اور پھر اچانک عاشر کو عنایہ پسند آگئی۔ رشتہ بہترین تھا۔ انکار کا سوال نہ تھا۔ مگر انہیں شادی کی جلدی تھی۔ کیونکہ عاشر کی دادی بیمار تھیں اور ان کی خواہش تھی کہ وہ اپنی زندگی ہی میں پوتے کے سر پر سہرا دیکھ لیں۔

"سمیعہ بہن! عنایہ کو گھر کے کاموں اور پکانا ریندھنا وغیرہ سیکھنے کا موقع نہیں مل سکا کیونکہ پڑھائی ختم ہوتے ہی اسے فوراً" اچھی جاب مل گئی تھی لہٰذا وہ پھر اس میں مصروف ہو گئی۔" منگنی کے دن انہوں نے اس کی ہونے والی ساس کو یہ بتانا ضروری سمجھا۔

"لیجیے بھئی! یہ کون سی پریشانی کی بات ہے۔ آج کل کی لڑکیاں کہاں یہ شوق پالتی ہیں اور پھر میں سب سکھا دوں گی۔ بس آپ شادی کی تیاریاں کیجیے۔" سمیعہ نے یہ کہہ کر گویا ان کا دل ہلکا کر دیا۔

شادی دھوم دھام سے ہو گئی۔ عاشر توقع سے بھی اچھے شوہر ثابت ہوئے۔ انہوں نے اس کی جاب پر بھی کوئی اعتراض نہ کیا۔ عنایہ تو گویا ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔ ہنی مون کا عرصہ بھی شان دار رہا کہ دونوں کو ایک دوسرے کو سمجھنے کا موقع ملا۔ عنایہ نے خود ہی فیصلہ کیا کہ اسے تھوڑے دن کے لیے جاب چھوڑ دینی چاہیے۔ لیکن عاشر نے اسے کہا کہ وہ گھبرا جائے گی۔ اس لیے "پارٹ ٹائم" کام کرتی رہے۔

اور یوں زندگی گویا گل و گلزار تھی۔

☼ ☼ ☼

"عنایہ! کریمان آج کل چھٹی پر ہے۔ تم میرے ساتھ آج کچن میں آجاؤ۔"

سمیعہ کی آواز پر عنایہ کی تو جان پر بن آئی۔ مگر "مرتا کیا نہ کرتا" کے مصداق وہ کچن میں پہنچ گئی۔

"لو! تم مسالا بھون کر چکن دھو کر ڈال دو۔ اتنے میں میں بریانی چڑھا دوں۔" سمیعہ نے اس کے آگے چکن کی ٹرے رکھی۔

"میں چکن دھولوں؟"

"ہاں تو۔۔۔" انہوں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"میں نے تو کبھی گوشت کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔" وہ پریشان تھی۔

"تمہاری ماما نے تمہیں کچھ بھی نہیں سکھایا؟ حیرت ہے۔" سمیعہ ستے سے اکھڑ گئیں۔

"پلیز امی! میری ماما کو کچھ نہ کہیں۔ انہوں نے تو۔۔۔"

"چپ رہو!" ان کی آواز اونچی تھی۔ "لڑکیوں کو کچھ تو سکھایا ہی جاتا ہے۔ کیا انہیں معلوم نہیں تھا کہ کل کو تمہیں بیاہنا بھی ہے؟"

سمیعہ کے دو ہی بیٹے تھے۔ عاشر اور ساحر۔ ولید صاحب بھی کھانے پینے کے شوقین تھے۔ اس لیے انہوں نے تو اپنی جوانی سے ہی بہت سا وقت کچن میں گزارا تھا۔ پھر وہ جو کچھ کر سکتی تھی۔ اس نے احسن طریقے سے کرنے کی کوشش کی۔ ساتھ ساتھ ان کی بڑبڑاہٹ بھی سنتی رہی۔ ان کی ہر بات اس کے لیے تازیانہ ثابت ہو رہی تھی کہ سارا الزام ماما کے سر آرہا تھا۔ اس کا دل درد سے بھر گیا۔

"عنایہ! انسان کسی بھی کام میں ماہر نہ ہو۔ مگر اسے تھوڑا بہت تو ہر کام آنا چاہیے۔ خاص طور پر پکانا۔" ماما کی آواز ذہن کے پردے پر گونج رہی تھی۔ ایک عجیب سی سرد جنگ ساس، بہو کے درمیان چھڑ گئی تھی۔ سمیعہ شاید اپنی جوانی کے بدلے نکال رہی تھیں کہ انہوں نے تو ایک بالکل گھریلو زندگی گزاری تھی۔ عنایہ نے وہ چینل دیکھنے شروع کر دیے۔ جہاں کھانا پکانے کی ترکیبیں سکھائی جاتی تھیں۔ اب عاشر کے جھلانے کی باری تھی۔

"یار! یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ میں اسپورٹس دیکھنا چاہتا ہوں۔ تم یہ لگا لیتی ہو۔ امی سے سیکھ لو۔ کیوں پریشان ہو؟"

اب وہ کیسے بتاتی کہ اسے کیا کیا سننا پڑتا ہے۔

"کتنا آہستہ کام کرتی ہو۔ ہٹو! میں خود کر لوں گی۔ تم نے اب تک بس یہ کباب بنائے ہیں۔ رہنے دو۔ تم تو شام کر دو گی۔"

اسے ایسے ہی طنزیہ اور تنقیدی جملے سننے کو ملتے اور تان ہمیشہ اس بات پر ٹوٹتی کہ۔

"تمہاری ماں نے تمہیں سکھایا کیا ہے آخر؟"

پھر ایک سنگین حادثے نے ماما کو اس سے چھین لیا۔ اس کے لیے اس صدمے سے سنبھلنا بہت مشکل تھا۔ مگر وہ صرف عاشر کی محبتوں کے سہارے پھر سے زندگی کی طرف لوٹ آئی اور خود کو نارمل کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ لیکن شاید سمیعہ کو بھی اس کی کمزوری کا علم ہو گیا تھا۔ وہ اسے اب بھی نہ بخشتیں۔ ہر غلطی کا الزام وہ اس کی ماں پر ڈال دیتیں۔ حالانکہ اب وہ ماں بھی بننے والی تھی عاشر اور وہ بہت خوش تھے۔

وہ تیزی سے سیڑھیاں اتر رہی تھی کہ سمیعہ سامنے آگئیں۔

"ارے! ارے گھوڑے پر سوار کیوں ہو؟ پتا نہیں کہ ان دنوں میں احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیا تمہاری ماں نے یہ بھی تمہیں سمجھایا تھا؟"

اور عنایہ کا دل چاہا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔

☼ ☼ ☼

وقت گزرتا گیا اور "درد کا ایک دریا" پار کر کے وہ ایک پھول سی بچی کی ماں بن گئی۔ اس نے شدت سے اپنی ماں کو یاد کیا۔ دل میں ہزاروں آنسو اتار کر ان سے معافی مانگی کہ اسے اب اندازہ ہوا تھا کہ ماں بننا کتنا مشکل ہے۔

وہ مئی کا دوسرا اتوار تھا۔ یعنی "مدرز ڈے" عاشر نہ صرف اپنی ماں کے لیے۔ بلکہ اس کے لیے بھی ڈھیروں تحائف لایا تھا کہ ماں کا عہدہ اسے بھی مل چکا تھا۔

صبح ہی صبح جب اس نے نیچے آکر عاشر کی امی کے گلے لگ کر "ماؤں کے عالمی دن" کی مبارک باد دی تو انہوں نے بڑے تیکھے لہجے میں کہا۔

"شکریہ! مگر کیا تمہاری ماں نے یہ بھی نہیں بتایا کہ بڑوں کو پہلے سلام کیا کرتے ہیں۔"

عنایہ کا وجود زلزلوں کی زد میں آگیا۔

"امی! آپ کو خدا کا واسطہ، اب میری مرحومہ ماں کو معاف کر دیجیے۔ ان کو الزام دینا چھوڑ دیجیے۔ سارا قصور میرا ہے۔ بہت کوشش کی تھی انہوں نے کہ میں گھر کا کام سیکھ لوں۔ مگر مجھے ہی دلچسپی نہ تھی۔ میں نے اکلوتی ہونے کا ناجائز فائدہ اٹھایا تھا۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ اپنی بیٹی کو عنایہ نہیں بننے دوں گی۔"

اس نے ان کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

"آج ماؤں کا عالمی دن ہے۔ میری مرحومہ ماں کو معاف کر دیجیے۔ اس گناہ پر جو انہوں نے کیا ہی نہیں۔"

سمیعہ کا دل ہل کر رہ گیا۔ یہ اتنی بڑی کمی یا خامی تو نہ تھی۔ جس کے لیے وہ ہر وقت عنایہ کو طعنے دیتی رہتی تھیں۔ ہر انسان اپنی فطرت لے کر پیدا ہوتا ہے۔ عنایہ میں اگر ایک کمی تھی تو بہت ساری خوبیاں بھی تھیں۔ اس کی ماں نے اسے بہت کچھ سکھایا تھا۔ بڑوں کا ادب، احترام کرنے کی تربیت دی تھی۔ بہترین تعلیم دلائی تھی۔ کھانا پکانے سے اسے دلچسپی نہیں تھی اور وہ نہیں سیکھ پائی تو اس میں اس کی ماں کا کیا قصور تھا۔ ہر ماں اپنی طرف سے اولاد کی بہترین تربیت کرنا چاہتی ہے۔

کیا ان کی اپنی بیٹی میں کوئی کمی یا خامی نہ تھی۔ پھر وہ کیوں توقع رکھتی تھیں کہ بہو ہر لحاظ سے مکمل ہو گی۔ آج عنایہ نے ان کی آنکھیں کھول دی تھیں۔ ان کا سر جھکتا چلا گیا۔

ناولٹ

فرحین اظفر

مقروض گناہگار

شہر خموشاں کے باسی ان مانوس آہٹوں کے عادی تھے۔

جو ایک خاص دن مقررہ وقت پر بے آواز فقط سرسراتی ہوئی ان کچے راستوں کے درمیان گونجتی ہوئی ایک مخصوص جگہ جا کر تھم جاتیں۔

رضوانہ بتول زوجہ مدثر رضا۔

ہمیشہ کی طرح اس نے ہاتھ میں تھامی پلاسٹک کی تھیلی سے گلاب کی نم خوشبودار پتیاں نکال کر اس پر ڈالیں۔ وہیں بیٹھ کر چند لمحے کتبے کو تکتا رہا۔ پھر دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔

جتنی بھی قرآنی سورتیں اور مغفرت و بخشش کی مسنون دعائیں تھیں لبوں سے بے آواز نکل کر فضا میں بکھرنے لگیں۔ جانے کتنی دیر گزری تھی۔

ایک بار، دوبار، تین بار، دعاؤں کا ورد جاری رہا۔ یہاں تک کہ ساکن فضاؤں میں پرندوں کا شور اور اجالے کا سفر ملگجے کی سمت بڑھنے لگا۔

تب بے حد تھکے تھکے انداز میں اٹھ کر اس نے ایک آخری نگاہ اس جگہ ڈالی۔ جہاں وہ کبھی کبھی اور خاص آج کے روز ہر سال لازمی آتا تھا۔

ایک گہری سوگوار سانس اپنے وجود سے کھینچ کر فضا کے سپرد کرتے ہوئے واپسی کے لیے قدم بڑھا دیے۔

☼ ☼ ☼

پورے صحن میں رنگ برنگی جھنڈیاں لگی ہوئی تھیں۔ آس پڑوس سے آئی ہوئی عورتیں صحن میں بچھے تخت پر براجمان باتوں میں مشغول تھیں۔ اندر کمرے سے کسی بچے کے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

”کب آئیں گے بابا؟“

”آجائیں گے بیٹا! مغرب کی نماز سے پہلے... بلکہ بس اب آتے ہی ہوں گے۔“

آئینے میں دیکھتے ہوئے اس نے کاجل کی باریک دھار اپنی بڑی بڑی آنکھوں میں ڈالی۔ پھر آئینے میں نظر آتے اپنے بچے کے عکس کو دیکھا۔

وہ چہرے پر دنیا جہان کا شوق اور معصومیت طاری کیے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے پلٹ کر ممتا سے چور انداز میں بچے کو سینے سے لپٹا لیا۔ بے شک ان کا لخت جگر ہی دنیا میں جینے کا آخری سہارا تھا۔ تب ہی چوکھٹ پر آہٹ ہوئی۔ دونوں ماں بیٹے نے پلٹ کر دیکھا۔

"بابا!" بچہ خوشی سے چلاتا ہوا باپ کے پیروں سے لپٹ گیا۔

"کتنی دیر لگادی بابا! میری برتھ ڈے کا کیک لائے کہ نہیں؟"

اب وہ ٹھنک کر لاڈ سے کہہ رہا تھا اور رباب اس کے چہرے کے نقوش دیکھتا ماضی کے خدوخال کھوج رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"راجی..... اری او راجی..... کہاں مرگئی؟"

چاچی صغریٰ کی آواز شاہ خاور کی پرتپش شعاؤں سے زیادہ نوکیلی تھی۔ وہ جو چارپائی پر گرمی اور دھوپ سے بے نیاز نیند کے مزے لوٹ رہا تھا۔ بے مزا سا ہو کر اٹھ گیا۔ چادر منہ سے ہٹا کر کسل مندی سے داہنی طرف کروٹ لی تو سامنے برآمدے میں کھلے کمرے کے دروازے کے اندر نظر سیدھی راجی پر ہی پڑی۔ دھوپ اور نیند کی وجہ سے آنکھیں چندھیائی ہوئی تھیں۔ پھر بھی منظر قابل دید تھا۔

راجی، چاچی کی بے سری چیخ نما چنگھاڑوں سے مکمل طور پر بے نیاز اپنے لانبے ناخنوں پر چڑھے رنگ کا جائزہ لینے میں مگن تھی۔ اسے زور کی ہنسی آئی۔ مگر ہونٹ داب لیے۔ تب ہی برابر والے کمرے سے آنکھیں ملتا ذیشان عرف شانی نکلا۔ اسے بھی یقیناً" چاچی کی آواز نے ہی جھنجھوڑا تھا۔ مگر وہ اس کی طرح مہمان نہیں تھا۔ اس کی سڑی ہوئی شکل سے ظاہر تھا کہ نیند میں مداخلت کتنی گراں گزری ہے۔

"راجی! مرن جوگی، بہری ہے کیا؟"

چاچی کا نقارہ ایک بار پھر بج اٹھا۔ شانی جیسے کھڑے کھڑے نیند میں بڑبڑایا۔

پھر ایک قدم آگے بڑھ کر برابر والے کمرے میں جھانکا۔ وہاں راجی کو کھڑے دیکھ کر ایک جست میں اس کے سر پر پہنچ گیا۔ اگلے لمحے راجی کی چوٹی اس کی مٹھی میں تھی اور وہ اس کی آوازوں کی پروا کیے بغیر اسے گھسیٹتا ہوا کچن کی طرف لے جا رہا تھا۔ جہاں چاچی جانے کون سے کام میں مصروف تھی۔

"ارے، چھوڑ کمینے....."

وہ جو چارپائی پر داہنی کروٹ سے لیٹا تھا۔ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

شانی نے راجی کو چوٹی کے بل گھما کر جھٹکے سے کچن کے دروازے سے اندر دھکیل دیا۔ وہ دہائیاں دیتی رہ گئی اور وہ ڈھٹائی سے ہنستا ہوا باہر صحن میں آگیا۔

"اٹھ جا ویر..... بڑا دن چڑھ آیا ہے۔"

وہ اسے دیکھ کر آنکھ مارتا ہوا صحن میں ایک جانب بنے بیسن کی جانب بڑھ گیا۔ اندر رسوئی میں چاچی نے شاید راجی کی طبیعت صاف کی تھی۔ جب ہی شانی کی حرکت اور راجی کی منمناتی آوازوں پر اس کے ہونٹوں میں دبی مسکراہٹ، ہنسی کی صورت میں آزاد ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

یہ اس کے چاچا کا گھر تھا۔ کراچی کے نچلے طبقے کے ایک نیم پسماندہ علاقے میں۔ جہاں کہیں چوڑی پکی سڑکیں تھیں۔ تو کہیں الٹیاں کرتے گٹروں سے بھری کچی، چند بالشت کھلی پتلی پتلی گلیاں۔

ان ہی گلیوں میں سے ایک گلی میں واقع اس گھر کے اندر کا منظر اتنا تنگ و تاریک اور گھٹن زدہ نہیں تھا۔ کھلا سا صحن جس کی بائیں دیوار کے قریب بڑا سا پیپل کا درخت تھا۔ جو آدھا اس گھر کے صحن میں اور آدھا برابر والوں کے یہاں سایہ فگن تھا۔ گھنیری شاخیں چھت تک پھیلی ہوئی تھیں۔

مدثر نے جب گھر میں پہلا قدم رکھا تو یہی درخت طبیعت میں تازگی بھرنے کا سبب بنا تھا۔ جس کے چمکدار، چیٹے پتے ٹھنڈی ہوا سے یوں جھوم رہے تھے۔ جیسے گھر میں مہمان کی آمد پر خوشی سے تالیاں پیٹ رہے ہوں۔

باقی گھر جدید سہولیات سے محروم تھا۔ اے سی، یو پی ایس، جنریٹر، کمپیوٹر اور مائیکروویو کچن جیسی بلائیں گھر کے نام تھے، ان سے گھر والے صرف نام کی حد تک ہی واقف تھے۔ البتہ وہ خود کئی سال ہاسٹل میں رہنے اور شہر آکر پڑھنے کی وجہ سے اس درجہ ناواقف نہ تھا۔

مگر پورے تعلیمی دور کو گزار کر شہر میں پہلی بار چاچا جی کے گھر آتے ہوئے اس نے گھر کا جو تصور کیا تھا۔ یہ ایک سو بیس گز کا مکان اس پر ستر فیصد بھی پورا نہیں اترتا تھا۔

اگلے ہی مہینے کرائے کا گھر، آفس کے نزدیک بہتر علاقے میں، اس کی ترجیحات کی فہرست میں اپنے لیے پہلی ضرورت لکھی گئی۔

گھر کے لوگ اس کے اپنے تھے۔ اس لیے ان کے دل خلوص، محبت سے بھرے ہوئے تھے۔ چاچی اس کی ضروریات کا خیال رکھتیں اور راجی جوان کی اکلوتی بیٹی تھی، اس سے بھی رکھواتیں۔ وہ بھی مارے باندھے، جو نہ کچھ کر ہی دیتی۔

چاچا جی اس کے آنے سے بہت خوش تھے۔ اس کی تعلیمی اسناد کی فہرست بہت لمبی نہ سہی، مگر اتنی ضرور تھی کہ خاندان کے تقریباً" سب ہی چشم و چراغ بجھے بجھے سے لگتے اور چاچا جی کو امید تھی کہ وہ ضرور ان کے انٹر پاس ذیشان عرف شانی پتر کو بھی کسی ڈھنگ کی نوکری سے لگوا دے گا۔

اس نے بھی چاچا جی کی امیدوں کو فی الحال ناامیدی کی دوڑ نہیں لگوائی تھی۔

آج ہفتہ وار تعطیل کے دن یہ خصوصی چہل پہل راجی کے سسرال والوں کی آمد کی مرہون منت تھی۔ چونکہ وہ لوگ دوپہر تک آنے والے تھے۔ لہٰذا چاچی کی مصروفیت عروج پر تھی۔

کباب، بریانی اور سویوں پر مشتمل عام سا کھانا بنانے میں وہ ہلکان ہو رہی تھیں۔ اوپر سے راجی نے ڈھٹائی کا عالمی ریکارڈ قائم کرنے کا سوچ رکھا تھا۔ وہ باورچی خانے میں کسی طرح ہاتھ بٹانے پر راضی نہ

تھی۔ چاچی نے تھک ہار کر صفائی کے آرڈر جاری کر کے اسے کچن سے نکالا تھا اور وہ دیکھ رہا تھا کہ یہ صفائی ستھرائی کے تمام اقدامات صرف راجی کی اپنی ذات تک محدود تھے۔

بالآخر اس کی سستی کو چستی میں بدلنے کے لیے چاچی کو اپنی پلاسٹک کی سخت چپل والی بیٹری چالو کرنی پڑی۔ ہزار وولٹ کا جھٹکا اس کی کمر پر دہکانے سے ایک فائدہ ہوا' راجی کے کمزور ہوتے سیل پھر سے جان پکڑ گئے۔

وہ سی سی' سوں سوں کرتی' ڈبڈباتی آنکھوں سے تیز تیز ہاتھ چلانے لگی۔

چاچی کو ناشتے کا منع کر کے وہ نہانے چلا گیا۔ جب واپس آیا تو وہ گیلا پونچھا برآمدے میں پھیر رہی تھی۔ الجھی الجھی بکھری لٹیں پسینے سے گردن سے چپکی تھیں۔ چہرہ ابھی ابھی رویا رویا سا لگتا تھا۔

وہ چپ چاپ دل ہی دل میں ترس کھاتا ناشتا کرنے کے ارادے سے گھر سے نکل کر ہوٹل کی طرف چل پڑا۔

"بیٹا! ذرا چھیتی آنا۔ راجی کے سوھروں میں وڈے بھرا کی طرح ملاقات کراؤں گا۔ ذرا رعب پڑ جائے گا۔" گلی میں چاچا جی نے اسے روک کر نصیحت کی۔

☼ ☼ ☼

"مدثر بھائی! وہ لوگ آگئے ہیں۔ اماں کہہ رہی ہیں کہ آپ بھی آجائیں۔"

آدھ گھنٹہ ابا جی سے بات کر کے اٹھا تو طبیعت کچھ اور تازہ دم ہو چکی تھی۔ ابا نہ صرف اس کی نوکری مل جانے سے بے انتہا خوش تھے۔ بلکہ زرین جو پچھلے ایک ہفتے سے بخار میں پڑی تھی۔ بھلی چنگی ہو چکی تھی۔

گوکہ گھر پر کھانے کا انتظام تھا۔ مگر اسے خالی ہاتھ جانا مناسب نہیں لگا۔

"اصل میں تو میری خوشی کی وجہ زرین کی صحت یابی ہی ہے۔"

گرما گرم مچھلی فرائی' کولڈ ڈرنک اور نان خریدتے ہوئے اس نے ایمانداری سے اپنا تجزیہ کیا اور لبوں کے ساتھ ساتھ دل کو بھی مسکراتے ہوئے محسوس کیا۔ بھاری شاپر زاٹھا کر اس نے جب گھر میں قدم رکھا تو برآمدے میں کھلے دروازے سے چاچا جی ہی سب سے پہلے دکھائی دیے۔ جو اسے دیکھ کر کم اور اس کے لدے پھندے ہاتھ دیکھ کر زیادہ لپکے تھے۔

"یہ میرا بھتیجا ہے۔ سولہ جماعتیں پاس ہے۔ ابھی کچھ دن پہلے ہی نوکری کے لیے کراچی آیا ہے۔ وہاں گاؤں' تار بھیج کر کمپنی والوں نے اسے بلوایا ہے شہر۔"

اسے چاچا کی محبت پر شک نہیں تھا۔ اس وقت بھی شرمندہ ہو گیا تھا۔

راجی منہ پھلائے مہمان خواتین کے بھاری جثوں کے بیچ پھنسی ہوئی تھی۔ وہ اس کی حالت سے محظوظ ہوتا رہا۔

☼ ☼ ☼

کچن سے کھٹر پٹر کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ کل کے آفس کے کپڑے پریس کر کے نکلا تو دیکھا راجی سستی سے بریانی کی پتیلی مانجھ رہی تھی۔

اس نے غور سے اس کا چہرہ غور سے کھوجا۔ عام دنوں کے برعکس آج چونکا۔ اس کے سوھروں نے رونق لگا رکھی تھی تو اس رونق کا عکس اس کے چہرے پر جھلملانا چاہیے تھا۔ مگر وہاں تو جیسے لوڈشیڈنگ چھائی ہوئی تھی۔

وہ صبح والی عزت افزائی کو اس کیفیت کا شاخسانہ سمجھتا رہا۔ مگر حقیقت چند دن بعد واضح ہوئی۔ مغرب کے بعد کا وقت تھا' جب وہ ٹھنڈی ہوا کھانے کی غرض سے چھت پر آیا تھا۔ مگر اندھیرے میں سرسراتی راجی کی آواز نے اسے وہیں تھام لیا۔

"میں تو نادر کے علاوہ اور کسی کا سوچ بھی نہیں سکتی۔"

"اوہ!" وہ لمحے میں بات کی تہہ تک پہنچا تھا۔ اسے یاد آیا' جس دن سے اس کے سسرال والے ہوکے گئے تھے۔ راجی کا موڈ بہت ہی خراب تھا۔

"اور تجھے یقین ہے' نادر بھی تیرے بارے میں ایسا ہی سوچتا ہے؟" دوسری طنزیہ آواز اس کے پڑوس میں رہنے والی سعدیہ کی تھی۔

"ہاں! مجھے اس پر بہت یقین ہے۔"

"ہونہہ! مجھے تو لگتا ہے' نادر تیرے علاوہ ہر کڑی کے بارے میں سوچتا ہے۔"

"سعدی! تو میرا دل جلانے کے لیے آئی ہے؟"

راجی تپ گئی۔

"نہیں! تجھے آخری بار آئینہ دکھانے۔" ٹھنڈی ہوا کا جھونکا اسے چھوتا ہوا گزرا اور پیپل سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگا۔ پیپل کی کھلکھلاہٹ میں سعدیہ کی آواز دب گئی۔

"خالہ بہت مارے گی تجھے۔ ابھی تو یہ بات میرے تک ہے۔ بعد میں پورے محلے میں پھیلتے دیر نہیں لگے گی۔"

"تو تیری اماں بی بی سی ہے کیا؟ جتنا کہا ہے' اتنا کرے۔ میرا کام کرے گی یا نہیں' اتنا بتا۔"

"تو اتنا بڑا قدم اٹھانے سے پہلے نادر سے بات تو کرلے۔"

سعدیہ کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ "بڑا قدم؟ یہ کون سے بڑے قدم کی بات ہو رہی ہے؟" مگر اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ سنتا۔ گیٹ کھلنے کی آواز آئی۔

"شاید ابا جی آگئے ہیں۔ میں جا رہی ہوں۔"

اس نے راجی کو کہتے سنا تو بجائے واپس جانے کے دو سیڑھی پھلانگ کر اوپر آگیا۔ اسے غیر متوقع طور پر سامنے دیکھ کر راجی کا رنگ فق ہو گیا۔

"میں کہنے آیا تھا' چاچی نے بلایا ہے۔"

اس نے سرسری لہجے میں بول کر یہ تاثر دیا کہ اس نے راجی کی کوئی بات نہیں سنی۔ راجی کے منہ کے زاویے بگڑ گئے۔

"یاد آگیا ہوگا پھر کوئی کام۔ رضوانہ بتول! تو صرف شکل کی رانی ہے بس۔ قسمت سے تو کرانی ہے پوری۔"

وہ جلے دل سے بڑبڑاتی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔ اس نے حیرت سے راجی کی خوش فہم لن ترانیوں کو سنا۔ پھر بے اختیار ہنس دیا۔

☼ ☼ ☼

گاؤں میں سب خیریت تھی۔ وہ پہلی بار ویک اینڈ پر گاؤں جانے کا ارادہ کر رہا تھا۔ خالی ہاتھ جانا مناسب نہ لگا تو ابا جی اور زرین کے لیے سوٹ بھی لے لیا۔ پھر کچھ خیال آیا تو چاچا اور چاچی کے لیے چھوٹی موٹی چیزیں اور راجی کے لیے اس کے پسندیدہ شوخ کلر کی میک اپ کٹ خرید ڈالی۔

چشم تصور سے وہ چاچا' چاچی اور راجی کو خوش ہوتے دیکھ رہا تھا۔ مگر جب گھر میں قدم رکھا تو منظر ہی اور تھا۔ بڑے کمرے سے چاچی کی چیخ وپکار کی آوازیں باہر تک آرہی تھیں۔

ساتھ میں راجی کے رونے اور زور زور سے بولنے کی آواز بھی۔

وہ سامان رکھ کر تیزی سے اندر داخل ہوا۔ راجی مسہری پر بیٹھی رو رہی تھی۔ چاچی اور چاچا اس کے سر پر کھڑے تھے۔ اسے دیکھ کر اس قدر پرشور منظر پر ایک لمحے کے لیے سکوت سا طاری ہو گیا۔

"چاچا! کیا ہوا؟ سب خیر تو ہے؟"

سامنے کا منظر اسے سیاق وسباق کی کچھ آگہی دے تو رہا تھا۔ لیکن اس نے خود سے قیاس کرنے سے بہتر سمجھا کہ وہ جو کہانی سنائیں گے وہ اس پر یقین کر کے انہیں یہ اطمینان دلا دے گا کہ اسے حقیقت کا کچھ علم نہیں۔

"خیر نہیں ہے۔" کمرے میں چھانے والے لمحے بھر کے سکوت کو راجی کی آواز نے توڑا۔

"تو خود ہی بتا بھا مدثر! پسند کی شادی کرنا کوئی جرم ہے؟" اس نے خود ہی گھر کے سب سے پوشیدہ اور نازک معاملے کو اس کے سامنے بے پردہ کر دیا۔ اس نے ایک لمحے میں چاچا پر گھڑوں پانی پڑتا محسوس کیا۔

"دے گھنیئی! بے غیرتاں۔"

چاچی البتہ اس کی بات پر لگنے والے جھٹکے سے باہر آکر چپل سمیت اس پر پل پڑیں۔ اس نے آگے بڑھ کر انہیں روکنا چاہا۔

"ہٹ جا۔ آج میں اس کے ٹکڑے کردوں گی۔"

راجی بے بس سی دو چار چپلیں کھا کر اونچی آواز میں رونے لگی۔ چاچا بھی دبی آواز میں کچھ کہہ رہے تھے۔

"چاچی! خدا کے لیے بس کریں۔"

اس نے زبردستی انہیں پیچھے گھسیٹا۔ وہ رک کر بری طرح ہانپنے لگیں۔

"ہوش کی دوا کریں چاچی! مسئلہ جو بھی ہو۔ بیٹھ کر بات کرنے، سلجھانے سے حل ہوتا ہے۔ یوں شور مچا کر تو آپ آس پڑوس میں بھی سب کو خبر کردیں گی۔"

وہ ان کو سمجھانے چلا تھا۔ وہ اور بھڑک اٹھیں۔

"اس مردوئی نے کون سا گھر چھوڑا ہے۔ جہاں اپنے یارانے کی کہانیاں نہیں سنائیں۔۔۔ الو کی پٹھی۔"

چاچی دوبارہ چیل کی طرح جھپٹیں۔ مگر اس بار وہ بیچ میں آکر راجی کی ڈھال بن گیا۔ راجی اچھا خاصا پٹ چکی تھی۔ چاچی کے بڑھنے پر اس کی چیخ نکل گئی۔ وہ تیزی سے کونے میں سمٹ گئی۔ مگر اس کے انداز میں عجلت تھی۔ خوف نہیں۔

"میرے کمرے میں چلیں چاچی! آپ آئیں تو سہی۔"

چاچا جی کو پانی لانے کا اشارہ کر کے وہ انہیں سہارا دیتا ہوا اپنے کمرے میں لے آیا۔

"کی دساں میں تینوں پتر!" ان سے بات مکمل نہیں کی گئی۔ وہ منہ پر دوپٹا ڈال کر رونے لگیں۔ اس نے تاسف سے انہیں، پھر چاچا جی کے جھکے کندھوں کو دیکھا۔ گھر آتے وقت اس کا موڈ جتنا اچھا تھا، اب اسی قدر پژمردہ ہو گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ راجی اتنا بے وقوفانہ قدم بھی اٹھا سکتی ہے۔ منگنی اس کی مرضی کے بغیر ہوئی تھی اور وہ نادر سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ یہ بات اپنی ماں تک پہنچانے کے لیے اس نے سعدیہ کی امی کو گھر بلا بھیجا۔

چاچا اور چاچی کے بھڑکنے کی اصل وجہ یہی تھی کہ بات اب گھر سے نکل کر پورے محلے میں پھیل گئی تھی۔

"اس عمر میں میرے سفید چونڈے تے کھے ڈلوادی جنموں جلی نے۔۔۔ ہائے او ربا۔" چاچی کا دکھ حد سے سوا تھا۔۔۔ اور ایسا غلط بھی نہ تھا۔

☼ ☼ ☼

دو چار دن میں سب کے بوتھے اپنی جگہ پر آگئے۔ بات تو بری تھی۔ مگر کب تک یاد کی جاتی۔ معمول واپس پلٹنے میں زیادہ دن نہیں لگے۔

چاچی چند گھنٹے منہ سر لپیٹ کر پڑی رہیں۔ راجی بھی منہ سوجا کر یہاں وہاں پھرتی رہی۔ پھر دھیرے دھیرے سب معمول پر آگیا۔ گو کہ ماحول کا کھنچاؤ مکمل ختم نہیں ہوا تھا۔ مگر پھر بھی بہتر تھا۔ چاچا نے عقلمندی کا ثبوت دیتے ہوئے شانی سے بات چھپالی تھی۔ ورنہ راجی کی اصل شامت تو تب آتی، جب وہ اس کی خبر لیتا۔

عمر میں راجی سے سال بھر چھوٹا ہونے کے باوجود وہ اس پر بڑے بھائیوں والا رعب جماتا تھا اور سچ یہ تھا کہ راجی اس سے ڈرتی بھی تھی۔

صبح اسے گاؤں کے لیے روانہ ہونا تھا۔ اس لیے رات کے کھانے کے بعد وہ گھر والوں کے لیے خریدے گئے تحفے لے کر چاچا کے کمرے میں چلا آیا۔ راجی کے لیے لی گئی میک اپ کٹ گو کہ اس بات کے بعد جی تو نہیں چاہتا تھا، مگر شانی کے ہاتھوں اس کے کمرے میں بھجوادی۔

چاچا اور چاچی تو نہال ہی ہو گئے۔ مگر دعائیں ابھی ان کے لبوں میں ہی تھیں کہ راجی تن فن کرتی آئی اور میک اپ کٹ اٹھا کر اس کے سامنے پھینک دی۔

وہ اس درجہ بدتمیزی پر گنگ رہ گیا۔

"یہ کیا حرکت کی تو نے راجی! پروہنے سے بات کرنے کی تمیز ہے کہ نہیں؟" چاچا نے غصے سے اسے گھورا۔

"پروہنا ہوتا ہے دو دن کا۔۔۔ جو مہینے بھر پڑا رہے، وہ کاہے کا پروہنا۔" اس کے لہجے میں کاٹ تھی۔

"او وڈا بھاہے تیرا۔ کچھ تو خیال کر۔"

"میرا صرف ایک بھائی ہے، وہ بھی چھوٹا۔ باقی مجھ سے کوئی زبردستی کی رشتے داری نہ گانٹھے۔" وہ حیران سا اسے تک رہا تھا۔ اس نے کتنی تذلیل کی بات کی تھی۔ مگر اسے غصے کے بجائے حیرت ہی تھی۔

بھلا راجی اس سے کس بات کی جلن نکال رہی تھی۔

"بہت زبان چل رہی ہے تیری۔ تیرا علاج تو صرف میرے پاس ہے۔" چاچی نے تیزی سے پلنگ سے زمین پر پیر رکھا۔

"ہاں! چل رہی ہے زبان۔ تو کیا کرو گی؟ کاٹ دو گی، اس پرائی اولاد کے لیے؟ تو کاٹ دو زبان میری۔ اس سے بھی چین نہ ملے تو آگ لگا دو مجھے۔۔۔"

"راجی! آگے ایک لفظ نہیں۔۔۔" وہ بے اختیار کھڑا ہو گیا۔

"تاں! تو کون ہوتا ہے میرے پھڈے میں ٹانگ اڑانے والا؟ تیرے اگلے پچھلوں کو کس بات کی تکلیف ہے جو بار بار۔۔۔"

غصے میں وہ ادب و لحاظ، تمیز سب حدود پھلانگ گئی۔ اس کے اندر اشتعال کی تیز لہر اٹھی۔ جسے اس نے بمشکل قابو کیا۔ مگر راجی اس کا جواب سننے کے لیے رکی نہیں تھی۔ وہ بکواس کر کے واپس پلٹ گئی تھی۔

"کل ہی اس کے سوہروں کو بلا کر تاریخ دیں ویاہ کی۔"

چاچی بلبلا کر اب چاچا سے کہہ رہی تھیں۔ اس نے وہاں اپنی موجودگی کو فضول خیال کیا اور بوجھل پیر گھسیٹتا کمرے سے نکلا تو برآمدے میں راجی اپنے دروازے پر کھڑی تھی۔

"پڑ گئی تیرے کلیجے وچ ٹھنڈ؟"

اسے دیکھ کر اس نے چبا چبا کر کہا اور اندر گھس کر کنڈی چڑھالی۔

چند ثانیے میں راجی کی ناراضی کی وجہ سمجھ میں آچکی تھی۔ چاچی کو اس کی جلد از جلد شادی کا مشورہ دینے والا وہ خود ہی تھا اور یقیناً یہ بات اسے پتا چل چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

اونچے نیچے کچے راستے اس کی مٹی سے اٹے جوتوں کے نیچے سے سرکتے رہے اور بالآخر اس نے دروازے کے سامنے پہنچ کر گہری سانس لی۔

قریبی مسجد میں جماعت ہو رہی تھی۔ دروازوں پر لگے کہیں سانٹھ تو کہیں سو واٹ کے بلب جل اٹھے تھے اور شام کی مخصوص رونق ماند پڑ چکی تھی۔

دروازہ بند نہیں تھا۔ بس یونہی بھیڑ دیا گیا تھا۔ وہ جانتا تھا، ابا کی واپسی کے لیے دروازہ کھلا چھوڑا گیا ہے۔ زرین اس وقت گھر میں اکیلی ہوتی تھی۔ سوچ کر اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔

اس نے دبے پاؤں صحن کے وسط میں پہنچ کر اندازہ لگایا۔ باورچی خانے سے کھٹ پٹ کی آواز آ رہی تھی۔ یقیناً زرین وہیں تھی۔

کندھے پر لدا بیگ اتار کر قدموں کے پاس رکھتے ہوئے وہ خاموشی سے باورچی خانے کے دروازے تک آیا اور دل کی دنیا میں چراغ جل اٹھے۔

وہ دروازے کی سمت پشت کیے کچھ کام کر رہی تھی۔ ناگن جیسی بل کھاتی چوٹی کمر پر جھول رہی تھی۔ آدھی آستینوں میں سڈول سفید بازو اور پسینے میں بھیگی گردن سے لپٹی کالی گھنگھور لٹیں، مکھن جیسی کان کی لو میں سنہری بالی تیر رہی تھی۔

دل میں ایک دم ہی کتنی خواہشوں نے سر اٹھایا۔ انہیں دباتے دباتے وہ بے اختیار سا ہو کر ایک قدم آگے بڑھا اور عین کان کے قریب سرگوشی کی۔

"زرین!"

وہ اپنے دھیان میں دال کو بگھار رہی تھی۔ گرم گرم

تھی ہاتھ کانپنے سے کلائی پر چھلک گیا۔
"سی۔۔۔ ی۔۔۔ ی۔" کی آواز کے ساتھ فرائی پین چھوڑ کر اس نے کلائی پکڑلی۔ چشم زدن کی بات تھی۔ اگلے ہی لمحے وہ کلائی پکڑے اس کی خفا خفا شکل دیکھتے ہوئے معذرت کر رہا تھا۔
"کمال کرتے ہیں آپ بھی۔۔۔ یہ کوئی طریقہ ہے۔" گوری کلائی پر سرخ نشان پڑ گیا تھا۔
وہ چند لمحے اس کا ضبط سے گلابی پڑتا چہرہ دیکھے گیا۔ یہاں تک کہ تکلیف میں بھی اس کے لبوں پر کنول کھلنے لگے۔
"اب ہٹ بھی جائیں یا یہیں کھڑے رہیں گے؟"
وہ گہری نظروں سے اسے دیکھتا ہوا باہر نکلا۔ تب اسے احساس ہوا۔ اس نے بڑی تیزی سے دروازے پر لٹکا دوپٹا کھول کر اوڑھ لیا۔
مدثر کے لبوں پر جاندار مسکراہٹ کھلنے لگی۔ ابا نماز پڑھ کر لوٹے تو دیر تک چھاتی سے لپٹائے کھڑے رہے۔
رات کے کھانے کا وقت ہو چکا تھا۔ دیسی گھی کے بگھار والی ماش کی دال اور تازہ پھلکوں نے لطف دوبالا کر دیا۔
کھانے کے بعد اس نے فرمائش کر کے دودھ پتی بنوائی۔ الائچی اور گاڑھے دودھ کی سوندھی سوندھی خوشبودار بھاپ کے اس پار زرین معصوم جھینپا جھینپا روپ لیے بیٹھی تھی۔ اباجی سے دیر تک باتیں کرتے وہ اس کا ان چھوا وجود نگاہوں سے دل میں اتار تا رہا۔ پھر اباجی نے ہی اسے یاد دلایا کہ چونکہ فجر کے وقت اٹھنا ہے۔ اس لیے اب سو جانا چاہیے۔ وہ یوں ہی سر ہلاتی شرماتی اٹھ گئی۔ گاؤں کی یہی سادہ زندگی' یہاں کا اصل حسن تھی۔ فجر کے وقت اٹھنا اور عشاء کے بعد سو جانا۔
سیدھی سادی زندگی بھولے بھالے لوگ۔

☼ ☼ ☼
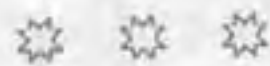
فجر کی اذانوں سے اس کی آنکھ کھلی تھی۔ ابا غسل خانے سے نکل رہے تھے۔ اس نے اٹھ کر وضو کیا اور نماز کے لیے مسجد کی طرف چل دیا۔
صبح صبح گھر میں زرین کی غیر موجودگی کو اس نے نیند سے تعبیر کیا۔ "سو رہی ہوگی۔" فجر کی نماز کے بعد صبح کی سیر کے ارادے سے گاؤں سے ذرا باہر کی طرف بہنے والی ندی کی طرف آگیا۔
یہ کچے پکے راستے' پگڈنڈی' ہرے بھرے کھیت' طلوع آفتاب کا وقت اور ٹھنڈی' پرکیف ہوا۔ اس نے ندی کنارے اگی جھاڑیوں اور جنگلی پودوں کے جھنڈ کے قریب رک کر گہری سانس لی۔ اسے اس جگہ سے' اپنی مٹی سے عشق تھا۔ یہی وجہ تھی کہ شہر میں پڑھنے اور ملازمت کرنے کے باوجود کبھی وہاں جا کر بسنے کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔
رات میں بھی ابا اس سے شادی کی بات کر رہے تھے تو اس نے یہی جواب دیا۔
"میں پہلے اس گھر کو بڑا اور پکا کرواؤں گا ابا! نوکری بھلے شہر کی ہو۔ مگر ٹھکانہ تو میرا ادھر ہی رہے گا ہمیشہ۔"
اسے یقین تھا' زرین بھی اس کے فیصلے کو سراہے گی۔
سوچوں کے بنتے بگڑتے دائروں میں کسی کے گلابی آنچل کا پتھر آن لگا۔
اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ ندی کے کنارے گھاس والی پکی زمین پر زرین یقیناً" ندی کے پانی میں پیر ڈالے بیٹھی تھی۔
اسے اپنی کل والی حرکت یاد آئی تو قدموں سے دانستہ آواز پیدا کرتا ہوا قریب گیا۔ زریں نے آہٹ پر مڑ کر دیکھا تو ہونق سی ہو گئی۔
"آپ یہاں؟" اس نے آنچل جلدی سے سر پر ڈالا۔

وہ گہری نگاہوں سے اس کی گھبراہٹ کا جائزہ لینے لگا۔ اتنی سویرے اس کی یہاں موجودگی اور پھر اس کی اڑی اڑی رنگت۔
"کیوں' کسی اور کو آنا تھا کیا؟"
راجی والے واقعے کا اثر کہیں لاشعور سے نکل کر اس کی زبان تک آگیا۔
"جی۔۔۔ وہ حیرت سے اس کا منہ تکنے لگی۔ "میں تو۔۔۔ میں تو۔" اس سے کوئی جواب نہیں بن پڑا۔ یوں

سر جھکا کر ہتھیلیاں مسلتی وہ اس کے شک کو تقویت دے رہی تھی۔
"کیا میں تو......" اس کے چہرے کی شگفتگی، سنجیدگی میں بدل گئی۔
زرین سے کوئی جواب نہیں دیا گیا اور وہ بالکل مقابل آ گیا۔ مگر اس کے کچھ کہنے سے پہلے وہ گھبرا کر ایک قدم پیچھے ہٹی اور اس کا پیر پھسل گیا۔ چکنی مٹی اسے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر ندی میں گھسیٹ چکی تھی۔ اس کے حلق سے زوردار چیخ نکلی۔
اگر مدثر بروقت ہاتھ نہ پکڑتا تو وہ یقیناً "آگے نکل جاتی۔ ندی کا بہاؤ کافی تیز تھا۔ پچھلے دنوں بارشوں کی وجہ سے کنارا گہرا ہو چکا تھا۔ کٹاؤ بھی بڑھ گیا تھا۔
بمشکل تمام اسے کھینچا تو دونوں ہی بری طرح ہانپ گئے تھے۔ تھوڑی دیر وہ سر جھکائے گہرے سانس لیتا رہا۔ پھر کچھ دیر پہلے والے شک پر غصہ اور فطری محبت غالب آ گئی۔
"پاگل ہوئی ہو تم۔ کس نے کہا تھا اتنی سویرے چڑھی ہوئی ندی پر آنے کو؟" وہ دبی آواز میں برس ہی پڑا۔
وہ اپنے آنسو ضبط کرتی ہوئی پیر پکڑے بیٹھی تھی۔ جس میں آدھ انچ کا کانٹا کھبا ہوا تھا۔ جواب نہ ملنے پر اس نے آگے ہو کر بے دردی سے کانٹے کو کھینچ لیا۔ اس نے درد کے مارے اپنے لب دانتوں میں دبا لیے۔
"بولو۔" وہ اپنا سوال بھولا نہیں تھا۔ جنگلی پودوں کے زہر سے بچنے کے لیے زخمی جگہ کو دو اطراف سے پکڑ کر دبایا۔ اس کی گلابی ایڑی گاڑھے سرخ خون کی لکیر سے سج گئی۔
"اف میرے اللہ! میں روز آتی ہوں یہاں۔" اس سے تکلیف برداشت نہیں ہوئی۔
"کیوں؟" اس نے حیرت سے سر اٹھایا۔
"کیونکہ آپ یہاں آتے تھے۔ آپ کو یہ جگہ اچھی لگتی تھی۔ اس لیے۔" ناراضی میں اس نے لٹھ ماری تھی۔ مگر پھول کی چھڑی جیسی۔ وہ اس کا چہرہ تکنے لگا۔ جو اپنی بات کی خوب صورتی سے بے نیاز اٹھ کر چپل پیروں میں ڈال رہی تھی۔ معاً اس نے بڑھ کر کلائی تھام لی۔
"میں نہ ہوتا تو کیا ہوتا آج۔" وہ نیچے بیٹھا اس کا چہرہ پڑھ رہا تھا۔ وہ کلائی تھامنے پر خود بھی تھم سی گئی تھی۔ پھر اس کی لو دیتی نگاہوں سے نظریں چرائیں۔
"آپ نہ آتے تو میں گرتی ہی نہیں۔"
"اگر میں آنے سے منع کر دوں تو......"
"تو میں نہیں آؤں گی۔" اس کی آواز دھیمی ہو گئی۔

مدثر کے دل پر گیلی گیلی پھوار پڑنے لگی۔ اس نے مسکرا کر ہاتھ چھوڑ دیا۔ وہ ڈگمگاتی ہوئی واپس مڑ گئی۔ اس کے بازو کیچڑ کے دھبوں سے بھر کے بھی برے نہیں لگ رہے تھے۔
وہ مڑا۔ ندی کے شفاف پانی کو دیکھا۔ کچھ دیر پہلے کا منظر یاد کر کے دل میں گدگدی سی دوڑ گئی۔ جب وہ اتنی قریب تھی۔ اس کی باہوں میں۔
اس نے ایک پتھر اٹھا کر ندی کے پانی میں اچھالا اور گنگنانے لگا۔
"گوری پنگھٹ پہ ٹھہرو گھر نہیں جاؤ۔"

☆ ☆ ☆

چاچی کا گھر ویسا ہی تھا۔
چوبیس گھنٹے میں بھلا بدل بھی کیا سکتا تھا۔ برآمدے میں چائے کے کپ اور پکوڑوں کی رکابی رکھی تھی۔ اسے آتا دیکھ کر چاچی نے راجی کو گرم پکوڑوں کی آواز لگائی۔ مگر وہ منع کرتا ہوا وہیں بیٹھ گیا۔
دوپہر میں زرین نے ٹھیک ٹھاک دعوت کی تھی۔ بھنا مرغ، فیرنی اور ٹھنڈی لسی۔ اس وقت کچھ کھانے کی گنجائش نہیں تھی۔ راجی چائے لے کے آئی تو منہ سوجا ہوا تھا۔
"شاید ہی اس لڑکی کو کبھی ہنستے بولتے دیکھا ہو۔" اس نے کن انکھیوں سے دیکھ کر دل میں سوچا۔

ابا آج کل اس پر شادی کے لیے بہت زور دینے لگے تھے۔ کیونکہ ان کا بی پی بہت بڑھ جاتا تھا۔
اور چاچا چاچی کو اس کی موجودگی تقویت دیتی تھی۔ شانی ابھی چھوٹا بھی تھا اور جذباتی بھی۔ اس کے برعکس وہ کئی بار معاملہ فہمی کا ثبوت دے چکا تھا۔
راجی کے وہی معمولات تھے۔ چوری چھپے چھت پر جانا، کبھی شام تو کبھی رات کے وقت تانکا جھانکی، اپنی سہیلی سعدیہ کے ساتھ میٹنگ اور اس کے ساتھ بدزبانی۔ مدثر نے اسے مخاطب کرنا چھوڑ دیا تھا۔
وہ درمیان میں ایک دن چند گھنٹوں کے لیے گاؤں گیا تو ابا کو نکاح کا عندیہ دے آیا۔ پندرہ دن بعد اسے چاچے اور چاچی کو ساتھ لے کر گاؤں جانا تھا۔
"اگلے ہفتے آنے کا کہہ رہے ہیں وہ لوگ۔" چاچی کے پاس بھی خوشخبری تھی۔ اس نے سن کر چاچی کا چمکتا چہرہ دیکھا تو سکون کا سانس لیا۔
راجی کا سکون البتہ غارت ہو چکا تھا۔

☆ ☆ ☆

نہ نہ کرتے بھی اس نے کافی اہتمام کر ڈالا۔
راجی کے سسرال والوں نے کھانے کا تکلف کرنے سے منع کر دیا تھا۔ وہ ریفریشمنٹ کی ہی متعدد چیزیں لے آیا۔ چاچا چاچی اس کے مشکور ہو گئے۔ وہ دعائیں دیتے رہے اور یہ دل ہی دل میں شرمندہ ہو کر حساب لگاتا رہا کہ کسی چیز کی کمی تو نہیں۔ رول، سموسے، مٹھائی بسکٹ، نمکو اور بازار کے بنے فروزن کباب۔
چاچی کو چولہے کے آگے کھڑے ہونے کی ضرورت ہی نہ پڑی اور رہی راجی تو وہ سارا دن کمرے میں پڑی رہی۔ نہ اس نے گھر کی صفائی ستھرائی کو ہاتھ لگایا، نہ اپنی۔
مدثر تو یوں بھی اس سے بات کرنے کے موڈ میں نہ تھا۔ ہاں! البتہ شانی خوب اس کے ساتھ جوش و خروش سے اندر باہر دوڑ لگاتا رہا۔

جس کمرے میں مہمانوں کو بٹھانا تھا۔ اس کا مختصر سامان باہر نکال کر صحن میں قرینے سے مردوں کے بیٹھنے کے لیے سیٹ کیا گیا اور کمرے میں فرشی نشست کے لیے چاندنیاں اور مدثر ہی کے لائے گئے فلور کشنز ڈال دیے گئے۔
"ماں صدقے! جیویں رہ میرا پتر۔" چاچی نم آنکھوں سے اس کی بلائیں لیتی رہیں۔ کمرے کی الگ ہی شکل نکل آئی تھی۔ سفید چاندنیوں پر رکھے میرون مخملیں کشن نگاہوں میں بہت جچ رہے تھے۔
شانی اور چاچا کی بھی خوشی دیدنی تھی۔ انہوں نے کب اتنا اہتمام کیا تھا۔ بیٹی کے سوہروں پر جو رعب پڑنا تھا، وہ الگ۔
خاص الخاص مہمانوں کی آمد پر بھی ان کی جیب چپس اور بسکٹ سے زیادہ کی اجازت نہ دیتی تھی۔
"پر ایک بات مجھے بڑی چبھ رہی ہے۔"
کوئی کام کرتے کرتے چاچی ایک دم اس کا ہاتھ تھام کر کونے میں لے گئیں۔ شانی بھی ساتھ ہی تھا۔
"راجی بڑی گپ چپ تیاری کندی پئی اے۔ بنٹر عین ویلے کوئی سیاپا نہ ڈال دے۔" شانی نے پہلے نا سمجھی سے انہیں، پھر اسے دیکھا۔
"کچھ نہیں ہو گا چاچی! میں ہوں ناں۔"
اس نے چاچی کو اطمینان دلاتے ہوئے دل میں بے پناہ فخر محسوس کیا۔
مہمانوں کے استقبال اور تواضع کا مرحلہ بخیر و خوبی نمٹ گیا۔ اسے کل شام تک گاؤں کے لیے نکلنا تھا۔ گھر میں وہ سب کو ابا کے ارادے سے باخبر کرنا چاہتا تھا۔ مگر اچانک خوشخبری دینے کے خیال سے رہ گیا۔ شاید یہی اس کی سب سے بڑی غلطی تھی۔

☆ ☆ ☆

رات کا جانے کون سا پہر تھا، جب مچھروں کی یلغار اور شدید حبس سے نیند ٹوٹی۔ شاید لائٹ چلی گئی تھی۔ اس نے پسینے سے بھیگی قمیص اتار کر پلنگ پر پھینکی پھر ہاتھ والا پنکھا جھلاتا باہر نکلا۔ باہر حبس کا وہی عالم

تھا، مگر فضا میں معمولی سی خنکی تھی۔ اس نے بے زاری سے صحن پر نگاہ دوڑائی۔

بڑے کمرے کے فرنیچر میں سے پلنگ شانی نے ضرورت پڑنے پر کمرے میں رکھ دیا تھا۔ باقی صوفہ اور بید کی کرسیاں ابھی باہر ہی پڑی تھیں۔ وہ صوفے کو غنیمت جان کر اس پر پڑ گیا۔

ذہن ابھی غنودگی میں نہیں جا پایا تھا، جب اس نے درمیانے کمرے کا دروازہ بے آواز کھلتے دیکھا۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ اتنی گرمی میں بے وقت لائٹ جانے پر گھر کے سب ہی افراد کو ایک کے بعد ایک صحن یا پھر چھت کی طرف سفر کرنا ہی تھا۔

دروازے سے راجی برآمد ہوئی۔ وہ اس چھوٹے کمرے میں اکیلی سوتی تھی۔

مدثر اسے دیکھ کر آنکھیں بند کر لینا چاہتا تھا۔ مگر کر نہ سکا۔

اس کا انداز بہت چوکنا سا تھا۔ وہ چاچا اور شانی کے کمروں کے دروازوں تک گئی۔ چند لمحے وہیں کھڑی رہی۔

ساکت لیٹا اس کی حرکتیں دیکھ رہا تھا۔

دونوں اطراف سے اطمینان کرنے کے بعد اس نے صحن میں قدم رکھا۔ اب کی بار اس کا سراپا کچھ اور واضح ہوا۔ بڑی ساری چادر میں پورا جسم چھپا کر اس نے چہرہ تک ڈھانپا ہوا تھا۔ انداز سے لگتا تھا، بغل میں سامان یا گٹھڑی دبی ہوئی ہے۔

مدثر کے دل پر ایک گھونسا سا لگا۔

"کیا راجی کی ہمت اتنی بڑھ گئی کہ۔۔۔"

حیرت زدہ سا بے حس و حرکت پڑا وہ سوچے چلا گیا۔ یوں لگ رہا تھا کوئی خواب سا چل رہا ہے۔

اماوس کی تاریک رات میں اس کا وجود کسی ہیولے کی مانند لگ رہا تھا۔ وہ بالکل بجلی کی طرح بے آواز، محتاط چال چلتی ہوئی دروازے تک پہنچی تھی۔ پھر اس نے بازو میں دبائی ہوئی پوٹلی زمین پر رکھی۔ چادر کو قدرے سمیٹا اور دونوں ہاتھوں کا زور لگا کر دروازے کی کنڈی کھولنے لگی۔

کنڈی زنگ خوردہ تھی اور صرف رات میں لگائی جاتی تھی۔ اس لیے اسے کھولنے اور بند کرنے میں معمولی سی دقت صرف ہوتی تھی۔

مدثر کے پاس کچھ ہی لمحے تھے۔ اس نے یک لخت فیصلہ کیا اور پھرتی سے چادر پھینک کر اس کے سر پر پہنچ گیا۔

"کہاں جا رہی ہے اس وقت؟"

اس کی آواز سرگوشی سے زیادہ بلند نہ تھی۔ مگر کڑک دار ضرور تھی۔ راجی یوں اچھلی گویا بچھو نے ڈنک مارا ہو۔

اس کے ہاتھ سے کوئی چیز چھوڑ کر زمین پر گرنے کی مدھم آواز آئی۔

"بول! کہاں جا رہی ہے؟" اب کی بار اس نے سختی سے راجی کا بازو دبوچ لیا۔

"وہ۔۔۔ وہ مدثر۔۔۔ میں۔"

راجی کو بھلا کیا معلوم تھا کہ وہ کمرے سے نکل کر درخت کے نیچے اندھیرے میں صوفے پر پڑا ہو گا۔ ورنہ شاید صورت حال مختلف ہوتی۔

"کیا میں۔۔۔ بول۔"

دل تو کر رہا تھا۔ اپنی اکلوتی بیلٹ سے اس کی چمڑی ادھیڑ ڈالے۔

اندھیرے سے مانوس ہو جانے کی وجہ سے اسے راجی کے چہرے پر لکھا خوف کسی قدر نظر آ چکا تھا۔ جب ہی جانے کس مصلحت کے تحت اس کی آواز اب تک نیچی ہی تھی۔ راجی کے ساتھ ساتھ خود اسے بھی اندازہ تھا کہ اگر چاچا یا شانی میں سے کوئی جاگ گیا۔ تو اس حالت میں راجی کو دیکھ کر اس کی موت یقینی ہے۔

جب ہی اندر کمرے میں کھٹکا ہوا۔

وہ بجلی کی سی تیزی سے اسے گھسیٹتا ہوا کمرے میں لے گیا اور سامنے دھکیل دیا۔ وہ پلنگ کے پاس ہی زمین پر گر سی گئی۔

اندھیرے کمرے میں اس کی سسکیاں ابھرنے لگیں۔

گرمی، حبس، اندھیرا اور یہ صورت حال۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس عقل کی کوری کو کیا کہے۔

"تجھے کچھ اندازہ ہے کہ تو اپنے ماں باپ کو بدنامی کے کس غار میں دھکیلنے جا رہی تھی؟" وہ اندازے سے اس کے قریب پنجوں کے بل بیٹھا۔

"کیوں اپنے آپ کو عمر بھر کے لیے دکھوں کے حوالے کر رہی ہے۔ کچھ نہیں ملے گا تجھے۔ کیوں نہیں سمجھتی۔" اس کی آواز قدرے نرم پڑ گئی۔

"اور میں کیا کروں؟"

"کیا کروں؟ سیدھی طرح شادی کرو۔ اور کیا کرنا ہے تو نے؟"

اس نے ایک تھپڑ رکتے رکتے بھی رسید کر ہی دیا۔ اس کا سر پلنگ کی پٹی سے ٹکرایا۔ وہ اندھیرے سے مانوس نگاہوں سے اس کا جھٹکے کھاتا وجود دیکھ رہا تھا۔

"نہیں کرنی مجھے اس منحوس سے شادی۔" وہ سنبھل کر دور ہٹتے ہوئے دبی آواز میں چلائی۔

مدثر کے دماغ میں غصے کی لہر نے پھر سر اٹھایا۔ مگر اس نے ہاتھ چلانے سے گریز کیا۔ پورا جسم پسینے سے تر بتر ہو چکا تھا۔

"ٹھیک ہے! میں ابھی جا کر چاچا کو بتاتا ہوں۔" وہ فیصلہ کن انداز میں اٹھا۔ راجی نے یکدم اٹھ کر اس کے کندھے کو دبوچنا چاہا۔

"نہیں نہیں مدثر۔۔۔ تجھے میری۔۔۔" خوف سے اس کی آواز بلند ہو گئی۔

اسی وقت باہر صحن میں روشنی کا جھماکا ہوا۔ لائٹ آ گئی تھی۔ دونوں نے ٹھٹک کر باہر پھیلتی روشنی کو دیکھا۔

"شانی میرے ٹکڑے کر دے گا۔ تجھے رب دی سوں مدثر! نہ کر۔"

"نہیں! تو نہیں مانے گی۔ تو ماننے والی ہوتی تو۔۔۔"

"مدثر!" جب ہی کمرے میں ایک تیسرے شخص کی آواز گونجی۔ دونوں نفوس اپنی جگہ ساکت ہو گئے۔ دروازے میں چاچی کھڑی تھیں۔ حق دق۔۔۔ ان کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ مدثر نے لمحے بھر میں ان کی سوچ پڑھ لی۔ پھر خود سے چمٹی راجی کو دیکھا۔

"اوئے! چھوڑ مجھے۔ پراں مر۔"

اس نے زور سے راجی کو دھکا دیا اور جلدی سے کھڑے ہو کر اپنی قمیص کی تلاش میں نظریں دوڑائیں۔ مگر راجی۔۔۔

وہ اس کے ذہن سے بہت آگے کی چیز تھی۔ اس کے اندازوں سے بڑھ کر پھرتیلی۔ اس کے خیالات سے کہیں زیادہ چالاک۔ وہ ایک لمحے میں اٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر روتی چاچی کے گلے لگ چکی تھی۔

"اماں۔۔۔ اماں! ہائے اماں! میں تو لٹتے لٹتے بچی آج اماں۔۔۔ دیکھ دیکھ اپنے لاڈلے کے کرتوت۔" اس کی بات نے مدثر کا دماغ بھک سے اڑا دیا۔

شور کی آواز سن کر چاچا اور شانی بھی وہیں دروازے تک آن پہنچے تھے۔ بری طرح روتی ہوئی دوپٹے سے بے نیاز بیٹی، تازہ چوٹ کا نشان، دگرگوں حالت اور مدثر کا پسینے میں بھیگا، قمیص کے بغیر ہانپتا بوکھلاتا وجود۔

"جھوٹ بول رہی ہے چاچا! یہ۔۔۔" اس کے لبوں سے لڑکھڑاتی ہوئی سی آواز نکلی۔

وہ کیا بھلائی کرنے چلا تھا اور حالات و واقعات اسے کیا رنگ دینے جا رہے تھے۔ وہ بری طرح سٹپٹا گیا۔ گو کہ خود کو بے گناہ ثابت کرنا مشکل نہ تھا۔

مگر اپنی حالت اور راجی کے واویلے نے اسے ہڑبڑا کر رکھ دیا۔ اس صورت حال کا اس نے تصور تک نہ کیا تھا۔ اس پر شانی کے بگڑے تیور۔ وہ کمرے کے اندر آ گیا۔

"کیا کیا تو نے میری بہن کے ساتھ؟"

"میں نے کچھ نہیں کیا شانی۔" اس نے کہنے کی کوشش کی۔ مگر راجی درمیان میں چلا اٹھی۔

"تجھے نظر نہیں آتا جو اس سے پوچھ رہا ہے؟ اماں۔۔۔ اماں۔" وہ اب چاچی کی طرف مڑی تھی۔

"میں تو صحن میں لیٹنے کے لیے نکلی تھی۔ اس نے اندھیرے میں بہانے سے بلایا تھا مجھے کمرے میں۔ پھر اکیلے دیکھ کر۔۔۔" آگے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

"شانی! جھوٹ بول رہی ہے یہ۔۔۔ بات سن میری۔"

"کیابات سنیں تیری بے غیرتا۔ اپنی بدنیتی دکھانے کو تجھے میرا ہی گھر ملا تھا؟" چاچی کی دھاڑتی آواز نے اس کے اوسان خطا کردیے۔

شانی غصے میں بھوکے شیر کی طرح اس پر جھپٹا۔ مگر اس کے دل میں کوئی چور نہ تھا۔ دونوں پل میں گتھم گتھا ہوچکے تھے۔

چاچا جی بچاؤ کروانے کے لیے کمزور تھے۔ جبکہ راجی اور چاچی کا شور شرابے سے گھر تو کیا پورا محلہ گونج اٹھا تھا۔

☼ ☼ ☼

کچھ رشتے کتنے انوکھے ہوتے ہیں۔

اس نے سوچتے ہوئے سر اٹھایا اور تاحد نظر نارنجی شام میں گھلتے بنفشی رنگوں کو دیکھا۔

بالکل ان شاموں کی طرح جو ہر موسم میں جدا رنگ لے کر آتی ہیں اور محسوس کرنے والے کے وجود پر سایہ فگن ہوجاتی ہیں۔

پت جھڑ کا دکھ اوڑھے زرد شام۔

جاڑے کی اداسی میں ڈوبی سرمئی۔

گرما کی سبک ہوا سمیٹے نارنجی۔

اور گلابی ...... گلابی شاموں میں سرخوشی کی عجیب سی لہر ہوتی ہے۔ بالکل ایسے ہی ہوتے ہیں کچھ رشتے۔ معصوم، نرم، نازک، پل میں کیا ہوجائیں خبر نہیں

جیسے شانی، جو اس رات سے پہلے اسے "بھائی بھائی" کہتا اس کا دم بھرتا تھا۔ جب خود بھائی بننے کا وقت آیا تو بہن کا بن بیٹھا۔

اس کی نظریں بدل گئیں۔ لہجہ بدل گیا۔ انداز بدل گیا۔ تو کیا رشتہ بھی......

چاچا، چاچی اس کے اپنے ہیں۔ وہ بھی شاید اس وقت صرف اپنی بچی کے ماں باپ تھے۔ کمرے میں زرین کے آنچل کی آسمانی جھلک دکھائی دی تو وہ اٹھ کر اندر آگیا۔

زرین اپنے لانبے بالوں میں کنگھا پھیر رہی تھی۔ سیدھے، ریشمی، کمر تک آتے سیاہ بال۔ کبھی کبھی اسے لگتا ان بالوں میں پیچ و خم نہیں تھے۔ مگر پھر بھی اس کی ساری حیاتی جکڑی ہوئی تھی۔

"تجھ کو معلوم نہیں، تجھ کو بھلا کیا معلوم
تیرے چہرے کے یہ سادہ سے اچھوتے سے نقوش
میرے تخیل کو کیا رنگ عطا کرتے ہیں
تیری زلفیں، تیری آنکھیں، تیرے عارض تیرے ہونٹ
کیسی انجانی سی معصوم خطا کرتے ہیں"

زرین نے اسے دیکھ کر میز پر پڑا ہوا لفافہ اٹھا کر اس کی طرف بڑھادیا۔

"رپورٹس آگئی ہیں۔ کوئی مسئلہ نہیں سب نارمل ہے۔" اس کا لہجہ بجھا بجھا سا تھا۔

کیوں؟ وہ جانتا تھا۔ اس لیے بستر پر سوتے ہوئے ننھے معصوم وجود کو تکنے لگا۔

☼ ☼ ☼

وہی کمرا تھا۔ وہی چاندنیاں۔ وہی نئے نکور فلور کشن۔ مگر آج ماضی کی طرح خوش خیال منظر نہیں تھا۔ دائیں طرف سے شانی اور بائیں طرف چاچے کے رشتے کے سالے نے اسے یوں دبوچا ہوا تھا۔ گویا وہ موقع ملتے ہی اٹھ کر بھاگ کھڑا ہوگا۔

کمرا اسی قسم کے چاچا کے سسرالی، دور و نزدیکی رشتے داروں سے بھرا تھا یا پھر محلے والوں سے چاچی اور راجی نے چیخ و پکار کرکے جس طرح آدھی رات کو محلہ جمع کیا تھا۔ ایسا منظر اس نے صرف فلموں، ڈراموں میں ہی دیکھا تھا۔

تمام ثبوتوں اور گواہان کے بیانات کی موجودگی میں تمام محلے والوں نے اسے لکھ لعنت سے نوازتے ہوئے متفقہ طور پر یہ حتمی فیصلہ دیا کہ راجی کو فوراً "اسی کے پلے باندھ دیا جائے تو بہتر ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ ان دونوں لعنتیوں کو یہاں سے دفع کرکے محلے کی اخلاقی صفائی کا بندوبست کیا جائے۔

راجی پر لعنت اس لیے بھیجی گئی۔ کیونکہ اس کا اور نادر کا معاشقہ زبان زد عام ہوچکا تھا۔

وہ چہرے پر پتھریلے تاثرات لیے جامد بیٹھا تھا۔ ایک وقت تھا، جب اس نے چیخ چیخ کر اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی تھی۔

"جھوٹ بول رہی ہے یہ۔ بکواس کررہی ہے۔ بھاگ رہی تھی اپنے یار کے ساتھ۔ میں نے پکڑا ہے ...... جب ہی۔" مگر تقریباً" ہر بار ہی بات ادھوری چھوڑ کر خود کو زدوکوب ہونے سے بچانا پڑا۔ دوسری طرف راجی تھی، جو اپنے جال میں خود ایسی پھنسی تھی کہ اب بن پانی کے مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھی۔ مگر وہ نہ تو کسی کو سچ بتاسکتی تھی۔ نہ اس سب سے اپنی جان چھڑا سکتی تھی۔ شاید معاملہ گھر تک رہتا تو وہ کوئی نہ کوئی رستہ نکال ہی لیتی۔ مگر اب تو جانے انجانے سب ہی بیچ میں کود پڑے تھے۔ نکاح کا فیصلہ سب نے مل کر کیا تھا۔ کچھ راجی کی پرفارمنس بہت جاندار تھی۔ جس پر وہ جتنا پچھتاتی، کم ہی تھا۔ سوم ساڑھے آنے والی گھڑیوں کا انتظار کررہی تھی۔ جس کا ہولناک تصور ہی اس کی ہتھیلیاں بھگونے کے لیے کافی تھا۔

معاً" دروازے پر مولوی صاحب اور ابا نمودار ہوئے۔ کمرے میں موجود عورتیں ایک طرف سمٹ گئیں۔ اس نے اماں کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ خود بخود اس کے آنسو بہہ نکلے۔

اگلے ہی پل وہ زور زور سے رو رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

نکاح کے بعد لوگ ایک ایک کرکے نکلنے لگے۔ تب ہی محلے کے ایک لڑکے کو دروازے کے پیچھے کچھ نظر آیا۔

یہ لڑکا انتظار حسین تھا۔ محلے کے آوارہ اور نکمے ٹولے کا ایک فرد۔ اسے نادر نے خبر گیری کے لیے بھیجا تھا۔ اسے یہاں کی رپورٹ لے کر سیدھا نادر کے پاس ہی جانا تھا اور اس کی جان چھوٹنے پر خوش خبری بھی سنانا تھی۔

اس نے دروازے کے قریب رک کر پیچھے مڑ کر دیکھا۔

گھر تقریباً" خالی تھا۔ جو دو، ایک بزرگ تھے، وہ کمرے کے دروازے پر کھڑے راجی کے ابا کو دلاسا دے رہے تھے۔ انتظار حسین نے جھک کر غور سے دیکھا۔

وہ نادر ہی کا پرانا موبائل تھا۔ جو اس نے راجی کو دے کر نیا سیٹ مار لیا تھا۔ اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ اس نے لمحے کی دیر کیے بغیر پاس پڑے کپڑے میں موبائل لپیٹ کر اچکا۔ دونوں چیزیں بغل میں داب کر گیٹ سے نکلا اور ناک کی سیدھ میں چلتا چلا گیا۔

"یہ موبائل اور وہ چڑیا تیرے نصیب میں نہ تھی مگر"

وہ دل ہی دل میں مسکراتا ہوا نادر سے مخاطب تھا۔

☼ ☼ ☼

اسے کسی پرسکون گوشے کی تلاش تھی۔

کسی اپنے کی تلاش تھی۔ کسی مہربان کندھے کی۔ جس پر سر رکھ کر وہ پتھر جیسا بھاری بوجھ ہلکا کرسکتا۔

شام میں ہی تو اس کا نکاح تھا۔ وہ چاچا چاچی کو بتا بھی نہیں سکا اور شام سے بھی پہلے زرین جیسے ہیرے کے بدلے قسمت نے اس کی جھولی میں راجی جیسا پتھر لا پھینکا تھا۔ پتھر بھی وہ جو کسی گدلے، کالے کیچڑ بھرے دلدل کے کنارے پڑا تھا۔

اس کے دل میں آگ لگی تھی۔ وجود میں بھانبھڑ جل اٹھے تھے۔ آنکھوں کی سرخی اور چہرے کی تپش بڑھتی جارہی تھی۔

بس نہیں چلتا تھا کہ یہ منظر اور گھر والے کہیں غائب ہوجائیں۔ اس کے سامنے صرف راجی رہ جائے۔ اور پھر وہ اپنے ہاتھوں سے اس کا گلا دبادے۔

کبھی ابا جی کا خیال آتا تو جی چاہتا کہ زہر کھالے۔ ایک مرد ہونے کے باوجود وہ کس طرح پھنسا دیا گیا۔ اپنی بے بسی اور زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ سن کر اس کے اندر لگی

آگ بڑھتی جا رہی تھی۔ یوں لگتا تھا تھوڑی دیر اور ایسے بیٹھا تو یا تو خود کو کچھ کر لے گا یا راجی کو مار ڈالے گا۔

جب چہرے' آوازیں' منظر ماند پڑ گئے' برداشت سے باہر ہو گئے۔ تو وہ اٹھا اور چپل پیروں میں اڑس کر تیزی سے باہر نکلا۔

"کتھے جا رہا ایں اس ویلے؟" چاچی کی کڑک آواز نے بیچ صحن میں اس کا راستہ روکا۔

"فکر نہ کرو چاچی! اب تو نکاح ہو گیا ہے ناں۔ چھوڑوں گا نہیں میں اسے۔"

وہ مڑ کر دانت کچکچایا تو اس کے لہجے کی تپش نے چاچی کو چپ سا کر دیا۔ وہ دھاڑ سے دروازہ مارتا ہوا کمرے سے باہر جا چکا تھا۔ چند قدم کی گلی کا فاصلہ طے کرنے میں اسے کتنی دقت ہوئی' یہ صرف وہی جانتا تھا۔

یوں لگ رہا تھا' ہر انگلی اس پر اٹھی ہوئی ہے۔ ہر آنکھ میں تمسخر ہے۔ اور ہر لب پر بہتان' تہمت' الزام

ہر قدم اس کے غصے میں اضافہ کر رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

شام بیت گئی تھی۔

وہ خوب صورت گھڑیاں جن کا اس گھر میں سب کو انتظار تھا۔ وہ گھڑیاں امر ہوئے بغیر بیت گئیں۔ انتظار' انتظار ہی رہا۔ اور پھر ذلت بھری شرمندگی میں بدل گیا۔

گاؤں کے لوگ سیدھے' سادے اور سانجھے ہوتے ہیں۔ تقریباً" سب ہی نے اباجی کے سامنے فکر اور تشویش کیا مظاہرہ کیا۔ ان ہی چند لوگوں میں وہ بھی شامل تھے' جو راجی کو اپنانے کی خواہش اباجی سے کر چکے تھے۔ سب ہی کا انداز جدا تھا۔ کسی کا فکروں بھرا تو کسی کا تکلیف دہ۔ مگر وہ خود تو باپ تھے۔ انہیں اپنی اولاد پر بھروسا تھا۔

انہوں نے جتنی بھی بار فون کرنے کی کوشش کی' فون آف ہی ملا۔ ان کی فکروں میں اضافہ ہی ہوا۔ اس نے خود کہا تھا کہ وہ نکاح والے دن چاچا کو خوشخبری سنائے گا اور ساتھ لے کر ہی گاؤں آئے گا۔

دل میں اٹھتے الٹے سیدھے واہموں کا سر کچلنے کے لیے انہوں نے بالآخر چاچا کا نمبر ملایا۔

رات آنگن میں اپنا دامن پھیلا چکی تھی۔ مہمان رخصت ہو چکے تھے۔ ایسے میں چاچا جی کا بے حد سرسری انداز میں خیر خیریت دریافت کرنا' ان کے فون پر بات کرنے کی وجہ پوچھنا اباجی کو بہت کچھ سمجھانے کے ساتھ ساتھ خاموش بھی کر گیا۔

چاچا جی تو اس کے نکاح سے سرے سے لاعلم ہی تھے۔ اسی لیے اس فون کے لیے ذہنی طور پر تیار بھی نہ تھے۔ جب ہی چاچا جی رک رک کر بولیں۔

"اس کے سر میں درد ہے۔ کمرا بند کر کے لیٹا ہے۔ میں نے ہی اسے کہا تھا کہ موبائل بند کر کے آرام نال سو جا۔"

"اچھا!" ابا کی آواز سے صاف ظاہر تھا کہ انہیں یقین نہیں آیا تھا۔

البتہ اب اس کی خیریت معلوم ہو جانے کے بعد' ان کی تمام فکریں' شکر میں بدل رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

رات گہری ہو چلی تھی۔

مدثر کا کہیں پتا نہ تھا۔ چاچا اور چاچی اپنے کمرے میں تھے۔ شانی نے باہر برآمدے میں پلنگ ڈالا ہوا تھا۔

راجی کے آنسو خشک ہو چکے تھے۔ غم و غصے پر بے بسی غالب آنے لگی تھی۔ پتا نہیں کب روتے روتے اور آنے والے وقت کو سوچتے اس کو ذرا سی اونگھ آئی تھی۔ پھر نہ جانے کس احساس نے اسے ہڑبڑا کر نیند سے جگایا۔ وہ چند لمحے یونہی کمرے کے دروازے کو دیکھتی رہی۔

جب ہی اسے لگا کہ گھر کا باہر والا دروازہ کسی نے دھڑ دھڑایا ہے۔ وہ خوف زدہ سی چپکی بیٹھی رہی۔ باہر اب خاموشی تھی۔

پھر کسی کی بھنبھناہٹ نے اس کے دل کی رفتار کو

بڑھا دیا۔ اماں' ابا اور کسی تیسرے شخص کی مدھم آواز دروازے کے نزدیک آئی۔ تب اس پر پہلی بار انکشاف ہوا کہ دروازے پر باہر سے کنڈی لگائی گئی تھی۔

اس کے دل کو عجیب سا احساس ہوا۔ جب ہی چاچے نے اندر قدم رکھا۔

"چل اٹھ مردودئی! ترا خصم آیا ہے۔ تجھے لے جانے۔"

اس کی سانس رکنے لگی۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ کوئی سوال کرتی۔ ابا کے پیچھے اماں اندر آکر بول پڑی۔

"اسے بول! تڑکے نکل جائیں۔ اری رات نوں جواں ووہٹی لے کے کتھے مرنے لگا اے۔" ان کے لہجے میں جوان بیٹی کی ماں والے خدشے بالآخر بول پڑے تھے۔

"اوئے! دماغ پھر گیا ہے میرا۔ جتنی جلدی اسے دفع کر اتنا ہی چنگا اے۔" ابا نفرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ راجی نے سر جھکا لیا۔ اس کا دل اور آنکھیں بھرنے لگیں۔

☼ ☼ ☼

نئے گھر' نئی زندگی کی پہلی رات اندازوں سے بڑھ کر ہولناک تھی۔ مدثر کے غصے کا اندازہ تو تھا' پر جنون کا نہیں۔

منہ پر بندھے دوپٹے نے اس کی آوازیں نہیں سانسیں تک گھونٹ ڈالی تھی۔

پرسوں رات کی دل میں دبی مدثر کی خواہش بڑی جلدی پوری ہو گئی۔

چمڑے کی بیلٹ سے جسم پر لگنے والی شدید ضربوں نے اسے بن پانی کی مچھلی کی طرح پھڑکا کر رکھ دیا۔ اسے اس گھر میں قدم رکھنے سے پہلے تک یقین تھا کہ اس کا یہی حشر ہونے والا ہے۔ پھر بھی وہ بری طرح تڑپ کر رہ گئی۔

"بول! ملا سکون تجھے؟ تیری پھڑکتی محبت کو اب بھی قرار آیا کہ نہیں؟" مٹھی میں بے دردی سے بال جکڑ کر وحشیوں کی طرح جھٹکے دیتے ہوئے اس نے راجی کو ایک انتہائی غلیظ گالی دی۔

کمر پر لگنے والے ٹھڈوں کے بعد یہ عمل اتنا تکلیف دہ تھا کہ اگر منہ پر دوپٹا نہ ہوتا تو اب کے راجی کے حلق سے کٹے جانور کی سی آواز نکلنی تھی۔

اس کی آنکھیں ابل آئی تھیں۔ وہ بار بار بے قراری سے ہاتھ جوڑتی تو کبھی اس کے پیروں سے لپٹنے کی کوشش میں منہ اور سینے پر لاتیں کھاتی۔ مگر بے بسی اتنی تھی کہ ہاتھ آزاد ہونے کے باوجود منہ پر باندھا دوپٹا کھولنے کی ہمت نہ کر سکتے تھے۔

"یہی۔۔۔ یہی۔" اس نے آگے بڑھ دو ٹھڈے اس کی رانوں پر رسید کیے۔

"یہی سزا ہونی چاہیے تیری۔۔۔ یہی ہونا چاہیے تیرے ساتھ۔" اس کے لہجے کی سفاکیت اپنی انتہا کو چھو رہی تھی اور جنون تھا کہ بڑھتا جاتا تھا۔ وجود میں لگی ہوئی آگ کو باہر کا راستہ کیا ملا' وہ راجی کا وجود ہی خاکستر کرنے پر تل گیا۔ نیم جان' نیم مردہ وجود سے آواز بھی بیٹھی ہوئی نکل رہی تھی۔

مغلظات بک کر اس نے چند لمحے زمین پر بے بسی سے پڑے ہوئے جسم کو دیکھا۔ پھر بے دردی سے پیر سے لڑھکا کر سیدھا کیا۔

سانس ایسے چل رہی تھی گویا کوئلے والے انجن سے بھاپ نکل رہی ہو۔

وہ پنجوں کے بل اس کے نزدیک بیٹھا نفرت سے چند لمحے گھورتا رہا۔ پھر اس کی گردن کے گرد شکنجہ کس دیا۔

راجی کی آنکھیں ابل پڑیں۔۔۔ بے جان ہاتھوں سے اس کی کسی ہوئی انگلیوں کو کھولنے کی ناکام کوشش کرنے کے بعد وہ بری طرح تڑپنے لگی۔

قریب تھا کہ اس کا وجود ٹھنڈا پڑ جاتا۔ مگر مارنے والے سے بچانے والا بڑا۔۔۔

"اللہ اکبر۔۔۔ اللہ اکبر۔"

فجر کی اذان کی آواز قریبی مسجد میں اس قدر اچانک اور زور سے گونجی جیسے خدا نے یک بارگی اسے تنبیہہ کی ہو۔ کسی نادیدہ قوت کے زیر اثر اس کے ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے۔

ایک جھٹکے سے اس نے راجی کو واپس زمین پر چھوڑا اور پیچھے ہٹ کر نفرت سے زمین پر تھوک دیا۔

☼ ☼ ☼

دن ڈھل رہا تھا۔

کچن کی کھڑکی سے نکلتا' تازہ بگھار کی خوشبو سمیٹے ہلکا دھواں' زرین کی مصروفیت کا گواہ تھا۔

اس نے پشاوری چپل کا اسٹرپ بند کرکے کمرے کے اندر سے لے کر باہر صحن تک پھیلی سوگوار فضا کو گہری سانس لے کر خود میں اتارا اور باہر چارپائی پر سر نیہوڑائے بیٹھے ابا کو دیکھا۔ اس لمحے اس نے خود کو بے بسی کی انتہا پر محسوس کیا۔

ابا کے سامنے اس نے خود کو مجرم ثابت ہونے سے تو بچا لیا تھا۔ مگر وہ اسے باعزت بری بھی نہ کرپائے تھے۔

کیسا لگتا ہے' جب زندگی کا کوئی ایک لمحہ بے دردی سے ہماری سب سے قیمتی متاع ریت کی طرح ہماری ہتھیلیوں سے پھسلا دیتا ہے۔ تب زندگی بے رحم لگتی ہے اور اپنا وجود قابل رحم۔

صحن پار کرنے سے پہلے وہ بے ارادہ ہی ابا کے قدموں میں بیٹھا۔

"ابا!" کیسی التجا تھی اس کی پکار میں۔

ابا گہری سانس لے کر دوسری طرف دیکھنے لگے۔ اس کے ہاتھ ڈھیلے ہو کر زمین سے جا لگے۔

صبح فجر سے اب تک جتنے مکالمے اس کے اور ابا کے درمیان ہونے تھے' ہو چکے تھے۔

اس نے صحن میں کھلتی باورچی خانے کی کھڑکی کو دیکھا۔ لوہے کی سلاخ سے لپٹی سفید انگلیاں نم بھی تھیں اور لرزیدہ بھی۔ ایک لمحے کو اس کا دل چاہا کہ ان انگلیوں کی نرمی اپنی ہتھیلیوں میں جذب کرے۔ خواہ پل بھر کے لیے ہی سہی۔ مگر۔۔۔

سر جھٹکتا وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔

خواہش لاحاصل۔۔۔ تمنائے ناتمام۔

"او چل اوئے! ایکواس نہ کر۔ تو کوئی نازک کڑی تھا' جس کی عزت لوٹ لی گئی اور وہ کچھ نہ کر سکی؟ مردانگی دکھانی تو اس وقت دکھاتا۔ زرین گری پڑی نہیں جو ایک بٹے ہوئے مرد سے بیاہ دوں۔ جیسے تیرا پیو ہوں ویسے اس کا بھی۔ اب جو ہو گیا' سو ہو گیا۔ نبھالے۔"

ابا کے الفاظ واپسی کے سارے راستے اس کی سماعتوں اور دل میں پیوست ہوتے رہے۔

☼ ☼ ☼

صبح' دوپہر' شام' رات' سوئی گھڑیاں' دن' ہفتوں اور مہینوں کا روپ دھارے زندگی کے اسٹیج پر اپنا کردار ادا کرتی رہیں۔

ملا کی دوڑ کی طرح اس کی پہنچ بھی آفس اور اپنے نام نہاد گھر کے علاوہ گاؤں تک رہ گئی۔ دوست یار چھوٹ گئے۔ لبوں پر خاموشی کے قفل اور دل پر پژمردگی نے پنجے گاڑ دیے۔ راجی کا وجود بھی کسی ہیولے کی طرح ایک کمرے کے کوارٹر میں یہاں سے وہاں بے مقصد پھرا کرتا۔

جس دن وہ راجی کی درگت بنا کر گاؤں گیا تھا۔ اس رات واپسی پر اس کی دگرگوں حالت نے جہاں اس کے ہاتھ پیر پھلائے تھے۔ وہیں کسی حد تک نادم بھی کیا تھا۔ وہ گاؤں کا رہائشی ضرور تھا۔ مگر گنوار نہیں تھا۔ اس نے غصے کے ہاتھوں مغلوب ہو کر جو کچھ بھی کیا تھا غصہ اترنے اور دماغ ٹھنڈا ہو جانے کے بعد اس نے اسی لگن سے ڈاکٹر سے علاج بھی کروایا۔

اور یہ سچ بھی تھا کہ یہ اس کی فطرت نہ تھی۔ نہ اس کی تعلیم اسے اس وحشیانہ فعل کی اجازت دیتی تھی۔ راجی کیا سوچتی تھی' سمجھتی تھی۔ اسے نہ پتا تھا' نہ ضرورت تھی' نہ سروکار۔

دھیرے دھیرے گھر' زندگی کرنے والے مختصر سامان سے بھی آشنا ہو گیا۔

باورچی خانے میں برتن' کنستر اور بھری ہوئی برنیاں' واشنگ مشین' استری اسٹینڈ بھی۔ ہر چیز کے اضافے کے ساتھ راجی بنا کچھ کہے اس چیز سے متعلق کام کا چارج سنبھال لیتی۔

وہ سگھڑ نہیں تھی۔ وہ بہت چست بھی نہیں تھی۔ ہاں! وہ شوخ و چنچل پہلے کبھی تھی۔ اب اس کے لب بھی آواز سے بول چال سے ناآشنا لگتے تھے۔

بھرے پیٹ رات گئے لوٹنا اور کمرے کی اکلوتی چارپائی پر پڑ جانا۔ صبح سویرے تیار ہو کر نوکری کو نکل جانا۔ پیچھے رہ جانے والے تنہا وجود سے اسے ایک فیصد بھی دلچسپی نہیں تھی۔

"راجی کو زندگی بھر میری بیوی بن کر نہیں رہنا۔ زرین کو میں ضرور اپناؤں گا۔ وہی میرا نصیب ہے اور یہ......"

کبھی سوچوں کی شورش میں وہ ایک بے دھیان، بے زار نظر اس پر ڈالتا۔

☼ ☼ ☼

وہ بھی ایسا ہی ایک عام سا دن تھا۔

گاؤں والی بس پکڑتے اس کا اپنا سر بھاری محسوس ہوا اور جب وہ کھیتوں کے درمیان سے گزرتی کچی پکی سڑک پر قدم رکھ رہا تھا تو اس کا جسم بخار کی حدت سے تپنے لگا تھا۔

گھر میں گھس کر اباجی کو سلام کرنے کے بعد اس میں کھڑے ہونے کی سکت نہ بچی۔

ساری رات اسے اپنی پیشانی پر بھیگی ٹھنڈک والے کپڑے کا لمس محسوس ہوتا رہا۔ یوں لگتا تھا، جلتی آگ پر کوئی ٹھنڈے چھینٹے مار رہا ہو۔

نیم غنودگی کے عالم میں پوری رات اور اگلا دن گزرا۔ شام ڈھلے کہیں جا کر جسم پسینے میں بھیگا تو اس نے واپسی کا قصد کر لیا۔

یوں بھی اب اس کی آمد کا مقصد صرف ابا اور زرین کی خبر گیری تک محدود ہو گیا تھا۔ جو اپنے مطلب کی بات وہ کرنا چاہتا، ابا اسے سننے تک کو تیار نہ تھے۔ وہ گاؤں میں زرین کے لیے کوئی دوسرا بر تلاش کر رہے تھے۔ وہ جب بھی سوچتا، اس کا خون کھول اٹھتا۔

اس وقت بھی گو کہ بخار اتر چکا تھا۔ مگر جسم کی ٹوٹتی کیفیت کے باوجود اس نے سفری بیگ اٹھا لیا۔ تب ہی دروازے میں کھڑی زرین پر نظر پڑی۔

وہ جہاں کا تہاں تھم گیا۔ آج کتنے عرصے بعد وہ مقابل آئی تھی۔

"آپ جا رہے ہیں۔" دھیمے سے بول کر اس نے دودھ کا گلاس اس کی طرف بڑھا دیا۔

اس نے بنا جواب دیے گلاس منہ سے لگا لیا۔ نیم گرم میٹھا اور الائچی کی خوشبو سے بھرا دودھ گھونٹ گھونٹ حلق سے اترتا جسم و جان کو تازگی بخشنے لگا۔

"جانا تو ہے۔"

"پر ابھی تو نہیں جائیں ناں۔ آپ کی طبیعت......"

وہ جانے کیوں کہتے کہتے رک گئی۔ اس نے ایک نظر زرین کے مرجھائے ہوئے چہرے کو دیکھا۔

"ابا تمہارے لیے رشتہ ڈھونڈ رہے ہیں۔ تم انہیں منع کیوں نہیں کرتیں۔" زرین اسے تک رہی تھی۔ اس نے ایک دم نم پلکیں جھکا لیں۔

"میں کیسے منع کر دوں۔ میرے ابا کی جگہ ہیں وہ۔"

"زرین!" ابا جانے کس وقت آئے تھے۔ ان کا لہجہ اور آواز سخت تھی۔

"اباجی! میں تو یہ کہہ رہی تھی کہ تھوڑا تاپ ٹھنڈا پڑے تو نکل جانا۔" اس نے زرین کو گھبراتے ہوئے دیکھا۔

"اس سے کچھ بھی کہنے کا اب کوئی فائدہ نہیں۔" انہوں نے کہا۔ بات بظاہر سیدھی تھی۔ مگر اپنے اندر کتنے معنی سمیٹے ہوئی تھی۔

مدثر کو پھر سے غصے نے گھیرا۔

"کچھ نہیں ملنا ادھر سے۔ چل!"

وہ اسے طنزیہ نظروں سے گھورتے زرین کو باہر لے گئے۔ اور ان کی نظروں کی کاٹ مدثر کے اندر تک اتر گئی۔

☼ ☼ ☼

کھولتا خون آگ کی لپٹوں کی طرح جسم میں شرارے سے دہکا رہا تھا۔

کمرے میں گھپ اندھیرا تھا اور اسے کسی پل قرار نہ تھا۔ ٹوٹتا جسم دہائیاں دے رہا تھا کہ گزشتہ رات کی طرح کوئی مہربان ہاتھ آج بھی ٹھنڈی پٹیاں ماتھے پر رکھ دے۔ کسی کا لمس مسیحائی روح تک کو شانت کر دے۔ جب شدید بے بسی کے عالم میں ٹوٹتے جسم سے ادھ مری آواز نکلی۔

"راجی۔" وہ قریب ہی تھی۔ شاید ابھی لیٹی بھی نہیں تھی۔

"میرے پیر داب دے۔" نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے لبوں سے نکل گیا۔ اگلے ہی لمحے وہ دھیرے سے چارپائی کی پائنتی پر چڑھی پیر دبا رہی تھی۔

"کچھ نہیں ملنا اب ادھر سے۔"

ابا کی آواز تھوڑی تھوڑی دیر بعد پھن پھیلا کر اسے ڈستی اور وہ بے چین ہو کر سر پٹختا۔

"سر دبا دوں آپ کا۔" رضائی میں پیر دباتے اس کے ہاتھ ذرا کی ذرا رکے۔

"ہوں...... ں...... ں۔" اس نے ایک ہیولے کو خود پر جھکتے دیکھا۔ یہی وقت تھا۔

"کچھ نہیں ملنا اب ادھر سے۔" اس کی سماعتوں پر سلگتا کوڑا لپکا۔

راجی کا بے آب و گیاہ صحرا کی مانند کورا وجود اس کی انگارہ نگاہوں میں آن سمایا۔ سرد موسم میں کمرے کی فضا سرد تھی۔ سوائے اس رضائی کے جو اس نے اوڑھ رکھی تھی۔ رضائی کے اندر اس کے جسم کی سلگتی تپش راجی کے وجود میں اتر گئی اور وہ کچھ نہ کر سکی، سوائے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ کر آواز دبانے کے۔

سمے کا جادوگر اپنی آٹھ پہری ٹوپی میں سے دن، ہفتے اور مہینوں کے کبوتر نکال نکال کر اڑاتا رہا۔ اور جب تک مدثر کے علم میں یہ بات آئی تب تک سمے کا سامری اپنا سحر پھونک کر اسے پتھر کر چکا تھا۔

"بتایا کیوں نہیں؟" اس نے بازوؤں سے پکڑ کر راجی کے کانپتا جسم کو جھنجھوڑ ڈالا۔

"مجھے بتایا کیوں نہیں تو نے۔ بول!" وہ چیخ پڑا۔

"میں...... میں۔"

دو برس پہلے کی وحشیانہ مار اسے بھولی نہیں تھی۔ وہ وحشت زدہ سی ہو گئی۔

"میں سمجھی آپ کو پتا ہو گا۔ معاف کر دیں۔ بھول ہو گئی۔"

وہ چارپائی پر گر سی گئی۔

پیر کی ٹھوکر سے راستے میں رکھی ہر چیز کو اڑاتا وہ گھر سے باہر نکل گیا۔

"یا اللہ! میں کتنی بے وقوف ہوں۔" وہ وہیں پڑی ہچکولے کھاتے وجود کے ساتھ سوچتی رہی۔ "میں نے کیوں امید لگائی تھی کہ اپنی اولاد کا سن کر وہ پگھل جائے گا۔ میں بھول گئی تھی۔ وہ تو بے خطا، بے قصور ہے۔ یہ تو میری کرنی کا پھل ہے۔ میری سزا ہے، جو آخرت کے لیے اٹھا کر نہیں رکھی گئی۔ دنیا میں ہی مل رہی ہے۔ مجھے معاف کر دے مدثر۔ میں کس منہ سے تجھ سے کہوں۔ میں وہ راجی نہیں رہی۔"

☼ ☼ ☼

ابا کے پڑوس والے گھر میں ڈکیتی ہو گئی تھی۔ لٹیروں نے جان و مال کے ساتھ عزت کو بھی نشانہ بنانے کی پوری کوشش کی تھی۔ مگر خدا نے خیر کی کہ وقت کی کمی اور گھبراہٹ کے باعث وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکے۔

پڑوس والی مائی خیراں کے بین سن کر ابا کا کلیجہ سہم سا گیا تھا۔ گھر کے کسی اندرونی کونے میں منہ چھپائے پڑی سکینہ بچ کر بھی مصلوب ہو گئی تھی۔

نم آنکھیں رگڑتے بے حد جھکے کندھوں کے ساتھ واپسی ہوئی تو صحن میں ٹاکی پھیرتی زرین کو دیکھ کر ان کے دل نے سناٹے کی بکل اوڑھ لی۔ انہیں پہلی بار احساس ہو رہا تھا کہ وہ اس کی حفاظت کرنے کے قابل نہیں۔ زندگی میں بہت کم راتیں انہوں نے حقیقی معنوں میں جاگتے ہوئے گزاری تھیں۔ بلکہ حقیقی معنوں میں جلتے توے پر کروٹیں بدلتے۔

اگلی صبح مدثر کو گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر بجائے اطمینان حاصل ہونے کے انہیں اور بے کلی نے گھیر لیا۔ گاؤں میں قدم رکھتے ہی اسے ماسی خیراں کے گھر پر

گزرنے والی قیامت کا علم ہو گیا تھا اور اس کا اپنا خیال یہ تھا کہ یقیناً" اب ابا اس کی بات کو سنجیدگی سے لینے پر مجبور ہو جائیں گے۔ وہ ایک بار پھر زرین کو اپنانے کے لیے ابا کے آگے عرضی رکھنا چاہتا تھا۔

مگر ابا کی خاموشی اس کی بات شروع ہونے سے پہلے اور ختم ہونے کے بعد طویل تر ہو گئی۔

وہ امید و بیم کی سرکش لہروں کے درمیان ڈوبتا ابھرتا ان کے تاثرات پڑھنے کی ناکام کوشش کرتا رہا اور جب اسے لگا کہ ابا فیصلہ کر چکے ہیں۔ پر اس کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں پاتے۔ تب اس نے دھیرے سے ان کا گھٹنا چھوا۔

"ابا!" وہ جیسے کہیں بہت دور سے واپس پلٹے۔ پھر گہری سانس لے کر زمین تکنے لگے۔

"کبھی مت کہہ لے میری تو۔ پر میرا دل نہیں مانتا۔ اوئے! ایسا نہیں ہے کہ مجھے تیرے دل کی خبر نہیں۔" جانے کس خیال کے تحت انہوں نے پہلی بار وضاحت کی ضرورت محسوس کی۔

"میں تو صرف اس کڑی رضوانہ کو زیادتی سے بچانا چاہتا تھا۔ پر اب حالات ایسے ہیں کہ اس کے بنا کوئی چارہ ہی نہیں بچا۔" اس نے دل میں امڈتی بے ساختہ خوشی کو بڑی دقت سے قابو کیا۔

"پر۔۔۔ پر کچھ وقت۔۔۔" اسے راجی کی حالت بہت بے وقت یاد آئی۔

"کچھ وقت انتظار کرنا ہو گا۔ ابھی 'ابھی۔۔۔ وہ راجی۔'

اس نے ڈھکے چھپے انداز میں ابا کو راجی کی حالت سے آگاہ کر دیا۔ جواباً" انہوں نے ایسی نظروں سے دیکھا کہ مدثر کا جی چاہا' وہ ابھی ان نگاہوں کی حدود سے باہر نکل جائے اور کبھی واپس نہ پلٹے۔

قسمت کی دیوی نے دستک دی تھی۔ وہ کواڑ وا کرنے بھاگا بھی تھا۔ مگر جانے انجانے میں پیر رپٹ گیا اور۔۔۔

اور دیر ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

آپریشن تھیٹر کے دروازے کے اوپر لگی سرخ بتی جل رہی تھی۔ جانے اسے کب تک جلنا تھا۔ اسے لگ رہا تھا برآمدے کے ٹھنڈے فرش پر ٹہلتے اس کے تلووں میں اس ٹھنڈک نے جلن پیدا کر دی ہے اور اس کے تلوے بھی اس سرخ بتی کی مانند دھیمی سرخ آنچ پر تپ رہے ہیں۔

تھوڑی دیر پہلے جب ڈاکٹر اس کے پاس آئی تھی تو اس کے دل میں کہیں اس جلن کا نام و نشان نہ تھا۔ ہاں! دل کے کسی انتہائی نہاں خانے میں خوشی کی ایک ننھی سبز کونپل نے ضرور اٹھایا تھا۔ مگر پھر ڈاکٹر نے بولنا شروع کیا۔

"بے انتہا ویک نیس اور لاپروائی کی انتہا۔ ایک بار بھی الٹرا ساؤنڈ نہیں کروایا گیا۔ نہ ایچ بی ٹیسٹ۔۔۔ یورین لیول۔۔۔ بلڈ پریشر۔"

وہ پاگل تو نہیں تھا۔ مگر ڈاکٹر گردان رہی تھی۔

پھر اس نے ایک روح فرسا انکشاف کیا۔

"بہت مشکل ہے ماں اور بچہ دونوں بچ سکیں۔ آپ اس پر سائن کریں اور پھر بتائیں کہ ہم دونوں میں سے کس کو ترجیح دیں۔"

وہ منہ کھولے ٹکٹکی باندھے ڈاکٹر کا منہ تک رہا تھا۔

لاشعور میں کہیں ابا کی آواز گونج رہی تھی۔

"اوئے تو تو بہت ناک والا بنتا تھا۔ بنالی ناں گرہستی ٹیک دیے ناں گوڈے۔ اب تو باپ بننے والا ہے۔ پھر کیا لوڑ ہے صرف عیاشی کے لیے اسے تیرے پلے باندھ دوں میں۔ جورو والا تو' تے اولاد تیرے پاس۔ یہ خوشی کی خبر دینے واسطے تو آیا تھا میرے کول۔ ہیں؟"

ڈاکٹر جلدی میں تھی۔

اسے لگا جیسے وہ ایک صدی سے اس کشمکش کے بھنور میں ڈول رہا ہے۔

ابا مانتے مانتے پھر سے اڑ گئے تھے۔ پہلے اس کے پاس دلیل تھی کہ راجی اس کی مجبوری ہے۔ زبردستی اس کے پلے باندھی گئی ہے۔ مگر اب وہ کس منہ سے ابا کو یہ بات کہتا۔ راجی اس کے بچے کی ماں بننے والی تھی۔

جب ان کے دل نہیں مل سکے تھے۔ جب اسے راجی کا وجود' اس کا ساتھ گوارا نہیں تھا تو پھر یہ سب کیا تھا۔

ابا ٹھیک کہہ رہے تھے۔ جس شخص کی زندگی میں کسی قسم کی کوئی کمی نہ تھی۔ محض اس کے دل کی خواہش کو پورا کرنے کے لیے وہ زرین کو اس کی نکاح میں دے کر پوری زندگی کے لیے اسے دو کشتیوں کا سوار کیوں بناتے۔ زریں نہیں تو راجی۔۔۔ راجی نہیں تو زرین۔۔۔ کسی بھی بے قصور کو عمر بھر کے لیے ادھورے انتظار کی اذیت میں مبتلا کیوں کرتے۔

وہ لاکھ محبت کا دعوے دار بنتا۔ مگر اپنی محبت کو ثابت نہیں کر پایا تھا۔ کسی جلتی ہوئی رات کے کمزور لمحوں میں وہ راجی سے ہار گیا تھا۔ اپنے نفس سے' اپنی قوت برداشت سے ہار گیا تھا اور آج ایک بار پھر ابا کے سامنے۔۔۔ جتنی خوشی اور جوش سے وہ گاؤں گیا تھا۔ واپسی میں اتنی ہی پژمردگی سے لور لور پھرتا رہا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ راجی کو کبھی بھی کسی بھی وقت اس کی مدد کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔ رات کے دوسرے پہر جب اس نے گھر کی دہلیز پار کی تو راجی درد اور تکلیف کے ہاتھوں بے سدھ ہو چکی تھی۔

اور راجی۔۔۔ رضوانہ بتول۔

اس کے دل میں کسی نے ایک چٹکی سی کاٹی۔

اگر راجی اس کی زندگی میں نہ رہتی تو زرین کو تو اس کا ہو ہی جانا تھا۔ مگر کیا وہ اتنا ظالم ہو سکتا تھا۔۔۔ اتنا بے رحم اور سفاک ہو سکتا تھا۔۔۔ اور کیا موت صرف راجی کو آئی تھی۔ اسے اور زرین کو نہیں۔

"جی۔۔۔ مسٹر مدثر۔۔۔ کیا سوچنے لگے۔ اتنا ٹائم نہیں ہے۔"

اس نے چونک کر ڈاکٹر کی شکل دیکھی۔ یوں لگا جیسے صدیوں کا سفر چند لمحوں میں طے کر کے واپس پلٹا ہو۔ جس ڈاکٹر کی راجی سے کوئی رشتہ داری نہ تھی' کوئی تعلق نہ تھا۔ وہ بھی اپنی مریضہ کی صحت اور زندگی کے لیے پریشان تھی۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے فارم پر دستخط کیے۔

"آپ۔۔۔ آپ ماں کو بچائیے۔ اولاد اگر قسمت میں ہوئی تو۔۔۔"

پھڑپھڑاتے لبوں سے نکلتی ٹوٹی پھوٹی بے ربط بات مکمل ہونے سے پہلے ہی ڈاکٹر اس کا مطلب جان کر پلٹ چکی تھی۔

وہ بے دم سا ہو کر بینچ پر ڈھے گیا۔

☼ ☼ ☼

کتنے لمحے دبے پاؤں اس کے پہلو سے اٹھ کر کھو گئے تھے۔ وہ حساب رکھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ صبح کاذب کے ملگجے اندھیروں میں فجر کا اجالا پھیل رہا تھا۔

اسے بے اختیار وہ وقت یاد آیا۔ جب وہ اپنے ہاتھوں سے راجی کی جان لینے کے درپے تھا۔ تب بھی اسی مہربان صدا نے اسے روک دیا تھا۔

"اللہ سب سے بڑا ہے۔"

"یا اللہ!" معاً" اس کے دل کی گہرائیوں سے صدا نکلی۔

"جو میرے لیے بہتر ہے' وہ مجھے عطا کر دے مالک! اور جو میرے لیے نہیں' اس کے خیر اور شر سے مجھے پناہ دے دے۔"

انتہائی بے بسی میں ایک ننھا منا آنسو داہنی آنکھ کے کونے سے نکل پڑا۔

آج اس کی آنکھیں اس کے لیے نم تھیں' جو واقعی اس کی اپنی تھی۔ جسے اللہ نے اس کے لیے چنا تھا۔ اسے اس کے لیے جائز بنایا تھا۔ حلال کیا تھا اور جو کتنی دیر سے موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا تھی۔ دعا کے لیے پھیلے ہاتھوں میں صرف اور صرف راجی کا نام تھا۔ اس کے لیے دعائیں تھیں۔ جب ہی اوٹی کا دروازہ کھول کر ایک نرس ننھے منے کمبل میں لپٹے وجود کو تھامے اس کی طرف آئی اور اس کے بازو ایک بے پایاں خوشی اور مسرت سے لبریز نعمت خداوندی سے بھر گئے۔

"مبارک ہو۔ بیٹا ہوا ہے۔ ماشاء اللہ بالکل صحت مند ہے۔" ننھی سرخ پیشانی چومتے کچھ سوچ کر اس کا وجود ڈگمگا سا گیا۔

"اور۔۔۔ اس کی ماں؟" نرس نے ایک گہری سانس لی۔

"آپ ان سے مل سکتے ہیں۔" وہ مبہم سی بات کہہ کر پلٹ گئی۔

☼ ☼ ☼
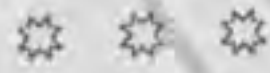
سفید بستر پر نیم بے ہوشی کی حالت میں پڑا لاغر وجود بچائے جانے کے لیے توجہ کا متقاضی تھا۔ اس کے دل میں ایکا ایکی ترس اور ہمدردی نے سر اٹھایا۔

"راجی!" اس نے بچے کو راجی کے پہلو میں لٹا کر دھیرے سے آواز دی۔ اس نے زرد آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا۔

مدثر کی سمجھ سے باہر تھا کہ اپنے دل کی بدلی کیفیت اس وقت راجی کو کیسے سمجھائے۔ بس اس کی نم پیشانی پر ہاتھ رکھ کر دھیرے سے پکار بیٹھا۔

"کیسی ہو رضوانہ۔۔۔ تکلیف میں تو نہیں؟" راجی کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ ان آنسوؤں کو کسی زبان کی ضرورت نہیں تھی۔

"مت رو راجی! رونے سے کمزوری بڑھے گی۔ تو ٹھیک ہو جائے گی جلدی۔"

اس نے دھیرے سے اس کے بال سہلائے۔

وہ چند لمحے اسے دیکھتی رہی۔ پھر بدقت تمام اپنے خشک لبوں پر زبان پھیر کر لب کھولے۔

"ڈاکٹر۔۔۔ ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ۔۔۔ تم بچے کو نہیں مجھے بچانا چاہتے تھے۔"

"ہاں، ہاں! میں تمہیں بچانا چاہتا تھا۔ ٹھیک بتایا تھا اس نے۔۔۔" اس نے بے اختیار راجی کا ہاتھ تھاما۔

"پر۔۔۔ کیوں مدثر؟ میرے ہوتے تو نے کوئی۔۔۔" اس کا سانس ذرا سی بات کر کے پھولنے لگا۔ "خوشی نہیں دیکھی۔۔۔ پھر؟" اس نے گہرا سانس لے کر آنکھیں موند لیں۔

"ہاں۔۔۔ پھر بھی۔۔۔ میں نے کہا۔ میری راجی کو کچھ نہیں ہونا چاہیے۔" مدثر کے حلق میں پھندا سا پڑنے لگا۔ وہ نہیں جانتا تھا۔ وہ یہ سب کیوں کہہ رہا تھا۔ بس! یاد تھا تو اتنا کہ راجی کی حالت تسلی بخش نہیں لگ رہی تھی۔

"کیا۔۔۔ کیا کہا تو نے۔۔۔ تو نے "میری راجی" کہا۔" اس کے پپڑی زدہ لب بے ہنگم انداز میں ذرا کی ذرا ہلے۔

"ہاں۔۔۔ ہاں! میری راجی۔۔۔ تو میری راجی ہے۔" اس نے دھیرے سے راجی کا ہاتھ چوما۔

"مجھے پتا تھا۔ تیرا۔۔۔ تیرا دل موم ہو ہی جائے گا۔ تو اتنا پتھر نہیں، جتنا بنا پھرتا ہے۔"

اس کی آواز دھیمی پڑنے لگی۔ پھر وہ غنودگی میں چلی گئی۔

مدثر نم آنکھوں سے اس کے نقوش پڑھتا رہا۔ اس نے کبھی مر کر بھی نہ سوچا تھا کہ زندگی سے بھرپور ہنستی کھلکھلاتی راجی اس کی زندگی میں اتنے برے انداز میں شامل ہوگی کہ اسے اس کی شکل دیکھنا گوارا نہ ہوگی اور پھر ایسا وقت آ جائے گا، جب وہ اس کی زندگی سے جا رہی ہوگی۔ مگر اسے روکنا اس کے بس سے باہر ہوگا۔

معاً اس کی پلکوں میں جنبش ہوئی۔

"میرے۔۔۔ میرے بچے کا بہت خیال رکھنا مدثر۔۔۔ میری خطاؤں کو معاف کر دینا اور۔۔۔ اسے پرائی نہیں۔ اپنی سگی اولاد سمجھ کر پیار دینا۔۔۔ یہ تمہارا ہی خون ہے۔"

وہ اٹک اٹک کر بولی اور گہری سانسیں لینے لگی۔

"جھلی ہے تو راجی۔۔۔ بھلا میں اس سے کیوں غیریت برتنے لگا؟ اور معافی تو۔۔۔ مجھے تجھ سے مانگنی چاہیے۔ میں۔۔۔"

اس سے بات مکمل نہیں کی گئی۔ راجی نے نفی میں سر ہلایا اور پلکیں موند لیں۔

اس نے لب بھینچ کر باقی بات کو اپنے اندر اتار لیا۔ شاید یہ وقت ان باتوں کا نہیں تھا۔ مگر اسے اندازہ نہیں تھا کہ ان باتوں کا وقت اب کبھی نہیں آئے گا۔

راجی کے ہاتھ کو دھیرے سے سہلا کر باہر نکلتے ہوئے جانے کیوں اسے یوں لگا۔ جیسے اس کا دل خالی ہو رہا تھا۔ جیسے اپنی کوئی بہت ہی قیمتی چیز پیچھے چھوڑ کر جا

رہا تھا۔ یہ خالی پن سا کیوں تھا۔ اسے جلدی پتا چل گیا۔

بہت کم وقت انتہائی نگہداشت میں رہنے کے بعد راجی دوبارہ ہوش میں نہ آسکی۔ ڈاکٹر نم سے لہجے میں اطلاع دینے آئی تو واجبات ادا کرنے اور میت وصولنے کے شرائط و ضوابط سے آگاہ کرنے کے بعد بولی۔

"بہت کم 'بہت گنے چنے قسمت والے مردوں کو ایسی بیویاں ملتی ہیں۔ میں نے آپریشن سے پہلے انہیں یہ بات بتادی تھی کہ آپ کے ہسبینڈ کو بے بی نہیں چاہیے۔ مگر وہ پھر بھی آخر وقت تک اپنی ضد پر قائم رہیں۔ بہت ہمت چاہیے اپنی جان پر رسک لے کر اپنے لائف پارٹنر کو اولاد کا تحفہ دینے کے لیے۔" ڈاکٹر کے لہجے میں توصیف تھی اور مدثر کو لگا اس کے کندھوں پر منوں وزنی بوجھ آگرا ہے۔

☼ ☼ ☼

"خدا کی قسم راجی! میں نے کبھی نہیں چاہا تھا کہ تم میری زندگی سے اس طرح نکل جاؤ۔" اسے جب جب راجی کی یاد آتی۔ وہ دل ہی دل میں اسے مخاطب ضرور کرتا۔ حالانکہ وہ جانتا تھا۔ آئندہ زندگی اس کی مرضی اور پسند کی ہوگی۔ راجی کی موت اسے ڈھب پر لے آئے گی اور ہوا بھی یہی۔

چاچا اور چاچی نے اتنے عرصے بعد بیٹی کو دیکھا بھی تو تب' جب وہ ان سے گلے شکوے کرنے کی حسرت دل میں لیے ابدی نیند سوچکی تھی۔ ان پر جو قیامت گزری سو گزری۔ مگر مشیت ایزدی کے آگے سب ہی بے بس تھے۔ سو وہ کچھ نہ کرسکے۔ ہاں! مگر جانے سے پہلے مدثر کو اس کی موت کا ذمہ دار ضرور ٹھہرا گئے۔

مدثر کے دل میں ایک ملال نے مستقلاً "ڈیرا جما لیا۔ زندگی نے اس کی جھولی میں بے شمار ان گنت خوشیاں ڈالیں۔ ان خوشیوں کی بوچھاڑ میں ملال کے رنگ ہلکے تو ہوگئے۔ مگر دھل نہ سکے۔

زندگی ایک سیدھی ڈگر پر رواں تھی کہ ایک دن زرین نے اسے چونکا دیا۔

"کمال ہے۔ اب تو آس پڑوس ملنے والیاں بھی باتیں بنانے لگی ہیں۔" وہ مدبر کا ڈائپر بدل رہی تھی۔ ابا بھی راہی ملک عدم ہوچکے تھے۔ مگر جانے سے پہلے زرین کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے کر' مدبر کا نام رکھ کر گئے تھے۔

"آپ کو خود احساس نہیں ہوتا۔ اگر آج ابا زندہ ہوتے تو سال میں کتنی بار آپ سے کہہ چکے ہوتے۔" زرین بولتے ہوئے اس کے لیے سوچ کے۔ نئے در وا کر رہی تھی۔

"چلیں ناں۔ جتنی جلدی ہوسکے۔ مجھے شہر جاکر ڈاکٹرنی کو دکھانا ہے۔" مدثر کو زرین کی طرح اتنی جلدی اولاد کی خواہش نہیں تھی اور گو کہ زرین مدبر کو بالکل ماؤں کی طرح چاہتی اور اس کا خیال رکھتی تھی۔ مگر اسے مستقل کسی کمی کا احساس تنگ کرنے لگا تھا۔

اس کا اصرار دن بدن زور پکڑنے لگا تو مدثر مجبور ہو ہی گیا۔

"آئی ایم سوری! مگر حقیقت چھپانے کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔ آپ چاہیں تو اپنی تسلی کے لیے کسی اور گائنی ایکسپرٹ سے کنسرن کرسکتے ہیں۔ یہ اللہ کے کام اور اسی کی مرضی ہے۔ بظاہر ایسی کوئی کمی بھی نہیں۔ بس اچھے کی امید رکھیں۔"

مدثر کو حقیقی معنوں میں پیروں تلے سے زمین سرکتی محسوس ہوئی۔

☼ ☼ ☼

زندگی نے گزرتے ماہ و سال میں جہاں اس کی بے شمار خواہشیں پوری کی تھیں۔ وہیں ایک آرزو کو حسرت بنا کر دل کے کونے میں ڈال دیا تھا۔

زرین کبھی ماں نہیں بن سکتی تھی۔

کتنے معالج بدل کے' بحث و مباحثے کرکے' پیسہ بہاکے اور روپیٹ کے وہ اس بات پر یقین کرنے کے لیے تیار ہوئی تھی۔

مدثر کے لیے جتنی ناقابل یقین' زرین کے لیے اتنی ہی ناقابل برداشت حقیقت تھی۔ اس کی مکمل خوشیوں بھری زندگی میں ایک کسک مگر جو ایک تکلیف دہ احساس دلاتی رہے گی کہ میں ہوں۔۔۔ ہاں! میں ہوں تمہاری زندگی کی اٹل حقیقت۔

وہ راجی کو اپنی زندگی سے نکال دینا چاہتا تھا ناں۔ راجی نے اس کے کہنے کا انتظار نہیں کیا اور زرین نے بھی اس کی زندگی میں شامل ہونے کے لیے انتظار نہیں کروایا تھا۔ مگر فرق کہاں تھا۔

راجی کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی سب کچھ دان کرگئی تھی۔ اس کی اولاد' اس کا بیٹا' اس کا اپنا خون۔۔۔ اور زرین سب ہوتے ہوئے بھی اسے یہی سب کچھ نہیں دے پائی تھی۔ اس کا وارث' نام لیوا' بازو۔ راجی چلی گئی اور جاتے جاتے اس پر لگائے گئے بہتان کا کفارہ بھرتی گئی۔ اب تو اس کے پیچھے صرف ایک افسوس اور پچھتاوے کی بازگشت تھی۔۔۔ یا ایک معافی نامے کی درخواست۔

جو وہ اس کی آرام گاہ پر' اس کے حضور پیش کرتا تھا۔ مگر دل کی بے کلی کا تدارک نہ کرپاتا تھا۔

"کیا زندگی میں کبھی میں اپنے شانوں پر لدے اس احسان کے بوجھ کو اتار بھی پاؤں گا یا نہیں۔"

اس نے گہری سانس لے کر جلتی آنکھوں کو مسلا۔

"مدبر۔۔۔ مولی! میری جان' کہاں ہے میرا بیٹا؟"

زرین پیار سے اس کے بیٹے کو آوازیں دے رہی تھی۔ یہ بھی شکر کا مقام تھا کہ اس نے مدبر کے خلاف کبھی محاذ نہیں کھولا۔ بلکہ اس کے وجود میں اپنی ذات کی محرومی کا علاج تلاش کرکے' اپنی پیاسی ممتا کے بیش بہا خزانے اس پر بے دریغ لٹائے تھے اور خود کو مدبر کی کھلکھلاہٹوں میں گم کرلیا تھا۔

"مدبر۔۔۔ میرا بیٹا۔۔۔ میرا اور رضوانہ کا بیٹا۔"

اس کے دل میں ایک انوکھی سوچ نے سر اٹھایا۔ جس کی سرشاری نے اس کے لبوں پر شگوفے کھلا دیے۔ آن کی آن میں اس کا مرجھایا ہوا دل کھل اٹھا۔

"زرین! میں اپنے بیٹے کا نام بدل رہا ہوں۔" اس نے چشم تصور سے راجی کو بھی مسکراتے دیکھا۔

"جی؟" وہ ناسمجھی سے اسے دیکھنے لگی۔

"ہاں! میں نے مدبر کا نام تبدیل کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔"

وہ اپنے مجازی خدا کے مزاج اور طبیعت کے الجھاؤ سے واقف ایک سمجھ دار بیوی تھی۔ چند لمحے اس کا چہرہ دیکھنے کے بعد سکون سے پوچھنے لگی۔

"تو پھر کیا رکھیں گے اس کا نام؟"

وہ مسکرا دیا۔ پھر بولا تو اس کے لبوں کو جیسے کسی مٹھاس نے چھولیا۔

"رضوان۔"

☼

ناولٹ

آمنہ ریاض

تماشا

عبدالباقر لودھی اپنے منجھلے بیٹے تقی کی غیر ذمہ دارانہ طبیعت سے سخت نالاں ہیں اور اسے ہر وقت بدحرامی کے طعنے دیتے رہتے ہیں۔ تقی کو شوبز میں کام کرنے کا شوق ہے جبکہ لودھی صاحب اس کام کے سخت مخالف ہیں۔ دونوں باپ بیٹے میں اکثر جھڑپیں ہوتی رہتی ہیں۔ رضی اور جری سے البتہ باقر صاحب کو کوئی شکایت نہیں۔

شفا کو عمیر نے والدین کے بعد باپ بن کر پالا ہے۔ وہ عمیر کی بے حد لاڈلی ہے مگر عمیر کی بیوی سماہر کو اس سے شدید جلن ہے وہ عمیر سے جھوٹ بول کر اسے شفا سے بدظن کرنے کی کوششیں کرتی رہتی ہے۔ عمیر کو اپنی بیوی پر پورا یقین ہے۔

سماہر اور عمیر کی شادی کے ابتدائی دنوں میں شفا سماہر سے بہت بدتمیزی کیا کرتی تھی۔ وہ اسے ہر وقت عمیر کی نظروں سے گرانے کی کوشش کرتی اور جھوٹی سچی کہانیاں سنا کر اسے عمیر سے ڈانٹ پڑوا دیتی۔ رات کے کھانے پر پاستا نہ بنانے پر اس نے سماہر سے بدلہ لینے کا ارادہ کیا اور سیڑھیوں سے حادثاتی طور پر گر جانے کا الزام سماہر پر لگا دیا کہ سماہر نے اسے دھکا دیا ہے۔ اس بات پر عمیر، سماہر کو دو تھپڑ مار دیتا ہے۔ سماہر کو بہت دکھ ہوتا ہے۔ شفا خود بھی گنگ ہو جاتی ہے۔

تقی کے گہرے دوست سمیر کے ابا اپنی پسند سے اس کی منگنی کر دیتے ہیں۔

—۳—

تیسری قسط

”بذریعہ ٹرین راولپنڈی‘ لوکل وین سے آگے مری۔“

انہوں نے اپنا ٹرپ ترتیب وار پلان کیا تھا اور چونکہ ان میں سے کوئی بھی پہلی بار وہاں نہیں جارہا تھا اس لیے انہوں نے کم سے کم مری تک کے لیے کسی ٹور کمپنی کی مدد نہیں لی تھی بلکہ تمام کام آپس میں بانٹ لیے تھے۔

سمیر نے مری میں ان کی رہائش کے ساتھ ساتھ گاڑی اور گائیڈ کا انتظام کیا تھا‘ جو انہیں ناران‘ کاغان سے آگے جھیل سیف الملوک تک لے جاتا۔ وہاں سے ان سب کا ارادہ آنسو جھیل اور پیر چناسی جانے کا تھا۔ پہاڑی علاقے میں گاڑی چلانے کی ذمہ داری ثاقی نے لی تھی۔ وہ چارسدہ کا پلا بڑھا تھا اور پہاڑی علاقوں میں اس طرح گاڑی چلا لیتا تھا جس طرح گھر کی چار دیواری میں بچے ڈنکی کار دوڑائے پھرتے ہیں۔ ناران میں ان کا ارادہ کیمپنگ کا تھا۔ کیمپنگ سے متعلقہ سامان کا انتظام تقی نے کرنا تھا جبکہ اشیائے خورد و نوش کا ڈپارٹمنٹ حسان اور طلحہ نے سنبھال لیا تھا۔ باقی بچے سرار سلان..... تو انہوں نے سینیارٹی کا فائدہ لیتے ہوئے کوئی بھی ذمہ داری قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ وین ابھی اسٹیشن پر پہنچی ہی تھی کہ ڈرائیونگ سیٹ کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھے سرار سلان نے گردن موڑ کر اپنی لیڈر شپ کا اعلان کر دیا تھا۔

”چلو بھئی سارے لڑکے بچے بن کر میری بات غور سے سن لیں۔ میں نے اس ٹرپ کے لیے کچھ اصول و ضوابط مقرر کیے ہیں‘ جو سب دھیان سے ذہن نشین کر لیں کیونکہ جس نے ان اصولوں کی خلاف ورزی کی اسے گروپ سے باہر نکال دیا جائے گا۔“

”آبجیکشن سر جی!“ تقی نے سب سے پہلے ہاتھ اٹھایا تھا۔ ”پہلے تو ذرا اس بات پر روشنی ڈالیں کہ آپ نے یہ اصول و ضوابط کس خوشی میں طے کیے ہیں؟“

”کیونکہ میں اس گروپ کا لیڈر ہوں اور ہر لیڈر نظم و ضبط قائم رکھنے کے لیے کچھ نہ کچھ اصول ضرور طے کرتا ہے۔“ فلسفیانہ انداز میں فرمایا گیا۔

”لیکن ہم میں سے تو کسی نے آپ کو ووٹ نہیں دیا‘ پھر آپ کیسے لیڈر بن گئے؟“ تقی نے ہی کہا تھا۔

”کرسی خالی تھی لیڈر کی۔ تو میں نے سوچا رضا کارانہ طور پر میں ہی یہ کرسی سنبھال لوں..... تم لوگوں میں تو کوئی اتنا باصلاحیت ہے نہیں..... تو ذرا احساس ذمہ داری ملاحظہ کرو۔“ کڑک کر ارشاد فرمایا گیا۔

”اسے احساس ذمہ داری نہیں‘ ڈکٹیٹر شپ کہتے ہیں سر جی!“ یہ طلحہ تھا۔

”ڈکٹیٹر شپ بھی تو اصول دنیا ہے بیٹا جی! میں جو کہہ رہا ہوں‘ ماننا تو تمہیں پڑے گا۔“

”ہم جمہوریت کے قائل عوام ہیں۔ کالے کوٹ پہن کر آپ کی ڈکٹیٹر شپ کے خلاف بغاوت بھی کر سکتے ہیں۔“ حسان نے مکاری ہنسی کے ساتھ دھمکایا۔

”پھر تو سوچنا پڑے گا۔“ سرار سلان نے مایوسی سے کہا تھا پھر سب کا مشترکہ قہقہہ گونجا اور بالآخر یہ زبردستی کی لیڈری تسلیم کر لی گئی اور سر جی خوشی خوشی اپنی رول بک کھول کر بیٹھ گئے۔

”کسی نے بیمار نہیں ہونا رول نمبر ون..... جس نے یہ حماقت کی میں نے اسے اٹھا کر دریائے ستلج میں پھینک دینا ہے..... بولو منظور ہے کہ نہیں؟“

”منظور‘ منظور۔“ یک زبان ہو کر آواز آئی۔

”کوئی جھگڑا نہیں کرے گا رول نمبر ٹو..... اور رول نمبر تھری یہ ہے کہ جہاں جانا ہے گروپ کی شکل میں جانا ہے کوئی ”گواچی گاں“ (گمشدہ گائے) کی طرح اکیلا پھرتا نظر نہ آئے مجھے۔“

پانچ سر سعادت مندی سے اثبات میں ملتے رہے۔

”فورتھ اینڈ لاسٹ رول..... لڑکیوں کو دیکھ کر کسی نے شوخا نہیں ہونا۔ نہ ہی خود کو ٹام کروز اور بریڈ پٹ کا جانشین سمجھ کر انہیں متاثر کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگانا ہے بلکہ ان کی طرف دیکھنا بھی نہیں ہے۔“

اصولی طور پر تو یہ اصول بھی سعادت مندی سے قبول کر لیا جانا چاہیے تھا لیکن دس آنکھیں بری طرح سرار سلان کو گھور رہی تھیں۔

”او بھائی ڈرائیور..... ذرا گاڑی روک دے سائیڈ پر۔“ طلحہ نے آواز لگائی تھی۔ ”ایسا بے کار رول فالو کرنے سے بہتر ہے میں اس سیرو تفریح پر ہی فاتحہ پڑھ لوں..... گاڑی روک دو بھائی! اس سے زیادہ خوش تو ہم اپنے علاقے کے فیملی پارک میں ہی ہو لیں گے۔“

”بالکل ٹھیک۔“ حسان نے طلحہ کی ہاں میں ہاں ملائی۔ ”اور میں آپ کو بتا دوں سر جی! اس قدر واہیات رول بنانے پر میں کالا کوٹ پہنے بغیر ہی آپ کے خلاف احتجاج کرنے لگا ہوں۔“

”حسان بھائی! قدم بڑھاؤ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔“ سمیر کی آواز سب سے بلند تھی۔

”او ہو‘ جذباتی قوم کے جذباتی نوجوانو! پہلے پوری بات تو سن لو۔ میرے کہنے کا مطلب تھا لڑکیوں کو متاثر کرنے کے سارے طریقے پرانے ہو چکے ہیں۔ میں تمہیں نئے طریقوں سے متعارف کرواؤں گا۔“ تحمل و بردباری سے کہا۔ ”میں تم لوگوں کو ایسے ایسے لیٹسٹ طریقوں سے متعارف کرواؤں گا کہ عش عش کر اٹھو گے۔“

”مجھے آپ کے کسی لیٹسٹ طریقے کی ضرورت نہیں ہے۔“ سمیر نے ناک چڑھا کر نخوت سے کہا۔

”کیوں بھئی..... آپ کے پاس کوئی گیدڑ سنگھی ہے جسے سنگھا کر آپ.....؟“ سرار سلان کے اندر کا استاد جاگ اٹھا تھا غصے سے پوچھا۔

”میں بتاتا ہوں۔“ تقی نے کہا۔ ”سمیر نے پاپولر فکشن کی خواتین رائٹرز کے تمام ناولز پڑھ رکھے ہیں۔ ہر ناول میں لڑکیوں کو متاثر کرنے کے کم سے کم بھی دو‘ تین آئیڈیاز تو ضرور مل جاتے ہیں اور اتفاق سے وہ سارے آئیڈیاز سمیر کو ازبر ہیں۔ اس لیے اسے کسی مشورے کی ضرورت نہیں ہے۔“ اس بات پر ایک قہقہہ بلند ہوا تھا۔

”میں نہیں جا رہا تم لوگوں کے ساتھ۔“ سمیر منہ بنا کر بولا۔ اس بات پر دوسرا قہقہہ لگا تھا۔ اسی طرح ہنسی مذاق کرتے وہ لوگ اسٹیشن پہنچ گئے تھے۔

☼ ☼ ☼
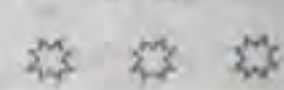
”یہ چکن ڈونٹس چکھ کر دیکھو..... میری بھابھی نے بنائے ہیں۔“ ریسٹ ہاؤس پہنچ کر فرح نے ڈونٹس والا جار فرداً ”فرداً“ سب کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

پائن کے درختوں میں گھرا ہوا ریسٹ ہاؤس پہاڑ کی چوٹی پر واقع تھا۔ اس ریسٹ ہاؤس کی خاص بات یہ تھی کہ یہاں سے پورا شہر ایک ویو میں دکھائی دیتا تھا۔ قدیم طرز تعمیر پر مشتمل یہ عمارت بہت خوب صورت تھی۔ لکڑی کی چھتیں‘ لکڑی کے شہتیر‘ لکڑی کے فرش‘ لکڑی کے زینے‘ بالکونیوں کے آگے کو جھکے ہوئے دلفریب ڈیزائین والے چھجے جن سے زمانہ قدیم کی نینشی ابھرتی تھی۔

عمارت کے چاروں طرف قدرتی سبزے کی بہتات تھی لیکن اندر سبزے کی ایک پتی بھی دکھائی نہ دیتی تھی۔ کمروں کی دیواریں خالی تھیں۔ البتہ مین ہال کی دیواروں پر بہت خوب صورت پینٹنگز لگی ہوئی تھیں اور چھت سے فانوس لٹک رہا تھا‘ جس میں مشعل کی شکل کے الیکٹرک بلب نصب تھے کاریڈورز میں لکڑی کا بہت اعلیٰ کام تھا جبکہ ہال اور کاریڈورز میں آرائشی مورتیاں بھی رکھی گئی تھیں۔ جنہیں دیکھتے ہی ثمر نے ناپسندیدگی کا سرٹیفکیٹ بھی جاری کر دیا تھا۔

طویل سفر نے ان سب کو تھکا دیا تھا۔ چار چار لڑکیوں کو ایک ایک کمرا الاٹ کیا گیا تھا۔ ان چاروں نے شکر ادا کیا کہ ان کا کمرہ ایک ہی ہو گا اور کسی اور لڑکی کو اندر آنے کی اجازت نہیں ہو گی۔

ثمر اور حرم آتے ہی جو بیڈ پر گریں تو اب تک اٹھنے کا نام نہ لیا۔ شفا اور فرح نہ صرف ریسٹ ہاؤس کا ایک چکر لگا آئی تھیں بلکہ انہیں یہ بھی پتا چل چکا تھا کہ کون کون سے گروپ کس کمرے میں ٹھہرے ہیں۔ اب شفا کھڑکی کھولے دوربین آنکھوں سے چپکائے نیچے وادی میں جھانک رہی تھی جبکہ فرح اپنا سوٹ کیس کھول کر بیٹھ گئی تھی۔

”ڈونٹس تو بہت مزے کے ہیں فرح! تمہاری بھابھی کے ہاتھ میں تو بہت ذائقہ ہے..... تمہارے تو بھئی مزے ہیں۔ ہر روز مزے مزے کی چیزیں کھانے کو

ملتی ہوں گی۔" حرم نے ڈونٹ کھاتے ہوئے کہا۔
"میری بھابھی سال میں ایک بار کچن میں قدم رنجہ فرماتی ہیں اور خدا جھوٹ نہ بلوائے تو اس قدر بکواس کھانا بناتی ہیں کہ ہم باقی کے تین سو چونسٹھ دن اسی کوشش میں گزار دیتے ہیں کہ وہ دوبارہ کچن میں جانے کی زحمت ہی نہ کریں۔" فرح نے مزے سے کہا۔
"تو یہ ڈونٹس کیا آسمان سے اترے ہیں؟" ثمر نے تعجب و نا سمجھی سے پوچھا۔
"ایک یہی واحد چیز ہے، جو وہ ڈھنگ کی بنا لیتی ہیں ___ اور وہ میں منتیں کر کے بنوا کر لائی ہوں ___ ورنہ اس سال کا چکر تو وہ کئی روز پہلے ہی لگا چکی تھیں۔"
"مجھے روایتی نند کے جلنے کی بو آ رہی ہے۔" حرم نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا تھا۔
"میں کیوں جلوں گی یار!" فرح نے کہا۔
"تمہیں شاید پتا نہیں ہے کہ بھابھی وہ واحد مخلوق ہوتی ہے جو کتنی بھی سلیقہ مند اور سگھڑ کیوں نہ ہو۔ اس کے کام میں نفاست اور ہاتھ میں ذائقہ ہرگز نہیں ہوتا۔" فرح نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔
"اور تمہیں یقیناً" یہ نہیں پتا کہ نند وہ مخلوق ہوتی ہے جس کو جتنی بھی محبت اور خلوص دے لو، وہ جھگڑالو، فسادن اور غاصب ہی رہتی ہے۔" حرم نے دوبدو کہا۔
"اب تم کیوں جل رہی ہو؟" ان تینوں نے بیک وقت حرم کی طرف دیکھا تھا۔
"اتفاق سے میں تین عدد چڑیل صفت نندوں کی بھابھی ہوں جنہوں نے میری رخصتی سے پہلے ہی میری ناک میں دم کر کے رکھا ہوا ہے۔" حرم نے جتنی بے چارگی سے کہا تھا۔ اتنا ہی بے ساختہ ان تینوں کا قہقہہ تھا۔
"ویسے یہ بات مجھے آج تک سمجھ میں نہیں آئی کہ بھابھیوں کے منہ سے نند کی اور نندوں کے منہ سے بھابھیوں کی برائی ہی کیوں نکلتی ہے؟ آخر ایسی کیا خامی ہے اس رشتے میں، جو وہ دونوں ایک دوسرے کی برائی کرنے پر مجبور ہو جاتی ہیں؟" فرح نے سوٹ کیس کھلا چھوڑ دیا تھا اور بیڈ پر لیٹ گئی تھی۔
"یار! رشتے میں برائی نہیں ہوتی، ساری بات دراصل مفادات کی ہوتی ہے۔" ثمر نے کہا تھا۔ "اگر بھابھی کے مفادات زیادہ ہوں گے تو وہ نند کی برائی کرے گی اور اگر نند کے مفادات زیادہ ہوں گے تو وہ بھابھی کی برائی کرتی نظر آئے گی۔ ورنہ اسی رشتے میں بہت محبت سے بھی رہتے ہیں لوگ۔" ثمر کا تجزیہ صاف اور ستھرا تھا۔
"ثمر بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے۔" شفا نے ثمر کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا تھا۔ "نند بھابھی کا رشتہ خوامخواہ بدنام کیا ہوا ہے لوگوں نے۔ میری اور ساہر بھابھی کی مثال تم لوگوں کے سامنے ہے۔ ہم دونوں کے تو ایسے کوئی اختلافات نہیں ہیں جن کی خاطر ہم دونوں ہر وقت ایک دوسرے کی ٹانگیں کھینچتے نظر آئیں۔ کوئی ایسی بات ہو بھی جس میں ہمارا کلیش ہو رہا ہو تو ہم دونوں کمپرومائز کر لیتے ہیں اور جھگڑا ہونے سے پہلے ہی ختم ہو جاتا ہے۔ ہم نند بھابھی تو بہت محبت سے رہ رہے ہیں۔"
"اپنی مثال نہ دو شفا! تمہارا گھر جو جنت کی عملی تصویر بنا ہوا ہے تو اس میں سارا کمال تمہاری ساہر بھابھی کا ہے۔ وہ تو بالکل فرشتہ صفت ہیں۔ عام انسانوں والی باتیں تو ان میں ہیں ہی نہیں۔ میں تو کہتی ہوں انہیں انسان کہنا بھی زیادتی ہے انہیں تو دیوی کہنا چاہیے۔ شکر ادا کیا کرو تم لوگ ہندوستان میں نہیں رہتے ورنہ جتنی تمہاری بھابھی میں خصوصیات ہیں ___ بت پرستوں نے تو ان کی مورتی بنا کر ان کی پوجا شروع کر دینی تھی۔"
شفا نے ثمر کو دیکھا اور سب سمجھ گئی۔ البتہ حرم اور فرح تعجب سے پوچھ رہی تھیں۔
"واقعی شفا!" شفا نے خاموشی سے رخ کھڑکی کی طرف موڑ لیا۔
"شفا تو اپنی بھابھی کی تعریف میں پورا قصیدہ لکھ سکتی ہے۔" ثمر نے جل کر لیکن بظاہر مسکرا کر کہا تھا۔
"ثمر! میری بھابھی کے بارے میں کچھ نہ کہو۔ میں ان کی تعریفیں بے وجہ نہیں کرتی۔ وہ دنیا کی بیسٹ

بھابھی ہیں۔" شفا نے سادگی سے کہا تھا۔
"اور یہ بیسٹ بھابھی خوش قسمت بھی بہت ہیں کہ انہیں تم جیسی چغد نند ملی ہے۔" ثمر نے سابقہ انداز میں کہا۔ شفا اسے دیکھ کر رہ گئی اور ثمر کو شاید اس کی شکل دیکھ کر ترس آ گیا تھا۔ تب ہی موضوع بدل دیا۔
شفا دانستہ کان بند کر کے نیچے وادی میں بل در بل پیچ اور دھند میں لپٹی سڑک کو دیکھنے لگی۔
وہ جانتی تھی ثمر ساہر بھابھی کو کچھ خاص پسند نہیں کرتی۔ وہ اکثر ان کے خلاف بولتی اور شفا کو ان کے خلاف بھڑکانے کی کوشش کرتی تھی لیکن شفا کے دل میں ان کے لیے اتنا احترام اور محبت موجود تھی کہ اس پر کوئی بات اثر نہ کرتی۔
گو کہ بھابھی واقعی بہت اچھی تھیں لیکن ان کے بارے میں اچھا سوچنے میں کسی قدر ہاتھ شفا کی شرمساری کا بھی تھا۔ یہ وہ احساس تھا جسے شفا اپنی سہیلیوں سے بھی ڈسکس نہیں کر سکتی تھی۔ وہ انہیں کیسے بتاتی کی نند اگر اس کے جیسی ہو تو بری بھی ہو سکتی ہے۔

☼ ☼ ☼

ٹرین کی روانگی سے قبل سارا سامان از سر نو چیک کیا گیا کہ کچھ رہ نہ جائے۔ پتا چلا سمیر چھ ڈائجسٹ اور تین سفرنامے ساتھ لے جا رہا ہے۔
"جہلم اسٹیشن سے جب ہم نان پکوڑے لیں گے تو انہی رسالوں کے صفحوں کو بطور دسترخوان استعمال کیا جائے گا۔" حسان نے اطمینان سے سمیر کی دکھتی رگ چھیڑ دی تھی۔
"خبردار! جو کسی نے میرے ڈائجسٹوں کو بری نظر سے دیکھا۔" سمیر تڑپ کر آگے بڑھا تھا۔ "یہ ڈائجسٹ میں سفر کے دوران تم لوگوں کی بے کار باتوں کی بوریت سے بچنے کے لیے ساتھ لے جا رہا ہوں۔ تم لوگوں نے پڑھنے ہوں تو مانگ لینا۔ دو عقل والی باتیں تم لوگ بھی سیکھ لو گے لیکن وحشیانہ طریقے سے پھاڑنے کی اجازت میں ہرگز نہیں دوں گا۔"
"ہمیں زنانہ ڈائجسٹ پڑھنے کا کوئی شوق نہیں ہے... یہ شوق تمہیں ہی مبارک ہو۔"
"ہونہہ۔" سمیر نخوت سے بیگ کی زپ بند کرنے لگا۔
اسے کتب بینی کا شوق بچپن سے تھا۔ جس عمر میں لڑکے گلی اور اسپن پر ہاتھ صاف کر رہے ہوتے ہیں، وہ اپنی باجیوں کی الماری سے رضیہ بٹ اور بشریٰ رحمن کے ناول چوری کر کے پڑھا کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ جہاں اس کا یہ شوق اسے اعلیٰ ادبی رجحانات کی طرف لے گیا اور اسے خواتین کے مشہور ماہناموں کے مطالعے میں مزا آنے لگا وہیں اسے اپنے دوستوں کی طرف سے اکثر مذاق کا نشانہ بھی بننا پڑتا لیکن آفرین ہے سمیر کی مستقل مزاجی اور استقلال پہ۔ مجال ہے جو ایک بھی بار اس نے ڈائجسٹ نہ پڑھنے کا سوچا ہو۔ تقی تو سب کو سمجھاتا۔
"تم لوگ سمیر کو ٹوکنا چھوڑ دو، میں تو کہتا ہوں تم لوگ بھی ڈائجسٹ پڑھا کرو۔ اس سے پتا چلتا ہے لڑکوں کو کس طرح کے انداز اور طور طریقے اپنانے چاہئیں۔ ان میں موجود کہانیوں سے لڑکوں کو اپنی پرسنالٹی امپروو کرنے میں بہت مدد ملتی ہے۔" وہ جتنی سنجیدگی سے کہتا تھا، اتنی ہی سمیر کو آگ لگ جاتی تھی۔ وہ ایک بار اسے بتا بیٹھا تھا فرحت اشتیاق اور نبیلہ ابر راجہ اس کی پسندیدہ مصنفین ہیں۔
"ان دونوں کے ہیروز میں مجھے اپنی جھلک نظر آتی ہے۔" تقی کی وجہ پوچھنے پر سمیر نے اترا کر بتایا تھا۔
"اچھا ___ تو ان دونوں کے ہیروز چغد ہوتے ہیں؟" تقی نے دلچسپی سے پوچھا تھا۔
"جی نہیں ___ وہ تو بہت باکمال اور ہینڈسم نوجوان ہوتے ہیں جیسے کہ میں ہوں۔" سمیر نے بدک کر کہا۔ تقی ہنس ہنس کر دوہرا ہو گیا تھا۔ اور اس کے بعد تو جیسے اس نے سمیر کی چھیڑ ہی بنا لی تھی۔ سمیر لاکھ چڑتا لیکن تقی کو کون روکے بھلا۔ گو کہ اسے پڑھنا بڑا مشکل کام لگتا تھا لیکن صرف اور صرف سمیر کو چڑانے کے لیے

اس نے متعلقہ مصنفین کے ایک دو ناولز پڑھ ڈالے تھے۔ بخشتا تو خیر وہ پہلے بھی نہیں تھا مگر اس کے بعد تو بس حد ہی ہو گئی۔ بعض مرتبہ تو سمیر سر پکڑ کر بیٹھ جاتا تھا کہ اس کے سامنے یہ بات کہی کیوں۔

سمیر نے بیگ کی زپ بند کر کے سیٹ کے نیچے ٹھونس دیا۔ انہوں نے سفر کی دعا با آواز بلند پڑھ کر سفر کا آغاز کیا۔ ٹرین وسل بجا کر ہولے ہولے پٹڑی پر آگے کی طرف کھسکنے لگی تھی بتدریج اس نے رفتار پکڑی اور بہت تیزی سے کھڑکیوں سے باہر مناظر گزرنے لگے۔

وہ لوگ کچھ دیر آپس میں خوش گپیوں میں مصروف رہے پھر صبح کی سستی نے ان سب کو گھیر لیا۔ سر ارسلان اور طلحہ برتھ پر چڑھ گئے۔ ثاقی اور حسان نے وہیں سیٹوں پر پیر پھیلائے اور سستانے لگے۔ سمیر نے "منہ دل کعبے شریف" میں منہ گھسا لیا۔ تقی بے زاری سے بیٹھا رہا، پھر دروازے میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ ہوا زور زور سے اس سے ٹکراتی تھی۔ مکان، بازار، گاڑیاں، خاک میں اٹے میدان، کھیت، درخت سب پیچھے کی طرف دوڑے جاتے تھے۔ وہ بے مقصد وہاں بڑی دیر تک کھڑا گزرتے مناظر کو دیکھتا رہا پھر سمیر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا وہ چونک کر پلٹا۔

"تو کیا پرانی فلموں کی ہیروئنز والے پوز مار رہا ہے؟" سیدھی بات تو ان دوستوں کے درمیان گویا حرام ہی تھی۔ تقی نے نفی میں سر ہلایا اور باہر دیکھنے لگا۔

"تقی! تجھے پتا ہے ناں میں اچھا فیس ریڈر نہیں ہوں... بتا تو سہی ہوا کیا ہے؟" سمیر نے زور دے کر کہا۔

"کچھ خاص نہیں... بس میری قسمت ہی خراب ہے۔" اس نے نروٹھے پن سے جواب دیا۔

"واہ... پہلے تو صرف ہیروئنوں والے پوز مار رہے تھے اب تو ڈائیلاگز بھی بول رہے ہو۔"

"شٹ اپ سمیر!" تقی نے چڑ کر کہا پھر اسی چڑچڑاہٹ کے ساتھ سارا قصہ اس کے گوش گزار کر دیا۔

"کل اسٹور پر ابا نے چار بار فون کر کے میرے بارے میں پوچھا۔ توقیر نے چاروں بار کہہ دیا میں نماز پڑھ رہا ہوں۔ پانچویں بار فون کرنے کے بجائے ابا بہ نفس نفیس میری خبر لینے پہنچ گئے کہ ایسی کیا مصیبت آئی کہ میں نفلی نمازیں پڑھتا جا رہا ہوں لیکن میں اسٹور پر ہوتا تو ملتا نا۔ اس پر مصیبت یہ ہوئی کہ دو ملازمین کا جھگڑا ہو گیا۔ ابا جس وقت پہنچے دونوں گتھم گتھا ہو رہے تھے ابا نے وہاں تو معاملہ سنبھال لیا مگر صبح مجھے اتنی باتیں سنائی ہیں کہ کیا بتاؤں...."

"غلطی تو ہوئی ہے تقی!" سمیر نے قدرے شرمندگی سے کہا تھا کیونکہ اسے پتا تھا تقی کی کتنی درگت بنی ہو گی اور وہ بھی محض اس لیے کہ وہ اس کے ساتھ چلا گیا تھا۔

"مان گیا تھا میں... معافی بھی مانگی... لیکن ابا!"

"اچھا چھوڑو اب اس بات کو۔" سمیر نے اس کا ذہن ہٹانا چاہا۔

"اب چھوڑنا نہیں ہے۔" تقی نے قطعیت سے کہا۔ "میں نے سوچ لیا ہے اب نوکری تو ڈھونڈنا ہی پڑے گی۔ روپیہ کما کر ابا کے ہاتھ پر رکھوں گا تو شاید انہیں میری قدر آئے۔ اگلی بار ابا نے ڈانٹا... بلکہ واپس جا کر ہی میں گھر چھوڑ دوں گا۔ جہاں دن رات ذلیل ہونا پڑے، مجھے وہاں رہنا ہی نہیں ہے۔" وہ بہت زیادہ جذباتی ہو رہا تھا۔ سمیر نے تائید میں سر ہلا دیا۔

"ٹھیک ہے جو تم مناسب سمجھو۔" اس نے تقی کا کندھا تھپتھپا کر کہا۔ وہ سمجھ گیا تھا کم سے کم اس وقت تقی کو سمجھانے کا کوئی فائدہ نہ ہوتا، تب ہی اس نے یہ کام کسی اور وقت کے لیے ٹال دیا اور تقی کا دل بہلانے کے لیے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا۔

☆ ☆ ☆

جس وقت عمیر بھائی کی شادی ہوئی، وہ بہت چھوٹی تھی۔ اسے صحیح اور غلط کا فرق نہیں پتا تھا۔ اپنے بچپنے کی جذباتیت کے ہاتھوں کٹھ پتلی بن کر اس نے بھابھی کو بہت تنگ کیا تھا۔

دراصل عمیر بھائی صرف اس کے بھائی ہی نہیں تھے، وہ اس کی زندگی کا ہر رشتہ تھے۔ بھائی، بہن، ماں، باپ، دوست لیکن سماہر بھابھی کے آتے ہی جیسے سب کچھ بدلنے لگا تھا۔ ان کی توجہ بھابھی کی طرف رہنے لگی تھی یہ بھی نہیں کہ انہوں نے شفا کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا تھا بس یہ ہوا تھا کہ ان کی توجہ جس کا مرکز پہلے شفا ہوتی تھی، اب اس توجہ کو بھابھی نے تقسیم کر دیا تھا۔

اور یہی بات شفا کو کھٹکتی تھی۔

وہ بچی تھی لیکن بھابھی بچی نہیں تھیں، انہیں جلد ہی شفا کی چالاکیاں سمجھ میں آنے لگیں لیکن یہ ان کا بڑا پن ہی تھا کہ وہ اس کی بدتمیزیوں پر تحمل کا مظاہرہ کرتیں۔ کبھی کبھی ان کی برداشت جواب بھی دے جاتی لیکن اکثر و بیشتر وہ ان جھگڑوں کو ٹال دیتیں جن کے لیے شفا بڑی ہوشیاری سے فضا قائم کرتی تھی۔

ایسے میں شفا اور زیادہ جھنجھلاتی اور پہلے سے زیادہ بدتمیزیوں پر اتر آتی۔

عمیر بھائی سے دوری کی بنا پر اس کی زندگی میں خلا پیدا ہو گیا تھا۔ اسے اپنا آپ بہت تنہا لگتا۔ قریبی رشتوں کی تو پہلے ہی کمی تھی اس کی زندگی میں۔ سماہر بھابھی نے عمیر بھائی کو بھی چھین لیا۔

تنہا بیٹھ کر وہ جانے کیا کیا سوچتی۔

اس روز بھابھی کی کوئی سہیلی ان سے ملنے آئی ہوئی تھیں جن کے سامنے شفا نے جان بوجھ کر بدتمیزی کی۔ اپنی سہیلی کے جانے کے بعد بھابھی نے ایک جھلستی ہوئی نگاہ اس پر ڈالی اور اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ شفا پہلے تو دل ہی دل میں خوش ہوتی رہی کہ اس نے بھابھی کی بے عزتی کروا دی پھر اسے شرمندگی محسوس ہونے لگی۔ اسے اپنے دل میں اٹھتی شرمندگی سے بھی اکتاہٹ ہو رہی تھی۔ دل اور دماغ کی کشمکش سے وہ بری طرح اکتا گئی۔ یہاں تک اسے تنہائی اور اکیلے پن نے گھیر لیا اور وہ بیٹھ کر رونے لگی۔ اسے امی بہت شدت سے یاد آ رہی تھیں۔ پہلی بار اس نے سوچا کاش اس کی کوئی بہن بھی ہوتی۔

لیکن اس روز کے آنسوؤں کا فائدہ یہ ہوا کہ اگلے کئی روز تک عمیر بھائی اسے بھرپور ٹائم دیتے رہے۔ گو کہ وہ دیکھ رہی تھی کہ بھائی بھابھی کے درمیان کوئی کھٹ پٹ چل رہی ہے لیکن اس کے لیے یہی بہت تھا کہ بھائی اس کی طرف متوجہ رہنے لگے ہیں۔

ہدیہ کی پیدائش کے بعد اس کے دل میں سماہر بھابھی کے لیے موجود ناپسندیدگی میں کسی قدر کمی آئی تھی۔ اسے چونکہ ہدیہ اچھی لگتی تھی اس کی وجہ سے سماہر بھابھی بھی تھوڑی سی اچھی لگنے لگی تھیں۔ کچھ یہ بھی تھا کہ بھابھی کا رویہ بھی اس کے ساتھ بہت اچھا رہنے لگا تھا۔ وہ جھگڑے پہلے بھی ٹالتی تھیں اب اور زیادہ کوشش کرتیں۔ شفا کوئی سلگانے والی بات کرتی بھی تو سہ لیتیں۔ سخت رد عمل نہ کرتیں۔

لیکن اتنی ساری باتوں کے باوجود شفا کے دل میں ان کے لیے بہت گنجائش پیدا نہ ہوئی تھی۔ وہ پہلے سے زیادہ تنہائی پسند ہو گئی تھی۔ سماہر بھابھی سے جھگڑے بھی کم ہو گئے تھے لیکن ختم نہیں ہوئے تھے۔ جب بھی جھگڑا ہوتا شدید ہوتا اور اس کی خوشی کی انتہا نہ رہتی، جب بھائی اس کا ساتھ دیتے۔

کبھی کبھار وہ محض بھائی کو اپنا ساتھ دیتا دیکھنے کے لیے بھابھی سے جھگڑا کرتی تھی اور چونکہ فطرتاً بری نہیں تھی، اس لیے بعد میں شرمندہ بھی ہوتی۔ سماہر بھابھی سے اس کی کدورت درست سہی لیکن اس نے کبھی یہ نہیں چاہا تھا کہ عمیر بھائی ان پر ہاتھ اٹھائیں۔

ان کی شادی کی سالگرہ والے روز کسی معمولی سی بات پر بحث ہو گئی تھی جس کی بنا پر بھائی نے اسے بری طرح جھڑک دیا تھا۔ شفا کو پہلے ہی سماہر بھابھی پر غصہ آ رہا تھا، ان کے سامنے ڈانٹ پڑنے پر احساس توہین کے مارے بالکل ہی ہتھے سے اکھڑ گئی۔

اب اسے تب تک سکون نہیں آنا تھا، جب تک اس کے سامنے بھابھی کو بھی ڈانٹ نہ پڑ جاتی۔ اسی

لیے اس نے سیڑھیوں سے گرنے کے بعد جھوٹ بول دیا کہ سماہر بھابھی نے اسے دھکا دیا ہے۔ جس وقت وہ جھوٹ پر جھوٹ بول رہی تھی' اسے اپنی غلط بیانی کی بدصورتی کا احساس تک نہ ہوا تھا۔

لیکن جیسے ہی عمیر بھائی نے انہیں تھپڑ مارا' شفا دنگ ہو کر خاموش ہو گئی تھی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ بھائی بھابھی پر ہاتھ بھی اٹھا سکتے ہیں۔

☼ ☼ ☼

شفا کئی روز تک شرمندگی کا شکار رہی۔ اس میں سماہر سے نظریں ملانے کی ہمت بھی نہیں رہی تھی۔ ان کی اتری ہوئی صورت اور روئی ہوئی آنکھیں مستقل اس کے دل پر کچوکے لگاتی رہیں' تب اس نے دل کڑا کر کے ان سے معافی مانگ لی۔

"آئی ایم سوری۔۔۔ مجھے غصہ ضرور آ گیا تھا لیکن میں یہ نہیں چاہتی تھی کہ بھائی آپ پر ہاتھ اٹھائیں۔۔۔ میری وجہ سے بھائی نے بہت غلط کیا۔ انہیں آپ کو مارنا نہیں چاہیے تھا۔ پلیز! مجھے معاف کر دیں۔" وہ اس کے کمرے میں دودھ کا گلاس رکھنے آئی تھیں۔ تب شفا نے جھجکتے ہوئے کہا تھا۔

"میں نے دودھ کا گلاس رکھ دیا ہے۔ ساتھ ہی میڈیسن بھی رکھی ہے' کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو بتا دو۔"

اس کی بات کے جواب میں سماہر بھابھی نے نرمی لیکن لاتعلقی سے پوچھا تھا۔ انہوں نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں تھی۔ ویسے بھی شفا نوٹ کر رہی تھی' اس واقعہ کے بعد سے بھابھی کے انداز میں عجیب سی سرد مہری اور لاتعلقی آ گئی تھی گو کہ وہ شفا کا پورا خیال رکھ رہی تھیں اس کے کھانے پینے' پہننے اوڑھنے کا خیال رکھتیں روزانہ سہارے سے چلانے کی پریکٹس بھی کرواتیں اور دوا کا بھی پورا خیال رکھتیں لیکن اس کے علاوہ وہ شفا سے کوئی بات نہ کرتیں۔

وہ بھابھی سے زیادہ اور گھر کے ایک فرد کے برعکس کسی نرس کی طرح اس کے ساتھ لگی ہوئی تھیں۔

"بھابھی! میں آپ سے ایکسکیوز کر رہی ہوں۔"

"میں نے سن لیا ہے۔۔۔ کوئی کام ہو تو آواز دے لینا۔" وہ آہستگی سے کہہ کر باہر نکل گئی۔

شفا بے دم سی ہو کر بیٹھی رہی۔ اس کی معذرت کو نظر انداز کر دیا گیا تھا۔

دن اسی طرح گزرنے لگے۔ گھر کا ماحول عجیب سا ہو گیا تھا۔ سارا دن خاموشی چھائی رہتی۔ سماہر بھابھی وقتاً "فوقتاً" اس کے کمرے میں آ کر اس کی ضروریات کے متعلق پوچھ لیتیں لیکن کچھ دیر اس کے پاس بیٹھنے کا تردد ہرگز نہ کرتیں۔ عمیر بھائی اور ان کے درمیان بول چال بند تھی۔ اس بار ناراضی زیادہ طویل ہو گئی تھی۔ عمیر بھائی بھی جھنجلائے پھرتے۔ زیادہ وقت گھر سے باہر ہی گزارتے اور گھر آ کر ہدیہ پر غصہ اتارتے۔

شفا شرمندگی کے بوجھ تلے دن بہ دن دب رہی تھی' جو بھی ہوا سارا قصور اسی کا تھا۔

پھر اسی دوران سیالکوٹ سے ثروت خالہ چلی آئیں۔ وہ ان کی سگی خالہ تھیں۔ عمیر بھائی اور شفا کی ان سے بہت دوستی تھی۔ وہ تین روز کے لیے آئی تھیں۔ پہلے چپ چاپ دو روز تک گھر کے ماحول کا جائزہ لیتی رہیں' تیسری رات شفا کا پیچھا لیا۔ اگلی صبح ان کی روانگی تھی۔

"گھر میں کیا بات ہوئی ہے۔ عمیر اور سماہر تو مجھے کچھ بتا نہیں رہے اب تم ہی اگلو۔۔۔ اور سنو! مجھ سے جھوٹ مت بولنا۔"

ثروت خالہ سے دوستی بھی تھی اور کچھ وہ اپنا دل بھی بوجھل کیے بیٹھی تھی سو ایک سانس میں ساری بات سچ سچ بتا دی۔

"شفا! مجھے یقین نہیں آ رہا۔۔۔ تم اتنی بری حرکت کیسے کر سکتی ہو۔" ثروت خالہ نے ہمدردی کے بجائے اس کے خوب لتے لیے تھے۔

"میں ایسا نہیں چاہتی تھی خالہ جان! بس بے ساختگی میں میرے منہ سے جھوٹ نکل گیا۔" اس نے شرمندگی سے کہا۔

"ایسا جھوٹ انسان بے ساختگی میں بھی تب ہی بولتا ہے' جب اس کے دل میں کسی کے خلاف عناد ہو۔" خالہ تو جرح کرنے لگی تھیں۔

"مجھے سماہر بھابھی اچھی نہیں لگتیں۔" اس نے سر جھکا کر شرمندگی سے کہا تھا۔

"کیوں؟"

"پتا نہیں۔"

"کسی کو ناپسند کرنے کی کوئی نہ کوئی وجہ تو ہوتی ہے۔" ثروت خالہ نے کہا۔ "کیا سماہر تم سے برے طریقے سے پیش آتی ہے؟"

"نہیں۔" اس نے سابقہ انداز میں کہا تھا۔

"کیا وہ تمہارا خیال نہیں رکھتی؟"

"رکھتی ہیں۔"

"تم سے جھگڑا کرتی ہے؟"

"نہیں۔۔۔ میں کرتی ہوں۔"

"پھر تو اسے تم کو ناپسند کرنا چاہیے۔"

"وہ بھی مجھے ناپسند کرتی ہیں۔"

"تم نے کیسے اندازہ لگایا؟"

"مجھے ایسا لگتا ہے۔"

"میں تین دن سے آئی ہوئی ہوں۔ میں نے تو اس دوران سماہر کے رویے میں ایسی کوئی بات نہیں دیکھی جس سے پتا چلے وہ تمہیں ناپسند کرتی ہے۔ البتہ تمہارا رویہ ضرور قابل گرفت لگا ہے مجھے۔"

شفا سر جھکائے خاموشی سے بیٹھی رہی۔

"تمہارے پاس سماہر کو ناپسند کرنے کی کوئی ٹھوس وجہ ہے تو مجھے بتاؤ۔"

"انہوں نے عمیر بھائی کو مجھ سے چھین لیا۔ کیا انہیں ناپسند کرنے کے لیے یہ وجہ کافی نہیں ہے۔" اس نے تیز لہجے میں کہا۔

ثروت خالہ اس کی بات سن کر دنگ رہ گئیں پھر انہوں نے تحمل سے کہا۔

"نہیں۔۔۔ یہ وجہ کافی نہیں ہے۔"

"خالہ جان! عمیر بھائی میرے بھائی تھے' سماہر بھابھی نے انہیں میرا نہیں رہنے دیا۔ شادی سے پہلے وہ ایسے نہیں تھے۔ وہ دیر تک مجھ سے باتیں کرتے تھے۔ میرے ساتھ بیٹھتے تھے۔ مجھے آؤٹنگ پہ لے جاتے تھے۔ میرے اسکول کی میری فرینڈز کی باتیں سنتے تھے۔ مجھے پڑھائی میں مدد دیتے تھے۔۔۔ لیکن جب سے سماہر بھابھی آئی ہیں وہ ایسا کچھ نہیں کرتے۔ میں کہتی ہوں آؤٹنگ کے لیے چلیں۔ میرے ساتھ کیرم کھیلیں تو وہ انکار کر دیتے ہیں اور سماہر بھابھی کہیں تو فوراً" راضی ہو جاتے ہیں۔"

وہ بولتی چلی گئی۔ تم لہجے میں اس نے اپنے بوجھل دل کی ساری بھڑاس خالہ کے سامنے نکال دی۔ اس کے شکووں اور اعتراضات سے بچپنا جھلکتا تھا۔

"سماہر بھابھی نے میرے ساتھ بہت برا کیا ہے۔ میرے پاس عمیر بھائی کے سوا اور تھا ہی کون' انہیں بھی بھابھی نے مجھ سے دور کر دیا۔ ابھی صرف دور کیا ہے۔ مجھے لگتا ہے' کسی دن وہ بھائی کو مجھ سے بہت دور بھی لے جائیں گی اتنی دور کہ پھر ان تک میری رسائی بھی ممکن نہیں ہو گی۔۔۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود میں اپنی اتنی غلطی ضرور مانتی ہوں کہ مجھے ایسا جھوٹ ہرگز نہیں بولنا چاہیے تھا کہ بھائی بھابھی پر ہاتھ اٹھاتے۔"

"چلو یہ بھی غنیمت ہے کہ تمہیں اپنی کسی غلطی کا احساس تو ہے۔" ثروت خالہ نے گہری سانس بھرتے ہوئے کہا۔

"ورنہ بھائی کو خود سے دور کرنے والی حرکتیں تو تم خود کر رہی ہو۔۔۔ میں تو آج تک اپنی بیٹیوں کو تمہاری مثال دیتی ہوں کہ کس قدر سمجھ داری سے تم نے گھر اور رشتوں کو سنبھالا ہوا ہے لیکن یہاں آ کر پتا چلا تم نے تو حد کی ہوئی ہے۔ سارا خاندان جانتا ہے کہ تم نے سماہر کا ناک میں دم کیا ہوا ہے۔۔۔ یہ ساری باتیں سماہر نے تو خاندان میں نہیں پھیلائیں' ظاہر ہے جو رشتہ

دار گھر آتے جاتے رہے، انہوں نے تمہارے رویے سے خود ہی اندازہ لگا لیا کہ تمہارے اور ساہر کے درمیان تعلقات کس قدر کشیدہ ہیں۔"

"آپ کیسے کہہ سکتی ہیں ساہر بھابھی نے خاندان میں باتیں نہیں پھیلائیں؟" شفا کو یہ سن کر دھچکا لگا تھا کہ خاندان میں بھی سب اسی کو برا کہہ رہے ہیں۔

"یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کیے میں نے۔ اتنا تو انسان کو پہچان ہی سکتی ہوں کہ وہ فطرتاً" کیسا ہے۔ ساہر غیر خاندان سے آئی ہے لیکن وہ اچھے مزاج کی لڑکی ہے۔ یہاں وہاں بیٹھ کر نند کی برائی نہیں کر سکتی۔ پھر ہمارے خاندان میں وہ جانتی ہی کتنے لوگوں کو ہے کہ ان سے بے فکر ہو کر گفتگو کرے یا تمہارے خلاف ان کے کان بھرے۔"

"آپ بھی ان ہی کی سائیڈ لے رہی ہیں۔۔۔ شاید بُرے مزاج کی لڑکی تو میں ہی ہوں۔"

"کس نے کہا کہ تم بُری ہو۔" ثروت خالہ نے پیار سے اس کے سر پر چپت لگاتے ہوئے کہا۔

"بس تم ناسمجھ ہو۔۔۔ تمہیں بات سمجھ لینا چاہیے کہ جو بہنیں اپنے بھائیوں کی بیویوں کی عزت نہیں کرتیں۔ انہیں بہانے بہانے سے زچ کرنے کی کوشش کرتی رہتی ہیں تو ایک وقت آتا ہے جب وہ بھائی بھی اپنی بہنوں کی عزت کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔۔۔ تمہیں خوف ہے کہ ساہر عمیر کو تم سے دور نہ لے جائے اور مجھے ڈر ہے اگر تم اسی طرح ساہر کو تنگ کرتی رہیں، عمیر سے اس کی جھوٹی سچی شکایتیں لگاتی رہیں تو عمیر تم سے خود ہی دور نہ ہو جائے۔"

"آپ مجھے ڈرا رہی ہیں خالہ!" اس نے دہل کر کہا۔

"ڈرا نہیں رہی، سمجھا رہی ہوں۔"

"لیکن کیا سمجھا رہی ہیں؟ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔" اس نے سر ہاتھوں میں گراتے ہوئے لاچاری سے کہا۔

ثروت خالہ مسکرائیں اور اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے پیار سے تھپکتے ہوئے بولیں۔

"سنو شفا! ہوتا دراصل یوں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے دل میں ہر رشتے کے اعتبار سے محبت کا الگ الگ خانہ رکھا ہوتا ہے۔ یعنی ماں کی محبت کا خانہ الگ، باپ کا الگ، بہن بھائیوں اور دوستوں کی محبت کا الگ۔۔۔ اسی طرح بیوی کی محبت کا خانہ بھی الگ ہوتا ہے۔۔۔ مرد ماں اور بہنوں کی محبت کا کوٹہ بیوی پر نہیں لٹا سکتا، نہ بیوی کے حصے کی محبت ماں بہنوں پر نچھاور سکتا ہے۔ یہ قانون قدرت ہے۔"

"مطلب؟" وہ الجھی۔

"مطلب یہ کہ عمیر کے دل میں شفا کی محبت کا خانہ الگ ہے اور ساہر کی محبت کا الگ۔۔۔ لیکن چونکہ تمہیں عمیر کی توجہ میں کمی بیشی کا پہلا تجربہ تھا اس لیے تمہیں ساہر سے پرخاش ہو گئی کہ شاید وہ عمیر کو تم سے دور لے جا رہی ہے اور تم یہ بات سمجھ نہیں پائیں۔۔۔ لیکن وقت ابھی تمہارے ہاتھ میں شفا! عمیر کو اس کی بیوی سے متنفر کرنے کی کوششیں بند کر دو۔۔۔ ایسا نہ ہو کل کو جب عمیر کو پتا چلے کہ تم جھوٹ بولتی رہی ہو تو وہ تم سے نفرت کرنے لگے۔

ساہر بہت اچھی لڑکی ہے، پہلے دن سے تمہارے ساتھ اچھے طریقے سے پیش آ رہی ہے۔ اس کی قدر کرو شفا! اتنی اچھی بھابھیاں قسمت سے ملا کرتی ہیں۔۔۔ میری مانو اس سے اپنی غلطیوں کے لیے معافی مانگ لو۔ اچھی لڑکی ہے وہ۔۔۔ دونوں مل جل کر رہو تاکہ عمیر بھی پرسکون ہو کر اپنی ملازمت اور کاروبار پر دھیان دے سکے۔"

شفا کے لیے یہ باتیں نئی تھیں۔ اس وقت وہ نویں کلاس میں تھی اور اس کے پاس اتنی سمجھ بوجھ نہیں تھی کہ کسی گائیڈ لائن کے بغیر یہ عقل والی باتیں سمجھ پاتی۔ اب تک اس کے ذہن و دل پر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ثروت خالہ کی باتیں اس اندھیرے میں مشعل بن کر ذہن و دل کو روشن کر گئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

وہ رات شفا کے لیے سوچ کے کئی روزن کھول گئی تھی۔ وہ ساری رات سوچتی رہی اور پھر اسے احساس ہوا ثروت خالہ بالکل ٹھیک کہہ رہی تھیں۔ عمیر بھائی کی توجہ تقسیم ہونے کی بنا پر وہ ساہر بھابھی سے بیر باندھ کر بیٹھ گئی تھی ورنہ بھابھی نے تو ہمیشہ اس کے ساتھ رویہ بہترین ہی رکھا تھا۔ وہ خود تھی جو بلاوجہ جھگڑوں کے بہانے ڈھونڈتی تھی۔

عمیر بھائی کو ہمیشہ کے لیے کھو دینے کے ڈر سے اور اپنی ساری غلطیوں کو تسلیم کر لینے کے بعد اس نے پکا عہد کیا تھا کہ وہ دوبارہ بھابھی کو تنگ نہیں کرے گی اور اپنی ہر بدتمیزی کے لیے ان سے معافی مانگ لے گی۔

اگلی صبح جب ثروت خالہ رخت سفر باندھے کھڑی تھیں۔ اس نے خالہ سے گلے ملتے ہوئے ان کے کان میں چپکے سے کہا۔

"میں نے سوچ لیا ہے دوبارہ بھابھی کو تنگ نہیں کروں گی اور ان سے معافی بھی مانگ لوں گی لیکن میں ایک بار پہلے بھی معافی مانگ چکی ہوں مگر بھابھی کے رویے میں تبدیلی نہیں آئی۔"

"وہ اس لیے کہ عمیر اس سے خفا ہے۔ جب تک عمیر کی خفگی ختم نہیں ہو گی، ساہر کا موڈ بھی ٹھیک نہیں ہو گا۔ تم ساہر سے معافی مانگ لو اور عمیر کو بتاؤ کہ تمہیں غلط فہمی ہوئی تھی کہ ساہر نے تمہیں دھکا دیا ہے۔۔۔ دیکھنا سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔"

ثروت خالہ اسے سمجھا بجھا کر گھر کا ماحول درست کرنے کا طریقہ بتا کر چلی گئیں۔ شفا نے اسی وقت عمیر بھائی کو سب کچھ بتا کر ساہر بھابھی سے معافی مانگ لی۔

"میں نے آپ سے جھوٹ بولا تھا عمیر بھائی! دراصل میں بھابھی سے بدلہ لینا چاہتی تھی، اسی لیے میں نے کہہ دیا کہ انہوں نے مجھے سیڑھیوں سے دھکا دیا ہے۔"

وہ ایک ایک کر کے عمیر کو اپنی ساری کوتاہیوں سے آگاہ کرتی چلی گئی۔

عمیر ہکا بکا رہ گئے تھے۔

"تمہیں پتا ہے تمہاری وجہ سے میں نے کتنی بار ساہر کی انسلٹ کی ہے۔" عمیر بھائی نے جو اسے ڈانٹنا شروع کیا تو تب تک ڈانٹتے رہے جب تک روتے روتے اس کی ہچکیاں نہیں بندھ گئیں، پھر ساہر بھابھی ہی بیچ میں آئیں اور عمیر بھائی کو خاموش کروا دیا۔

"اس بے چاری کو اور کتنا ڈانٹیں گے۔۔۔ بس بھی کریں اب۔" انہوں نے شفا کے آنسو پونچھے بال سمیٹے اور بہت پیار سے کہا۔

"جو ہونا تھا ہو چکا۔ اب کوئی پرانی بات نہیں ہو گی بلکہ آج سے ہم اچھی فرینڈز بن کر رہیں گی۔"

شفا کے دل میں ساہر بھابھی کی قدر اور بھی بڑھ گئی تھی۔ اس کے بعد سب ٹھیک ہوتا چلا گیا۔ اس کے اور بھابھی کے تعلقات واقعی بہترین ہو چکے تھے۔ ثمر اکثر اسے بھابھی کے خلاف بھڑکانے کی کوشش کرتی لیکن شفا نے جب ایک بار انہیں تعصب کی نگاہ سے دیکھنا بند کیا تو اسے بھابھی کی اچھائیاں ہی دکھائی دینے لگیں۔ ایسی کوئی برائی یا ان کی طرف سے کوئی ناانصافی اسے دکھائی ہی نہیں دیتی تھی کہ وہ کوئی برا رد عمل کرتی۔

البتہ عمیر بھائی اس کی طرف سے کچھ شکوک کا شکار ہو گئے تھے۔ وہ جب بھی موقع ملتا اس کی برین واشنگ کرتے۔ شفا کو ان کا سمجھانا برا نہیں لگتا تھا جتنی اس سے غلطیاں سرزد ہو چکی تھیں وہ سمجھتی تھی ان کو مدنظر رکھتے ہوئے عمیر بھائی کا فکرمند رہنا جائز تھا۔

وہ ابھی کھڑکی میں ہی کھڑی تھی کہ ثمر نے اس کا کندھا زور سے ہلا دیا۔

"مراقبہ توڑ کر میری بات سن لو۔"

"تم سے تو میں اچھی طرح نمٹوں گی ثمر! کیا ضرورت تھی فرح اور حرم کے سامنے ساہر بھابھی کے بارے میں اتنا بولنے کی۔۔۔ وہ پتا نہیں کیا سمجھ رہی

ہوں گی۔" اس نے جھنجلاتے ہوئے کہا تھا۔
"اس غور طلب سوال کا جواب میں فرصت سے دوں گی۔ فی الحال چینج کر کے فٹافٹ ہال میں چلو۔ لنچ سرو ہو چکا ہو گا اور مجھے یقین ہے لڑکیاں کھانے پر ٹوٹ بھی پڑی ہوں گی۔۔۔ پلیز جلدی کرو۔۔۔ مجھے بوٹیوں کے بغیر چکن پلاؤ کھانے کا کوئی شوق نہیں ہے۔"
ثمرے نے اتنا شور مچایا کہ شفا ہڑبڑا کر بغیر کپڑے لیے ہی باتھ روم میں گھس گئی پھر جھنجلاتی ہوئی باہر نکلی تو ثمر دور بین آنکھوں سے لگائے مزے سے ہنس رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"شفا نظر نہیں آ رہی۔ میں کب سے آیا ہوا ہوں کہاں ہے وہ؟" عمیر نے سماہر کے ہاتھ سے پانی کا گلاس لیتے ہوئے پوچھا تھا۔
سماہر نے اس صورت حال کے لیے بڑی پلاننگ کی ہوئی تھی 'جلدی سے گھبراہٹ کے تاثرات چہرے پر سجا کر بولی۔
"وہ 'وہ سو رہی ہے۔"
توقع کے عین مطابق عمیر نے اس کی گھبراہٹ کو فوراً نوٹس کر لیا تھا۔
"یہ سونے کا کون سا وقت ہے؟"
"کالج سے آئی تو تھکی ہوئی تھی تب سے سو رہی ہے۔ پہلے ہم کھانا کھا لیتے ہیں پھر میں اسے اٹھا دوں گی۔" اس نے جلدی سے کہا اور کچن کی طرف مڑ گئی۔
عمیر کو اس کے انداز نے چونکا دیا تھا۔ انہوں نے چند لمحے سوچا پھر بدیہ سے شفا کو جگانے کے لیے کہا۔
"میں آپ سے کہہ تو رہی ہوں عمیر! میں کھانا کھا کر شفا کو جگا دوں گی۔"
"ابھی جگانے میں کیا مسئلہ ہے بھئی؟" عمیر ذرا سا جھنجلائے۔
"عمیر!" سماہر نے بے بسی سے کہا۔ "آپ پلیز پہلے کھانا کھا لیں پھر میں آپ کو ساری بات بتاتی ہوں۔" اس نے منت بھرے انداز میں کہا تھا۔

"تم دونوں کا جھگڑا ہوا ہے؟" عمیر نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ سماہر نے بے بسی سے بالوں میں انگلیاں پھنسا لیں بولی البتہ کچھ نہیں۔
"شفا!" عمیر نے اسے مستقل خاموش پا کر شفا کے کمرے کی طرف پیش قدمی کی۔ سماہر ایک دم ان کے سامنے آ گئی۔
"عمیر پلیز! ادھر نہ جائیں۔"
"کیوں ادھر گولہ باری ہو رہی ہے؟" عمیر نے دوبارہ شفا کو آواز دیتے ہوئے کہا۔
"عمیر! شفا اپنے کمرے میں نہیں ہے۔" سماہر نے بیچارگی سے کہا۔ "وہ کالج ٹرپ کے ساتھ مری چلی گئی ہے۔"
عمیر چند لمحے کے لیے کچھ بول نہیں سکے۔ "میرے منع کرنے کے باوجود۔۔۔"
"میں نے اسے منع کیا تھا یہ بھی بتایا تھا کہ آپ نے سختی سے منع کیا ہے لیکن اس نے میری بات نہیں مانی۔ کہنے لگی عمیر بھائی کے کان آپ نے بھرے ہوں گے۔ آپ دونوں تو چاہتے ہی نہیں کہ میں چند دن سکون سے گزاروں۔۔۔ عمیر بھائی آئیں گے تو میں ان سے خود بات کر لوں گی۔ آپ ہم دونوں بہن بھائیوں کے درمیان نہ آیا کریں۔"
"مجھے یقین نہیں آ رہا۔" عمیر نے بے یقینی اور جھنجلاہٹ سے کہا۔ "تم سے جھگڑا اپنی جگہ لیکن شفا میری بات نہیں ٹال سکتی۔"
"اب آپ بھی مجھے الزام دے دیں۔۔۔ شفا کی نظر میں تو میں پہلے ہی بُری ہوں۔" سماہر نے روہانسی ہو کر کہا۔
"اتنا اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ منتیں تک کر لیں مگر مجال ہے جو اس نے میری بات پر کان دھرے ہوں۔"
"بات شفا کی ہوتی ہے درمیان میں تم کہاں سے آ جاتی ہو۔" عمیر نے بھڑک کر کہا اور سیل فون اٹھا کر شفا کو نمبر ڈائل کرنے لگے۔
"میں شفا کو فون کرتا ہوں۔"

"کوئی فائدہ نہیں ہے عمیر! آپ کے فون کرنے سے وہ واپس نہیں آئے گی۔ اسے آپ کی بات کا اتنا پاس ہوتا تو جاتی ہی نہیں۔"

"تو پھر کیا کروں میں۔" عمیر کا دماغ جیسے غصے اور صدمے سے پھٹ رہا تھا۔

"آپ مجھ پر کیوں چلا رہے ہیں؟" ساہر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

عمیر گرنے کے انداز میں صوفے پر بیٹھ گئے انہوں نے اپنا سر ہاتھوں میں گرا لیا تھا۔

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا ساہر! میں کیا کروں۔ شفا کو کیا ہو گیا ہے میں سمجھ ہی نہیں پا رہا۔ میں جتنی اس سے محبت کرتا ہوں، جتنا اس کے قریب ہونے کی کوشش کرتا ہوں، وہ اتنا مجھ سے دور ہوتی جا رہی ہے۔ پہلے بات مان لیتی تھی اب سننا بھی گوارا نہیں کرتی۔۔۔ کبھی کبھی مجھے لگتا ہے وہ مجھے اپنا کچھ سمجھتی ہی نہیں ہے۔۔۔ جیسے امی ابو کی ڈیتھ ہو چکی ہے شاید شفا نے مجھے بھی مرا ہوا سمجھ لیا ہے۔"

"خدارا عمیر! اتنی بری بری باتیں مت سوچیں۔" ساہر نے ان کے قریب بیٹھتے ہوئے نرمی سے کہا تھا۔ "شفا کم عمر ہے نا سمجھ ہے، پھر اس کی دوستیاں بھی ایسی ہیں جو اسے بغاوت پر اکساتی رہتی ہیں، شفا کو محبت کی ضرورت ہے عمیر! توجہ چاہیے اسے۔ محض آپ کی توجہ حاصل کرنے کے لیے ایسی حرکتیں کرتی ہے۔ یقین مانیں محبت سے سمجھائیں گے تو آپ کی ہر بات سمجھ لے گی۔"

"کب تک میں یہی سمجھتا رہوں کہ وہ کم عمر ہے، کب تک سمجھوں نا سمجھ ہے، کب تک میں یہی سمجھوں کہ امی ابو کی موت نے اس کی زندگی میں خلا پیدا کر دیا ہے جسے میں اپنی پوری کوشش کے باوجود بھر نہیں پایا۔۔۔ میں تھک چکا ہوں ساہر! خود کو سمجھا سمجھا کر۔" عمیر نے سابقہ انداز میں کہا تھا۔

"آپ شفا کو آ لینے دیں۔۔۔ اس بار میں اسے سمجھاؤں گی۔"

"تم بھی اپنی سی کوششیں کر چکیں۔ اب تو شفا کو میں ہی سمجھاؤں گا۔" عمیر نے گہری سانس بھرتے ہوئے سنجیدگی سے کہا پھر اٹھ کھڑے ہوئے۔

"میں کھانا لگاتی ہوں۔" ساہر نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"رہنے دو مجھے بھوک نہیں ہے۔"

"عمیر! کھانا تو کھا لیں۔ کھانے سے کیسی ناراضی؟"

عمیر ان سنی کر کے بیڈ روم میں چلے گئے۔

ساہر چند لمحے بیٹھی رہی پھر گہری سانس بھر کر اٹھی اور بچوں کا بکھراوا سمیٹنے لگی۔

عمیر کی بڑی بری عادت تھی۔ گھر آتے ہی جب تک بہن کو نہ دیکھ لیتے انہیں سکون نہیں آتا تھا۔ ساہر کو اس عادت سے سخت چڑ تھی لیکن آج اسی عادت کا فائدہ حاصل کیا تھا اس نے۔ شفا کے معذرت کر لینے کے باوجود اس کے دل سے کدورت دور نہیں ہوئی تھی۔

عمیر کے مارے ہوئے ان دو تھپڑوں نے اس کی عزت نفس پر اتنی گہری ضرب لگائی تھی کہ اس کا سارا وجود پھوڑے کی طرح دکھنے لگا تھا۔ اس نے اسی روز تہیہ کر لیا تھا کہ تب تک اس درد کو ختم ہونے نہیں دے گی جب تک شفا کو عمیر سے ویسے ہی دو تھپڑ نہیں پڑوا لیتی۔

تب تک سکون سے نہیں بیٹھے گی جب تک اسے عمیر کی نظروں میں نہیں گرا دیتی۔ عمیر نے شفا کے جھوٹ پر یقین کر کے ساہر کی بے عزتی کی تھی۔ اب عمیر کو ساہر کے جھوٹ پر یقین کر کے شفا کو بے عزت کرنا تھا۔

اب تک ساہر نے اپنی عادت اور فطرت کے برخلاف بہت کمپرومائز کیا تھا۔ اس نے شفا کی ہر بدتمیزی ہر بدتہذیبی کو نظر انداز کیا تھا لیکن اس جھوٹ کو نظر انداز کرنا اس کے بس میں نہیں تھا۔ اس کے دل و دماغ میں غم و غصہ اس بری طرح بھر چکا تھا کہ کبھی کبھار اس کا دل چاہتا اس کے پاس جادو کی چھڑی آ جائے اور وہ اس چھڑی کو گھما کر شفا کو اپنی اور عمیر کی زندگی سے غائب کر دے لیکن اپنی خواہش پوری کرنے کا یہ شارٹ کٹ اسے میسر نہیں تھا۔ اس لیے اس نے وہی کیا جو کر سکتی تھی۔ اس نے بے حد ہوشیاری سے شفا کے گرد شکنجہ کسنا شروع کر دیا تھا۔

بظاہر اس نے شفا اور عمیر کی معذرت کو کھلے دل سے قبول کر لیا تھا ثروت خالہ کی نصیحتوں پر بھی سعادت مندی سے سر ہلاتی رہی تھی لیکن اس کے دل میں کیسا کینہ پنپ رہا تھا کوئی نہیں جانتا تھا۔ شفا کا عمیر کے سامنے اپنی غلطیاں تسلیم کر لینے کے بعد گو کہ اسے زیادہ تردد بھی نہیں کرنا پڑا تھا عمیر نے جیسے ہر بات کے لیے خود بخود شفا کو قصور وار سمجھنا شروع کر دیا تھا لیکن اس کے باوجود وہ وقتاً "فوقتاً" معصوم بن کر اور شفا کی ہمدردی کی آڑ میں عمیر کے کان بھرنے لگی تھی۔

وہ عمیر کو شفا کی نام نہاد بدتمیزیوں کی فرضی رپورٹ سناتی۔ اس کی سہیلیوں خصوصاً "ثمر کے بارے میں جھوٹے قصے سنا کر متنفر کرتی۔ دوسری طرف وہ شفا کو ثمر سے ملنے پر اکساتی رہتی۔ ساہر نے ایسے بہت سے کام کیے جن کے ذریعے عمیر پر ثابت کر سکے کہ شفا کے نزدیک عمیر کی حیثیت اب نہ ہونے کے برابر ہے۔ وہ صرف ایک بار شفا کو عمیر کی نظروں میں گرا ہوا دیکھنا چاہتی تھی اور اس کے لیے اپنی تمام تر محنت صرف کر رہی تھی۔

انتقام نے جیسے اسے اندھا کر دیا تھا اور جب انسان اندھا ہو جاتا ہے تو اسے اچھائی، برائی، صحیح، غلط میں فرق دکھائی دینا بھی بند ہو جاتا ہے۔ ساہر کے ساتھ بھی یہی ہو رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

سمیر نے اپنے کسی دور کے رشتہ دار کے قریبی دوست کے یہاں رہائش کا بندوبست کیا تھا۔ اسی دوست نے ناران کے لیے وین اور گائیڈ فراہم کرنا تھا۔ جس وقت یہ لوگ وہاں پہنچے تو ایک خوب صورت شام آسمان سے ٹوٹ کر شہر کی گود میں آ گری تھی اور سرمئی بادلوں سے ڈھکا آسمان پہاڑوں پر جھک رہا تھا۔ لیکن چونکہ وہ سب راستہ بھر ہلے گلے میں مصروف رہے تھے اس لیے تھکان ان پر حاوی تھی اور کوئی بھی موسم کی خوب صورتی پر دھیان نہ دے پا رہا تھا، پھر بہت ہی نا مساعد صورت حال یوں درپیش ہوئی کہ صاحب خانہ اپنے بال بچے اور بوریا بستر سمیٹ کر پشاور جا بیٹھے تھے۔ فون کرنے پر پتا چلا سمیر نے انہیں نومبر کی سترہ کو پہنچنے کا عندیہ دیا تھا جبکہ آج ستمبر کی سترہ تھی۔ سب نے اپنے سر پیٹ لیے گو کہ پیٹنا سمیر کو چاہیے تھا۔

"سمیر کو خچر کے آگے ڈال دو۔" سمیر تھیلے سے کیلے خرید رہا تھا جب حسان نے سوچ بچار کے بعد کہا۔

"خچر نے کیا غلطی کی ہے جو اسے ایسی سزا دی جائے۔" یہ طلحہ تھا۔

"یہ بھی ٹھیک ہے۔" حسان نے کہا۔ "پھر ایسا کرو سمیر کو اٹھا کر کھائی میں پھینک دو۔"

سمیر نے اسے بری طرح گھورا۔ "میری کوتاہی اتنی بھی سنگین نہیں۔"

"ایک کام لگایا تھا تمہارے ذمے۔ وہ بھی پورا نہ ہو سکا۔"

"میں نے تو ستمبر ہی کہا تھا وہ نومبر سمجھے تو اس میں میرا کیا قصور؟"

"ڈائجسٹ کا پیچھا چھوڑ کر اگر دو روز پہلے فون کر دیا ہوتا تو کون سی قیامت آ جاتی؟" تقی نے جل کر کہا تھا۔

"نو پرابلم یار! ہوٹلز، ریسٹ ہاؤسز تو یہاں جگہ جگہ بکھرے پڑے ہیں، ہم بھی کوئی سستا سا ہوٹل ڈھونڈ لیتے ہیں۔" سرار سلان نے کہا۔

"ہوٹل بھی مل جائیں گے۔ ہوٹل میں کمرے بھی مل جائیں گے لیکن وہ سستے ہرگز نہیں ہوں گے۔" تقی نے سامان اٹھاتے ہوئے کہا۔

"جیب پر اضافی بوجھ منظور ہے لیکن میں بتا دوں پیدل مارچ ہرگز برداشت نہیں ہوگا۔ تھکن سے میرا برا حال ہے۔" حسان نے دھمکی دی۔

"جی نہیں، جیب پر بھی اضافی بوجھ نہیں ہونا چاہیے۔۔۔ تم سب لوگ برسر روزگار ہو، ہمیں نہیں

...." تقی نے کہا۔

"اچھا بھئی بے فکر رہو۔" سر ارسلان نے قصہ سمیٹا۔

تھوڑی سی تلاش کے بعد انہیں ایک ہوٹل میں جگہ مل ہی گئی۔

"اب میرے حصے کا خرچ بھی تو اٹھائے گا۔" چونکہ تقی کی جیب برداشت نہیں کرپا رہی تھی' اس لیے اس نے سمیر سے کہا۔

"کیسے خبیث دوست ملے ہیں مجھے۔" سمیر نے کیلا چھیلتے ہوئے دانت پیس کر کہا' پھر اپنے احتجاج کا کوئی خاطر خواہ اثر نہ ہوتے دیکھ کر اردگرد کا جائزہ لینے لگا۔

ریسٹ ہاؤس کا انٹیریر اور ایکسٹیریر بہت بہترین تھا ریسپشن سے چند فٹ ادھر دوسری منزل کی طرف جاتا ہوا زینہ تھا جبکہ داہنی طرف ہال کا بڑا سا منقش دروازہ تھا۔

جس وقت وہ جائزہ لینے میں مشغول تھا۔ چند لڑکیاں آگے پیچھے ہال سے نکلیں اور ریسپشن کے قریب کھڑی ہو کر دھیمی آواز میں باتیں کرنے لگیں۔

لڑکوں میں کھلبلی مچ گئی۔ زاہد خشک تو سچ بات ہے ان میں سے کوئی بھی نہیں تھا' سو چپکے چپکے سب نے پوری نظریں ڈال لیں' ساتھ ہی ایک دوسرے کو دل کے نشان بنا کر بھی دکھا دیے۔ واحد سمیر تھا جو ایک تو دیوار پر لگے ایک لینڈ اسکیپ میں گم تھا اس لیے حسان کی کہنیاں بھی اس طرف متوجہ نہ کر سکیں' دوسرے نئی نئی نسبت طے ہونے کا خمار بھی سر کو چڑھا ہوا تھا' سو وہ اخلاقی طور پر خود کو پابند تصور کر رہا تھا۔

"کمال کی شہزادیاں ہیں مگر سچ کے بدذوق.... مجال ہے جو کسی ایک نے بھی نظر اٹھا کر غلطی سے ہی ہماری طرف دیکھ لیا ہو۔" چند منٹ بعد ثاقی نے جل کر سرگوشی کی۔

"تم لوگ جو ہو انہیں نظریں اٹھا اٹھا کر بلکہ دیدے پھاڑ پھاڑ کر گھورنے کے لیے۔" آنکھیں بے شک لینڈ اسکیپ کی طرف تھیں لیکن کان تو سب سن رہے تھے اور دل تو بہت ہی مچل رہا تھا۔ بھئی منگنی ہو جانے کا اب یہ مطلب تو ہرگز نہیں ہوتا ناں کہ انسان کی حس لطیف مر جائے۔

"ہاں جی آپ نے تو کبھی کسی کو دیکھا ہی نہیں۔ وہ ٹینا قاسم والا قصہ مجھے اب تک یاد ہے۔ کہو تو سنا دوں؟" ثاقی نے مزے سے کہا تھا۔

"کھسیانا بلا کھمبا نوچے۔" سمیر گنگنایا اور تقی سلگ گیا۔

"سمیر کے بچے! مجھے پہلے ہی بہت غصہ ہے تم پہ۔ اب گردن مروڑ دوں گا۔"

"سیز فائر' سیز فائر۔" سر ارسلان بروقت مداخلت کی تھی۔ "دیکھا سیانے ٹھیک ہی کہتے تھے زن' زر' زمین ہیں ہی فساد کی جڑ.... جن پر نظر پڑتے ہی دو دوست آپس میں جھگڑنے لگے۔ ان پر اب کوئی دھیان نہیں دے گا۔"

سب نے سعادت مندی سے سر ہلا دیے۔ ریسپشنسٹ نے کارروائی پوری کرنے کے بعد انہیں چابیاں دے دی تھیں۔ سب اپنا اپنا سامان اٹھا کر زینے کی طرف بڑھے' تب ہی ان لڑکیوں میں سے ایک نے باآواز بلند کہا۔

"ثمر! جلدی آؤ بھئی' ہم کب سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔"

سمیر کا ڈسٹ بن میں کیلے کا چھلکا اچھالتا ہاتھ ہوا میں ہی ٹھٹک گیا۔ اس نام سے چند روز قبل ہی تو خاص تعلق جڑا تھا۔ چونک جانا کچھ ایسا غیر متوقع عمل نہیں۔ اس نے گردن موڑ کر دیکھا اور پھر.... بقول شاعر چراغوں میں روشنی نہ رہی۔

اردگرد کی ..... آوازیں بھنبھناہٹوں میں بدل گئیں۔ منظر پر صرف "وہ" باقی رہ گئی جو روشنی کے رتھ پر سوار ہال کے دروازے سے نکل رہی تھی۔

آف وائٹ اور بلیک کنٹراسٹ کے لباس میں ملبوس سرو قد' بیضوی چہرہ' بڑی بڑی غلافی آنکھیں' اس کے بال بے حد لمبے اور سیاہ تھے اور کچھ لٹیں چہرے کے اطراف میں لاپروائی سے جھول رہی تھیں۔

سمیر اسے بے خودی کے عالم میں دیکھ رہا تھا۔ اسی پل اس سراپا حسن نے اپنی گھنی پلکیں اٹھا کر سمیر کی طرف دیکھا۔ سمیر پہلے ہی رعب حسن سے صم بکم کھڑا تھا' رہی سہی کسر اس ایک نظر نے پوری کر دی۔ اس کے دل نے غش کھایا اور پورے قد سے اس پری کے قدموں میں جھک گیا۔ اسی پل اس پری کے چہرے پر سنسناہٹ کے تاثرات نمایاں ہوئے۔ وہ بری طرح لڑکھڑائی' اس سے پہلے کہ گر جاتی اس نے دیوار کا سہارا لے کر خود کو گرنے سے بچالیا۔

"اف....." ساتھ ہی وہ پیر پکڑ کر نیچے بیٹھ گئی۔

سمیر کے اردگرد پھیلا ہوا فسوں چھٹ گیا۔ وہ ہڑبڑا کر سیدھا ہوا۔ ثمر کی سہیلیاں اس کے گرد گھیرا ڈالے کھڑی تھیں اور وہ خود کراہتی ہوئی سمیر کو کھا جانے والی نظروں سے گھور رہی تھی۔ پہلے تو سمیر ان نظروں کا مطلب سمجھا نہیں اور جب سمجھا تو اس کا دل چاہا اپنا سر پیٹ ڈالے۔

"کیا ہوا؟" تقی چند سیڑھیاں اتر کر واپس آیا۔ سمیر گھبرایا کھڑا تھا۔ وہ ثمر کو دیکھنے میں اتنا مشغول تھا کہ ہاتھ میں پکڑا کیلے کا چھلکا ڈسٹ بن میں گرنے کے بجائے عین اس جگہ گرا جہاں چند منٹ بعد اس پری کا پیر پڑنے والا تھا۔ اور اب وہ شرمندہ شرمندہ سا کھڑا تھا جبکہ ثمر اسے غضب ناک نظروں سے گھور رہی تھی۔

تقی نے وہیں کھڑے کھڑے صورت حال کا جائزہ لیا' پھر سمیر کا بازو کھینچ کر سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

"جو ہونا تھا ہو چکا۔ اب یہاں کھڑے ہو کر ایک پاؤں پر چلہ بھی کاٹ لو تو کچھ نہیں ہو سکتا۔" تقی نے آواز دبا کر کہا۔

"میں ایکسکیوز تو کر سکتا ہوں۔" سمیر نے بے چارگی سے دہائی دی۔

"اور وہ تو جیسے معاف کر ہی دے گی۔" تقی نے سرعت سے کہا۔ "جتنی بری طرح اس کا پاؤں مڑا ہے اور جتنے غصے سے وہ تجھے گھور رہی ہے' ان سب باتوں کے ساتھ وہ جواباً تیرا سر تو پھاڑ سکتی ہے' معاف ہرگز نہیں کرے گی۔ اس لیے اب ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں۔ صبح معافی مانگ لینا تب تک اس کا غصہ بھی کچھ کم ہو چکا ہو گا۔"

"لیکن تقی.....!" وہ کہتا رہ گیا لیکن تقی نے ایک نہ سنی اور اسے کمرے میں لا کر ہی چھوڑا۔ جہاں ٹرپل بیڈ لگے تھے اور یہ کمرا انہیں ثاقی کے ساتھ شیئر کرنا تھا۔

☼ ☼ ☼

"احمق' گدھا۔"

ثمر کو جتنی گالیاں ازبر تھیں۔ کمرے میں پہنچنے تک اور تکلیف کی شدت سے مسلسل کراہتے ہوئے اس لڑکے کو دے ڈالی تھیں۔

"بس کرو ثمر! کیوں اس بے چارے کو گالیاں دیے جا رہی ہو۔ ہو سکتا ہے اس نے جان بوجھ کر چھلکا نہ پھینکا ہو۔" شفا نے حسب عادت تصویر کے مثبت پہلو کی طرف اس کی توجہ دلانا چاہی اور اسے بیڈ پر بٹھا کر اس کے سوجے پیر کا جائزہ لینے لگی۔ کیلے کے چھلکے سے پھسلنے سے وہ سنبھل گئی تھی لیکن اس کوشش میں اس کا پیر ایک مورتی سے ٹکرا گیا تھا جس کے لیے یہاں آتے ہی ثمر ناپسندیدگی کا اظہار کر چکی تھی۔ اس کے انگوٹھے کا ناخن آدھے سے زیادہ اکھڑ چکا تھا اور خون تیزی سے بہہ رہا تھا اور سوجن بھی شروع ہو گئی تھی۔

"بے چارہ..... وہ تقریباً" چیخی تھی۔ "خبیث کہو خبیث..... بدتمیز پہلے مجھے گھور رہا تھا..... لوفر نہ ہو تو..... پھر اس نے چھلکا میرے راستے میں پھینک دیا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی یہ حرکت۔"

"جب دیکھ ہی لیا تھا تو سائیڈ سے ہو کر نہیں گزر سکتی تھیں۔ تم نے ضرور چھلکے پر پاؤں رکھنا تھا۔" شفا نے اکتا کر کہا کہ وہ ثمر کے مسلسل بولنے سے چڑ رہی تھی۔

"میں نے بتایا ناں وہ مسلسل مجھے گھور رہا تھا میں نے بھی جواباً گھورنا چاہا کہ کچھ تو شرمندہ ہو گا لیکن اس فضول آدمی نے اسی وقت کیلے کا چھلکا میرے راستے

میں پھینک دیا اور بے دھیانی میں میرا پاؤں اس پر پڑ گیا ۔۔۔ پتا نہیں آج کل کے لڑکوں کو کیا ہوتا جا رہا ہے ۔ کوئی تمیز تہذیب تو جیسے ان کے اندر باقی رہی ہی نہیں ہے ۔۔۔ میرے ہاتھ لگے ذرا یہ لڑکا ۔۔۔ اس کی بوٹیاں کر کے پہاڑی کوؤں کو نہ کھلا دیں تو میرا نام بھی ثمر نہیں۔" اس نے مٹھیاں بھینچتے ہوئے اس طرح کہا گویا ان مٹھیوں میں اس لڑکے کی گردن ہو۔

شفا کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

"تم اس کی بوٹیاں پہاڑی کوؤں کو کھلانا یا اس کی ہڈیوں کا سوپ بنا کر اہل مری کی دعوت کر دینا لیکن خدارا اس وقت چپ ہو جاؤ۔ میں تمہارے پاؤں کی بینڈیج کر دیتی ہوں۔ بینڈیج کا سامان ہے میرے پاس لیکن اس سے پہلے یہ خون روکنا ضروری ہے جو تمہاری زبان کی رفتار سے بھی زیادہ تیزی سے بہہ رہا ہے۔" شفا اپنے بیگ سے فرسٹ ایڈ کا سامان نکالنے لگی۔

"حرم! ذرا ریسپشن سے پتا کرو ڈیٹول یا پائیوڈین مل سکے تو لے آؤ۔" اس نے حرم سے کہا۔

"ریسپشن تک جانے کے لیے تو لمبا چکر لگانا پڑے گا۔ نوشین کہہ رہی تھی اس کے پاس پائیوڈین ہے۔ حرم! ایسا کرو نوشین سے مانگ لاؤ۔" فرح نے کہا نوشین اس وقت ان کے ساتھ تھی 'جب ثمر کو چوٹ لگی۔

"نوشین کی روم میٹس بہت بدتمیز لڑکیاں ہیں ۔ اسکول کے زمانے سے میری ان کے ساتھ کھٹ پٹ چل رہی ہے اس لیے مورل سپورٹ کے لیے تم میرے ساتھ چلو۔"

حرم نے کہا تو فرح فوراً" اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ چند منٹ بعد وہ دونوں پائیوڈین لے آئیں۔ ان کے پاس الیکٹرک راڈ موجود تھی اس کی مدد سے نیم گرم پانی کا بندوبست کیا۔ اس میں پائیوڈین ملا کر زخم صاف کیا پھر احتیاط سے آدھا اکھڑا ہوا ناخن کاٹ کر شفا نے اس پر بینڈیج کر دی۔

"اب تم آرام کرو۔" اس نے کسی قابل ڈاکٹر کی طرح ہدایت کی تھی۔ "زیادہ چلنے جلنے سے زخم میں پس پڑنے کا خدشہ ہے۔"

"اب میں تم لوگوں کے ساتھ کل نہیں جا سکوں گی ۔۔۔ پنڈی پوائنٹ 'کشمیر پوائنٹ اور پتریاٹہ ۔۔۔ میں کبھی نہیں دیکھ سکوں گی۔" اس کے اشتعال پر اب مایوسی کی کہر پھیل چکی تھی۔

"تم نہیں جاؤ گی تو ہم بھی نہیں جائیں گے۔" شفا نے باقی دونوں کی بھی نمائندگی کی تھی۔ "ہزار بار کی دیکھی ہوئی جگہیں ہیں۔ اب کیا خاص بن گیا وہاں کہ ہم بھاگ بھاگ کر جائیں۔"

"میرے لیے اپنا پروگرام خراب کرو گی تم لوگ؟"

"ہرگز نہیں۔" شفا نے قطعیت سے کہا۔

"تو پھر؟"

"صبح تک تم اچھی بھلی ہو جاؤ گی ان شاء اللہ ۔۔۔ پین کلر بھی کھا لو۔" اس نے ٹیبلٹ حرم کی ہتھیلی پر رکھی۔ حرم نے اسے منرل واٹر کی بوتل دی۔ ثمر نے گولی پھانکی اور ایک گھونٹ کے ساتھ حلق میں اتار لی۔ تب ہی نوشین اس کی خیریت معلوم کرنے آ گئی۔

"اب کیسا ہے پاؤں؟ زیادہ درد تو نہیں ہو رہا؟"

"بینڈیج کر دی ہے 'صبح تک ٹھیک ہو جائے گا۔" ثمر کے بجائے شفا نے ہی جواب دیا تھا۔

"کوئی ٹیبلٹ بھی کھا لو۔ صبح ہم نے اتنا گھومنا پھرنا ہے ثمر کو تو بڑی دقت ہو گی۔" نوشین نے کہا۔

"میں نے کہا ناں۔ ان شاء اللہ صبح تک ٹھیک ہو جائے گی۔ اللہ سے اچھی امید رکھنا چاہیے۔"

"ہاں یہ تو ہے۔" نوشین فرح کے ساتھ کمبل میں گھس کر بیٹھ گئی اور اپنی جیکٹ کی جیب سے مونگ پھلی کا پیکٹ نکال کر عین درمیان میں رکھا اور تڑ تڑ مونگ پھلیاں کھانے لگی۔

"تم لوگ بھی آ جاؤ۔" فرح تو بغیر کہے اس کا ساتھ دینے لگی تھی۔ نوشین نے باقیوں کو بھی دعوت دی پھر اشتیاق بھرے لہجے میں پوچھنے لگی۔

"تم لوگوں نے لڑکے دیکھے؟"

ثمر اس کا اشارہ سمجھ گئی تھی۔ چڑ کر بولی۔

"ہم کیا تمہیں شکل سے وچو لنیں نظر آتی ہیں جو لڑکے دیکھتی پھریں گی؟"

اس بات پر نوشین دل کھول کر ہنسی۔

"مجھے تم لوگوں کی کور ذوقی سے یہی امید تھی کہ کسی نے ان پر نظر ڈالنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی ہو گی مگر میں نے تو فوراً" سب کا جائزہ لے لیا تھا اللہ جھوٹ نہ بلوائے تو چھ کے چھ شکل و صورت کے بہترین ہیں لیکن وہ جس کے پھینکے ہوئے چھلکے سے ثمر سلپ ہوئی وہ تو اتنا ہینڈسم ہے کہ کیا بتاؤں۔ ایمان سے بالکل فرحت اشتیاق کے کسی ناول کا ہیرو لگ رہا تھا ۔۔۔ کیوں ثمر! میں ٹھیک کہہ رہی ہوں ناں۔ تم نے تو اسے خاصا دیکھا تھا۔"

"میں نے اسے دیکھا نہیں تھا گھورا تھا اور میرا دل چاہ رہا تھا اس کی گردن توڑ کر اسی کے ہاتھ میں پکڑا دوں ۔۔۔ یہ تو ہوئی ایک بات ۔۔۔ دوسری بات یہ کہ میں نے تو آج تک فرحت اشتیاق کے کسی ناول میں بندر جیسے ہیرو کا ذکر نہیں پڑھا، تمہیں پتا نہیں وہ کس انگل سے ناول کا ہیرو لگا ہے۔" ثمر نے تڑخ کر کہا احتیاط سے اٹھی اور بمشکل زخمی پیر گھسیٹتی واش روم میں چلی گئی۔

"میرا خیال ہے اس کے پیر پر نہیں بلکہ دماغ پر چوٹ لگی ہے۔" نوشین نے ان تینوں کی طرف دیکھتے ہوئے کھسیانی ہو کر کہا پھر خود ہی ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنس پڑی۔

☆ ☆ ☆

وہ سب ہی تھکے ہوئے تھے 'سو کھانا کھا کر سونے کے لیے لیٹ گئے۔ یوں بھی صبح جلدی بیدار ہو کر ان سب کو کلیات کی طرف نکلنا تھا۔ اب سب گہری نیند سو رہے تھے۔ تقی تو لگتا تھا صدیوں بعد سونے لیٹا ہے تب ہی اس قدر گہری نیند کی کیفیت اس پر طاری تھی حالانکہ ثاقب کے خراٹوں نے کمرے میں طوفان مچا رکھا تھا پھر بھی وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ صرف سمیر تھا جس نے کروٹ پر کروٹ بدلتے آدھی رات گزار دی تھی۔

اسے ثاقب کے خراٹے کچھ نہ کہہ رہے تھے بس ایک منظر تھا۔ ایک چہرہ تھا جو آنکھیں بند کرتے ہی سامنے آ جاتا اور سونے نہ دیتا تھا۔ سمیر کے لبوں پر مسکراہٹ پھیلتی غائب ہوتی رہی پھر ذہنی و قلبی کشمکش سے گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ جب یہ کشمکش زیادہ شدید ہوئی تو آؤ دیکھا نہ تاؤ ساتھ والے پلنگ پر بے سدھ سوئے تقی کو جھنجھوڑ ڈالا۔

"کیا ہوا ۔۔۔ کیا ہوا؟" تقی تھا اس افتاد پر حواس باختہ ہو کر اٹھ بیٹھا۔

"مجھے محبت ہو گئی ہے تقی!" سمیر نے بے چارگی سے کہا۔ سمیر نے آنکھیں پٹپٹا کر چند لمحے اسے دیکھا' جیسے سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو۔

"در فٹے منہ۔" تقی نے پورے دل اور پورے ہاتھ سے اس پر لعنت بھیجی اور سر تک کمبل تان کر لیٹ گیا۔ اس عزت افزائی پر سمیر کو خاموشی سے جا کر لیٹ جانا چاہیے تھا لیکن اس نے پھر تقی کا کندھا ہلایا۔

"میری بات سن تو تقی! میں سچ کہہ رہا ہوں مجھے واقعی محبت ہو گئی ہے۔"

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

سمیرا حمید

گرمیوں کے دن تھے اور وہ پچھواڑے جانے کے بجائے اوپر چھت پر آگئی۔ چھت کے بنیرے نہیں تھے۔ چارپائی پر بیٹھے بیٹھے ہی اس نے دور تک پھیلے ہوئے پچھواڑے میں لگے لسوڑے کے درخت کے پاس مچلتی ہوئی سدرہ کو دیکھا اور دیکھتی ہی رہی۔

سات دن ہوئے تھے اس کی شادی ہوئے اور اس کا شوہر آج ہی اسے لے کر اس کے میکے آیا تھا۔ درخت کے پاس اٹکھیلیاں کرتے وہ دونوں نہ جانے کون کون سی کہانیاں سنا رہے تھے۔ وسیع پچھواڑے کو عبور کرتی سدرہ کی ہنسی کی ہلکی سی آواز اسے چھت پر بھی سنائی دے رہی تھی۔ صدیق لسوڑے کے درخت پر چڑھنے کی کوششیں کرتا اور سدرہ نیچے سے اس کی ٹانگ کھینچ دیتی اور پھر ہنستی ہی چلی جاتی نئی نئی شادی میں ہنسی بلاوجہ ہی آتی ہے۔

گھومتی ہوئی دنیا میں اسے جیسے صرف سدرہ ہی نظر آرہی تھی۔

اچانک سدرہ کی نظر اوپر چھت پر اس پر پڑی سدرہ کی ہنسی کم ہوتے ہوئے تھم گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ ایک بار پھر صدیق کی ٹانگ کھینچتی۔ وہ اوپر چڑھتے چڑھتے خود ہی ایک دم سے نیچے آگرا اور اتنی زور سے گرا کہ اندرونی کمروں سے بھابھی اور دوسرے لوگ بھاگتے ہوئے اس کی طرف آگئے۔ چھت سے بھاگتی ہوئی وہ بھی اس کی طرف لپکی۔

سدرہ نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ "تو رہن دے مائی!"

بھابھی اور گھر کے دوسرے افراد نے کچھ غصے اور کچھ خوف سے سدرہ کو گھور کر دیکھا جیسے وہ ہر بار اسے گھورا کرتے تھے لیکن اس کے چہرے پر وہی تاثر قائم رہا اس کی آنکھوں اور انداز میں غصہ اور نفرت صاف دکھائی دے رہے تھے' صدیق کراہ رہا تھا اور سدرہ کی آنکھوں سے آنسو باہر آنے کو تھے۔

سدرہ کی آنکھوں میں اپنے لیے نفرت اسے اچھی نہیں لگی۔ غصہ وہ اکثر اس پر اتار لیا کرتی تھی۔ اپنے کپڑوں کے پھٹ جانے' جل جانے' گم ہو جانے کہ بے ڈھنگا سلنے پر بھی' کھیر میں چینی کم ہو جانے' بازار سے چیزیں ٹھیک نہ ملنے' گندم میں کیڑے پڑ جانے' اور اپنے پراندے کی بے ڈھنگی گرہ پر بھی وہ تلملاتی ہوئی اسی کے پاس آتی...... وہ سو بھی رہی ہوتی تو اس کا لحاف اٹھا کر اسے جلی کٹی سناتی۔ کبھی چلا چلا کر اور کبھی رو رو کر اپنا غصہ نکالتی۔

"تو چاہتی ہی نہیں تھی کہ میں رخسانہ کی شادی میں جاؤں۔ یہ دیکھ! میرے کپڑے جلے تو جلے' میرا پاؤں بھی سوج گیا لنگڑی ہو گئی ہوں میں۔ اب خوش ہے تو' پڑ گئی ٹھنڈ؟ لڑکیوں کی شادی کی خبر سنتے ہی تو پاگل ہو جاتی ہے نا..... اچھا کیا رخسانہ کی اماں نے تجھے نہیں بلایا تو تو اس کے باراتی بھی نگل جاتی۔ جل جاتے وہ یا مر جاتے۔ لے مر' اب میں نہیں جاؤں اس کی شادی میں' تیرے ساتھ مل کر بین ڈالوں گی۔"

کتنی چھپ چھپ کر تیاریاں کی تھیں لیکن پھر بھی ایک کپڑا نہ بچا اور جوتیوں کے لیے پہلے پیسے کم ہو گئے اب پاؤں جل گیا۔ اگر ابھی بھی میں نے جانے کا خیال دل سے نہ نکالا تو یا میں جل کر مر جاؤں گی یا میرا منہ بھی تیری منہ کی طرح فٹے منہ ہو جائے گا۔ کہیں جانے کے قابل ہی نہ رہے گا' اللہ جانے تجھے کب ٹھنڈ پڑے گی۔ بہت سوں کے ارمان تو راکھ کر دیے......

مائی! تو ہماری جان کب چھوڑے گی؟ ہر لڑائی کا اختتام اس ایک جملے پر ہوتا جان چھوڑنے سے اس کا مطلب مر جانا قطعی نہیں ہوتا تھا۔

لیکن صدیق کے گرنے پر اس نے کچھ نہیں کیا۔ رات کو وہ اس کے پاس آئی۔

"میں جا رہی ہوں مائی!" اس نے ایسے کہا جیسے بہت ضبط سے بول رہی ہو۔

"رہنا نہیں؟ تو تو رہنے آئی تھی؟"

"وہ کہہ رہے ہیں' گھر چلتے ہیں پھر کبھی آجائیں گے۔" وہ پائنتی پر ٹک گئی۔ "کہا سنا معاف کرنا۔"

"رہ جاتی۔" مائی کی آواز لرزنے لگی۔

"رہ لوں گی پھر کبھی۔" اس نے ایسے کہا جیسے کہا ہو۔ "ہونہہ"

"یہ لے......" اس نے دوپٹے کی گرہ کھول کر ایک پچاس اور ایک بیس کا نوٹ اس کی طرف بڑھایا۔ چارپائی سے اٹھ کر اس کا ماتھا چوما اور کھڑی ہو کر اسے دیکھنے لگی۔ پھر اس کا ماتھا چوما.....

"رہن دے مائی! یہ لاڈ پیار ہمیں راس نہیں آتے تیرے۔ ہمیں تو تیری ساڑھ راس ہے۔"

ضبط کرتے کرتے بھی وہ کہہ ہی گئی۔ مائی کے ادھ جلے چہرے پر سیاہ رنگ آکر گزرنے لگے۔

جب وہ جوان تھی تو وہ سدرہ کے باپ کو نہلایا کرتی تھی۔ وہ اس کا سب سے چھوٹا بھائی تھا اور سدرہ اس کی سب سے چھوٹی بیٹی تھی۔ ورنہ بڑے دو بھائیوں کے تو بچوں کے بچے بھی جوان ہونے کو تھے۔ گھر بھرا پڑا تھا بھائیوں کی اولادوں کی اولادوں سے۔ کسی کی مجال نہیں تھی کہ مائی کو کچھ کہہ جائے۔ کچھ ڈرتے تھے' کچھ احترام کرتے تھے' کچھ محبت اور بہت سارے ہمدردی.....

ایک سدرہ تھی جو کم ہی لحاظ کرتی تھی۔ وہ ان پچاس پچاس لوگوں میں سے شاید اکیلی تھی جس نے دمڑی مائی کو خود بخود ہی سمجھنا شروع کر دیا تھا۔

جہاں دوسروں کو "چُپ تمہیں نہیں پتا" کہہ کر خاموش کروایا جاتا تھا وہاں سدرہ "جانتی ہوں میں اس دمڑی کو" کہہ کر سب کو خاموش کروا دیا کرتی تھی۔

وہ اندر ہی اندر اس سے خار نہیں کھاتی تھی بلکہ دکھاتی بھی تھی۔ وہ اس سے محبت بھی کرتی تھی اور نفرت بھی۔ وہ اس کی اکلوتی پھوپھی تھی اور اسے پیاری تھی جیسی کہ عموماً" پھوپھیاں ہوتی ہیں۔

"مائی روئی ہو گی بہت؟" ہر نئے نئے جوان ہونے والوں کی طرح اس نے بھی یہ سوال سب سے اور بہت بار پوچھا۔ بتانے والے کی شکل بتا دیتی کہ مائی کتنا روئی ہو گی۔

"نہیں ترس نہیں آیا؟"

"بہت محبت کرتی ہو گی۔"

کیا ابھی بھی کرتی ہے؟ یاد تو آتا ہو گا؟"

"اچھا تو پھر بہت نفرت کرنے لگی ہو گی اس سے۔ اسی لیے ایسی ہو گئی ہے۔"

"ہائے یہ اپنی مائی ہے..... اپنی دمڑی....."

وہ بلیک اینڈ وائٹ تصویر نہ صرف اس نے خود دیکھی بلکہ گھوم پھر کر ہر اس شخص کو دکھائی جو مائی سے خار کھاتا تھا۔

"مائی اتنی خوبصورت تھی؟" دیکھنے والے تصویر پکڑ لے شک میں مبتلا ہو جاتے کچھ تصویر ہاتھ میں چھپا کر ایک نظر مائی کو اور ایک نظر تصویر کو دیکھے جاتے اور حیران ہوتے جاتے۔ "یہ مائی ہے؟"

وہ مائی ہی تھی، جہاں دوسروں میں کبھی غصہ، کبھی نفرت کبھی لڑائی تھی جہاں وہ سب کے سب خوشی، ضرورت، لحاظ احترام، پیار اور ابہام سے بھرے پڑے تھے وہاں مائی میں ایک ہی چیز بہت تھی وہ کرب۔ تھی اور بہت زیادہ تھی وہ کالی زبان والی تھی۔ وہ بیٹھے، کھڑے، لیٹے، سونے سے جاگتے، خوشی، مرگ، اندر یا باہر کسی بھی وقت شروع ہوجاتی تھی، پہلے وہ ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہتی، کبھی لمحوں کے لیے، کبھی گھنٹوں کے لیے۔ اس کی آنکھیں سرخ ہوکر ضبط سے باہر آنے کو ہوتیں، اس کا ادھ جلا منہ اور سیاہ ہوجاتا اور اس کا وجود پھنکارنے لگتا......

جیسے ایک بار دھوپ سینکتے ہوئے وہ سب مالٹے کھا رہے تھے۔ امانت مشین کا ہینڈل گھما گھما کر مالٹے کا جوس نکال رہا تھا۔ کالی مرچ چھڑک کر وہ باری باری سب کو گلاس بھر بھر دے رہا تھا، مائی گھنٹے سے مشین کے ہینڈل کے ساتھ ساتھ اپنی آنکھیں گھما رہی تھی ایک طرف رخ کیے جیسے وہ سب سے بے نیاز تھی۔

"تو مرجائے شمیم اختر......"

اس کا رخ اپنی بڑی بھابھی کی طرف تھا جو گندم صاف کررہی تھی۔

"لولی لنگڑی ہوجائے، بیوہ ہوجائے، تیرا منہ کالا ہوجائے، تیری قبر میں کیڑے پڑیں۔ تیرے جنازے کے پیچھے کتے روئیں، تیری شکل پر پھٹکار پڑے، لعنت ہو تجھ پر، چیل کوے تیرا مردار کھائیں۔ تیری......"

سانس لیے بغیر وہ بکتی ہی چلی گئی۔ سب منہ اٹھا کر اسے دیکھنے لگے۔ ساگ کاٹتے کاٹتے منجھلی بھابھی کی بہو جس کی شادی کو ایک مہینہ ہی ہوا تھا اپنی انگلی کاٹ بیٹھی، بڑی بھابھی کی دو بہوئیں جو ہاتھ سے گندم صاف کررہی تھیں، ہاتھ روک کر تشویش سے اپنی ساس کی طرف دیکھنے لگیں۔

"دمڑیے! خدا کا خوف کر......" وہ چھاج پھینک کر لپک کر اس کے پاس آئی اور اسے بری طرح سے جھنجوڑا۔ یہ سوال تو اب پرانا ہوچکا تھا کہ "میں نے کیا کیا؟" یا "میں نے کیا کہا۔"

وہ دمڑی تھی۔ وہ کسی وقت بھی کسی پر بھی شروع ہوجاتی تھی ایک دم سے ابل پڑتی تھی۔

شمیم اختر اس کے سرپر کھڑی اسے جھنجوڑتی رہی لیکن اس کی زبان نہیں رکی۔ دھوپ سینکتے سب کو سانپ سونگھ گیا۔ دمڑی بددعاؤں پر بددعائیں دیے جارہی تھی اور کوئی اسے خاموش نہیں کروا سکتا تھا اتنے سالوں میں کہاں کوئی کروا سکا تھا۔

رات سوتے ہوئے شمیم اختر کے پیٹ میں ایسا درد اٹھا کہ اسے ایمرجنسی میں اسپتال لے جانا پڑا۔ وہاں ان کے پتے کا، جو پھٹنے ہی والا تھا، آپریشن ہوا تھا۔ اسپتال میں دمڑی ان کے ساتھ ساتھ رہی۔ چار دن تک آنکھ جھپکے بغیر وہ ان کی خدمت کرتی رہی۔

"اب تو خوش اے دمڑیے!" تیسرے دن انہوں نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔ "تو ہماری بنی ہی نہیں۔" شمیم اختر نے اپنے آنسو صاف کیے "تیرے آگے ہاتھ جوڑ جوڑ کے بھی تھک گئے ہم۔"

دمڑی انہیں آنسو صاف کرتے دیکھے جارہی تھی۔ ایسی باتیں سنتے ہوئے وہ مردوں کی طرح ہوجاتی تھی۔ مہینہ بھر پہلے بھی وہ ایسے ہی ہوگئی تھی جب وہ چار سال کی منزہ کو گھورے جارہی تھی اور گندی گندی گالیاں اور بددعائیں دے رہی تھی۔ بھابھی اس کے منہ پر رگڑ رگڑ کر صابن لگارہی تھیں صابن لگے ہاتھوں سے ہی وہ بھاگ کر اس کے پاس آئی اور ہاتھ جوڑ کر رونے لگی۔

نہ میری بہن...... نہ...... اس بچی کا کیا قصور ہے۔ نہ دمڑیے! خدا کا واسطہ ایسا نہ بول۔"

پر وہ بولتی ہی چلی گئی۔ صابن آنکھوں میں جانے سے منزہ زور زور سے رونے لگی، پر بھابھی پھر بھی دمڑی کو ہی چپ کروانے کی کوششیں کرتی رہیں۔ منزہ کی ماں اندر سے گرتی پڑتی آئی۔ دو دن پہلے ہی اس کے گھر بیٹے کی ولادت ہوئی تھی۔ دیوار کا سہارا لے کر وہ منزہ تک آئی اور اس پر پانی ڈالنے لگی۔

کمزوری اور نقاہت سے وہ خود کو سنبھالتے سنبھالتے بھی منزہ پر اس زور سے گری کہ منزہ اس کے نیچے دب گئی۔ اس کا منہ کھرے کی بنی سے اس زور سے لگا کہ اس کے سامنے کے دو دانت ٹوٹ گئے اور منہ خون سے بھر گیا۔ ماتھے پر ایک کٹ پڑ گیا اور آنکھ کی ہڈی پر اتنا شدید دباؤ آیا کہ وہ سانس لینا اور رونا بھول گئی۔ بھابھی سے پہلے دمڑی منزہ کے پاس پہنچی اور لپک کر اسے سینے سے لگالیا۔

وہ دمڑی تھی۔ سب اس سے عاجز اور بے زار تھے لیکن وہ کیا کرتے، وہ ان کی مائی تھی۔ جب نئی نئی سدرہ کی ماں بیاہ کر آئی تو وہ اس سے بہت خار کھاتی تھی تب وہ صرف دمڑی تھی، مائی نہیں تھی۔

اس نے اس کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا۔ شروع دنوں کی چڑ اور خار وقت کے ساتھ ساتھ پیار اور ہمدردی میں بدلنے لگی کیونکہ وہ اتنی ہی بے ضرر تھی جتنی کہ ایسی عورتیں ہوتی ہیں۔ جنہوں نے شادی نہ کی ہو اور جو وقت سے پہلے ہی بوڑھی لگنے لگی ہوں۔

جیسے بڑے دو بھائی اور بھابھیاں اس کا خیال رکھتے تھے۔ وہ بھی رکھنے لگی۔ اس دن دمڑی باورچی خانے میں مٹی کے چولہے کے پاس بے وجہ بیٹھی تھی۔ کھانا کب کا کھایا جاچکا تھا، دودھ بھی ابال لیا تھا۔ لکڑی کے تخت کوئلے ابھی بھی گرم تھے، جنہیں وہ کبھی تنکوں سے اور کبھی ہاتھ سے کرید رہی تھی۔ ان میں سے جو دبی دبی چنگاری اٹھ رہی تھی وہ اس کی آنکھوں میں دکھائی دے رہی تھی۔ کافی دیر سے وہ یہی کچھ کررہی تھی۔

عشاء کی نماز پڑھ کر سب اپنے اپنے کمروں میں بند ہوچکے تھے۔ صرف راحت تھی، جو صحن میں ٹہل ٹہل کر اپنے شوہر کا انتظار کررہی تھی۔ باورچی خانے کے بڑے اور کھلے دروازے سے دمڑی کبھی کبھی آنکھ اٹھا کر اسے بھی دیکھ لیتی تھی۔ راحت کا پیٹ بڑھا ہوا تھا۔ اس کے پیٹ پر نظر پڑتے ہی دمڑی کی آنکھوں کی چنگاری جاگ اٹھی اور کچھ آنسو نکل کر جلتے بجھتے کوئلوں پر گرے۔

"دمڑیے! سونا نہیں ہے۔ اتنی ٹھنڈ ہے۔ کیوں بیٹھی ہے یہاں......" راحت اپنے شوہر کے لیے کھانا گرم کرنے آئی تھی۔ اس کی آواز، اس کی چال، اس کا انداز سب کچھ دلربا تھا۔ دمڑی نے آنکھ بھر کر اسے دیکھا۔ اس کی ایک ایک ادا کو جانچا، جیسے اس کی شرم و حیا اور مسرت کے ذائقے کو چکھنا چاہتی ہو۔ راحت نے اس کی طرف دیکھا اور ڈر گئی۔

"کیا ہوا ہے۔ ایسے کیا دیکھ رہی ہو"

"تیرا...... تیرا پیٹ مردہ ہوجائے......"

یہ وہ آخری الفاظ تھے، جو آگ کی طرح راحت کے کانوں میں پڑے دمڑی ساتھ ساتھ گرم کوئلے اس پر اچھال رہی تھی...... راحت منہ کھولے اسے دیکھنے لگی۔ وہ وحشی لگ رہی تھی۔ دمڑی کا یہ روپ دیکھ کر اس کے جیسے تن بدن میں آگ ہی لگ گئی۔ اس نے پہلے صرف سنا ہی تھا......

سات ماہ کے بچے کو جنم دے کر وہ کئی دن تک روتی رہی اور جس دن بچہ اٹھائیس دن کا ہوکر مرگیا، اس دن اس نے بھی دمڑی کے ہی انداز میں اسے بددعائیں دیں۔ اس نے اپنی جھولی پھیلائی اور اسے کوسنے لگی۔

"تیرا ککھ نہ رہے دمڑیے!"

"اس کے پاس ہے ہی کیا جو ککھ ہوگی وہ......"

بڑی بھابھی نے آہ بھری۔

وہ چھوٹی تھی۔ پہلا بچہ تھا۔ غم سہہ نہ سکی۔ نہ وہ اسے معاف کرسکتی تھی نہ بھول سکتی تھی۔ دمڑی کی شکل دیکھتے ہی اسے کوسے دینے لگتی۔ پھر جھر جھر رونے لگتی۔

کئی سال ایسی کشمکش میں گزر گئے کہ یا اس گھر میں دمڑی رہے گی یا وہ۔ وہ ناراض ہوکر میکے گئی۔ کئی عیدیں گزر گئیں مگر وہ نہیں آئی، اس کا بھائی سوکھ کر کانٹا ہوگیا۔ کبھی دمڑی کے آگے رولیتا، کبھی اس کی منت کرتا۔ کبھی صبر کرجاتا، کبھی بے صبرا ہوکر باؤلا ہوجاتا......

آخر دمڑی ہی راحت کو لے کر آئی۔ دونوں میں کیا بات ہوئی۔ کوئی نہیں جانتا تھا لیکن نہ صرف راحت واپس آگئی تھی بلکہ پہلے ہی کی طرح دمڑیے کا خیال رکھنے لگی تھی۔

آنے والے ہر دن، ہر پہر کے ساتھ وہ دمڑی بنتی گئی۔ بہت سوں کو اس کی زبان کی کاٹ سہنی پڑی۔ کوئی چھوٹا، بڑا، اپنا، غیر، رشتے دار، پڑوسی، ملنے جلنے والا سلام دعا والا، پھیری والا، سبزی والا، بس والا، رکشے والا ایسا نہیں تھا، جو اتنے سالوں میں اس کی زبان کی زد میں نہ آیا ہو۔ لوگوں کے لیے اس کی ادھ جلی شکل سے زیادہ اس کی زبان بدصورت تھی۔

عام دنوں میں وہ اپنے آپ میں گم رہتی، اپنے کام سے کام رکھتی رضائیوں گدوں میں تگندے ڈالنے پر آتی تو سردیوں سے گرمیاں آجاتیں اور ایک سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے گھر تک آتے آتے موسم بدل جاتے۔ کسی کی چارپائی کی بنائی، کبھی گندم صاف کرنا اور کبھی گندم کے بڑے بڑے ڈرم دھوپ میں دھو دھو کر چمکاتی، کوئی ساگ کاٹنے کو دے جاتا اور کوئی بے کار پرانے اونی سویٹروں کے گولے بنانے کو دے جاتا۔ کام کوئی سا بھی ہوتا۔ وہ انکار نہیں کرتی تھی حتیٰ کہ ایک بار سدرہ نے اسے چھلوں پر دھاگا لپیٹنا سکھا کر رات دن اس سے چھلے بنوائے۔

سب کچھ ٹھیک تھا کہیں خرابی تھی تو اس کی ہولناک زبان میں جب جب اس کی زبان کی زد میں کوئی آتا۔ اس پر موقع پر سب کا جی چاہتا کہ دمڑی کا گلا ہی دبا دے۔

"منحوس، کالی زبان والی۔"

پھر اس کی تاریخ کھنگالی جاتی

اس کا ماضی دہرایا جاتا۔ کیوں، کب اور کیسے۔۔۔

بڑی دو بھابھیاں سسکیاں بھرتیں۔ ان کی اولاد جیسی بھی دمڑی، اور ان کی اولاد یا اولاد کی اولاد اسے برا بھلا کہتے تو ان سے برداشت نہیں ہوتا تھا۔

"مائی ایسے کیوں کرتی ہے؟" نوید نے بری طرح پاؤں پٹخے۔

"شادی ہی کر دیتے مائی کی۔" قدسیہ نے فرخندہ کے کان میں گھس کر کہا۔

"وہ مردوں سے نفرت کرتی ہوگی۔" فرخندہ نے بھی سرگوشی ہی کی۔

"اگر مردوں سے نفرت کرتی تو گھنٹہ گھنٹہ گھر کے مردوں کے سروں میں مالش نہ کرتی۔"

"ایسی شکل والی سے کون شادی کرتا۔"

"اماں بتا تو رہی تھی ایک دن کہ مسجد کے مولوی صاحب جو حافظ بھی تھے۔ کتنا اصرار کرتے رہے تھے۔"

"مائی کو مولوی پسند نہیں ہوں گے۔" فرخندہ نے بری سی شکل بنا کر کہا۔

وہ سب کمرے میں ٹولیاں بنائے ایک دوسرے سے لیکن ایک کو ہی سوچ رہے تھے۔ مائی کو۔۔۔ سب کے پاس کوئی نہ کوئی قصہ ہوتا سنانے کے لیے۔ کوئی بھاگاں کی نویلی دلہن کے بالوں کے جل جانے کا قصہ سناتا تو کوئی دولہا بنے احمد کی آنکھ کے پھوٹ جانے کا۔۔۔ کوئی نالے میں گر گیا تو کسی کی چھت گر گئی۔

"اس کی نظر کھا جاتی ہے۔" وہ آپس میں سرگوشیاں کرتے۔۔۔

"خود تو ہے ہی دمڑی، دوسروں کو بھی بنا کر ہی چھوڑے گی۔"

وہ سب اس کے کام بھول جاتے۔ اس کی خدمت، سالوں پر پھیلی اس کی خاموشی۔۔۔ یاد رکھتے تو وہ بددعائیں جو دمڑی جھولی پھیلا پھیلا کر انہیں دیتی۔ وہ گودیں اجاڑ دیتی، وجود جلا دیتی۔ وہ عورت تھی لیکن اس کا دل ڈائن کا تھا۔۔۔

خاندان کے وہ سب بڑے جن کے سامنے وہ پل کر جوان ہوئی تھی۔ اسے دیکھ دیکھ کر آہیں بھرتے۔

انہیں اس کی کربہہ بددعاؤں پر حیرت ہوتی تھی نہ افسوس۔ اور وہ لوگ جو اسے ڈھلتی عمر سے جانتے تھے۔ اس سے دبتے بھی تھے، خوف زدہ بھی تھے اور اس کے ہمدرد بھی تھے۔

خاندان میں، پاس پڑوس میں ہونے والی شادیوں میں اسے خاص طور پر بلایا جاتا۔ ویسے بھی لوگ ڈرتے تھے کہ اگر دمڑی کو نہ بلایا تو کہیں وہ ناراض نہ ہو جائے۔ اس کے لیے خاص طور پر کپڑے بنوائے جاتے۔ شادی کی رسومات میں تو خیر دمڑی کبھی بھی

شرکت نہیں کرتی تھی۔ سارا وقت شادی والے گھر کے کاموں میں جتی رہتی۔ یا الگ کسی کونے میں پڑی رہتی۔

لڑکے کی شادی میں اسے کوئی نہ کوئی سونے کی چیز بنا کر دی جاتی چاہے وہ باریک لونگ ہی کیوں نہ ہوتی۔ کتنی ہی لونگیں، جھمکیاں اسے ملیں مگر کسی نے ایک بار بھی اسے پہنے نہیں دیکھا۔ ملنے والی چیزوں کو وہ ایک سے دوسری نظر بھی نہیں دیکھتی تھی۔

اپنے بچے سنبھالنے کو اس کے حوالے اس کے کمرے میں سلا جاتے۔ وہ اکثر انہیں اٹھ اٹھ کر دودھ گرم کر کے دیتی۔ ایک رات جب سب اپنے اپنے کمروں میں دبکے پڑے تھے کہ اس کی چیخوں سے سہم کر اٹھ گئے۔ مائی کے کمرے میں سوئے چھوٹے بڑے بچے الگ رو رہے تھے۔۔۔

سب کے سب مائی کے کمرے کی طرف بھاگے۔ یہ ویسی ہی چیخیں تھیں جو اس سے پہلے سب نے اس کے جلنے پر سنی تھی۔۔۔ بھائیوں، بھابھیوں کی بانہوں میں وہ جیسے جھول گئی۔ جیسے دل پھٹا جا رہا ہو۔ اپنا منہ کھرچ کھرچ کر اس نے لہولہان کر لیا تھا۔ شام کے ہی قصے میں اس کا بڑا بھائی مین سوئچ سے مرتے مرتے بچا تھا جب لکڑیوں سے کھینچ کر انہیں زمین پر لٹایا گیا تو اسے لگا جیسے دفنانے کے لیے میت کو لٹایا ہو پل کے پل۔۔۔ اسی بھائی نے اس کا کھرچا منہ چومنا شروع کر دیا۔

مائی کی ان دہلا دینے والی چیخوں اور حالت کے بعد کبھی کوئی بچہ اس کے کمرے میں نہیں سویا۔ ماؤں نے جب انہیں جلدی سلانا ہوتا تو وہ کہتیں۔ "سو جاؤ ورنہ مائی کے کمرے میں سلا دوں گی۔" اور بچہ جھٹ سے سو جاتا۔

"وہ کیسی عورت تھی دمڑی اور کیسی ہو گئی۔"

☼ ☼ ☼

وہ اپنے پھوپھی زاد کے بیٹے کی شادی میں شرکت کے لیے آئی تھی۔ باقی گھر والوں میں سے صرف بڑے بھائی اور بھابھی ہی آئے تھے۔ وہ آنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کی طبیعت کچھ مکدر سی تھی لیکن اسے بلانے والوں نے اتنا اور اس طرح اصرار کیا کہ اسے آنا ہی پڑا۔ احاطے سے ڈھولکی بجنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ عورتیں ہنس بھی رہی تھیں اور گا بھی رہی تھیں۔ نہ جانے ایسے موقعوں پر انہیں اتنی شرارتیں کیسے سوجھتی ہیں کہ ہنسی کے فوارے ہی بند نہیں ہوتے۔ کوئی نہ کوئی چٹکلہ چھوڑ دیتا اور وہ گانا چھوڑ کر ہنستی رہتیں۔ بچے بھی شور کر رہے تھے اور مردانہ بھنبھناہٹ بھی کانوں میں پڑ رہی تھی۔

مائی کی چچا زاد، پھوپھی زاد، تایا زاد جو اس کی ہم عمر تھیں بنی ٹھنی بیٹھی ٹپے پر ٹپہ گا رہی تھیں۔۔۔ بیٹوں اور شوہروں کی کمائی سے بنے زیورات سے لدی پڑی تھیں۔ اپنی عمروں کا روپ ان سب کے پاس تھا۔ وہ سب کی سب لڑکیاں بالیاں بنی ڈھولکی ایسے بجا رہی تھیں جیسے کچھ دن بعد ہی ان کی بھی شادی ہو۔ دور پیڑھی پر بیٹھی مائی بے خیالی میں انہیں دیکھے جا رہی تھی۔ اسے ان کے گانوں یا ڈھولکی میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

جب ان کے فضول ہنسی مذاق ضرورت سے زیادہ بڑھ گئے تو وہ اٹھ کر سب سے کونے والے کمرے میں آ کر لیٹ گئی۔ یہاں ان سب کی آوازیں نہیں آ رہی تھیں۔ ان سب میں سبز رنگ کا سوٹ پہنے ایک عورت سب سے زیادہ دلربا لگ رہی تھی۔ وہ کون تھی دمڑی نہیں جانتی تھی۔ آج پہلی بار ہی دمڑی نے اسے دیکھا تھا لیکن وہ جو کوئی بھی۔ اس کی اداؤں پر سے نظر نہیں ہٹ رہی تھی۔ ایسے ہی جیسے کسی کو نئی نئی محبت ہو گئی ہو۔۔۔ ایسے ہی جیسے کبھی دمڑی ہوا کرتی تھی۔

کمرے میں آ کر اس نے اپنی آنکھیں رگڑیں۔ ادھ جلے چہرے سے ٹیسیں اٹھنے لگی تھیں۔ وہ لحاف میں دبک گئی۔ کچھ دیر میں ہی اس کا وجود کانپنے لگا۔ بخار تو نہیں تھا اسے لیکن وہ بے حال سے بے حال ہو گئی اور سسک سسک کر رونے لگی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے سبز سوٹ والی گھومنے لگی۔ وہ لپک لپک کر

ڈھولکی بجا رہی تھی اور مہندی لگے ہاتھوں سے اپنی ہنسی روک رہی تھی۔ وہ دمڑی کی ہم عمر ہو گی لیکن وہ مائی نہیں تھی۔

اسے کمرے میں کسی کے آنے کی چاپ سنائی دی۔ لحاف سے اس نے اپنا پورا منہ باہر نکال کر دیکھا۔ وہ گھوڑا بوسکی پر واسکٹ پہنے وہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔

"سفینہ!" کمرے میں اس سے نظریں ملتے ہی حیرت زدہ آواز گونجی۔

"سفینہ!" یہ نام اس نے اتنی صدیوں بعد سنا کہ اسے لگا کسی اور کو پکارا ہے۔

سفینہ تو وہ تب تھی جب وہ اس کا انتظار کر رہی تھی اور تب جب وہ ایک ہی تھی پوری کی پوری۔ ادھ جلی نہیں تھی۔

وہ اسے دیکھتا ہی رہا۔۔۔۔

وہ اس کا تایا زاد تھا یوسف۔ بچپن سے وہ ایک ساتھ کھیل کر لڑ کر بڑے ہوئے تھے ایک ہی گھر میں، پھر ان کے گھر دور ہو گئے لیکن ان کے دل ایک ہی تھے

خاندان کی تقریبات میں وہ اس سے کنارا کرتی تھی۔ بڑے ناراض جو ہوتے تھے۔ وہ دونوں دور پار کے رشتے دار کی شادی میں لازمی شرکت کرتے تاکہ وہ دونوں ایک دوسرے سے مل سکیں۔

ان دنوں وہ سفینہ تھی۔ دودھ جیسی سفید، بڑی بڑی سیاہ آنکھیں لیے وہ خود کو شیشے میں یوسف کی نظروں سے، اس کے مقطع سے بار بار دیکھتی تھی۔ وہ اس کے حسن کے قصیدے پڑھتا تھا اور اسے اپنا یہ حسن اسی کے لیے بھاتا تھا۔

ان دونوں کی شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں آتے ہی شادی کی تاریخ رکھ دی گئی۔

☼ ☼ ☼

وہ جلتی بجھتی آگ کو پھونکیں مار مار کر جلا رہی تھی اس کا سر نیچے زمین کے ساتھ لگا ہوا تھا جب منجھلا بھائی مٹی کے تیل کی کپی چولہے کے عین اوپر بنے کارنس پر رکھتے رکھتے تیل گرا بیٹھا۔ اپنے رنگ و روغن کے کام کو سمیٹ کر وہ احتیاطاً "تیل کو بچوں کی پہنچ سے دور رکھنے آیا تھا۔ کپی کارنس پر ہی پڑی لڑھکتی رہی اور اس کا تیل تل کی طرح گرتا رہا۔۔۔۔

اس کی چیخوں سے اماں باؤلی ہو گئی۔ دنوں انہیں ہوش نہیں آیا۔۔۔ سفینہ جل گئی۔۔۔ سفینہ جل گئی۔ اس کی پلکیں اور بھنویں بھی جل گئی تھیں۔

جل تو ارمان بھی گئے تھے سارے کے سارے، بچپن کے محبت کے۔۔۔ وعدوں کے۔۔۔ سب کے سب۔

پنچایتیں اکٹھا کی گئیں۔ منتیں کی گئیں، واسطے دیے گئے، رشتے داری، خونی رشتے یاد دلائے گئے، خدا خوفی، دریا دلی، اجر۔۔۔ نیکی، جنت۔۔۔ سب یاد دلائے گئے پر تایا نہ مانے۔۔۔۔

خاندان کے بڑوں نے کیا کیا نہیں کیا، لیکن کوئی بھی نہیں مانا، اس کا ادھ جلا یا منہ تھا جو ہر بازی مات کر رہا تھا۔

"اس کی تو کوئی دمڑی بھی نہیں دے گا۔ میں اپنا ہیرے جیسا بیٹا کیسے دے دوں؟" تائی نے بھری پنچائیت میں چمک چمک کر کہا۔

"نہ ہم راضی نہ ہمارا بیٹا۔"

سننے والوں نے یہ جملہ اتنی بار دہرایا کہ وہ سفینہ سے دمڑی ہو گئی۔ اس کی ماں نے بھی سینے پر ہاتھ مار مار کر کہا۔

"نی دمڑیے! تیرا ککھ نہیں رہیا۔"

تازہ زخموں سے اس کا منہ، آدھا سر، گردن اور سینے کا کچھ حصہ چھلا پڑا تھا۔ وہ خود کو شیشے میں اپنی نظروں سے نہیں دیکھ سکتی تھی تو یوسف کی نظروں سے کیسے دیکھتی۔۔۔ اس نے یوسف کو ہزار بہانے بنا کر بلایا اپنی بھابھیوں کو بار بار بھیجا۔ وہ ہر بار اپنی مایوس شکل لے کر آجاتیں، روتیں اور اسے سمجھاتیں کہ یوسف کبھی نہیں آئے گا۔

لیکن اس کی ایک ہی رٹ تھی کہ یہ سب تائی کی وجہ سے ہو رہا ہے، یوسف کی وجہ سے نہیں۔ وہ یوسف کو بچپن سے جانتی ہے۔ وہ تو اس کے مذاق سے کھینے پر بھی جلتا کوئلہ ہاتھ میں پکڑ لیتا تھا، ورنہ یوسف ایسا نہیں ہے۔

اسے اپنے جلے ہوئے حسن کی ذرہ برابر پروا نہیں تھی بے شک وہ ساری کی ساری جل جاتی۔ نہ ہی حسن کے گہنا جانے پر افسوس تھا۔۔۔ سب کچھ جل بھی جاتا مگر محبت کیسے جلتی۔۔۔۔

"سفینہ ہے نا تو؟" یوسف نے دیر تک گھورتے رہنے کے بعد پوچھا۔ وہ چارپائی پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اگر محبت کا تعلق عمر، وقت، زمانے یا حالات سے ہوتا تو اس کا دل یوں نہ دھڑک رہا ہوتا۔

وہی پرانی لے۔۔۔ وہی سُر تال۔

وہ شہر علاج کے لیے گئی تھی، جب تائی نے جھٹ پٹ یوسف کی شادی کر کے اسے واپس مسقط روانہ کر دیا۔ دونوں بھائی بہانے سے اسے شہر لے گئے۔ اس کی اماں چند مہینوں میں ہی غش کھا کھا کر مر گئی اس کے باپ کا اتنا بڑا دل نہیں تھا کہ وہ روتی بلکتی سفینہ کو آنکھ بھر کر دیکھ سکتا۔۔۔۔

"بڑی عجیب عجیب باتیں سنی ہیں تیرے بارے میں۔" وہ کبھی آنکھیں پھیلا کر اور کبھی سکیڑ کر اس کے جلے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ وہ اس کے سامنے سیدھا کھڑا تھا ڈھلتی عمر میں بھی شہزادہ لگ رہا تھا۔ ویسا ہی جوان اور خوبصورت۔۔۔ وہی روشن اور چمک دار آنکھیں۔

"سنا ہے تیری زبان انگارہ بن چکی ہے۔ لعنتی اور منحوس کہ۔۔۔ تیری شکل سے بھی زیادہ کریہہ اور غلیظ۔۔۔ اماں صحیح کہتی تھی تو قسمت کی طرف سے پھٹکاری گئی ہے۔"

اس کی آواز میں ان سب سے زیادہ رعونت تھی جو اس کی زبان کا شکار ہوئے تھے۔ شاید وہ ان سب کا بدلہ لینے آیا۔

ہاتھ مار کر اس نے قمیص کا دامن جھاڑا اور کوٹ کو ایسے کھینچا جیسے کسی کو ہاتھ سے اشارہ دیا ہو کہ چل جا دفعان ہو۔۔۔۔

سفینہ کے اندر ابلتی ساری کی ساری سسکیاں ٹھنڈی پڑ گئیں۔

"تجھے کریہہ کہہ رہے ہو۔" اس کی لرزتی آواز پاتال سے آئی۔

"کوئی نماز روزہ کرتی۔۔۔ خدا خوفی کرتی۔۔۔ توبہ تلا۔۔۔ مگر تو نے تو دوسروں کا ناس مارنا شروع کر دیا۔"

اس کی آنکھوں سے سب ہی لوگوں کی نفرت جھلکنے لگی۔ وہی آنکھیں جو کچھ دیر پہلے روشن اور چمک دار تھیں۔۔۔۔

سفینہ کا باقی ماندہ وجود بھی جل کر راکھ ہو گیا۔

"تو وں کیا بگاڑ لیا۔۔۔ تمہاری آہیں میں نے انہیں۔۔۔"

اس نے رعونت سے اسے گھورا۔ "تو میرا کیا بگاڑ لیا۔۔۔ تو نے۔۔۔ مجھے دیکھ! خدا کا کتنا کرم ہے مجھ پر۔ شکر اس کی ذات پاک کا۔۔۔" اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر عقیدت سے کہا اور پھر کوٹ کو نیچے کھینچا۔

"چودھویں کا چاند ہے میری بیوی۔ تجھے تو کسی کیے کی سزا ملی ہے۔"

اس کی نگاہوں میں سبز سوٹ والی سما گئی جس میں سفینہ کا حسن جھلک رہا تھا اور یوسف کی محبت۔۔۔۔۔

"تم سے محبت کی سزا ملی ہے۔" آہ کی طرح آخری بددعا جیسے اس کے ہونٹوں سے نکلی۔۔۔۔

یوسف کی شکل ایسے بگڑی جیسے الٹی کرنے والا۔

صبح سویرے بھابھی نے ہی اسے دیکھا۔ اپنی آواز دبائے بڑے بھائی کے ساتھ پچھلے دروازے سے چند اور لوگوں کی موجودگی میں وہ اسے لے کر اپنے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔۔۔۔

وہ شادی والے گھر میں دمڑی کی موت کا سوگ پھیلانا نہیں چاہتے تھے۔ جو اپنی زندگی میں ککھ تھی اس کی موت کیا ہو گی۔۔۔۔

کبھی زندگی میں اس نے اپنی کسی سہیلی سے کہا تھا۔

"جس پل میرے دل سے یوسف کی محبت نکلے گی اسی پل میرا دم نکل جائے گا۔"

☼

مکمل ناول

سائرہ رضا

سیدھی سڑک

سورج آگ کا گولا تھا۔ ہرذی روح اس کی تپش سے بچاؤ کا سامان کیے اپنے اپنے ٹھکانوں میں چھپا بیٹھا تھا۔ اکادکا بڑی ہی مجبوری کے عالم میں نکلنے والے بھی سایہ دار منزل کی تلاش میں تیز قدموں سے مسلسل بڑھتے ہی جاتے تھے۔

وہ مجذوب بھی نہیں تھا نہ دیوانہ' پاگل ایک خوش شکل' خوش لباس دراز قد جوان..... لیکن صبح سے مختلف گلیوں' چوراہوں' سڑکوں' فٹ پاتھوں کی خاک چھان چھان کر پہلی نگاہ میں وہ پاگل ہی دکھائی دے رہا تھا۔

دھول میں اٹے' آگ جیسے تپے جوتے
ان جوتوں کے اندر پیروں کے لیے ایسی گرمائش تھی جیسے بھاپ سے بھرا گھر...
مگر وہ شخص اتنا لاپرواہ کیسے تھا' اتنا بے حس...
اس وقت وہ چلتے چلتے معروف شاہراہ کے دوشاخے تک آگیا۔ ایک جانب باڑ لگا کر حد بندی کردی گئی تھی یہاں کوئی عظیم الشان پروجیکٹ زیر تعمیر تھا۔ وہ صبح سے منزل کا تعین کیے بغیر نکلا تھا اور اب بھی اس کا چلنا صاف بتا رہا تھا کہ وہ بس اندھا دھند چلتا ہی جارہا ہے۔

جتنی تپش اور آگ "اندر" تھی۔ جون کے اس تپتے سورج کی اس کے آگے کیا مجال۔

"احساس کی بار آوری کہیں بہت اندر ہوتی ہے' ایک بار کونپل پھوٹ جائے تو سرد و گرم سب سہنا آجاتا ہے۔"

وہ مسلسل سوچ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

سفید گھاگھرے پر سلور اور سیاہ پھول بنے تھے' کالی مردانہ اسٹائل کی بٹنوں والی شرٹ' گیلے بالوں میں ہاتھ چلاتی رینو نہانے کے بعد بھی فریش نہ ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں سرخی تھی اور جلن کے باعث وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد سختی سے آنکھیں میچ لیتی تھی۔
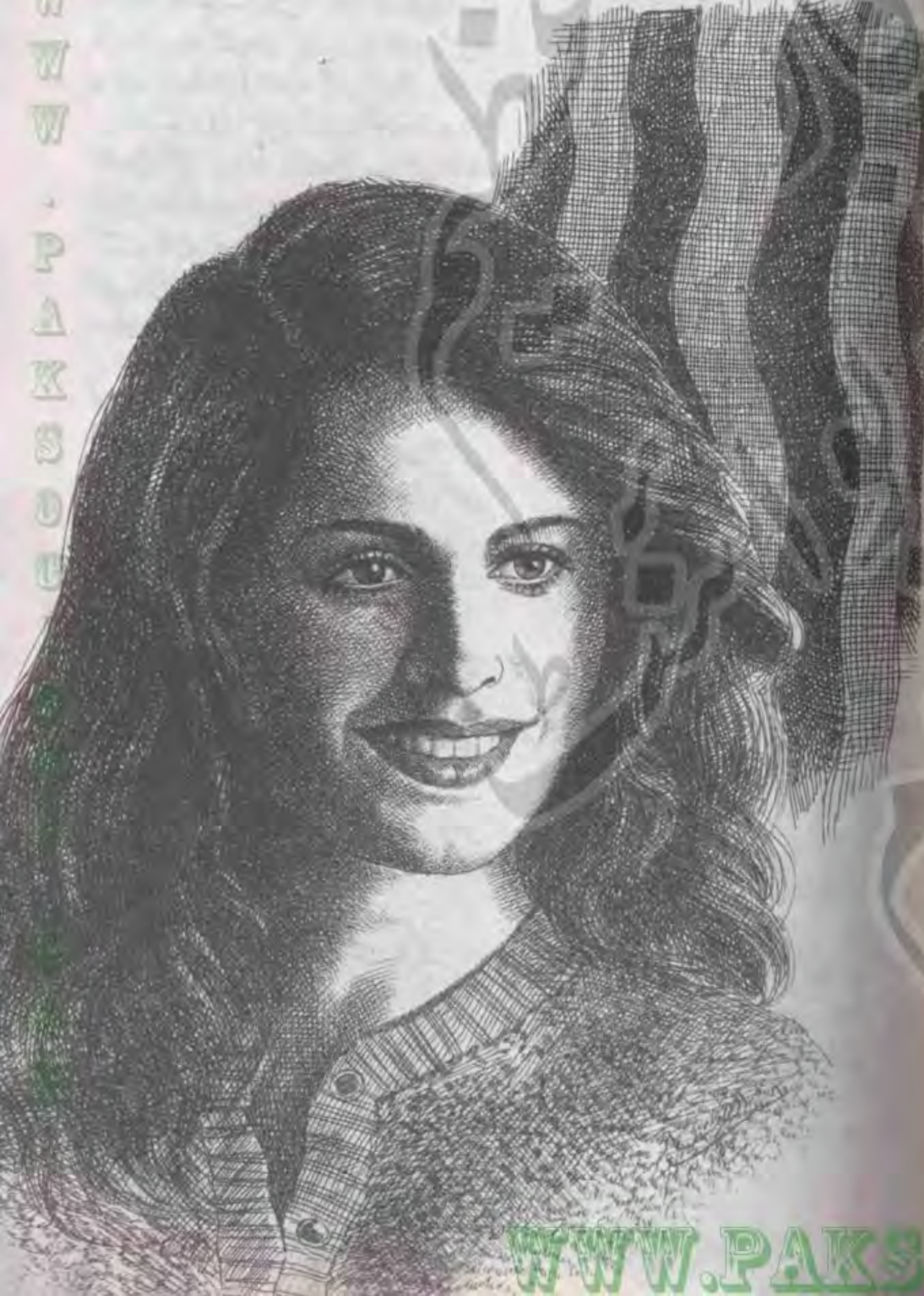
وہ ڈھیلے اور کسی قدر ڈولتے قدموں سے اپنے کمرے کی جانب بڑھ رہی تھی۔ جب ہی ٹھٹک کر رک گئی۔

اس کا چہرہ بے حد فریش تھا۔ سیاہ خواب ناک گھنی پلکوں والی آنکھوں میں بڑی طمانیت اور آسودگی تھی۔ وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھے بڑی آرام دہ حالت میں ریموٹ کے بٹنوں سے کھیل رہی تھی۔ اس کا آبنوسی حسن۔ وہ سنگ سیاہ سے تراشی مورت جیسی تھی۔

ربنو نے گھڑی دیکھی اور "رات" کو یادداشت میں ٹٹولا۔ (پھر بھی اتنی پر سکون؟) وہ اس کے عین سامنے جا کھڑی ہوئی تو وہ بری طرح چونکی۔ اپنی سحر پھونکتی آنکھیں اٹھا کر ربنو کے چہرے پر گاڑیں۔ ربنو نے ایک بھرپور نظر اس کے سراپے پر ڈالی۔ اس کی رنگت کے باعث سب اسے پیپسی کی بوتل کہتے تھے۔ سانولی، گہری سانولی، مگر بے داغ چکنی جلد جیسے سیاہ مشکی گھوڑے کی کھال۔

"تنی نکھری ستھری۔۔۔ رات تو تم بھی۔۔۔؟" اس نے جملہ چھوڑ کر آنکھ کے اشارے باقی سوال مکمل کیا۔ "سونے نہیں جانا؟"

"ہاں۔۔۔!" اس نے طویل لمبی سانس بھری "رات بڑی ہی عجیب و غریب تھی۔ میں۔۔۔"

"ہم جیسوں کی رات عجیب خواہ کتنی بھی ہو حیران کن بات نہیں۔ ہاں "غریب" بہر حال نہیں ہونی چاہیے۔" ربنو نے جملہ کاٹ کر تیزی سے بہت پتے کی بات کی۔

"ہاہاہا!" وہ سمجھ کر نزاکت سے ہنستی چلی گئی۔ "غریب" واقعی نہیں رہی۔ وہ پوری پے منٹ کر کے گیا ہے۔"

"مرد نارمل تھا ناں۔۔۔" ربنو نے آنکھیں نچائیں۔ وہ جواباً کچھ نہ بولی، مگر رستی ہنسی ایک بار پھر در و دیوار سے سر پٹخنے لگی۔

"تمہیں سہارنا اسے اپنے بس سے باہر لگا ہو گا۔" ربنو کا لہجہ حتمی تھا۔ "صبح تک ٹھہرایا رات کو ہی۔۔۔" اس نے آنکھیں نچائیں۔ "رفو چکر ہو گیا؟"

"فوراً" تو نہیں۔۔۔ مگر چلا گیا۔ ایک دم اٹھا اور گیٹ سے باہر۔" اس نے چٹکی بجائی۔

"تم نے روکا نہیں؟ کیا کوئی داؤ بھی نہیں چلا؟" از حد حیران تھی۔ وہ ان سب لڑکیوں کے ڈھیر کا انمول موتی تھی۔ شکل صورت، قد آواز، ادائیں، ہر رنگ میں رنگ جانے والی۔ وہ ہر کسی کے آگے پیش کیا جانے والا مال نہیں تھی۔ خاص الخاص لوگ۔۔۔ روتوں کے ساتھ روتی، ہنستوں کے ساتھ ہنستی، شاعر گر جاتے تو کیا گلی کوچے کے شاعر اور کیا بڑے بڑے ادبی نام اسے سب ازبر تھا۔

سیاست پر گفتگو کروا یا ریاست پہ، دین پر بات کروا یا لادینیت پر۔۔۔ وہ آنے والوں کے لیے سانچہ بن جاتی تھی۔ جیسے مرضی ڈھال لو اور اس فخر میں جھومو کہ "وہ اسی کی ہو چکی ہے۔" مگر صرف آدھی رات سے صبح صادق تک۔ اس کا بہروپ اس کے اصل پر کبھی غالب نہ آیا۔

وہ جو تھی۔۔۔ وہ ہی تھی۔

"کیوں داؤ چلاتی؟ میں کبھی کسی کو مجبور نہیں کرتی اور روکتی بھی کیوں۔۔۔

"ابھی نہ جاؤ چھوڑ کر کہ دل ابھی بھرا نہیں۔" وہ سریلی بھی بے حد تھی۔ "جبکہ وہ پوری پے منٹ میز پر دھر گیا تھا" وہ ہنس دی تھی۔ ربنو نے اس کی ادائے بے نیازی کو رشک سے دیکھا۔

"لگتا ہے پہلی بار اس رستے پر آیا تھا، بھٹک تو نہیں گیا تھا۔ جانا کہیں اور، پہنچا کہیں اور۔۔۔"

"ناں۔۔۔ نہیں۔۔۔ وہ تمہارے میاں "رنگیلے" کے ساتھ آیا تھا؟" اس نے ریموٹ سے آواز نکالی۔ بگ اسکرین پلازمہ پر پیاشا کی گونگی اداؤں کو زبان مل گئی۔

"جگر ما بڑی آگ ہے۔۔۔"

"اس کا مطلب ہے دوبارہ نہیں آنے کا۔۔۔" ربنو کھڑی ہو گئی۔ ساری خلقت آرام کی رات گزار کر مشقتوں بھرا دن گزارنے کے لیے بیدار اپنی اپنی منزل پر گامزن تھی جبکہ اس "گھر کی لڑکیاں" رات گزار کے اب آرام کی طلب میں ٹوٹے جسموں کو لیے بستر کی طرف بڑھ رہی تھیں۔

ربنو کے جملے پر وہ جو بڑی دلچسپی اور انہماک سے پیاشا کو دیکھنے لگی تھی بری طرح چونکی، اس کے ہونٹوں پر بڑی عجیب سی مسکان آرکی۔

"یہ بھی کہہ دیا۔۔۔" اس نے گردن پیچھے ڈھلکائی اور اپنی ہنسی کا مزا لیا "نہیں آئے گا۔ ضرور آئے گا، بہت جلد آئے گا۔۔۔ کیونکہ۔۔۔ کیونکہ جگر ما بڑی آگ ہے۔" وہ گنگنائی۔

ربنو اسے دیکھ کر رہ گئی۔ چندرا غلط دعوا نہیں کرتی تھی۔

☼ ☼ ☼

"او بجنا! ویسے تو تم پورے پکے مرد ہو۔ مگر وہ کہتے ہیں ناہر بندے کے اندر ایک کنڈھی (گرہ) ہوتی ہے۔ نفل ماننا۔۔۔ روزے رکھنا، منتیں ماننا بڈیوں (عورتوں) کا کام ہے۔ ہمارے پنڈ میں سارا سال ہی "عبادتیں" چلتی ہیں۔

منتیں مانتی ہیں، چڑھاوے چڑھاتی ہیں، میری مجھ کے کٹا (بھینس کا بچہ) ہوا تو ننگے پیر بابے ڈھکن شاہ کے مزار تک جاؤں گی۔ بکری نے اکٹھے چار بچے دیے تو سات روز تک بچوں کو کھیر بنا کر کھلاؤں گی اور بڈیوں کی عبادتیں منتیں مکتیں۔۔۔ ان کے تو روزے بھی سارے سال چلتے ہیں رکھے ہوئے روزے تے چھڈے (چھوڑے) ہوئے روزے۔۔۔" ظفر نے ایک ہی سانس میں اپنے مخصوص بے فکرے کھلے ڈلے انداز میں اسے حسب معمول نئی بات ہی بتائی۔ پھر اپنی ہی بات کا اتنا مزا آیا کہ جی بھر کے ہنسنے لگا اور وہ روزہ رکھنے کے باعث نقاہت لیے چپ بیٹھا تھا ہنس دیا۔

"اوئے ہوئے اتنی زخمی دل گیر مسکراہٹ۔۔۔ مگر پھر بھی قاتل مسکراہٹ۔۔۔" اس نے حسب معمول لوفرانہ انداز میں مگر سچی تعریف کی۔

"تم کہیں جا رہے تھے ظفر۔۔۔" اس کی لن ترانیوں کو روکنے کے لیے اس نے یاد کروانا ضروری سمجھا۔

"او یار! ہم کچھ کھا رہے تھے ایسے مزے کا کباب پراٹھا لایا تھا کہ دونوں یار مل کر کھائیں گے، مگر تیرے روزے کا سن کر بھوک ہی اڑ گئی۔ یہ پڑی ہے تھیلی افطاری کر لینا۔" اس نے یاد آنے پر میز پر دھری تھیلی اٹھا کر دکھائی۔

"میں تو کھا لوں گا مگر تم تو کھاؤ ناں۔۔۔"

"یار! تیرے روزے کا سن کر اپنی تو شرم کے مارے بھوک ہی اڑ گئی۔ سچ تو بڑا ہی نیک بندہ ہے نمازیں ساری۔۔۔ او بلکہ تو تو وہ صبح دس بجے والی بھی پڑھ رہا تھا ایک دن۔۔۔ ایسا کر۔۔۔ مجھ جیسے نافرمان کے لیے بھی دعا کر دے۔ ہمارا تو بچپن سے یہ حال رہا کہ بے بے سحری بناتی تھی تو دو پراٹھے چوری سے اٹھا کر کارنس کے برتنوں میں چھپا دیتے۔ پھر دن میں کھاتے۔ سحری، افطاری روزے داروں سے ڈبل کھاتے۔ اپنا بندوبست پہلے ہی کر لیتے۔ تو میرے لیے دعا مانگ لے یار کہ میں بس نیک ہو جاؤں۔۔۔ او زیادہ ناں سئی تھوڑا بوتا ہی۔۔۔" ظفر کا انداز گفتگو شروع ہی سے ایسا تھا کہ مقابل کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ جاتی۔ بے ہودہ سے بے ہودہ جملہ بھی انداز کی سادگی اور برجستگی کے باعث ناگوار نہیں گزرتا تھا اور کچھ ظفر کو بھی جملوں کے اخلاق و کردار کا ادراک نہیں تھا جو دل میں آگیا تڑتڑ سامنے والے کی سماعتوں پر برسا دیا۔

بے سوچے سمجھے جو کچھ بولتا جاتا، جملے کے اختتام پر مقابل ہنسے ناں ہنسے وہ خود ہی لوٹ پوٹ ہوتا رہتا۔ گھٹنے پر ہاتھ مارتا۔ ہنسی سے بے حال ہوتا اور پیٹ پکڑ کے گدے پر دہرا ہو جاتا۔ جملے کو سن کر مزا نہیں آیا یا برا لگا، مگر اس کا یوں بے حال ہونا اگلے کو بھی ہنسنے پر مجبور کر لیتا۔

اس وقت بھی یہی ہوا۔ وہ دل کھول کر ہنس دیا۔

"میں دعا تو ضرور کروں گا، مگر ظفر! خالی دعا سے کام نہیں چلتا، پہلے نیک عمل کرتے ہیں پھر اس کی قبولیت کی دعا۔۔۔

ابھی تم کہاں جا رہے ہو۔ مغرب ہونے ہی والی ہے، یہ کباب پراٹھا اکٹھے کھائیں گے اور بعد میں نماز۔۔۔ تم اپنے لیے ہدایت کی دعا خود مانگنا۔۔۔ اللہ کچھ

معاملوں میں ڈائریکٹ ڈیل کرنا پسند کرتے ہیں۔"
"یہ تونے ایسی گلاں کہاں سے سیکھیں۔ ایسی باتیں تو کتابوں میں نہیں لکھی ہوتیں۔ پڑھائی تو نے اے سی ٹیکنیشن کی ہے‘ بلے بھئی بلے۔"
"یہ پڑھنے پڑھانے کی نہیں غور کرنے کی باتیں ہیں۔ غور کریں تو خود بخود سمجھ میں آجاتی ہیں۔ پھر چائے کا پانی رکھ رہا ہوں تمہارے لیے بھی ڈال دوں؟" وہ کچن کی جانب بڑھتے ہوئے پوچھنے لگا کہ کیا وہ اس کے ساتھ افطاری کرے گا؟
"یار! تیری باتوں نے میرے دل پر بڑا گہرا اثر ڈالا ہے‘ مگر بات یہ ہے کہ میں نے کسی کو ملنے کا وقت دیا ہے اب وعدہ کرکے مکر جاؤ تو یہ بھی تو گناہ ہے نا؟" وہ بڑی معصومیت سے پوچھنے لگا۔
"وعدہ خلافی۔" اس نے دونوں کانوں کو باری باری چھوا۔ "توبہ توبہ! لیکن میرا وعدہ ہے‘ اگر عشاء تیرے ساتھ ہی پڑھوں گا۔" وہ کھڑا ہو گیا چارجنگ پر لگا اپنا مہنگا موبائل چیک کیا۔
ظفر باہر نکل گیا اور وہ وضو کرنے کے ارادے سے واش روم کی جانب بڑھا۔

☼ ☼ ☼

چچا جان کے کھنکھارنے کی آواز جیسے ہی اس کے کانوں سے ٹکرائی وہ ہڑبڑا کر کھڑی ہو گئی۔
"اللہ چچا جان مغرب پڑھ کر بھی آگئے اور میں ابھی تک تیار نہیں ہوئی۔" اصدق اس کی گود میں سر رکھ مزے سے نیم دراز تھا۔ اس کے اچھل کر کھڑے ہونے سے اس کا سر گدے پر جا لگا تھا۔
"حد کرتی ہو یار۔ چچا جان مغرب پڑھ کر بھی آگئے۔" اس نے برا سا منہ بناتے ہوئے اس کی نقل اتاری۔ "میرے والد بزرگوار ہی آئے ہیں‘ کوئی چھاپہ نہیں پڑ گیا تھا۔ سارا موڈ خراب کر دیا۔ لتنے مزے سے لیٹا تھا میں۔"
"چھاپہ والا کچھ نہیں ہے وہ نماز کے لیے جاتے ہوئے کہہ گئے تھے واپس آئیں تو سب تیار ملیں اور تب آپ نے کہا‘ راستے میں انہیں اتنے دعا سلام والے لوگ ملیں گے کہ گھنٹہ تو لگ ہی جائے گا بہت وقت ہے تیاری کے لیے۔ اب بڑے وقت چھوٹے کا پتا نہیں‘ مگر وہ لوٹ آئے ہیں۔"
"تم نے ان کا قرضہ دینا ہے‘ جو ایسے ہکلانے لگی ہو؟"
"ہکلا اس لیے رہی ہوں کہ آپ تو تیار بیٹھے ہیں بس جوتے ڈالے اور ریڈی۔ اور چچا جان نے منہ سے کچھ نہیں کہنا‘ سبز چائے کے چار گھونٹ چڑھائیں گے دو منٹ میں اور جا کر گاڑی میں بیٹھ جائیں گے۔ منہ سے کچھ نہیں کہتے‘ مگر میرے ہاتھ پیر پھول جائیں گے اور ابھی تو میں نے بال بھی ڈرائر نہیں کیے۔" اس نے کوفت سے اپنے گیلے بالوں میں انگلیاں پھیریں۔ ساتھ ساتھ وہ ڈریسنگ ٹیبل کی درازوں سے مختلف اشیاء نکال نکال رکھتی جا رہی تھی۔
"تو اچھا کیا نا۔ ڈرائر نہیں کیے۔ کتنے اچھے لگ رہے ہیں۔ بھیگے بھیگے گیلے گیلے۔" اصدق بیڈ سے اٹھ آیا ایک موٹی نم لٹ ہاتھ میں اٹھا کر اوپر اٹھائی اور سونگھ کر لمبی سانس بھری۔
"اف اللہ!" وہ بری طرح جھنجلائی جھٹکے سے لٹ کھینچی۔
"سارے میرے کپڑے بھیگ گئے۔" اس نے آئینے میں اپنی پشت دیکھی سیاہی مائل سبز جارجٹ کی قمیص نچڑنے والی ہو رہی تھی۔
"تیرے بھیگے بدن کی خوشبو سے لہریں بھی ہوئیں مستانی سی۔ ی۔" اصدق نے لمبی تان کھینچی اور اس کے قریب سرک آیا‘ مگر وہ الرٹ تھی دونوں ہاتھ اس کے سینے پر جما کر اسے الٹے قدموں پیچھے سرکایا۔ بیڈ پر بٹھایا۔
"خبردار جو اب یہاں سے آپ ہلے۔ اور میرے قریب تو غلطی سے بھی مت آنا۔" اس نے ڈرائر مشین گن کی طرح لہرا کر دکھایا۔

"اف ظالم۔" وہ جھوٹ موٹ کا سہما۔
"نگاہوں سے قتل کردو‘ نہ ہو تکلیف دونوں کو تمہیں خنجر اٹھانے کی‘ ہمیں گردن جھکانے کی۔"
مصنوعی سخت تاثرات کے ساتھ گردن موڑے گھما رہی تھی۔ شعر سن کر بے ساختہ ہنس دی۔ بلکہ اس کی ہنسی نے اصدق کے قہقہے کو بے قابو کیا۔ وہ کہنی کے بل تسلی سے نیم دراز ہوا۔
"اصدق! آپ یہاں سے چلے جائیں۔ بیچ میں کچھ الٹا سیدھا کرلوں گی آنکھ میں لپ پنسل یا لپ پر آئی پنسل۔" اس نے مجبوری بتائی۔ "پہلے ہی دیر ہو چکی ہے۔"
"او یار! ہمیں جانے کا کیوں کہتی ہو۔ ہم نے تو اب چلے ہی جانا ہے۔" اصدق نے بات کا رخ ہی موڑ دیا۔ اس کی آنکھوں میں اضطراب اور سرخی کی لہر آرکی۔ ملال اور بے کسی۔ مجبوری اور ناکامی سی۔
وہ پھر پنسری سے اترنے لگا تھا۔ سو اس نے قصداً بات کا رخ موڑا‘ وہ جلدی جلدی گلے میں نیکلس ڈال رہی تھی‘ کانوں میں آویزے۔
"کیسا لگ رہا ہے یہ سیٹ۔؟"
"بس مجھے اپ سیٹ کر رہا ہے۔" اصدق نے اس کے سجے بنے سراپے کو دل میں اتارا۔
سبز سوٹ‘ سبز نگوں سے مزین نازک سا سیٹ میرون لپ اسٹک نے ہونٹوں کے کٹاؤ کو مزید نمایاں کر دیا تھا۔ وہ بے خودی کے عالم میں اسے تکتا ہی رہتا‘ لیکن دروازہ کھلا اور چھ سالہ جڑواں فائق اور شائق اندر داخل ہو گئے۔
"دادا جان گاڑی میں بیٹھ گئے ہیں پاپا۔ آپ کو بلا رہے ہیں مما۔" دونوں جتنی تیزی سے اندر آئے تھے اسی طرح باہر نکل گئے۔
"فائزہ بھابھی! آجائیے بہت دیر ہو گئی ہے۔" کھلے دروازے سے آصفہ کی آواز آئی۔ "ابو جان گاڑی میں بیٹھ چکے ہیں۔ تایا جی اور تائی اماں بھی۔"
"یہ ناعمہ آپا ہر بار دعوتیں کیوں رکھ دیتی ہیں۔ آنے کی دعوت۔ پھر جانے کی دعوت۔ انہیں میرے جانے کی اتنی خوشی ہوتی ہے کہ دعوت رکھ کر جشن مناتی ہیں۔" وہ چڑچڑا ہو رہا تھا۔ الٹی سے الٹی بات۔
"یا اللہ!" فائزہ نے کرسی پر گر کے سر ہاتھ پر گرا لیا۔
"سال بعد آپ آتے ہیں۔ یہی تو ہوتے ہیں مل بیٹھنے کے موقع۔ یادگار پل۔"
فائزہ اور بھی کچھ کہنا چاہتی تھی‘ مگر اس نے چڑچڑے پن سے اسے ٹوک دیا۔
"میرے لیے وہی پل یادگار ہوتے ہیں جب میں اور تم۔ تم اور میں۔ باقی سب" اس کے لہجے میں قطعیت تھی۔
"اور دیکھو‘ کھانا کھاتے ہی اٹھ جانا۔ یہ نہیں کہ لمبی نشست جما کر بیٹھ جاؤ۔ کہہ دینا مجھے پیکنگ کرنا ہے۔"
"لیکن میں تو ساری پیکنگ کر چکی ہوں۔" اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ لیکن جیسے ہی نگاہ اصدق کے چہرے پر گئی تو وہ اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا گئی۔
اصدق نے اس کا بازو دبوچا اور اسے خود سے قریب بالکل سامنے کھڑا کر لیا۔ دیوار گیر کلاک کو دیکھا اور آنکھ کے اشارے سے اسے بھی کہا کہ وہ گھڑی دیکھے۔
"ساڑھے سات ہو چکے ہیں اور دس گھنٹے۔ صرف دس گھنٹے بعد میں نے سال بھر کے لیے چلے جانا ہے اور میں یہ سارے پل صرف تمہارے ساتھ بتانا چاہتا ہوں۔ صرف میں اور تم۔ تم کہتی ہو۔ پیکنگ کر چکی ہو۔" اس کے لہجے میں کرچیاں سی تھیں۔
"سو۔ سوری۔ وہ بس میرے منہ سے نکلا یوں ہی۔ میں تو بتا رہی تھی کہ میں نے پیکنگ کر لی۔"
"میرا دل پیک کر دو نا۔ میں ہر بار کور چڑھاتا ہوں۔ پھر کھل جاتا ہے مچل جاتا ہے۔ ہے کوئی ایسا بیگ۔ تھیلا۔" اس کی آنکھوں میں سرخی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ چپ سی ہو گئی۔
"بھابھی! فارا رونے لگی ہے اسے گود میں لیں۔"

آصفہ بولتے ہوئے آرہی تھی اس کی گود میں چھ ماہ کی گل گوتھنی سی فارا تھی جو نیند سے بیدار ہو کر ہونٹ لٹکا رہی تھی۔

فائزہ جوتی کی اسٹریپ بند کر رہی تھی۔ اصدق نے آگے بڑھ کر بہن کی گود سے فارا کو لے لیا۔ اسے سینے میں بھینچ لیا۔ اس کے سر سے اٹھتی مہک نے اسے بے خود سا کر دیا۔ پے در پے بوسے لیتے ہوئے وہ گردوپیش سے بے گانہ ہو گیا تھا۔ بچی مسلسل ماں کی طرف ہاتھ بڑھا رہی تھی۔

"ارے! میرا جانو بے بی۔۔۔ فیری رو رہی تھی۔" فائزہ نے دوپٹا لپیٹ کر جلدی سے ہاتھ بڑھا کر فارا کو خود میں سمو لیا۔ بچی فوراً" چپ کر گئی۔ فائزہ نے ہونٹ لگائے بنا بوسہ لیا۔

"آج کے بعد میں بھی ایسے ہی ہاتھ بڑھا بڑھا کے گلا پھاڑ پھاڑ کر رووں گا۔" اصدق نے آصفہ کے خیال سے دھیمے سے کہا۔ فائزہ اسے گھور کے رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

"آپ نے ابھی تک کپڑے بھی نہیں بدلے بھابھی۔۔۔" آصفہ کرسی کے پچھلے پیروں پر جھولتی ہوئی کوئی بہت موٹی سی کتاب پڑھ رہی تھی اسے دیکھ کر چونکی۔ اونچی آواز میں حیرانی سے پوچھا۔ کرسی سیدھی کر لی۔

"کہنے کو سارا دن سوتی رہی ہوں، مگر سر میں اتنا درد ہے۔ دراصل نیند پر سکون نہیں تھی۔ سوتی جاگتی سی کیفیت رہی۔ الٹی سی آرہی ہے پتا نہیں کیا ہو رہا ہے۔" اس کی آواز بھی بوجھل تھی وہ خالہ اماں (ساس) کے تخت پر ٹکی۔

"لاؤ! میں سر میں تیل ڈال دوں۔" اماں اپنی سوچوں سے ابھریں۔ صبح سے بیٹے کی اتری صورت دل کو بے چین کیے ہوئے تھی اور اب بہو۔۔۔ کی بدحالی۔۔۔ ان کے دل کو کچھ ہوا۔ اصدق دو ماہ کی چھٹی پر آیا تھا۔ ان دو ماہ میں فائزہ بناؤ سنگھار کے گویا سال بھر کے ارمان نکالے ایک سے ایک کپڑا، سولہ سنگھار، چوڑی، مہندی، پھول نکھری ستھری، بہار کا پرتو۔۔۔ ان کا دل ہول سا گیا۔

"بچے کہاں ہیں؟" سر پر تیل لگواتے ہوئے اسے دھیان آیا۔

"دونوں بڑے دادا کے ساتھ گئے ہیں۔ فارا کو عائزہ لے گئی ہے۔ باپ روز پارک لے کر جا رہا تھا۔ دونوں کی تو عادت بن گئی اس لیے تمہارے چچا لے گئے۔"

اماں اس کے سر میں تیل لگانے کے بعد ہاتھ دھونے اٹھ گئیں اور آصفہ نے بڑے سے مگ میں چائے لا دی۔

چائے کے گرم گرم گھونٹ اسے سکون پہنچانے لگے۔ ماحول میں پھیلا سناٹا اپنی جانب متوجہ کر رہا تھا۔ کل اس وقت کتنا شور و غل تھا ایک عجب سی چہکار در و بام سے پھوٹتی تھی۔ ایک جوش، ولولہ، زندگی۔

"کیا محض ایک شخص کی موجودگی زندگی کے زندہ ہونے کا اتنا گہرا احساس دیتی ہے" اس کے اندر سوال گونجا۔

"ہاں" اس نے ٹھنڈی آہ کی صورت تسلیم کیا۔

"تو یہ چہار جانب پھیلا سناٹا چیخ چیخ کر بول رہا ہے کہ اصدق جا چکا ہے۔ کس دور دیس کا رزق باندھ دیا اللہ میاں۔۔۔"

اصدق کہتے ہیں مجھے "جدائی" کا احساس نہیں۔ تب میں ہنس کر ٹال دیتی ہوں۔ یہ کیسے کہوں بجھ میں تو اب کوئی "احساس" ہی نہیں رہا۔ ہاں میں گھر اور بچوں میں مشغول ہو کر وچھوڑے کی اذیت پر پھاہے۔۔۔ رکھ لیتی ہوں۔ انہیں مشغول ہونے کو بھی کچھ میسر نہیں۔۔۔ بس اتنا فرق ہے، میں ہجوم میں مدغم ہو کر تنہائی کو جھڑک دیتی ہوں کہ جاؤ وقت نہیں۔۔۔ اور وہ تنہائی سے تنہائی کو کاٹتے ہیں۔ بس۔۔۔

"لیکن اصدق پھر اور کیا کیا دیکھتے؟" وہ خود سے ہمکلام بہت دور چلی گئی تھی۔

صبح ہونے نہ دیں۔ ساتھ کھونے نہ دیں

ایک دوسرے کو ہم۔۔۔

پورے کمرے میں فل آواز کے ساتھ گانا گونج رہا تھا جب وہ نائٹ ڈیوٹی کر کے لوٹا۔ ظفر لیٹے لیٹے ہی ڈانس کے تمام اسٹیپ لے رہا تھا۔ ارد گرد کا کوئی ہوش نہیں۔ یونہی آنکھ کھلی تو اسے کرسی پر براجمان جوتے اتارتا دیکھ اچھل گیا۔ دائیں بائیں ہاتھ مار کے ریموٹ ڈھونڈا۔ پہلے آواز بند کی پھر کچھ سوچ کر ٹی وی بند کر دیا۔

"یار! تیرے آنے کا پتا ہی نہیں چلا۔" اس نے جھینپے انداز میں کہا۔

"اتنے شور میں ڈاکو سب صفایا کر جائیں تو اس کا بھی پتا نہیں چلے گا۔" اس نے اسکرین پر نظر آتے جلوے کو دیکھ کر ناگواری سے پہلو بدلا تھا۔ اب بند ٹی وی کو بھی گھورا۔

"ناشتا بناؤں۔۔۔ یا آج بھی کوئی روزہ ووزہ ہے۔۔۔؟"

"بنالو۔ مگر کیا تم کو آج کام پر نہیں جانا؟" وہ الماری سے آرام سے شلوار قمیص نکال رہا تھا۔

"دیر سے جاؤں گا۔ وہی جو مجھے پاسپورٹ کا کام کروانا ہے چھٹی لی ہے آدھے دن کی۔" وہ کپڑے بدلنے کے لیے آگے بڑھ گیا۔ ظفر اونچی آواز میں گنگناتے ہوئے بڑے مگن انداز میں ناشتا بنا رہا تھا۔ وہ کھانا بنانے کا کام ہمیشہ بہت مزے سے کرتا تھا۔

اس کے آنے تک بڑی سلیقہ مندی سے وہ دستر خوان پر ناشتا چن چکا تھا۔ کل روزہ رکھنے کے باعث نقاہت رہی اور پھر نائٹ ڈیوٹی۔ اس کا چہرہ اترا ہوا، شدید تھکان کا ترجمان تھا موٹی سرخ آنکھوں میں نیند بھری تھی۔ وہ جلد از جلد بستر پر جانے کا خواہش مند تھا۔

"ویسے ایک بات ہے جگر!" ظفر نے حلق تک ٹھونس لینے کے بعد بے ہودہ سی ڈکار لی۔ اس نے ناگواری سے اسے دیکھا۔

"میں کافی دن سے نوٹ کر رہا ہوں اور اب تو پکے یقین کے ساتھ کہہ رہا ہوں کہ کوئی بات ہے ضرور۔۔۔ بدلے بدلے سے میرے سرکار نظر آتے ہیں میرا مطلب۔۔۔ خاموش اور اداس تو تو پہلے بھی رہتا تھا، مگر اس بار تو عجب پریشانی میں ہے، اگر کوئی مسئلہ وسئلہ ہے تو یار شیئر کر لے میرے اس مٹکے میں۔" اس نے اپنے پیٹ کو بجایا۔ "صرف کھانا ہضم کرنے کا کام نہیں آتا او میں راز شاز بھی سانبھ کر رکھتا ہوں کہہ دینے سے بوجھ کم ہوتا ہے اور۔۔۔"

"وہم ہے تمہارا۔۔۔" وہ لیٹنے کے لیے تکیے جما رہا تھا۔ ذرا سا ٹھٹکا پھر فوراً" مکر گیا۔

"اوئے کوئی وہم شہم نہیں ہے، میں ثابت کر سکتا ہوں۔" وہ اپنی بات پر قائم تھا۔

"پہلے سرکار جی۔ میرے ہاتھ کی کٹی پیاز کی بھی تعریفیں کرتے تھے اور آج میں نے اتنا اسپیشل انڈا بنایا ساتھ زیرے اجوائن والے پراٹھے۔۔۔ اور جناب ایک لفظ تعریف تنقید کا کیے بغیر سب اڑا گئے۔ مجال ہے جو منہ سے کچھ کہا ہو۔ پہلے کبھی ایسا ہوا جو اب۔۔۔"

"او سوری۔۔۔" وہ بری طرح چونکا۔ اس نے بے ساختہ دستر خوان کی جانب دیکھا جہاں اب کچھ بھی نہیں تھا۔ ہاں واقعی آج پراٹھوں کا ذائقہ بہت عمدہ تھا۔ اس نے خوب لطف اٹھایا تھا۔ انڈا بھی مزے دار۔۔۔ مگر اس نے تعریف نہیں کی تھی۔ ظفر کا شکوہ بجا تھا۔

وہ دونوں ڈیڑھ برس سے یہ روم بانٹ رہے تھے۔ ظفر یاروں کا یار تھا۔ شروع شروع میں یہاں آنے کے بعد اسے رہائش کا مسئلہ ہوا تھا۔ رہائش تو کمپنی کی طرف سے تھی، مگر کمرے بانٹنے پڑ گئے تھے اور روم میٹس اسے کبھی پسند نہیں آئے۔ وہ بے حد صفائی پسند، طریقے سلیقے والا بندہ تھا۔ جبکہ پاکستانی ہوں، انڈین ہوں یا اور بھی کوئی دوسرے عجب چنگڑ خانہ بنا کر رہتے تھے

دو سال پہلے ظفر اس کی کمپنی میں اسی کے رینک پر آیا۔ ڈے اور نائٹ ڈیوٹی کی شفٹ میں۔۔۔

بظاہر دونوں میں کوئی قدر مشترک نہیں تھی، مگر نجانے کب دوستی ہوگئی اس میں بھی ظفر کی ہنسوڑ فطرت کا زیادہ ہاتھ تھا

وہ دونوں ایک ہی ڈیپارٹمنٹ کے ڈے نائٹ انچارج تھے، مگر ظفر کی بے فکری کی وجہ یہ تھی کہ وہ کئی سالوں سے یہاں تھا اور اسے پاکستان پیسے بھیجنے کے حوالے سے اتنی فکر نہیں تھی جتنا پریشر اس پر تھا۔ ظفر کو زندگی بھر یہیں رہنا تھا۔

لیکن اسے واپس جانا تھا اپنے گھر اپنا شہر، اپنے لوگ، سب اذیت ناک سوچیں اس کا اندر پھونکنے لگیں تو سر جھٹک کر ظفر کی جانب متوجہ ہوا۔

"تو آپ ادھر آئے ہی کیوں؟"

"شریکوں کے بندے قتل ہوگئے تھے وڈے پا جی سے۔ وہ ہماری مٹی سونگھنے لگے۔ میرے ابا جی نے فورا" ٹکٹ کٹا کر بھیجا کہ معاملہ ٹھنڈا ہوگا تو واپس آجانا پر اب واپس کون کافر جائے؟" اس نے معنی خیز قہقہہ لگایا۔ وہ کچھ نہ سمجھا بس سر ہلا گیا۔

"جتنا یہ کمرا میرا، اتنا ہی تیرا۔ جیسے دل چاہے استعمال کرنا۔ میں غلطی کروں تو بتا دینا۔ اپنی مرضی کی صفائیاں کرتے رہنا، میرا کوئی دخل نہیں۔ اتنے سارے کمیوں، شودوں میں تو کھرا ہی لگا ہے۔"

اور چار سال تک کی بے چین، بے آرام زندگی کو قرار مل گیا۔ بے ضرر بندہ تھا۔ ہنسنے ہنسانے والا، دونوں کا ٹاکرا کم ہوتا، ایک آتا تو دوسرا جاتا، ویک اینڈ پر ظفر کی اپنی مصروفیات تھیں۔ زندگی میں اس جانب سے سکون پیدا ہوگیا تھا۔

بے حد مختلف مزاج ہونے کے باوجود دونوں کا ایک دوسرے سے دل مل گیا تھا۔ ظفر کھانے بہت اچھے پکاتا تھا۔ اس نے حیرت کا اظہار کیا تو وہاں حسب معمول ایک کہانی تیار۔

"یار پنڈ کے نائی کے دونوں منڈوں سے میری پکی دوستی تھی۔ اس کا باپ سمجھتا تھا، میرے ساتھ رہ، رہ کر وہ آوارہ ہوں گے کہ میرے باپ کی تو زمینیں ہیں [illegible] ہو نہ ہو، دانے مل جائیں گے۔ مگر نائی کے منڈ[illegible] باپ کا ہنر ہر صورت سیکھنا ہی ہے۔ جب موقع [illegible] گنڈے (پیاز) چھیلنے پر لگا دیتا۔ میں مجبوراً ان کے [illegible] گنڈے کاٹتا۔ مسالے کوٹتا کہ کام جلدی ختم ہو تو [illegible] جائیں۔ کھیل تو گیا جہنم میں اور مجھے آگئیں دیگیں [illegible] بنانی۔۔۔ حق ہا۔" ظفر کی آنکھوں میں ماضی ہلکورے لے رہا تھا۔

"زندگی میں جتنی مار اس دن ابا جی کے ہاتھوں [illegible] ہے نا، اتنی ساری زندگی کی کٹ بھی اکٹھی کر لو نا تو [illegible] پڑے ہاہاہا۔"

ظفر ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوگیا۔ وہ بھی ساتھ [illegible] قہقہے لگانے لگا۔ زندگی میں اب سکون آگیا تھا۔

۔ ظفر کی بدولت اچھا، بلکہ بہت اچھا کھانا، جیسے ہر شے اپنے ٹھکانے پر، ایک ترتیب اور نظم

لیکن انسان کی فطرت عجیب ہے۔
بھوکا ہو تو روٹی کی فکر۔
پیٹ بھر جائے تو لباس۔

لباس کے بعد چھت۔
لیکن فطرت کے کچھ تقاضے اور بھی ہیں اور اگر وہ سیدھے رستے سے پورے نہ ہوں۔

کچھ مسئلے کسی سے بانٹے بھی نہیں جاسکتے۔ وہ اپنے آپ میں گم تھا۔ مگر نہیں۔

ظفر اسے دیکھ رہا تھا، بھانپ رہا تھا۔

"یار! دو سال کا ساتھ ہے۔ تو بہت سوں سے الگ ہے، اپنے مزاج کا بندہ۔ مگر ہم ساتھ رہتے ہیں۔ میں اپنے گھر کا چھوٹا پتر تھا۔ مجھ سے چھوٹا کوئی نہیں۔ تو مجھے چھوٹے بھائی ہی کی طرح عزیز ہے۔ کوئی بھی چھوٹی بڑی پریشانی ہے تو اپنے جگر سے کہہ اور میرے پاس ہر مسئلہ کا حل ہوتا ہے آزمائش شرط ہے۔" ظفر برتن اٹھاتے ہوئے اس کی جانب دیکھے بغیر بولتا جارہا تھا۔

"اب تو ماشاء اللہ سے تو نے بڑے چھوٹے بہت سے کام نپٹائے ہیں۔ بجائے اس کے تو خوشی سے بھنگڑے ڈالتا۔ پارٹی شارٹی کرتا۔ بابا چپ شاہ بن گیا ہے۔ مانا ہوں ہر بندے کے اپنے دل کی باتیں۔ سو مسئلے مسائل، مگر تیری یہ اتری صورت برداشت نہیں ہوتی۔ اتنا یاد رکھ نہ بتانے والی باتیں بھی کسی نہ کسی کو بتانی پڑتی ہی ہیں۔ گھر سے بجائے اس کے خوش آئے تو بڑا اداس بیمار اور۔۔۔ (ویران ہو کے آیا ہے۔ بیمار شمار لگتا ہے۔ مجھے لگتا ہے تجھے کوئی تکلیف ہے۔ کوئی بڑی ہی اذیت۔۔۔ اچھی طرح سوچ سمجھ لے بتانے سے حل نکلتا ہے۔ میرے پاس بڑے آئیڈیے ہوتے ہیں۔"

وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھ چکا تھا۔ ظفر کے آخری جملوں پر کرنٹ کھاتے انداز میں چونکا۔

۞ ۞ ۞

مسلم آباد کے قصباتی ماحول میں بہت مضبوط بنیاد کے ساتھ اٹھایا جانے والا چھ کمروں کا یہ گھر اصدق اور فائزہ کے دادا نے دونوں بیٹوں میں برابر تقسیم کردیا تھا۔

درمیان میں ایک سیدھی دیوار اگر اٹھادی جاتی تو برابر حصے۔ لیکن فائزہ کی شادی تک دیوار اٹھانے کی نوبت نہیں آئی کہ دونوں کی مائیں سگی بہنیں تھیں۔

ہاں شادی طے ہوتے ہی عبدالجبار نے دیوار بنوالی تھی کہ بیٹی کی سسرال ہے۔ ایک حد بندی ضروری ہے۔ چھوٹے بھائی عبدالقیوم کی شدید ناگواری کو انہوں نے سمجھا بجھا کر ٹھنڈا کردیا تھا۔

دونوں بھائی، باپ کا چھوڑا جنرل اسٹور بہت حسن سلوک سے سنبھال رہے تھے۔ کوئی فرق یا بد نظمی کھوٹ کا گمان بھی نہیں تھا۔ بیویوں کا پہننا اوڑھنا تک ایک جیسا تھا۔ شروع میں کھانا پکنا بھی اکٹھا تھا جو بعد میں بوجوہ علیحدہ کرلیا گیا۔

اس منصفانہ تقسیم کے باوجود عبدالقیوم کے گھر خوش حالی کا دور دورہ تھا اور عبدالجبار کے گھر کھینچا تانی۔۔۔ سر اور پیروں کے بیک وقت ڈھکنے کی کشمکش۔ کیونکہ عبدالجبار اولاد کے معاملے میں خود کفیل تھے۔ اوپر تلے کی پانچ بیٹیاں، جبکہ عبدالقیوم کے ہاں پہلی اولاد اصدق نے اس وقت جنم لیا۔ جب عبدالجبار کے ہاں کے تیسری بیٹی فائزہ جنم لینے والی تھی۔ چھ سال کی بے اولادی کے بعد ملنے والی اولاد۔ اصدق کے سات سال بعد عارفہ اور عارفہ کے آٹھ سال بعد آصف۔۔۔

مادی حوالوں سے پیدا ہونے والا فرق نمایاں ہوتا تھا۔ مگر روحانی حوالے سے بھائیوں یا بہنوں کے دلوں میں کوئی تقسیم نہیں تھی۔ چھوٹا بھائی (اصدق کے والد عبدالقیوم) بنا بتائے جتائے بڑے بھائی کی اور گھر کی بہت سی ضروریات پوری کردیا کرتے۔ گوشت، سبزی، پھل، دوا دارو، بچیوں کے لاڈ، چھوٹی چھوٹی خواہشات، ضروریات جو ابا سے کہنے میں گھبراتیں یا اپنی اماں سے کہیں تو ڈانٹ پڑے گی۔ وہ چچا اور خالہ سے منوالتیں۔

اصدق کے بعد عارفہ سات سال بعد آئی۔ اس درمیانے عرصے میں زائرہ اور رائحہ اپنی خالہ پلس چچی کے ہاتھ کا کھلونا ہی رہیں۔ وہ اپنی اماں سے زیادہ عتیقہ بیگم کے ساتھ پائی جاتیں۔ بڑی بہن اور جیٹھانی حسنہ بیگم اپنی بیٹیوں پر بہن اور دیور کی نوازشیں دیکھتیں۔ بعض اوقات وہ نوازشوں کو حق سمجھ کر آنکھ بچالیتیں۔ بعض دفعہ احسان مانتے ہوئے مشکور ہوتیں اور پھر کبھی کبھار بچیوں کو سرزنش بھی کرتیں۔ کہ منہ پھاڑ کے فرمائشوں کا پلندہ لے کر نہ جایا کریں اور شروع میں بچیاں ناسمجھ تھیں۔ سنی ان سنی کرتیں یا ماں کا چہرہ دیکھتی رہ جاتیں۔ بعد میں بھول بھال جاتیں۔

ناعمہ بڑی تھی۔ وہ چیزوں کو جلدی سمجھ لیتی تھی۔ فطرتا" ہی ہوشیار، دور بین اور کسی قدر خود غرض واقع ہوئی تھی۔ سیدھی بات تھی۔ اماں، ابا اگر فلاں کام نہیں کرسکتے اور خالہ، چاچو کرسکتے ہیں۔ تو۔۔۔ تو۔۔۔ کردیں۔۔۔ کرنا چاہیے۔ بات ختم۔ عائزہ کی سوچ واضح نہیں تھی۔ وہ کبھی اپنی اماں کی مان لیتی، کبھی

ناعمہ کی پیروی کرتی۔ زائرہ اور رائحہ چھوٹی تھیں۔ وہ بڑی بہنوں کی سوچ لے کر پروان چڑھیں۔

اصدق کا معاملہ یہ تھا کہ وہ گھر کا اکلوتا بیٹا تھا۔ ماں' باپ کی تو طویل انتظار کے بعد کی اولاد تھا۔ مگر خالہ اور تایا کی بھی آنکھ کا تارا' اصدق سے محبت میں کوئی ملاوٹ یا فرق نہیں تھا۔ سب اپنے حساب سے اس پر جان چھڑکتے۔ باپ اور تایا اسے ہمہ وقت اپنی نگاہوں کے سامنے رکھتے۔ وہاں سے فرصت ملتی تو حسنہ بیگم کی آغوش۔

ناعمہ اور عائزہ کے لیے چھوٹا بھائی۔ زائرہ اور رائحہ کا بھائی جان۔

اب رہ گئی فائزہ۔ وہ بھی اصدق سے بہت پیار کرتی تھی۔ بے حد لگاؤ' پروا' فکر۔ مگر نہ چھوٹے بھائی کی طرح۔ نہ بڑے بھائی کی طرح۔ بس محبت

ناعمہ کی شادی گھر کی پہلی شادی تھی۔ بنا کہے سنے ذمے داریاں نپٹ گئیں۔ کچھ ارمان بھی زیادہ تھے اور کچھ ناعمہ کی ہر شے خرید لینے کی خواہش۔ (خواہش یا ہوس؟) لیکن پہلی۔ پہلی بار کے چاہ میں دونوں بھائیوں نے سارے وسائل بروئے کار لاتے ہوئے اسے مایوس نہیں کیا تھا۔

ناعمہ کی شادی کے وقت اصدق بیس برس کا نوجوان تھا۔ وہ باپ اور تایا کا فرماں بردار تھا۔ کالج جاتا تھا اور جنرل اسٹور دیکھتا تھا۔ فائزہ سے اس کی دوستی بڑی ستھری پاکیزہ سی تھی۔ ان کا باہمی لگاؤ ایک اشارہ تو تھا اور اس پر کسی کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔ بلکہ اپنی سادہ دلی اور من موجی طبیعت کے باعث سب بڑوں کی وہ پسندیدہ تھی۔

اس کے مزاج میں ناعمہ جیسی "میں" نہیں تھی۔ عائزہ جیسا غصیلا پن اور ضد بھی نہیں تھی۔ لیکن وہ زائرہ' رائحہ کی طرح لاپروا بھی نہیں تھی۔ وہ حساس اور دردمند تھی۔ حالات کو دیکھ کر کڑھتی تھی۔ کاش وہ سب کے لیے کچھ کر سکے۔ مگر وہ کیا کر سکتی تھی۔ بیس برس کی عمر میں وہ گریجویشن کے بعد ایک پرائیویٹ اسکول میں پڑھانے لگی۔

عائزہ رشتے کے انتظار میں تھی۔ وہ بھی اسکول جایا کرتی۔ مگر دونوں کی آمدنی کا مصرف جدا تھا۔ عائزہ اپنی تنخواہ کو بڑے اہتمام سے خود پر خرچ کرتی۔ وہ فزکس' بائیولوجی پڑھاتی تھی۔ اسکول میں اسے سب سے اچھا پیکیج ملتا تھا۔ حسنہ بیگم ہر ماہ اسے خود کو سنوارنے کے لیے تگ و دو دیکھتیں تو کبھی ٹوک دیتیں۔

اکڑائی اور بالوں کو جھٹکا دیا۔

"جہیز کی چیزیں خرید نا جمع کرنا آپ کا کام ہے۔ جیسے ناعمہ کے لیے خریدیں ویسے ہی میرے لیے بھی لیں۔"

عائزہ کا رشتہ اچانک ہی طے پا گیا۔ اپنے بھانجوں کو پک اینڈ ڈراپ کرتے نثار احمد جی جان سے اس پر نثار ہو گئے۔ رشتے میں کوئی قباحت نہیں تھی۔ ناعمہ پچیس برس میں بیاہی گئی تھی اور اب عائزہ پچیس کی تھی۔ سال ڈیڑھ سال کا وقت لینے کا ارادہ تھا۔ مگر دوسری جانب سے چٹ منگنی کے بعد پٹ بیاہ کا ارادہ تھا۔

ایک نئی مشکل۔ بے حد مشکل۔

اصدق پڑھنے' لکھنے کا شوقین تھا۔ اس کے بہت سے خواب تھے۔ مگر اس نے خوابوں کے گٹھڑی کو کسی کونے میں ڈال کر میدان عمل میں قدم رکھ دیا۔ عائزہ کی فوری شادی مالی اعتبار سے سارے گھر کا مسئلہ تھا۔ اس بار کمیٹیوں کے شروع کے نمبرز لیے گئے۔ تمام جمع جتھا نکالا گیا اور آخر میں کچھ ادھار کے ساتھ عائزہ اپنے گھر سدھاری۔

حسنہ بیگم اور عبدالجبار کی دوسری بیٹی بھی بہت عزت سے اپنے گھر بار کی ہو گئی تھی۔ پیچھے فرض کی بجا آوری کا سکون تو تھا۔ مگر مالی معاملات نے دن اور رات کا چین برباد کر دیا۔ نمبرز کے چکر میں ڈالی گئی کمیٹیاں لیتے وقت بڑا مزا آیا تھا۔ مگر اب ان ہی کو ہر ماہ

بھرنا بہت مشکل تھا۔ گھر کے خرچ کو کہاں تک روکا جاسکتا ہے۔

دوسری جانب جنرل اسٹور کے مقابل کئی نئے اسٹورز کھل گئے۔ جہاں توجہ کھینچتی پرکشش چیزیں تھیں۔ ادھر ان دونوں بھائیوں کا کاروبار انحطاط کا شکار ہو رہا تھا۔ وہی گنی بندھی اشیائے ضروریہ۔

اصدق کب کا پڑھائی کو خیرباد کہہ کر نوکری میں جت گیا۔ روز بروز بڑھتی مہنگائی کا طوفان۔ عارفہ چھوٹی تھی اور آنے والے دو' تین سالوں میں فائزہ اور زائرہ' رائحہ بھی؟

اصدق جھرجھری لے کر بیدار ہو گیا۔ آنے والے وقت کی ضروریات ترجیحات اور فرائض۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ مستقبل کے حوالے سے مضبوط اقدام کیے جاتے۔

"یہ کمیٹیاں ختم ہوں تو اسی طرح شروع کے نمبر لیے جائیں اور پھر اسٹور کو تھوڑا بڑھایا جائے۔ نیا مال ڈالا جائے۔ کچھ بیکری کارنر اور جوسز وغیرہ کے اسٹاک۔ "مال بھرتے ہی گاہکوں کا رش لگ جائے گا۔ آپ دیکھیے گا۔" اصدق پر یقین اور پرعزم تھا۔

لیکن۔ نئی کمیٹی شروع ہونے اور نمبر ملنے تک عبدالقیوم کے دیرینہ دوست جنہوں نے اپنی دوستی کو مزید مضبوط کرنے کے لیے سالوں پہلے عارفہ کو مانگ لیا تھا۔ وہ ایک روز شادی کا مدعا لے کر حاضر ہو گئے۔

"ہمیں کچھ بھی نہیں چاہیے' صرف عارفہ۔ بس۔" دوست واقعی دوست تھا' وہ جیسے سب بھانپ گیا تھا۔ لیکن کہا تو ایسے ہی جاتا ہے۔ مگر ایسے کیا تو نہیں جاسکتا نا۔

شادی تو کر ہی لی جاتی' بہت اچھے طریقے سے بھی۔ بڑے حساب کتاب جوڑ رہے تھے۔ مگر اصدق تو کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ آگے بڑھنے کے بجائے یہ مزید کئی قدم پیچھے ہٹنے کے مترادف تھا۔ نیا قرضہ' بدحالی کی جانب گامزن اسٹور اصدق نے بڑی مشکلوں سے جمع کی جانے والی رقم کی پوٹلی کو ہاتھوں میں تولا۔

"اس رقم کا صحیح مصرف کیا ہو سکتا ہے؟" گیند اس کے کورٹ میں تھی۔ اسے ایسا شاٹ کھیلنا تھا کہ جیت مقدر بنے۔

"کیسے بھی کر کے عارفہ کی شادی سال بھر کے لیے بڑھائی جائے۔" وہ بولا۔

"اسٹور جیسے چل رہا ہے' اسے چلنے دیں' گھر کا کچن الحمدللہ بخوبی چل رہا ہے۔" اس کے لب دوبارہ کھلے۔

"ہائیں۔" حاضرین بھونچکے رہ گئے۔ اصدق کی نگاہیں پوٹلی پر جمی تھیں۔ اس نے طویل لمبا سانس لے کر نگاہیں اٹھائیں۔ سب نا سمجھی کے عالم میں اسے تک رہے تھے۔

"یہ رقم مجھے دے دیں' میں ملک سے باہر جا رہا ہوں۔"

ایک دھماکا۔ ڈھا۔ ڈھا۔ ڈھن۔

☆ ☆ ☆

عادی ہو جائے تو مجرم کو جرم یاد نہیں رہتا۔ کب' کیسے' کیوں اور کتنا۔ وہ اپنی کامیابیوں' میں بس پھر آگے ہی بڑھتا ہے' پلٹ کر نہیں دیکھتا۔

گناہ یہ نہیں ہے کہ آپ گناہ گار ہیں۔

گناہ یہ ہے کہ آپ کو اس پر فخر ہے۔ آپ توبہ کے طلب گار نہیں' شرمسار نہیں۔

اور گناہ سے بڑا گناہ یہ بھی ہے کہ آپ کو اپنے گناہ کا احساس نہیں۔

اسے ہر قدم پر احساس تھا کہ یہ ایک غلطی ہو رہی ہے۔ یا ہونے جا رہی ہے یا بہر حال ہو جائے گی اور۔ اور۔ ہو گی نا پھر۔

خیالات کا ریلا تھا۔ وہ اپنے بچاؤ کی صورتیں سوچ سوچ کر ہلکان ہوتا تھا۔

☆ ☆ ☆

اس کی طبیعت خراب تھی۔ نزلے زکام کے باعث بخار جیسی کیفیت' کھانسی سے آرام کے لیے

کف سیرپ لیا تھا اور اس میں ہلکی غنودگی تھی۔ وہ خود سے بے زار تھی۔ دو دن سے بیڈ روم میں بند تھی۔ اب دل زیادہ تنگ ہوا تو باہر نکل آئی۔

بے حد ڈھیلے ٹراؤزر پر سفید ڈھیلے کرتے میں وہ اپنے گرد ہلکی سی شال لپیٹ کر ننگے پیر بالکونی میں آگئی۔

اس وقت بالکونی میں کھڑے ہو کر چاند کو دیکھنا اسے بے حد بھا رہا تھا۔ ورنہ دل دادہ تو وہ زمین کی روشنی کی تھی۔

تب ہی اس کی نگاہ نیچے کھڑے چند لوگوں پر پڑی۔ تیز روشنیوں میں سب کے چہرے واضح تھے۔ مگر ان سب چہروں میں وہ ایک خاص چہرہ نہیں تھا اور وہ جس دنیا سے تعلق رکھتی تھی' وہاں چہروں کا انتظار کیا بھی نہیں جاتا تھا۔ بے وقوفی سی بے وقوفی اور وہ تو تھی بھی بڑی حساب دان۔

مگر اس رات کا مہمان' حیرانی کے بعد اسے تجسس میں مبتلا کر گیا تھا اور تجسس ہر پل بڑھتا ہی گیا۔ وہ کہاں سے خبر لائے کہ وہ کون تھا' کہاں سے آیا تھا اور اس کے ساتھ مسئلہ کیا تھا۔ کچھ اور دن گزرے تو اسے ایک نیا احساس ہوا۔

کیا اس کی عمر کی الٹی گنتی شروع ہونے کو ہے۔ کیا اس کی اداؤں اور ناز و ادا میں کوئی کمی سی رہ گئی جو وہ اس روز ہاتھ لگانا تو در کنار' دیکھے بنا پلٹ گیا۔ کیا اس کا زوال شروع ہونے کو ہے۔ وہ اس گھر کی تمام لڑکیوں سے ہٹ کر تھی۔ جدا' منفرد۔۔۔ اس کے پاس آنے والے مرد دوبارہ سہ بارہ یہاں قدم رکھیں اور غلطی سے بھی کسی دوسری لڑکی کا ہاتھ تھام لیں۔ یہ کبھی ہوا نہیں تھا۔

پھر وہ کون تھا۔ خبطی' دیوانہ' پاگل یا اندھا۔

وہ آئینے کے روبرو اپنے خدوخال ٹٹولتی رہی' اپنی لانبی انگلیوں کو گال پر سرکاتی رہی۔ ہونٹوں کو چھوتی رہی۔ سب کچھ تو ویسا ہی قاتل تھا۔

کسی پشتینی نواب' مہاراجے کے مہمان خانے میں ایستادہ سیاہ مورتی جیسی سندر انمول۔۔۔ جسے حاصل کرنے کے لیے جتن کیے جائیں' منصوبے گھڑے جائیں۔

پھر وہ کیوں پلٹ گیا۔ چھوئے بنا' نگاہ غلط انداز بھی نہیں۔

اور اب اسے نیچے ایک ایسا شخص دکھ گیا تھا جو بتاتا کہ وہ کون تھا۔ اجنبی' بھٹکا ہوا مسافر۔

تیز روشنی میں وہ رنو کے میاں رنگیلے کو پہچان گئی تھی اور اس کے ساتھ مزید چار بندے تھے۔

اپنے وجود پر چھائی کسل مندی اور اضمحلال کی پروا کیے بنا وہ تیز قدموں سے بیرونی راہداری میں رکی۔ اس نگار خانے میں آنے والا ہر شخص اسے نظر آسکتا تھا۔

وہ پھولی سانس اور کانپتے پیروں کے ہمراہ موتیوں کے پردے کے پیچھے اس طرح کھڑی تھی کہ وہ سب دیکھ لے' مگر اسے کوئی نہ دیکھے۔ اس کا ہاتھ اپنے دل پر دھرا تھا۔

قدموں کی چاپ ابھری تو اس نے سر اٹھایا۔

آنے والے پانچ تھے۔ میاں رنگیلے سمیت۔ مگر۔۔۔ وہ۔۔۔ نہیں تھا۔

مہمان جھومتے گاتے مسکراتے آگے بڑھ گئے۔ تو وہ دبے قدموں خاموشی سے پلٹ آئی۔ عجیب سی ناکامی کا احساس' قدموں کو منوں وزن سے بندھا محسوس کر رہا تھا۔

وہ نہ جانے کیوں اب اس شخص کے لیے بے چین تھی۔

بہت ساری وجوہات ہو سکتی تھیں۔

حیرانی۔۔۔

تجسس۔۔۔

اور۔۔۔

اور۔۔۔

احساس توہین بھی۔۔۔ وہ اپنے پلنگ پر لیٹ کر اس رات کو سوچنے لگی۔

☼ ☼ ☼

وہ شخص کچھ حیران پریشان گردن گھما گھما کر کمرے کی آرائش دیکھ رہا تھا۔ اتنی کلاسیکل آرائش' انوکھی روشنیاں' عجیب سی لبھاتی خوشبو اور خوابناک ماحول' نازک موم بتیوں کی کپکپاتی روشنی' اسے بہت عجیب مگر اچھا لگ رہا تھا۔ وہ سحر زدہ تھا۔ اس کے الجھے دماغ اور شل اعصاب کو سکون پہنچ رہا تھا۔ جیسے کوئی گھونٹ گھونٹ امرت حلق سے اتار رہا ہو۔ سیرابی سی۔

کھٹکے کی آواز پر چونکا تھا اور اندر داخل ہوتی شخصیت کو دیکھ کر اچھلا۔ غوطہ سا لگا حلق میں کچھ پھنس گیا۔

"آپ؟" وہ کھڑا ہو گیا۔ وہ کہاں آگیا تھا اور اس کا دوست کہاں رہ گیا تھا۔ وہ اسے موجیں کروانے لایا تھا کسی کے گھر۔

وہ اس بیڈ روم نما ڈرائنگ روم یا ڈرائنگ روم نما بیڈ روم میں حیران منتظر تھا۔ سفید ساڑھی میں ملبوس وہ لڑکی' جو دروازہ پیر سے بھیڑتی بڑے نپے تلے قدم اٹھا رہی تھی۔ اس نے چند ہی قدم اٹھائے تھے۔ مگر پتا چلتا تھا کہ کس قدر نزاکت تھی۔ وہ اس کے پاس ٹھہری نہیں' گزرتی چلی گئی۔

حیرت کی زیادتی فقط "آپ" کہہ کر جیسے قوت گویائی کھو بیٹھا تھا۔

اس نے دونوں ہاتھوں سے پردے کو دائیں بائیں سمیٹنا چاہا تو سڈول بازو کسی دوشاخہ کی طرح دونوں جانب تن گئے۔ اس کے بازو اسی طرح کھڑکی میں رک گئے تھے۔ اس نے رخ نہ موڑا' بس گردن گھما کر اس حیران کو دیکھا جو سحر زدہ تھا۔ اس کی چال پر اسے لگا تھا پانی پر تیرتی عورت' اس کے تنے وجود کو دیکھ کر اسے کمان کا خیال آیا۔

"آپ کی میزبان۔" وہ اس کی آپ کا جواب دے رہی تھی۔

"نہیں! میں تو۔۔۔ دوستوں سے ملنے آیا۔"

"کیا میں آپ کو دشمن لگ رہی ہوں؟ میں ہی آپ کی میزبان ہوں اور آپ "آج رات" کے مہمان۔"

اس کے دماغ میں کچھ نہیں تھا مگر جیسے ایکدم جھماکا ہوا وہ کس چیز کا مہمان بنا تھا اور۔۔۔ اور اس کی میزبان کون تھی۔

"کوئی غلط فہمی۔۔۔ میرے دوست۔۔۔ مجھے یہاں لے آئے۔ میں۔۔۔" وہ باہر نکلنے کو مڑا تھا تو وہ ایک دم اس کے سامنے آگئی۔

"یہاں لوگ یار دوستوں کے ساتھ ہی آتے ہیں ہم نے کب اخبار میں اشتہار دیا یا رات بارہ کے بعد چینلز پر ہمارے ریٹ چلتے ہیں۔" وہ اپنی بات کا مزا لیتے ہوئے کھلکھلا کر ہنس دی۔ وہ خاک نہ سمجھا۔

"سنا ہے" آپ کا دل دکھا ہوا ہے' ہوم سک نیس کا شکار ہیں۔ آپ کو بہت پہلے آجانا چاہیے تھا۔ کتنے سال سے ہیں یہاں۔"

"سات۔۔۔ سات سال۔ بس۔"

"اور آج پہلی بار اس طرف۔۔۔" اس کی آنکھوں میں شرارت آمیز حیرانی تھی۔

"ویسے دل کس نے توڑا۔ گھر والوں نے یا گھر والی نے۔۔۔؟"

وہ جواب دیتا۔۔۔؟ سوال سادہ تھے۔ مگر پوچھنے کا انداز اور پوچھنے والی۔ وہ اس سے کیوں پوچھ رہی تھی۔

"آپ سائیکاٹرسٹ ہیں ڈاکٹر؟" اس کے الفاظ گم تھے۔

"ہاہاہا۔۔۔ وہ نزاکت سے ہنسی اور ہنستی چلی گئی۔

"ڈاکٹر؟ ہاہاہا۔۔۔ کہہ سکتے ہیں' بالکل کہہ سکتے ہیں بس یہ ہے کہ ہمارے کلینک کا بورڈ نہیں ہے۔ کرتے ہم بھی علاج ہیں لیکن کوئی یونیورسٹی ہمیں ڈگری نہیں دیتی۔" اس نے اس کھلی زیادتی پر احتجاجاً "منہ بسورا۔

"یہ کوئی اچھی بات ہے" آپ بتائیے ذرا؟"

"ویسے تو آپ ابھی تک کچھ نہیں بولے۔۔۔ لیکن اندازہ ہو رہا ہے کمال کے آدمی ہیں۔ پہلی بار ہمارے پیشے کو کسی نے صحیح نام دیا ہے واہ۔۔۔"

وہ کچھ نہ بولا۔ اس کے خالی ذہن و دل میں اب ایک ہی سوال تھا وہ یہاں آگیا؟

استغفراللہ' اسے خود پر غصہ آرہا تھا۔ اسے۔۔۔

"آپ بیٹھئے تو۔۔۔" اس نے اس کے کندھے پر ہلکا سا دباؤ دیا تو وہ بے ساختہ صوفے پر بیٹھ گیا۔

"کیا لیں گے' چائے ٹھنڈا۔۔۔ یا۔۔۔ یا بہت ٹھنڈا؟"

وہ معنی خیزی سے بولی اور دوسرے صوفے پر بڑی ادا سے براجمان ہو گئی۔ وہ مسکراتی آنکھوں اور لبوں کے ساتھ اسے دیکھ رہی تھی۔

"آپ تو یوں بیٹھے ہیں جیسے موقع ملتے ہی بھاگ کھڑے ہوں گے۔" وہ چونکا وہ دلوں کے حال جان لیتی تھی۔

"پہلی بار سب ہی ہچکچاتے ہیں بچہ پہلی بار قدم بھی ڈر ڈر کر قدم اٹھاتا ہے' تب ماں سہارا دیتی ہے۔ کیا آپ کو۔۔۔ مجھے سہارا دینا ہو گا؟" وہ کس جانب اشارہ کر رہی تھی۔ اس کے کان سے دھواں نکلنے لگا صوفہ چولہا بن گیا تھا۔ آگ۔۔۔ وہ اس کے ہر تاثر پر نظر رکھے ہوئے تھی۔ ہنس دی۔

"گھڑی کی سوئیاں چکر پہ چکر پورے کر رہی ہیں۔ آپ کو احساس نہیں کہ رات بیتتی جا رہی ہے۔"

اس شخص کی پیشانی پر پسینہ تھا اور نم ہتھیلیاں اور تر بتر پیر۔۔۔ ہر موئے جان سے پسینہ پھوٹ رہا تھا۔

اس نے بہت سے مرد برتے تھے۔ ہر طرح کے۔ اسے تو اب چہرے بھی یاد نہیں تھے' مگر سامنے صوفے پر بیٹھا وہ شخص جو نظریں بھی نہ اٹھاتا تھا۔ اسے بہت عجیب لگا' وہ ٹکٹکی باندھ کے اسے دیکھ رہی تھی وہ سوچ رہی تھی کہ وہ کب تک ایسے ہی رہے گا اسے اس کھیل کو دیکھنے میں بہت مزا آرہا تھا۔

یہ رات' یہ خوابناک اکساتا ہوا ماحول' خوشبو اور سب سے بڑھ کر وہ۔۔۔ کب تک اور کیسے اس طلسم کا توڑ ہو گا۔

رات بیت چکی تھی' مگر بہت سی ابھی باقی تھی' آخر تک وہ کشمکش کو جھیلے گا۔

وہ طمانیت سے سوچ رہی تھی ایک بے حد پرکشش مرد

ایک سحر کار عورت۔۔۔

سین مکمل تھا۔ تیاری پوری۔ بس ایکشن کہنے کی دیر تھی۔ کلیو آفٹر فائیو منٹس کب تک بچ کے رہے گا' وہ پر یقین تھی۔

مگر۔۔۔

ایک دم وہ اٹھا۔ وہ بری طرح چونکی تھی' مگر پھر مسکرا دی۔ وہ دروازہ کھول رہا تھا۔

"دائیں جانب جا کر درمیانی دروازے سے نکل جائیے گا۔"

اسے کہنا پڑا "آپ کہیں تو سی آف کرنے آؤں۔" وہ مزے سے بولی۔

اگلے پل وہ باہر تھا اس نے اپنا سر جھٹکا اور تڑ تڑ تڑ کر کے ساری ٹیوب لائٹس آن کر دیں پھر سبج سبج کے قدم اٹھاتی موم بتیوں پر پھونکیں مارنے لگی۔

اس کے کمرے تک پہنچنے سے پہلے پے منٹ کر دینے کا اصول لاگو تھا۔ وہ بے فکر تھی۔

☆ ☆ ☆

ایسے مواقع عام طور پر بہت کم آتے کہ ظفر اور وہ ایک ساتھ کمرے میں رہیں' مگر کچھ دنوں سے ظفر کے ڈیپارٹمنٹ میں شفٹوں کا مسئلہ تھا' وہ بھی اس کی طرح صبح جا رہا تھا اور رات کو دونوں اکٹھے کمرے میں۔۔۔

"اوئے ایسے موقع تو عید شبرات پر آتے ہیں۔" ظفر اپنے پسندیدہ لباس (دھوتی' ٹی شرٹ) میں تھا' وہ کچن میں کھڑا مختلف مسالوں سے نبرد آزما تھا۔

"آج میں بناؤں گا بریانی۔ وہی کراچی والی بریانی جو اور کہیں سے نہیں ملتی' ساتھ مچھلی فرائی کروں گا۔ دھنیا' پودینہ' لہسن مرچ پیس کر دہی والی چٹنی۔۔۔ بھئی واہ!" محض تصور سے اس کے منہ میں پانی آرہا تھا۔

"یہ جو دہی میں خیری صلاے چار بوندیں گر گئی ہیں نا' میں نے اپنے پنڈ کے ساون میں نہ بدل دیں تو میرا نام ظفر کی جگہ ڈفر رکھ دینا۔"

"ساون میں پکوڑے لازمی ہوتے ہیں۔ پورے آم' گرم گرم جلیبیاں۔" وہ بھی کھو گیا۔

"اوئے ہوئے اوئے۔۔۔ یہ سارے کام تو آپ کے جگر کے پٹھے (الٹے) ہاتھ کا کمال ہیں مگر وہ کیا ہے نا۔ ڈنر میں یہ سب اچھا نہیں لگتا۔ اس لیے بریانی' مچھلی رکھی ہے اور جلیبی مجھے بنانی نہیں آتی۔ دراصل ہمارے پنڈ کا حلوائی بے اولاد تھا اگر جو وہ میرے سائز کا کوئی پتر جم دیتا تو آپ کا یار مٹھائیاں بنانے میں بھی ماہر ہو جاتا۔" اس کے مخصوص لہجے اور انداز پر وہ بڑے دل سے ہنس دیا۔

"جلدی تیاری کر لے پھر یار دوست آتے ہوں گے تو برتن شرتن نکال لے۔"

"ظفر! میں جلدی سوتا ہوں اور عشاء کی نماز کے بعد دعوت ختم کر دینا۔" اس نے یاد دہانی کروائی ضروری بھی اور دوسرے۔۔۔" وہ بولتے بولتے رکا اور رکتے رکتے بول پڑا۔ "کھانے کے بعد مشروب میں صرف کولڈ ڈرنک اور سبز چائے ہو گی۔ سمجھ گئے نا؟"

ظفر بغور سن رہا تھا۔ "اوئے فکر ای نئیں۔۔۔ او میرا یار بڑا نیک ہے سب جانتے ہیں۔" ظفر اس کی تادیب کو بخوبی بھانپ گیا تھا۔

ظفر کی دی گئی "جبری ساون دعوت" اس کے ہاتھ کے بنے بے حد لذیذ کھانوں کے باعث بے حد شاندار رہی۔ ظفر کے ہاتھ کا ذائقہ اور اس کی سلیقہ مندانہ پریزنٹیشن نے کمال کر دیا۔

وہ بھی ضرورت سے بہت زیادہ کھا چکا تھا۔ فرائی مچھلی' ہرے مسالے کی چٹنی کے ساتھ اتنی مزے دار تھی کہ زبان کٹنے کا گمان ہونے لگا تھا' مگر دل نہیں بھرا۔ وہ بمشکل اٹھا اور برتن دھونے لگا۔

"اوئے صبح دھو لیں گے یار۔۔۔ ابھی کون سا کوئی انسپکشن کرنے آرہا ہے۔" ظفر گدے پر چت پڑا تھا۔

"مجھے ابھی نماز بھی پڑھنی ہے۔" وہ تندہی سے برتن دھو رہا تھا۔

"او تو بڑا نیک۔۔۔ ہے۔۔۔ یار۔۔۔ تجھے۔۔۔ سیدھے جنت۔۔۔ ت ت۔" ظفر کا جملہ ادھورا رہ گیا' وہ نیند کی وادی میں اتر گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

گہری نیند سے بیداری کا باعث۔۔۔ ظفر کو ٹوائلٹ جانا تھا' نائٹ بلب کی روشنی میں کمرے میں نیند پھیلی تھی' اے سی کی مدہم آواز کل عالم خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہا تھا' سناٹا' سکون۔۔۔

"ہیں؟" ظفر نے چونک کر اور پوری آنکھیں کھول کر اسے دیکھا جو جائے نماز پر سر بسجود تھا' پھر دیوار پر لگے سبز وال کلاک کو' جس کے سیاہ ہندسے چمک رہے تھے' ڈھائی کا وقت تھا۔ اس نے ٹائم پیس کو اٹھا لیا۔

دو بج کر پینتیس منٹ۔۔۔

ساری منڈلی ساڑھے دس بجے گھر سے جا چکی تھی۔ وہ آدھے برتن تو اس وقت تک دھو چکا تھا' بڑی تسلی سے نماز پڑھتا' یکسوئی کے ساتھ تب بھی گیارہ تک نماز مکمل ہو جانی چاہیے پھر رات کے ڈھائی۔۔۔ تو کیا تہجد پڑھ رہا ہے؟

ظفر ٹوائلٹ جانا بھول کر اسے عجب ناسمجھی کے عالم میں تکتا جا رہا تھا۔

وہ شلوار سوٹ کے بجائے اپنے نائٹ سوٹ میں تھا' پاکستانی کرکٹ ٹیم کے یونی فارم والا سوٹ۔ وہ

جائے نماز پر نہیں تھا۔ وہ اپنے گدے پر ہی سجدہ ریز تھا۔ اس کے سر پر ٹوپی نہیں تھی اور۔۔۔ اور۔۔۔ وہ قبلہ رخ بھی نہیں تھا سمت وہی تھی، مگر کافی ٹیڑھی سی۔
کسی کو حالت نماز میں جھنجھوڑنا نہیں چاہیے مگر۔۔۔
"اوئے اصدق۔۔۔ اوئے اصدق یاؤ۔ کون سے تیم کی نماز پڑھ رہا ہے تو۔۔۔ تہجد۔۔۔؟ تو بھلے پڑھ یار مگر ابھی تو میرے خیال میں ٹائم نہیں ہے اور تیری تو ساری حالتیں غلط ہیں۔" ظفر نے اسے شانوں سے پکڑ کر ہلا ہی دیا۔
وہ سیدھا ہو گیا تھا اور خالی آنکھوں سے ظفر کو دیکھ رہا تھا۔ ظفر بری طرح گڑبڑا گیا۔ اس کا جسم تپ رہا تھا اور وہ پسینے میں غرق تھا۔ وہ۔۔۔ وہ اپنے آپ میں نہیں تھا، وہ پتا نہیں کہاں تھا۔
"کیا ہو گیا ہے یار تجھے۔۔۔ کس چیز کی معافی مانگ رہا تھا۔ کس چیز سے ڈر رہا تھا ہیں۔" نزدیک ہونے پر ظفر نے ٹوٹے پھوٹے الفاظ سنے تھے۔ "کون سا گناہ۔ کیسا گناہ۔ کون سا گناہ کر دیا تو نے۔
یار تو تو اتنا نیک ہے۔ میرے سارے دوستوں میں سب سے الگ، مسلمان بندہ ہے، نیک، نمازیں بھی پوری، کوئی لت بھی نہیں، اتنے عرصے سے تو تجھے میں دیکھ رہا ہوں، تیری وجہ سے تو میں نے بھی پینا پلانا کم کر دیا ہے۔۔۔ ہم چند سال اور ساتھ رہ گئے نا تو قسم سے میں نے بھی تیرے جیسا ماڈرن مولوی بن جانا ہے، تجھے تو پتا ہے نا! میں یار دوستوں کی کتنی جلدی مان لیتا ہوں، ان جیسا ہو جاتا ہوں اور تو مجھے کہہ رہا ہے گناہ او کھڑا گناہ" (او کون سا گناہ) وہ زچ ہوا تھا۔
مگر اصدق آپے میں نہیں تھا وہ کچھ کہہ رہا تھا کیا، اسے پتا نہیں تھا۔ ظفر نے سننے کی سعی کی تھی، مگر کچھ پلے نہ پڑا۔
"کوئی گناہ نہیں کیا۔۔۔ مگر۔۔۔ میں۔۔۔ مگر میں گناہ کرنے سے ڈرتا ہوں ظفر۔۔۔"

☼ ☼ ☼

"اتنا بڑا فیصلہ۔۔۔ اور یوں ایک دم اچانک؟"
عبدالقیوم کی حیرانی نہ جاتی تھی۔
"فیصلہ تو بڑا ہی ہے، مگر ایک دم اچانک نہ کہیے۔ میں بہت عرصے سے اس پہلو پر سوچ رہا تھا۔"
"تو تم سے کس نے کہہ دیا کہ جیسے ہی جاؤ گے اگلے پلیٹ میں رکھ کے نوکری پیش کر دیں گے۔"
"دنوں مہینوں لگ جاتے ہیں ویزا، پاسپورٹ کے حصول میں۔۔۔"
سارا گھر کھلے آنگن میں اکٹھا تھا، سب کے اپنے اپنے تاثرات۔۔۔ باہر جانے والی بات کسی کو بھی ہضم نہ ہو رہی تھی۔
"میں یہ دونوں چیزیں حاصل کر چکا ہوں۔" اصدق نے اصل دھماکا کیا۔
زوں۔۔۔ ل ل ل۔۔۔ ایک ٹرین سب کے اوپر سے گزر گئی۔ عتیقہ بیگم نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھا اور تمام حاضرین کو۔۔۔ اگلے پل وہ منہ پر دوپٹا رکھ کے باآواز بلند رو رہی تھیں۔ حسنہ بیگم نے بھی بہن کا ساتھ دیا۔
"تو نے سوچ بھی کیسے لیا کہ میں تجھے جانے دوں گی۔ ایک لمحے کو ماں کا خیال نہ آیا جواب بھی رات کو اٹھ اٹھ کر یونہی خوامخواہ چہرہ دیکھنے چلی آتی ہے۔"
"امی! سال دو سال کی تو بات ہے۔ ابھی فوری مسئلہ عارفہ کی شادی اور اسٹور ہے اور چلیں ہم کسی نہ کسی اسے حل بھی کر لیں۔ تب بھی پچویشن سر ڈھانپے اور پاؤں ننگے والی ہی رہے گی، آگے زمانہ بہت مشکل آرہا ہے۔ عارفہ کے بعد دوسری لڑکیاں ہیں ایسے کیسے گزارا ہو گا؟"
"سال دو سال۔۔۔" عتیقہ بیگم نے ہچکی لی۔ اصدق کی حقیقت بیانی میں کوئی دو رائے نہیں تھی۔ انہوں نے خود کو پسپا ہوتے دیکھا تو اٹھ کر اندر چلی گئیں۔

☼ ☼ ☼

"امی! کیسے احمقوں کی طرح آپ لوگ خوامخواہ باتیں کرتے جا رہے ہیں۔ اس سے اچھا سنہری موقع کب ملے گا۔ سارے دلدر دور ہو جائیں گے، ڈبل کرنسی ہوتی ہے وہاں کی ایسے ہی مجھے رو رو کر بلوایا۔۔۔ میں نے کہا اللہ خیر کرے یہ تو بڑی ہی خوشی کی خبر ہے، بھنگڑے ڈالنے والی اور آپ لوگ۔۔۔ چچ چچ چچ۔" ناعمہ سب کے پاگل پن پر سر پیٹ لینے والی تھی۔
"بے حد عقل مندانہ فیصلہ۔" عائزہ ابھی تک اسکول کی استانی تھی دوٹوک اظہار "کل کا جاتا ہے آج جائے اور آج کا جاتا ابھی۔۔۔ قسمت والوں کو ملتے ہیں ایسے موقع۔ زبردست۔"
"لیکن وہاں بڑی مشکل زندگی ہوتی ہے۔ شدید ترین گرم صحرائی علاقے ہیں۔ ریت ہی ریت اور محنت بھی پوری پوری کرواتے ہیں تب ریالوں کی شکل دیکھنے کو ملتی ہے اور میرا اصدق لاڈوں پالا وہ۔۔۔" حسنہ بیگم کا دل بھر آیا انہیں بھانجے سے بہت محبت تھی۔
"اتنے سخت حالات میں۔۔۔" وہ دوبارہ بولنا شروع ہوئی تھیں۔ عائزہ نے سخت جھلائے انداز میں ٹوک دیا۔
"امی!" اس کے انداز میں ناگواری تھی۔ "مرد سختیاں جھیلا ہی کرتے ہیں۔"

☼ ☼ ☼

مگر وہ اپنی تیاریوں میں لگا ہوا تھا۔ چلتے پھرتے بس جانے ہی کی گفتگو۔ ہدایتیں، اعلان، فرمائش، خواہش ارادے۔
"دوست نے ساری سیٹنگ کر رکھی ہے، ہر شے طے ہے نوکری کا بھی بندوبست ہے کوئی فکر نہیں۔"
"دو تین ماہ تک ذرا تنگی جھیلنا ہو گی۔ پھر میں پیسے بھیجوں گا۔ تو سب سے پہلے اسٹور میں مال ڈلوانا ہے اس کی حالت درست کرنی ہے، میرے دوست علی اور شاہد کو میں نے نئے ریکس کے بارے میں سب بتا دیا ہے وہ پوری ذمے داری لیں گے۔ اسٹور سیٹ ہو گیا تو پھر باقی کے سب پیسے جمع ہونے ہیں۔ میں کروں یا آپ لوگ۔ گھر کا کچن حسب معمول اسٹور ہی چلائے گا، لیکن یہ ہے کہ جب نئے سال کے ساتھ اسٹور جدید انداز میں آجائے گا تو آمدنی چار گنا بڑھ جائے گی، ان شاء اللہ کوئی سیلز مین رکھ لیجیے گا۔"
عبدالقیوم اور عبدالجبار کی آنکھیں چمکیں۔ حسرت ہی رہی تھی کہ وہ بھی کسی کو ملازم رکھیں۔ ساری زندگی مل جل کر ہی کام نبٹایا تھا۔
"برانڈڈ اشیا رکھنی ہیں اور نئے ڈیپ فریزر تو لازمی لینے ہیں۔" ایک خاکہ سا چمکنے لگا تھا۔
"امی! آپ میرے لیے الیکٹرونکس کے سارے آئٹمز بھائی ہی سے منگوایئے گا۔ یہاں سے نہیں لوں گی، سب نقلی مال ملتا ہے دو نمبر۔" عارفہ اپنا آئیڈیا لیے حاضر تھی۔
"نہیں، پہلے میرے لیے گڑیا بھیجیں گے، میرے قد جتنی لمبی۔۔۔" آصفہ نے کہا۔ عتیقہ بیگم دونوں کی صورت دیکھتی رہیں۔
"میرے بچوں کے لیے اے بی سی والی گیم لائے گا ماموں۔" ناعمہ نے اپنے بچے کو پچکارا تھا۔
"باہر سے تو نیو بورن بے بی کے لیے بڑے ہی مزے کی چیزیں ملتی ہیں۔" عائزہ نے اپنے ہونے والے بچے کے لیے بھی کہہ دیا۔ "امپورٹڈ آئٹمز۔۔۔ واہ۔"
"سب کچھ چھوڑیں اصدق بھائی جان!" زائرہ، رائحہ ایک ساتھ حاضر ہوئیں۔
"آپ نے ہمارے لیے میک اپ کا سامان بھیجنا ہے۔ پہلی تنخواہ ملتے ہی سیدھے بازار جانا ہے اور میک اپ کے سارے آئٹمز۔۔۔ دکاندار خود ہی گائیڈ کرتے ہیں۔" ساتھ ہی اسے پریشانی نہ ہو گائیڈ کا بھی نام بتا دیا۔
"تم نے کوئی فرمائش نہیں کی؟" اصدق نے ستے چہرے کے ساتھ کمرے سے نکلتی فائزہ کو جالیا۔
فائزہ نے شہزادوں سے بڑھ کر خوب صورتی رکھنے والے اس شخص کو دیکھا۔ جو اپنی سرخ ڈوروں والی آنکھیں اس کے چہرے پر جمائے منتظر کھڑا تھا۔ بات کرتے ہوئے اس کی خوب صورت جاندار بولتی آنکھیں اس کے چہرے پر ٹک جاتی تھیں۔ یہ

چہرہ نظروں سے اوجھل ہونے جا رہا تھا۔ اتنی بے فکری کے ساتھ۔۔۔ ذرا جو پیچھے والے کا احساس کیا ہو وہ خفا ہی ہو گئی۔ سوچوں کا اتار چڑھاؤ چہرے سے چھلک رہا تھا۔ وہ منہ سے تو کچھ نہ بول رہی تھی بس خفا۔ بس۔۔۔ بے بس و مجبور۔
"اب بول بھی دو یار۔۔۔" وہ منتظر کھڑا تھا۔
"تو مت جائیے۔۔۔ رک جائیں۔" اس نے ایک دم کہہ دیا۔
اصدق کے چہرے پر زلزلہ سا آرکا۔ فائزہ زخمی مسکراہٹ لیے اسے دیکھتی رہ گئی۔
"اور یہ آپ سے ہو گا نہیں۔" وہ اندر بھاگ گئی۔

☼ ☼ ☼

"تم واقعی نہیں چاہتیں کہ میں جاؤں۔" اصدق نے شام میں اسے ڈھونڈ نکالا۔ وہ سب سے خفا پچھلی سیڑھیوں میں بیٹھی تھی۔ گود میں چمپا کے پھول بھر رکھے پتیوں کی ملائمت کو چھوتی وہ ذہنی طور پر کہیں اور ہی تھی آواز پر اچھل کر کھڑی ہوئی تو تمام پھول اصدق کے قدموں پر گر گئے۔
"واہ۔" وہ جھوم اٹھا اور وہ چونکہ خفا تھی سو پھول چننے کے بجائے ایک سیڑھی اور اوپر ہو کر بیٹھ گئی پھول اصدق ہی کو چننے پڑے۔ اس نے اپنا سوال دوبارہ دہرایا۔
"میرے چاہنے نہ چاہنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔" اس نے جیسے بات ہی ختم کر دی۔ "میری چاہت اہم ہوتی تو آپ جاتے ہی کیوں؟ بلکہ آپ کے دل میں ایسا خیال ہی نہ آتا۔"
"تم تو بڑی دردمند تھیں فائزہ۔۔۔ کسی گملے میں اگا ہوتا نا تو تب بھی صرف اپنے بارے میں نہ سوچتا۔ پورے کنبے کی ذمے داری ہے۔ کیسے پہلو تہی کروں۔ مجھے ہی ان ذمے داریوں کو پورا کرنا ہے اور بہت سوچنے سمجھنے کے بعد حل سب سے بہترین نظر آیا ہے۔ اچھے مستقبل کے لیے اپنے خوابوں، خواہشوں۔"
"آپ سے کب کہا میں نے کہ میرے خواب اتنے بلند ہیں؟" وہ بری طرح خفا ہوئی۔ اصدق نے ہاتھ میں موجود پھولوں میں سے ایک پھول اس کی جانب بڑھایا جسے اسے طوعاً" کرعاً" تھام لیا۔ وہ اس سے دو اسٹیپ نیچے سیڑھی پر ٹک گیا۔
"خواب میرے بھی بلند نہیں ہیں افنی۔۔۔ تم نے کب دیکھا مجھے حسرتیں پال کر خواہشوں کے پیچھے بھاگتے ہوئے۔ مگر گھر میں میری بہنیں ہیں۔ بہت بچپن میں سیکھا کہ یہ بہنوں کو شو مارنے کا بھی بہت شوق ہوتا ہے اور تیار شیار رہنے کا۔ سو میں اپنے لیے شیمپو اٹھا کر نہ لاتا۔ مگر ان سب کے لیے اٹھا لیتا۔ حالانکہ اپنا ذاتی اسٹور تھا۔" اس کے ہونٹوں پر معصوم بچے جیسی مسکان آرکی تھی اور لہجے میں لڑکپن بولنے لگا۔ فائزہ کو اپنا حلق خشک ہوتا محسوس ہوا۔ اس کے چہرے کا رنگ اڑ رہا تھا۔
"وہ میرا بچپن تھا۔ بچپن کی معصوم سوچ۔۔۔ بہنوں کو پرس پکڑ کے چلنے کا بہت شوق تھا اور میں انہیں ہر عید پر بٹوے گفٹ دیتا۔ لیکن اب وہ عمر کے اس دور میں داخل ہو گئی ہیں جب بٹوے کا نوٹوں سے بھرا ہونا بھی ضروری ہے اور میرے لیے یہ احساس موت جیسا ہے کہ وہ خالی بٹوے کے باعث خوش نہ رہ سکیں گی اور بٹوے کو بھرنے کے لیے میرے پاس یہی حل ہے، یہی ایک۔۔۔ ورنہ میرے لیے تو وہی ایک جینز کافی ہے۔"
اس کے لہجے میں موجود قناعت۔
فائزہ ششدر رہ گئی۔ اصدق نے ایک پھول پھر اس کی جانب بڑھایا۔
اصدق کی اپنی تو ایک ہی بہن تھی۔ عارفہ اور بہت چھوٹی آصفہ۔۔۔ اس نے بہنوں کہہ کر تایا کی بیٹیوں کو بھی شامل کیا تھا۔ ان کی فکر پالی تھی۔ اتنا بڑا دل۔ اتنا انمول احساس ذمہ داری۔
"یہیں رہ کر کچھ کر لیتے، اتنی دور۔۔۔" اس کی آواز گھٹ گئی۔
چند سال کی مشقت میں نے کون سا وہاں ہمیشہ رہ جانا ہے۔ یہیں لوٹوں گا۔ بس تمہیں ذرا سونے میں پیلا کر دوں۔ بیگم صاحبہ جیسی۔" وہ شریر ہوا اور باقی کے سارے پھول اس کی گود میں ڈال دیے۔
فائزہ کے چہرے پر رنگ آ گئے۔ وہ لجا گئی۔ پھر کچھ خفا ہو گئی۔
"کس نے کہہ دیا کہ مجھے سونے میں پیلا ہونے کا شوق ہے؟" اس نے اپنی گود کے پھولوں کو مٹھی میں اٹھا کر دکھایا۔ "میرے لیے تو یہی پھول کافی ہیں۔ سنگھار کے لیے بھی اور دل بھرنے کے لیے بھی۔" اس نے ایک دھار سے اپنی گود میں گرتے پھولوں پر نثار ہو کر کہا تھا۔ اصدق اس کے چہرے کو محبت سے دیکھتا ہی رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

خبروں کی پٹی پڑھتا ظفر بڑا مگن دکھائی دیتا تھا۔ وہ ناشتا کر رہا تھا اور ہر خبر میں اس کے لیے دلچسپی تھی۔ لیکن درحقیقت وہ بہت عمیق نگاہی سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ جو تین روز کی ناسازی طبع کے بعد آج کام پر جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا۔ چہرے پر ہلکی نقاہت، گہری بیزاری اور اکتاہٹ کا رنگ نمایاں تھا۔ وہ جیسے ناچاہتے ہوئے سب اعمال کی انجام دہی کر رہا تھا۔
"اوشٹ۔۔۔" دفعتاً" اس کی بے حد ناگوار، بیزار آواز گونجی۔ ایک دھاگے سے لٹکتا بٹن ٹیچ کی آواز سے فرش سے ٹکرایا اور تھوڑا سا گھومتا ہوا زمین پر ٹک گیا۔
"پہلے ہی اتنی دیر ہو گئی تھی۔" وہ بڑبڑایا۔
"تو یار! کوئی اور کپڑے پہن لے" ظفر نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔
"کوئی ایک کپڑا استری نہیں ہے۔ بلکہ استری تو کیا دھلے ہوئے بھی نہیں۔" وہ سر پر ہاتھ رکھ کے کرسی پر ٹک گیا۔ "کوئی اور بٹن ٹوٹتا تو مینج کر لیتا، بالکل گریبان کا ہے۔ کتنا برا لگ رہا ہے۔" وہ منہ بسور کر بولا۔
"اچھا خیر تو یہ ناشتا کر۔ تھوڑی، جان شان بنا، دودھ شدھ پی، کمزوری بھی جائے گی۔" ظفر ہدایتیں دیتا اٹھا، وہ کیبنٹ سے کچھ ٹٹول رہا تھا۔
اب اس کے ہاتھ میں سوئی دھاگا تھا۔ وہ بڑی مہارت سے دھاگا، سوئی کے ناکے سے گزار گانٹھ دے کر اس کے سامنے آرکا۔
"تم بٹن لگاؤ گے ظفر۔" اس کی بے زاری پر مسکراہٹ حاوی ہو گئی۔ "لگانا آتا ہے؟"
"لو جی۔۔۔" ظفر نے تاسف کا اظہار کیا۔ "پنڈ میں درزیوں کے دو پتر میرے پکے دوست تھے۔ ہم اس کی دکان پر جا کر بیٹھتے تو اس کا ابا ہمیں یا تو کپڑے استری کرنے پر لگا دیتا، یا ادھیڑنے پر۔ سارے پنڈ نے میرے ہاتھوں لگے بٹن ہی پہنے۔" ظفر کے جلے کٹے انداز پر وہ بے ساختہ ہنس دیا۔
"یہ تمہارے سارے دوست ایسے ہی کیوں تھے؟ درزی، نائی اور۔۔۔" وہ قصداً" رکا۔
"ہاہاہا۔۔۔" ظفر نے بھی زندہ دلی سے قہقہہ لگایا۔
"سب سے تم نے کچھ نہ کچھ سیکھا۔ لیکن میں تو ہر معاملے میں بڑا نکما ہوں۔ میری دوستی سے تو تمہیں کوئی فائدہ نہ ہوا ہو گا۔"
"خیر یاؤ! اب ایسی بھی کوئی شرمندگی کی بات نہیں۔ میں نے کہا نا دراصل میری اپنی تو کوئی خاص اوقات نہیں ہے۔ بس یار دوستوں کی صحبت نے جو بنا دیا بن گئے۔ رب سوہنا جانے۔۔۔ کہ چنگے یا مندے اور رہی آپ ہوراں سے سیکھنے والی بات۔۔۔ تو بس اتنا سیکھا کہ بندے کو اتنا شریف اور اتنا نیک بھی نہیں ہونا چاہیے۔" اس نے ذومعنی بات کہی تھی۔
"ہائیں! یہ کیسی بات ہے۔" اسے ایک لفظ بھی پلے نہ پڑا۔ ظفر نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ بٹن ٹانک چکا تھا اور گریبان پر جھکا ہوا دانت سے دھاگا کاٹ رہا تھا۔
"یار! تیرا میرا رشتہ بڑا ہی عجیب ہے۔ جب میں تیرے لیے کھانا بناتا ہوں نا۔ تو مجھے لگتا ہے میں تیری امی ہوں۔ ہاہاہا جب بیماری میں ماتھے پر پٹیاں رکھیں، تو

مجھے لگا میں تیری باجی ہوں۔۔۔ ہاہاہا۔۔۔ وڈی باجی' ہو ہو ہو۔" وہ لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ اپنے ہی جملوں پر۔

"لیکن آج تو کمال ہی ہو گیا نا۔ یہ بٹن ٹانکنے کے بعد مجھے لگ رہا ہے، میں تیری بڈی (بیوی) بھی بن گیا۔

اوئے میرے ربا!" وہ پیٹ پر ہاتھ رکھ کے گول گیند ہو گیا۔

"تم بہت بد تمیز ہو ظفر۔" اسے زور کی ہنسی آئی تھی۔ مگر اسے ٹوکنا ضروری خیال کیا۔

"او یار نویں گل کر۔ یہ والی بات تو پنڈ کی دائی نے میرے جمتے ہی کہہ دی تھی۔ چوہدری صاحب تہاڈے کار (آپ کے گھر) 'بدتمیز' ہوا ہے 'ہاہاہا۔"

"تم دائی کی پیش گوئی پر سر دھنتے رہو 'میں چلا۔ پہلے ہی دیر ہو گئی ہے۔" اس کے وجود پر چھائی بیزاری کی دھند چھٹ گئی تھی۔ وہ اب تیزی سے پیروں میں جاگرز چڑھا رہا تھا۔

"میرے دماغ میں ایک بات آئی ہے۔" ظفر کے لبوں سے پانی کا گلاس لگا تھا۔ وہ ہمہ تن گوش تھا۔

"تو بھرجائی ہوراں کو اپنے پاس کیوں نہیں رکھتا۔ میرا مطلب ہے فیملی 'بچے وچے تجھے بھابھی جی کو اپنے ساتھ ہی رکھنا چاہیے۔ میرا مطلب۔۔۔" ظفر نے بہت سے جملے سوچ رکھے تھے۔ مناسب 'موزوں ڈھیلے ڈھالے جملے' ہلکے پھلکے۔

"یہ بات کیوں کہی 'آئی مین اس وقت اچانک۔"

"نہیں۔ کوئی خاص بات نہیں۔ دراصل تو جو ہے نا۔" ظفر اٹکا۔ "یار تو چھڑا چھانٹ رہنے والا بندہ نہیں ہے۔ یعنی تیری ہڈی ہی نہیں کلم کلا (تن تنہا) رہنے کی۔" ظفر گڑبڑا گیا۔ وہ تین دن سے جملوں کی ترتیب بنا رہا تھا۔ تب کامیاب نہ ہوا تو اب ایک دم کہاں سے فصیح و بلیغ ہو جاتا۔

"میرا مطلب ہے تو وہی آدمی ہے یار! وہ اس کو کیا کہتے ہیں۔" وہ پیشانی مسلنے لگا۔ "ہاں وہ فیملی مین۔۔۔ یہ تھا میرا مطلب۔" ظفر نے بات گھما ہی لی۔ سنبھال ہی لی۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ مسکرا کر خدا حافظ کہتا باہر نکل گیا۔

"بچ گیا تو ظفر پتر۔" ظفر نے سارا گلاس ایک سانس میں چڑھا لیا۔

"بعض باتیں کہنی کتنی مشکل ہوتی ہیں۔ ایسے جملے امتحان میں بنا تا چھانٹ چھانٹ کر تو پورے پنجاب بورڈ میں پوزیشن بن جاتی۔ جتنے ان تین دنوں میں بنائے ہیں۔ مگر دھت تیرے کی 'عین ٹیم پر ایک بھی بر نہ آیا اور سچ کہتے تھے ابا جی! دو بندے بڑے ہی بے شرم ہوتے ہیں۔ ایک 'ڈاکٹر' تے دوجا وکیل۔ کیسے مزے سے کہہ دیا اس ڈاکٹر نے۔

"اپنے دوست سے کہیں 'وائف کو ساتھ رکھیں۔"

"لیکن چوہدری ظفر!" وہ خود سے مخاطب تھا۔ "یہ اتنا سیدھا مسئلہ نہیں ہے۔" بہرحال تین دن پہلے کی رات اپنی تمام تر جزئیات سے یاد تھی۔

☼ ☼ ☼

ایک رات تو وہ تھی۔ جس میں وہ انتہائی ناگفتہ حالت میں سجدہ ریز تھا۔ اس کا جسم گرم تھا اور سینہ ٹھنڈا۔۔۔ وہ نہ جانے کس عالم میں تھا کہ ظفر کے بار بار بلانے 'چونکانے پر واپس نہ پلٹتا۔ پھر عجیب سی بڑبڑاہٹیں جو ظفر کے خاک پلے نہ پڑیں۔ وہ اس کی پشت سہلانے لگا۔ ماتھے سے پسینہ پونچھا اور پھر پانی کا گلاس اس کے لبوں سے لگا دیا۔ پانی پی کر جیسے ہی حواس بحال ہوئے۔ وہ بے حد اچنبھے کے عالم میں ظفر کو تکنے لگا۔ پھر در و دیوار کو اجنبیت سے دیکھتے ہوئے دھیرے دھیرے واپس پلٹتا۔ اس نے اپنے پورے وجود کو دیکھا تھا اور پھر ایک دم اور اک سا ہوا 'نظریں چرا گیا۔

"کیا ہو گیا ہے یار تجھے!" ظفر کی حیرت آمیز پریشانی کی کوئی حد نہ تھی۔

"اچھا بھلا سویا ہوا تھا۔ یہ ایسے سجدے کی طرح موا (جھکا ہوا) کیوں پڑا تھا۔ کھانا ہضم نہیں ہوا۔ پیٹ

میں درد شروع ہے۔ تو مجھے جگا دیتا تھا۔ کوئی علاج ولاج کرتے۔ بلکہ میرے پاس تو بے بے کی دی ہوئی پھکی بھی ہوتی ہے۔" وہ بے بے کی پھکی ڈھونڈنے کے لیے ڈبے ٹٹول رہا تھا۔

"چل شاواشے! ایک چمچہ لپک کے اوپر سے گلاس پانی چڑھا لے۔ پھکی اندر درد باہر خرطا لگا کے۔" وہ چمچہ اور گلاس لیے کھڑا تھا۔

"اوں۔۔۔ ہوں۔" اس نے منہ پھیرا۔

"نہیں، میرے پیٹ میں درد نہیں ہے۔" وہ بولا۔

"ہائیں۔۔۔ تے فیر ٹیڈھ پھڑ کے موداکیوں سیں۔" (پھر پیٹ پکڑ کے دہرے کیوں تھے۔)

"سچ کہہ رہا ہوں ظفر! واقعی میرے پیٹ میں درد نہیں ہے۔ اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔ درد ہوا تو۔ ان شاء اللہ بے بے کی پھکی ہی کھاؤں گا۔"

وہ اوندھا لیٹ گیا۔

چیزیں واپس جگہ پر جماتے ظفر اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ جو واقعی پرسکون حالت میں سونے ہی والا تھا۔

ظفر نے شانے اچکائے۔ وہ بھی بستر پر گر گیا۔ نیند کی وادی میں غرق ہونے تک وہ مسلسل سوچ رہا تھا کہ یہ ہو کیا رہا تھا؟

مگر وہ کبھی بھی معاملہ فہم، زیرک نگاہ یا پیش بین نہیں رہا تھا۔ سیدھا صاف کھرا۔۔۔ گہرائی سے اس کا دور کا واسطہ بھی نہیں تھا کہ قیاس کرتا اور کڑیاں جوڑتا۔ اور اگر عقل کے گھوڑے دوڑا کر کچھ نتیجہ نکالنا بھی چاہتا تو وہ تو کبھی بھی نہ نکال سکتا۔ جو ڈاکٹر صاحب کہہ گئے تھے۔

دوسری رات یا دوسری مرتبہ کا ماجرا بالکل جدا تھا۔ یعنی گزشتہ سے پیوستہ تو تھا۔ مگر ایک نئے ڈھنگ کے ساتھ۔ وہ ویک اینڈ نائٹ تھی اور ظفر پوائنٹ چڑھا کر آیا تھا۔ وہ ہلکے سرور اور ترنگ کے زیر اثر تھا۔ میڈلے گاتا ہوا، بیک ٹو بیک میوزک سب مکس۔

"میری چی چی دا چھلا ماہی لالیا۔۔۔ گھر جا کے شکیت لاواں گی۔"

اپنی چابی سے لاک کھولتا وہ اندر داخل ہوا۔ آتشی گلابی پینٹ پر تھائی شرٹ تھی جو رنگوں سے بھری تھی اور ایک ڈریگن سینے پر منہ کھولے آویزاں تھا۔ وہ کارٹون فلمز کے جاسوسوں کی طرح پراسرار بنا چاپ پیدا کیے لمبے ڈگ بھرتا تھا۔

اب کے سال پونم میں۔۔۔ جب تو آئے گی ملنے ہم نے سوچ رکھا ہے۔

رات یوں گزاریں گے۔۔۔ چ چ چ۔"

ایک انتہائی عجیب و غریب ہنسی اور غیر فطری سی آواز پر وہ چونکا۔ یہ اس کی اپنی ہچکیوں کی آواز تو ہرگز نہیں تھی۔ وہ نشے کے زیر اثر تھا اور خوب موجیں اڑا کر آ رہا تھا۔ مگر گردن گھما کر جب زمینی گدے پر اوندھے اکڑے اور جھٹکے کھاتے ہوئے اصدق کو دیکھا۔ تو جیسے سارا نشہ ہرن ہو گیا۔ جیسے کسی نے بالوں سے پکڑ کر اسے ٹھنڈے برف پانی میں غوطے دے دیے ہوں۔

"اوئے ربا۔۔۔ اج پھر اس کے پیٹ میں درد ہو رہا ہے۔ او کہڑا روگ لا لیا۔ او جگر! او اصدق باؤ۔"

اسی پل اسے عجیب سا احساس ہوا کہ اس کی حالت پیٹ درد والی نہیں ہے۔ یہ۔۔۔ مرگی کے دورے جیسی کوئی حالت تھی۔ وہ وہیں رک کے اسے بغور دیکھنے لگا اور حتمی نتیجے پر پہنچ کر ادھر ادھر دیکھنے لگا کہ کیا کرے۔ وہاں پنڈ میں تو جوتی سنگھائی جاتی تھی، تو کیا وہ بھی۔۔۔ وہ سرعت سے جوتی اٹھانے لگا، مگر رک گیا۔ وہ اتنی ہی تیزی سے تب ٹیلی فون کی جانب بڑھا۔ وہ ایمرجنسی ڈاکٹر کو کال کر رہا تھا۔

اور پھر ڈاکٹر کے آنے تک اس کے اکڑے ٹیڑھے میڑھے وجود کو اس نے کیسے سنبھالا دیا تھا۔ یہ وہی جانتا تھا۔

جب تک ڈاکٹر آ کر جانچ کرتا رہا۔ وہ حیرت اور خوف کے زیر اثر کرسی پر پاؤں اوپر کیے سینے پر بازو لپیٹے بس اسے حیرت سے تکتا ہی جاتا۔

"کیا یہ شادی شدہ ہے؟"

"جی۔۔۔ جی۔۔۔ ماشاء اللہ تین بچے ہیں۔ دو منڈے، ایک کڑی۔"

"کتنا عرصہ ہوا شادی کو؟"

"او جی یہی کوئی آٹھ، سات سال۔" ظفر کو یہ سب سوال انتہائی غیر ضروری لگ رہے تھے۔ جلدی سے بتا ناکیوں نہیں ہو یا کی اے۔

ایک سکون آور انجکشن اپنی ناک کی سیدھ میں رکھ کے جانچتا ڈاکٹر اسے زہر لگنے لگا۔

بڑا ہی ڈھیلا ہے۔ اب منہ سے کچھ پھوٹ بھی دے۔

"کتنے عرصے بعد پاکستان کا رخ کرتا ہے۔ میرا مطلب ہے گھر جاتا ہے؟"

"او ڈاکٹر جی۔" ظفر کو بے تکا سوال نہ بھایا۔ "سیدھے سیدھے بتائیں۔ اینوں کی ہو ریا ہے۔ میں نے آپ کو ابھی ساری باتیں تو بتائی ہیں نا۔"

ڈاکٹر نے پراسرار انداز میں سر ہلایا۔ وہ سامان سمیٹ رہا تھا۔

"اپنے دوست سے کہیں، وائف کو ساتھ رکھیں۔"

"ہیں جی؟" ظفر بھونچکا رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

بہت دن ہوئے چندرا نے اسے دیکھ کے حیران ہونا چھوڑ دیا تھا اور وہ بھی اب ادھر آ کر اچنبھے سے گرد و پیش کو نہیں دیکھتا تھا کہ کہاں آ گیا، کیسے آ گیا؟ بس آ گیا، بیٹھ گیا اور چلا گیا۔

مگر اس وقت دونوں کے چہرے حیرانی کی تفسیر بنے ہوئے تھے۔ وہ بہت دنوں کے وقفے سے آیا کرتا تھا۔ ایسے ہی اچانک ایک دم حاضر۔۔۔ ورنہ دنوں غائب، نہ نام کی خبر نہ فون نمبر نہ پتا۔

فقط چہرے کی شناسائی۔

اور چندرا یوں حیران تھی کہ وہ ابھی پرسوں ہی تو آیا تھا اور حسب معمول اسے دھتکار گیا تھا۔

اور وہ حیرت سے اسے یک ٹک دیکھ رہا تھا۔ وہ تو بالکل ہی بدلے حلیے میں تھی۔ اس کے سامنے وہ ہمیشہ بہت ہلکے پھلکے سنگھار کے ساتھ نمودار ہوتی تھی۔ ہوا جیسی بے ضرر بن کر۔۔۔ مگر اس وقت تو وہ اتنی بدلی ہوئی تھی کہ وہ ٹھٹکا تھا اور خود کو قائل کیا تھا کہ وہ وہی تھی۔

گلاب رنگ کی ساڑھی کا بارڈر سیاہ و سنہری تھا۔ ڈھیروں گلاب جوڑے پر کے تھے۔ اس کی سڈول کلائیاں بھی پھولوں سے بوجھل تھیں۔

وہ سحر کار تھی۔ مگر ایسا ٹوٹکا۔۔۔ معمول پانی بھی نہ مانگے، ایڑیاں رگڑے اور ختم۔

"میں شاید غلط وقت پر آ گیا۔"

"نہیں۔" وہ مسکرائی۔ "وقت غلط ہو سکتا ہے، آپ خود کو الزام مت دیں، آپ درست ہیں۔" اس نے پورا پٹ وا کر دیا یعنی وہ اندر آ جائے۔

"کہیں جا رہی تھیں؟"

"نہیں۔" وہ کلائی کے پھول کھول رہی تھی۔ "کچھ مہمانوں کے ساتھ تھی۔" وہ بے نیازی سے پھول سونگھ کر احتیاط سے انہیں میز پر رکھتے ہوئے بولی۔

"دن کے وقت بھی مہمان؟" وہ اچنبھے کا شکار ہوا۔ "تم دن میں بھی یہی سب کرتی ہو۔ دن میں لوگ آتے ہیں؟" اسے کراہیت سی ہوئی تھی۔

"آپ بھی تو آئے ہیں۔" اس کی مسکراہٹ ہنسی کی حد کو چھو کر آئی تھی۔

"میں؟" "میں تو پتا نہیں کیوں آ جاتا ہوں اور آ جانے کے بعد سوچتا ہوں کہ۔۔۔" وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر پیشانی مسلنے لگا اور وہ جملے کے ادھورے پن پر ذرا نہ کلسی بخوبی جانتی تھی وہ کیا کہتا۔

خاموشی کے شور میں خوشبو بول رہی تھی۔ وہ ایک ایک کر کے سب چیزیں میز پر رکھتی جا رہی تھی۔

"میں نے کبھی تمہیں اتنے سنگھار کے ساتھ نہیں

دیکھا، میرا مطلب ایسے۔"
"آپ نے ابھی تک مجھ میں اور بھی بہت کچھ نہیں دیکھا صاحب۔" اس نے لطف اٹھا کر کہا تھا۔
اس کی نگاہیں گریبان کی کشتی پر ٹکیں' ٹھہریں اور پھر چونک کر پلٹیں۔ وہ اب قصداً" منہ موڑے بیٹھا تھا۔

چندرا کا لطف دوبالا ہو گیا۔ نگاہوں کی یہ چوری اس کی نگاہوں سے مخفی نہ رہی تھی۔ وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھ کے تسلی سے براجمان ہو گئی۔ ہاتھ سے فال کو جماتے ہوئے وہ کچھ کہہ رہی تھی۔

"طوائف اپنی مرضی سے کبھی کچھ نہیں کرتی۔ وہ خو کو گاہک کے حساب سے پیش کرتی ہے۔" اس کا انداز خطاب جیسا تھا۔
"ہمارے دھندے کے رولز لکھے ہوئے تو نہیں ہوتے۔ مگر نافرماضی کی بھی اجازت نہیں' دنیا کے ہر خطے میں طریقہ الگ ہو سکتا ہے' مگر مقصد ایک ہی ہوتا ہے۔ آمدنی بس۔" اور یہاں وہ ہنسی تھی اپنے ہی کسی خیال پر۔
"لوگ کہتے ہیں زمانہ ترقی کر گیا ہے۔ نئے نئے راستے' کاروبار کے نئے طریقے' پرانے پیشے دم توڑ رہے ہیں' مگر ہمارا پیشہ یہ اعزاز رکھتا ہے کہ دنیا کا سب سے قدیم پیشہ۔۔۔ جو آج بھی قائم و دائم ہے' بلکہ ترقی ہی کی جانب گیا ہے' بلکہ جتنی جدت اس کے اندر۔۔۔"
"چندرا۔۔۔" وہ اب اور سننے کی تاب نہ رکھتا تھا۔
"تمہارے منہ سے اپنا نام کتنا بھلا معلوم ہوتا ہے؟"

وہ دفعتاً" اٹھ کر اس کے صوفے پر آئی اور گردن سیدھی رکھ کے تن کے پیش ہوئی۔
وہ اس کے اتنے قریب تھی کہ وہ کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے خود سے۔۔۔ لیکن وہ ہمیشہ یہاں آگ بن کر آتا تھا اور برف بن جاتا تھا۔ پتا نہیں کیوں۔
دھواں آگ سے بھی نکلتا ہے اور۔۔۔ اور برف سے بھی؟
دھویں کے اس مرغولے سے چھلکتا وہ نمکین
اس نے بڑھے ہاتھ کو تھام لیا۔

کتنے پل بیت گئے۔
آگ اور برف کا دھواں۔۔۔ نتیجہ دھندلا منظر۔
"تم نے آج تک اپنا نام بھی نہ بتایا۔ شاید مجھے قابل بھی نہیں سمجھتے' تمہیں کیسے بتاؤں' میرے پ صرف یہ ہاتھ نہیں اور بھی بہت کچھ ہے۔" وہ خو کلامی سی کر رہی تھی۔
وہ غیر محسوس سا پیچھے ہوا اور اس کا یہ کترانا چندرا کی زمانہ ساز گھاگ نگاہوں سے پوشیدہ نہ رہا۔
"تمہیں مجھ پر ترس نہیں آتا' میری نزاکت دیکھو۔ کیوں آجاتے ہو یہاں۔۔۔" وہ اس کے بے قریب ہو گئی۔ اپنا بازو اس کے گرد پھیلاتے ہوئے بے خودی سے بولی۔
وہ آگ تھی اور وہ برف۔۔۔ دونوں ایک دوسرے حاوی ہو سکتے تھے مگر
وہ اسے جھٹکے سے خود سے دور کرتا' کھڑا ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

ان کے کام میں چھٹی کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ مگر کبھی کبھار ایسی فرصت کے دن بھی میسر آجاتے تھے۔ جب اس گھر کی تمام عورتیں' لڑکیاں' فراغت سے لطف اٹھاتیں' باتیں کرتیں۔
ایسی باتیں' جو قوت گویائی کو شرمسار کر دیں۔
جو حس سماعت کو منہ چھپانے پر مجبور کر دیں۔
اور وہ سب ہنس رہی تھیں۔ یادوں پر' باتوں پر' چہروں پر۔۔۔
"وہ چندرا سے عشق کرنے لگا ہے۔" اب موضوع چندرا تھی۔
وہ اوندھی لیٹی کش لے رہی تھی۔ دھویں کے مرغولے میں اس مرد کا چہرہ ہلکورے لینے لگا۔ اس کے

چہرے پر مسکان در آئی۔
"بہت دن سے وہ آیا نہیں۔"
"ڈر گیا۔" دوسری نے مزا لیا۔ "چندرا کو جھیلنا آسان نہیں۔" اس نے اپنے جملے کو مکمل کیا۔
"وہ یہاں کیوں آتا ہے چندرا۔۔۔ تو نے ابھی تک اگلوایا کیوں نہیں؟"
"وہ کھایا پیا ہضم کر کے آتا ہے۔" چندرا دوبارہ کہیں کھو گئی۔
"کتنے دن ہو گئے وہ آیا ہی نہیں۔" رنگیلے کو تو اس روز اس نے دیکھا تھا۔ وہ پوچھنا چاہتی تھی۔ مگر نہ جانے کیوں رک گئی۔
وہ اس سے کیا کہہ کر پوچھتی جس کا نام تک نہ جانتی تھی۔
چندرا کا سجن۔
اور یاد اتنی طاقت ور یا دل سے تھی کہ وہ اگلے روز موجود تھا۔ چندرا کسی اور کے ساتھ جانے کو تیار تھی، فیصلہ ہو چکا تھا۔
"آپ کسی اور کے ساتھ۔۔۔ روزا اور شعیلی ہیں ابھی۔" ان کی نگراں میڈم نے دوسرا راستہ بتایا تھا اور وہ والٹ کھول کر پیسے بڑھا رہا تھا۔ ٹھٹک کر رک گیا۔ اس کی نگاہیں چندرا کے چہرے پر رکیں، جو بس اسے دیکھ رہی تھی۔ پلکیں جھپکے بنا ٹکٹکی باندھ کے۔
اس نے پل بھر میں فیصلہ کیا تھا۔
والٹ سے نکلے پیسوں کو میڈم کے پھیلے ہاتھ پر دھر کے وہ ایڑیوں کے بل گھوما اور دھڑ دھڑ سیڑھیاں اتر گیا۔
چندرا کا دل پھسلا سکڑا اور پھر پسلیوں سے ٹکرا ٹکرا سر پٹخنے لگا۔
میڈم نے نوٹ گنے، وہ مسکرا رہی تھی۔ اندر بڑھتی چندرا کے قدم من من کے تھے۔

☼ ☼ ☼

پتا نہیں اس کی یہ حالت کیوں ہو رہی تھی، وہ تو سات سال سے یہاں تھا، مگر کچھ پچھلے ڈیڑھ سال سے وہ زیادہ بے چین تھا۔ بے چینی کا غیر معمولی احساس اب ایک تکلیف دہ روگ بن چکا تھا جس سے ابھرنے کی اس کے پاس کوئی صورت نہ تھی وہ کیا کرتا؟ وہ کیا کر سکتا تھا؟
جو واحد حل اس کے پاس تھا اس پر کم از کم فوری عمل در آمد ناممکن تو نہ تھا، مگر مشکل ضرور تھا۔ پردیس میں بن باس کاٹتے انسانوں کے پاس دل ہلکا کرنے کے سہارے نہیں ہوتے، ایمان کے ڈھیلے ہوں تو بدی کا راستہ بانہیں وا کیے خود میں سمیٹ لیتا ہے۔ اور داخل ہونے والے بغلوں میں منہ دیتے جاتے ہیں۔
دل میں تقویٰ کا قفل ہو تو بندہ خدا کی طرف رجوع کرتا ہے۔
دنیا کے ہر مسئلے کا حل اسی ایک "رجوع" میں ہے، مگر اسے لگنے لگا کہ اس کی حالت سے آرام کے لیے سب سے بہترین راستہ ہے کہ وہ اللہ سے نزدیک ہو جائے۔ اللہ جو صبر دیتا ہے اور ہمت اور استقامت اور ڈھال۔۔۔
اس نے سجدوں میں طوالت پیدا کر دی۔
وہ ہر وقت باوضو رہنے لگا۔
اس نے گانے سننے چھوڑ دیے۔ دیکھنے بھی۔۔۔
اس نے ٹی وی لگانا چھوڑ دیا۔
چاشت اور اشراق میں بھی باقاعدگی آئی۔
وہ دینی کتب کا ڈھیر خرید لایا، اس نے اخبار پڑھنا چھوڑ دیا۔
وہ قرآن پاک پڑھنے لگا جن کے اعراب میں بھی ہدایت پنہاں تھی وہ باقاعدگی سے تلاوت کرتا، تفسیر پڑھتا۔
اسے بہت سکون ملا۔۔۔ مگر۔۔۔ سکون ذہن و دل کے لیے تھا، مگر جبلی تقاضے جو بلی کی طرح گھات لگائے تاک میں بیٹھے رہتے جب موقع ملے اور حملہ آور ہوں۔
اس نے روزے رکھنے شروع کر دیے۔

دبئی کی شدید گرمی، سخت کام اور وہ حالت روزہ میں۔۔۔ لیکن روزہ کھولنا پڑتا ہے۔
وہ فون پر فائزہ کو اپنا حال سنا سنا کے اب خاموش ہو گیا تھا۔ وہ بھی کیا کر سکتی تھی۔ حیا کی پوٹ، ہونٹ کاٹتی، خود کو مجرم محسوس کرتی، لیکن۔۔۔ کرے تو کیا کرے، بڑی لمبی گتھی تھی۔
کہانی کا نیا موڑ یہ تھا کہ پہلے اس راز کے دو امین تھے۔ ایک اللہ اور دوجا اس کا بندہ یعنی وہ خود۔۔۔
اور اللہ عیب پوش ہے، لیکن۔۔۔ لیکن پتا نہیں کیسے ظفر بھی اس راز کا تیسرا بن گیا۔

☼ ☼ ☼

وہ زیادہ محتاط ہو گیا، مگن، کمپنی میں گزارا وقت تو سر کھجانے کی ضرورت بھی نہ دیتا تھا۔ پھر نماز پنجگانہ، تلاوت کلام، دینی تاریخی کتابیں اور گھر کی صفائی ستھرائی۔
جب اسے لگنے لگا کہ وہ کامیاب ہو رہا ہے۔ ایک سہل احساس اور پر سکون وجود۔۔۔
تب ہی
اب ظفر انجان نہیں تھا۔ وہ اسے سنبھالنے لگا، مگر اتنے دنوں بعد خراب ہونے والی طبیعت۔۔۔ ظفر اس کی حالت دیکھ رہا تھا۔ اسے کہیں جانا تھا۔ ظفر کے ہم مزاج دوستوں کے فون آ رہے تھے۔ ظفر دیر کیوں کر رہا تھا، ویک اینڈ نائٹ پر "ممنوع مستی" کا پروگرام تھا، لیکن ادھر اصدق۔۔۔
اس نے نجانے کیا سوچ کر کس خیال میں آ کر اصدق کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ اسے اس حال میں چھوڑ کر جانا نہیں چاہتا تھا اسے یکدم کوئی بھڑکیلا سا خیال آیا تھا۔
"اور زندگی اتنی مشکل بھی نہیں ہے۔ خوش رہنے کے سو راستے۔ چل میرے نال۔"
"کیا کر رہے ہو کہاں جانا ہے؟" وہ متامل تھا۔
"یار تو اک بار آ تے سئی۔"
اصدق بھی کمرے کی دیواریں تک تک کے تھک چکا تھا باہر کی تازہ ہوا، آوازیں، شور، وہ اٹھ کھڑا ہوا۔
"اتنے دن بعد باہر جا رہا ہے شیو تو بنا لے، لوگ مجنوں کہیں گے۔" وہ بھی نجانے کیا سوچ کر سر ہلا گیا، جو جو ظفر کہتا گیا وہ کرتا گیا۔ شیو کر کے نہایا دھویا، سلکی بالوں میں برش پھیرنے کے بعد اس کی جون ہی بدل گئی۔
وہ سانولی رنگت والا بے حد پرکشش مرد تھا اور اب آنکھوں میں چھائی کچھ ہراساں کیفیت، بجھی بجھی مسکراہٹ۔۔۔
سفید شرٹ، نیلی پینٹ
ظفر کی آنکھوں میں ستائش ابھر آئی۔ وہ ہمیشہ کی طرح اسے سراہنے لگا۔
"بس اپنی اپنی قسمت ہے یار! تو سب سے پہلے تو شادی شدہ ہی نہیں لگتا۔۔۔ ہمیں دیکھ جوان ہوتے ہی بڈھے لگنے لگے اور دوسرے تو نے صرف منہ دھو کر کپڑے بدلے ہیں اور تباہی آ گئی۔ اور میں نے پورے کمرے کی الماری کی تباہی کر دی، مگر مجال ہے جو ذرا رونق آئی ہو۔ سب محنت غارت گئی۔"
یہ اس کا ہمیشہ کا دکھڑا تھا۔ اصدق کچھ نہیں بولا، وہ تیار ہو چکا تھا، مگر ذہنی طور پر اب بھی حاضر نہ تھا۔ ظفر اپنا کالر سیٹ کر رہا تھا۔
"مگر ہم جا کہاں رہے ہیں؟"
"اوئے چپ۔۔۔" ظفر نے ہونٹوں پر انگلی رکھی۔ اپنا بازو اس کے شانے پر رکھا۔
"ادھر جدھر تجھے بہت پہلے چلے جانا چاہیے تھا۔" وہ معنی خیزی سے بولا۔ دونوں ہم قدم تھے۔

☼ ☼ ☼

جاتے وقت ظفر شاید آنے والے خوشگوار پلوں کا سوچ کر سرور میں تھا اور اب جب شام ڈھلے لوٹا تو پی پی کر مدہوش سا تھا وہ زمینی گدے پر گر کے بے خبر ہو گیا اور اس کے انتظار میں اصدق جو شاید اسے چیر پھاڑ ڈالنے کے ارادے سے گھر لوٹا تھا کہ وہ۔۔۔ آگے اس کا

ذہن خالی ہو جاتا۔

اس نے اپنے ذہن و دل سے ہر شے جھٹک جھٹک کر، ٹی وی لگا لیا ایک دوسرے پر بہتان بازی کرتے چلاتے لڑتے ہوئے سیاست دانوں کو دیکھتا رہا مگر سکرین پر کچھ اور ہی چمک رہا تھا۔ ایک سایہ سا، سفید سلیولیس بلاوز پر بے حد باریک شیفون کی ساڑھی، سیاہ و سفید کا ایسا امتزاج اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا ایک دوسرے کے مخالف دو علیحدہ رنگ سفید اور کالا ایک دوسرے میں کتنے انہونے انداز میں ضم تھے۔

اس نے تنگ آکر ٹی وی بند کیا اور خود کو کاموں میں الجھایا۔ تو وہ دھلتی پلیٹ سے چھب دکھلانے لگا۔ ٹب میں پڑے پانی پر لرزنے لگا اور جب جب وہ ظفر کی جانب دیکھتا تو پھر تو جیسے سایہ، خیال، مجسم ہو جاتا اتنا نزدیک کہ چھو لو اور ساتھ ہی اشتعال کی نئی لہر۔

اور ظفر کے بیدار ہونے کے انتظار میں وہ خود اونگھنے لگا تھا۔ جب کچن میں کھٹ پٹ ہوئی۔ وہ ہشیار ہوا ظفر ہی تھا چیک کی دھوتی اور ساتھ بنیان... وہ چونکنا ہو کر اٹھ بیٹھا۔

کھٹکے پر ظفر نے گردن موڑی۔ اسے جاگتا پایا تو بڑے دل سے مسکرایا۔

"چائے پینی ہے لاؤں؟" اس نے سوال کیا وہ منہ سے کچھ نہ بولا نفی میں گردن ہلا دی اس نے بہت سے سوال سوچ رکھے تھے۔ مگر اب وہ فقط اسے گھورے ہی جا رہا تھا۔

ظفر نے چائے کی پیالی اس کے سامنے دھر دی۔ وہ کچھ پوچھنے کو بے چین تھا مگر الفاظ کا چناؤ۔

اصدق بھی بولنے کو بے تاب تھا۔ مگر جملے کہاں سے لاتا۔

دونوں ادھیڑ بن میں تھے۔

"کل رات..."

"رات کو..."

دونوں کے منہ سے ایک ساتھ نکلا پھر دونوں ہی چپ ہو گئے۔

"تم مجھے کہاں لے گئے تھے ظفر؟" اس کی آواز میں برف جیسی ٹھنڈک تھی۔

ظفر کھنکھارا اس سوال کا جواب اس کے پاس تھا۔

"جہاں جانا تمہارے لیے ضروری تھا۔ بلکہ تمہیں بہت پہلے ہی چلے جانا چاہیے تھا۔"

"یہ گناہ ہے۔" وہ حیرت و صدمے کی زیادتی کے باعث چلا بھی نہ سکا آواز گھٹ سی گئی۔

ظفر نے از حد اطمینان سے چائے کا آخری گھونٹ حلق سے اتارا۔

"تو بیوی کو یہاں کیوں نہیں لے آتا؟ اس دن ڈاکٹر بھی مجھے یہی کہہ کر گیا تھا۔" وہ ظفر کے پہلے جملے پر خاموش ہو گیا تھا اور دوسرے پر ششدر رہ گیا۔

"میں مانتا ہوں۔ دبئی جیسے مہنگے شہر میں فیملی کو ساتھ رکھنے کے لیے ایک مخصوص اماؤنٹ لازمی چاہیے ہوتی ہے۔ لیکن میرے خیال میں تو اتنے تو کما ہی لیتا ہے۔ اب تو بہنیں بھی بیاہ دیں گھر بھی سیٹ کیا ہے۔ پھر کیا بات ہے؟" ظفر کے لہجے میں فکر، درد، حیرانگی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

دبئی جیسے ملک میں آکر سیٹل ہونا بڑا مشکل کام تھا۔ ہر لحاظ سے جن میں سب اہم معاشی مضبوطی، وہ اس حوالے سے خوش قسمت رہا تھا کہ اسے ایک اچھی جگہ پر ملازمت مل گئی۔ آمدنی بھی بہت اچھی تھی۔ کم از کم پاکستان کے تقابل میں... بہت زیادہ تھی یہاں کے تھوڑے ریال پاکستان میں خرچ کرنے میں بہت ہوتے لیکن اسے اپنا خرچا یہیں رہ کر یہیں کے حساب سے کرنا تھا۔

وہ ہمیشہ کے لیے یہاں نہیں آیا تھا۔ رہنے بسنے، اس نے گھر والوں کے سامنے خود کو بہت مضبوط اور لاپرواہ دکھایا تھا مگر یہ اس کا دل جانتا تھا وہ کیسے تنہائی کے سمندر میں بے بسی کی کشتی کو دھکیلتا آیا تھا۔ ماں، باپ، خالہ، تایا، بہنیں، کزنز، اپنا شہر محلہ ملک اپنے لوگ اور... وہ یعنی فائزہ، جسم ادھر آگیا تھا روح ادھر رہ گئی تھی۔

اور جسم بغیر روح... بے جان ہی کہلائے گا ناں؟

اسے اسٹور کو مستحکم کرنا تھا اور اسے کاروبار کو بڑھانا تھا اور بہنوں کی شادی اور...

مسلم آباد کے قصباتی ماحول سادہ زندگی میں وہ ریال... واہ اتنے سے ریال اور اتنے سارے نوٹ... بھئی بہت خوب ایک جانب سب کو احساس تھا کہ اس رقم کو بہت دھیان سے خرچ کرنا ہے۔ قطعاً "ضائع نہیں کرنا" سب کے ذہن میں واضح تھا۔ مگر... دوسری جانب نظر بھی آنے لگا کہ بیٹے کی باہر کی کمائی کو خرچ کرنے کا مزہ لیا جا رہا ہے۔ غیر محسوس سا، ہلکا پھلکا بے معنی سا فرق۔

سیل سے خریدے جانے والے لان کے جوڑے، بڑے حساب کتاب سے بنتے تھے۔ اس بار شہر کی سب سے بڑی دکان پر جا کر دھڑا دھڑ نئے نئے لان پرنٹس خریدے گئے۔ دونوں بھائیوں نے ساری زندگی سالانہ سیل سے جوتے خریدے تھے۔ وہ نیو کلیکشن سے نئے جوتے پسند کرتے نظر آئے۔ قیمت کی چٹ کو جانچے پرکھے بنا...

قربانی کے نام پر حصہ ڈالا جاتا یا پھر بکرا لا کر پال لیا جاتا تھا۔

اس سال پوری گائے لی گئی اور دو دو بکرے۔

اسٹور میں اتنا کام کرنا تھا جتنا کہ وہ تیز قدموں سے چلنا شروع کر دے۔ وقت گزرتا تو وہ بھاگنا شروع کر دیتا۔ مگر آتی رقم نے فیصلہ کروایا۔ اسٹور اول نمبر کی ریس میں حصہ لے گا۔

سال بعد جب وہ عارفہ کی شادی کے لیے لوٹا تو اس کے ہاتھوں میں سونے کے سکوں سے بھری مٹھیاں نہیں تھیں۔ لیکن وہ سب کچھ ضرور تھا جو پہلے کبھی نہیں تھا۔ عارفہ کی شادی بہت دھوم دھام سے انجام پائی۔ وہ کم عمر اور لاابالی سی تھی۔ اس نے عائزہ کی طرح کوئی فرمائش نہیں کی۔ نہ اعلیٰ نہ کمتر، اماں ابا جو مرضی خریدیں بنائیں وہ برتن بیڈ شیٹس اور فرنیچر تک پسند کرنے نہیں گئی۔ اس کی تو بس ایک ہی خواہش فرمائش جنون تھا ________ اچھا عروسی لباس گولڈ کی میچنگ جیولری اور قیمتی نگوں والے نازک جوتے اور خوب صورت کپڑے...

بس اور کچھ دیں نہ دیں میرے کپڑے سب سے اعلیٰ ہوں گے۔

مجھے وہی لہنگا لینا ہے جو چالیس ہزار کا ہے اور جس کی میچنگ آرٹیفشل جیولری نو ہزار کا سیٹ ہے۔ جوتا ساڑھے تین ہزار میں لے۔ اور کسی چیز کی ضد کی نہیں ایک تو کہا تھا ناں، وہ رو پڑی تھی۔

سب سمجھانے لگے ایک دن کا لباس... بلکہ ایک دن بھی کیا چند گھنٹے زیب تن رہے گا کون اتنی فضول ضد کرتا ہے سب کے اپنے الفاظ تھے۔

میں کرتی ہوں اتنی فضول ضد... میری شادی اور میں ہی خوش نہیں..." وہ ضدی نہیں تھی مگر اڑ گئی تھی۔

لیے اتنے آنسو۔ تم دیکھو اب میں کرتا کیا ہوں۔"

وہ بہن کی سوجی آنکھیں دیکھ دل کھول کے ہنس دیا۔ وہ بچوں کی طرح لہنگے پر اڑی تھی۔ باقی شادی اس کی بلا سے۔

وہ اسے لاہور لے گیا۔ عائزہ آپا ہمراہ تھیں۔ شام ڈھلے جب لوٹے تو عارفہ کا چہرہ کھلا کھلا تھا۔ روپ رنگ سرخ سرخ۔

"ارے تو پیچھے اور بھی بیٹھی ہیں، وہ پھر لاکھ کا مانگ لیں گی۔" توبہ قیامت کی نشانی لال جوڑا شگن کا۔ قیمت موئی سوا لاکھ۔

"تو ان کو بھی دوں گا۔ اس میں کیا اچنبھا۔"

"دوبارہ جانے کی باتیں ہیں ناں ساری..." امی نے پکڑ لیا۔

"امی جانا تو ہے؟" وہ سادگی سے بولا۔

"اب کس لیے! اسٹور میں مال ڈلوا لیا نئی لک بھی

دے دی۔ ہو رہی ہے عارفہ کی شادی، یہی کہا تھا ناں تم نے۔۔۔" وہ کچھ نہیں بھولی تھیں۔

"میں خود جانا نہیں چاہتا لیکن آپ بتائیں کیا میرا فیصلہ غلط تھا۔ آج بہن کی فرمائش پوری کر کے میں کتنا خوش ہوں کیا آپ اندازہ نہیں کر پا رہی ہیں۔ یہی بہن دوسرے حالات میں یا تو خواہش کا گلا گھونٹ کر بیٹھ جاتی کڑھتی سڑتی یا پھر کہہ دیتی تو میں ہی کونوں کھدروں میں منہ چھپاتا پھرتا۔"

"تو پھر میری بھی ایک شرط ہے۔"

"کیا آپ بھی میرے ساتھ جائیں گی۔ جیسے بچپن میں اسکول کے باہر گراؤنڈ میں بیٹھ جاتی تھیں۔" اسے مزا آیا۔

"نہیں۔۔۔ میں نہیں، تجھے شادی کر کے جانا ہوگا۔"

"جی ی ی ی۔۔۔" وہ اچھل ہی پڑا "امی مذاق کر رہی ہیں؟" اس نے ان کا چہرہ بغور دیکھا مگر وہاں تو گہری سنجیدگی اور قطعیت تھی۔

☼ ☼ ☼

"میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ میں تمہیں ایسے بیاہوں گا؟"

اس کے بیڈ روم میں وہی پرانا فرنیچر تھا۔ صرف نئی گولڈن و میرون بیڈ شیٹ ڈال کر نیا لک دیا گیا۔ سیج سجانے کا وقت نہیں تھا۔ کل اس کے ولیمہ میں عارفہ کی رخصتی ہوئی تھی۔ وہ اپنے کمرے کی آرائش کرتا جبکہ ادھر سو کام تھے۔

گلدانوں میں تازہ گلابوں کی لمبی لمبی ڈنڈیاں مہک رہی تھیں۔

یہ گلاب بھی اللہ جانے کس کی مہربانی سے یہاں پہنچے تھے۔

کمرے میں بظاہر عروسی کمرے والی کوئی بات نہیں تھی۔ مگر وہ شب زفاف تھی اور مہک رہی تھی۔

جیسے بعض دفعہ بن پیئے بہک رہے ہوتے ہیں۔

ابھی پندرہ روز پہلے ہی تو جب وہ عارفہ کو لہنگا دلوانے لے گیا تب ایک میرون لہنگے کو دیکھ کر اسے فائزہ کا خیال آیا۔

(وہ فائزہ سے کہے گا وہ میرون رنگ کا لباس ہی پہنے جب وہ دلہن بنے)

لیکن فائزہ اس وقت سبز چوڑی دار پاجامہ پر بہت کلیوں والا ڈھیلا کرتا پہنے ہوئے تھی۔ چنا ہوا دوپٹہ شام کو اس نے گلے میں ڈال رکھا تھا اب کھینچ تان کر سینے کی طرف سے پھیلانے کی کوشش کی گئی تھی ایک پلو سر پر لگا تھا اس کے کانوں میں موتیا کے بڑے بڑے بالے تھے اور ہاتھوں کی پوروں پر لگی مہندی ہنوز تھی اسے دھونے کا موقع نہیں ملا، مہندی اب سوکھ کر جم رہی تھی۔ وہ مسلسل پوریں رگڑ رہی تھی۔

یہ سارا سنگھار عارفہ کی مہندی کے لیے تھا۔ جب

ان دونوں کو پکڑ دھکڑ کر نکاح کی رسم ادا کر دی گئی۔ وہ بھونچکا رہ گیا۔ کچھ بولنا چاہا مگر یہاں سن کون رہا تھا۔ بڑوں کی آنکھوں میں نادیب تھی 'خاموش رہو سیدھے سیدھے ہاں کہنی ہے۔ تائی کی آنکھیں لبریز تھیں اور امی کی آنکھوں میں خوشی اتنی خوشی اس نے اتنی روشن آنکھیں کبھی نہیں دیکھی تھیں۔

اس کے حق دق چہرے پر بھی ہنسی نمودار ہو گئی۔

لیکن اب۔۔۔ کمرے میں آنے کے بعد ایک عجیب سا احساس شرمندگی اسے عرق عرق کرنے لگا۔ اس نے عارفہ کو اپنے پسندیدہ عروسی لباس، زیور، جوتے کے لیے مچل مچل کر روتے دیکھا تھا، وہ کسی کمپرومائز پر تیار نہیں تھی۔ تو کیا فائزہ لڑکی نہیں۔ اس کے بھی تو کچھ ارمان ہوں گے۔ اسے بھی تو ہزاروں کا لہنگا اور۔۔۔۔

یہ تو فائزہ کے ساتھ زیادتی ہو گئی۔

ایک دم شدید شرمندگی اور احساس جرم سا۔ بہت سے ڈائیلاگ سوچ رکھے تھے۔ مگر جب منہ کھولا تو۔۔۔

"کبھی سوچا نہیں تھا کہ میں تمہیں اس طرح بیاہوں گا؟"

وہ دیوار میں لگے آئینے میں اس کے چہرے کی کشمکش کو حرف بہ حرف پڑھ رہی تھی۔ چہرے پڑھنے کا یہ ہنر تو شاید پنگھوڑے میں ہی سیکھ لیا تھا۔ جب ہی تو کچھ بھی کہے سنے بنا محبت ہو گئی تھی۔

ایسے ہی اصدق کو اس احساس ندامت سے نکالنا تھا وہ تسلی دیتی یا ـــ "تو کیا آپ نے یہ سوچا تھا کہ بیاہوں گا نہیں اسے بھگاؤں گا ـــ ہیں؟" وہ اس کے رخ موڑنے پر چونکا تھا اور لب کھلنے پر ہمہ تن گوش ـــ مگر۔

"ہائیں!" اس نے اس کی صورت دیکھی۔ دونوں کی نظریں چار ہوئیں اور کمرے میں قل قل کرتی ہنسی گونجنے لگی وہ بیڈ پر آگیا اس کی طرح پیر لٹکا کر بیٹھ گیا۔

"سات جنموں پر یقین نہیں۔ لیکن اگر یونہی خوا مخواہ سوچا جائے تو یقیناً" میں نے کوئی بڑا نیک عمل کیا جو مجھے تم ـــ رکاوٹ تو کوئی نہیں تھی۔ مگر اتنی آسانی سے مل جاؤ گی یقین نہیں آیا۔"

"نیکی کرنے کے لیے ایک ہی جنم ملتا ہے اصدق ـــ اسی کو صحیح طرح سے گزار لیں تو سو جنموں کا ثواب مل جائے ـــ اور آپ نیک عمل کرتے ہی آئے ہیں۔ آپ برا کر ہی نہیں سکتے۔" وہ اس پر یقین کرتی تھی۔

"تمہیں ملال نہیں ہو رہا۔" وہ ہچکچاہٹ کا شکار تھا

"کس بات کا ملال ـــ؟" وہ حیران تھی۔

"کہ اس طرح ـــ اس لباس میں' میرا مطلب ہے تمہیں عارفہ کی طرح کے شوق نہیں۔"

"مجھے جس چیز کا شوق تھا وہ مجھے مل چکی ہے۔" فائزہ نے اپنا سر دھیرے سے اس کے شانے پر ٹکایا۔ وہ مسحور ہو گیا اپنا بازو اس کے کندھے پر پھیلا دیا۔

"میری امی کتنی اچھی ہیں ناں؟" اصدق بولا تھا۔

"ہاں!" وہ ہنس دی "بہت زیادہ۔"

☼ ☼ ☼

پہلی بار وہ دبئی ایئرپورٹ پر اترا تھا تو عارفہ کا چہرہ اور اسٹور کی بحالی کا خیال سب خیالوں پر حاوی تھا اور اس بار فائزہ کی سونی کلائیاں احساس شرمندگی سے دوچار کرتی تھیں۔ کسی بھی قسم کے لوازمات کے بنا دمکتا اس کا سنہرا روپ سونے چاندی "کا محتاج نہیں تھا مگر عارفہ اور فائزہ کے چہرہ آپس میں گڈمڈ ہوتے۔ سولہ سنگھار کیے عارفہ اور ادھر فائزہ ناک میں لونگ کانوں میں وہی سادہ گول بالیاں جو اس کے وجود کا ہی حصہ معلوم ہوتی تھیں۔

عتیقہ بیگم نے اپنے کانوں کی جھمکیاں اتار کر اس کے کانوں میں ڈال دیں تھیں مگر فائزہ کو خود ہی بے چینی نے گھیر لیا۔

"بچپن سے آپ کو ان ہی جھمکیوں میں دیکھنے کی عادت ہے "ان کے بغیر آپ کا چہرہ کس قدر ویران لگ رہا ہے۔ توبہ توبہ!" اس نے جھمکیاں انہیں پہنا کر ہی دم لیا۔ اصدق کی جیب خالی تھی مگر اس نے جانے سے پہلے ایک نازک سی انگوٹھی اس کی انگلی میں محبت سے پہنا دی۔

اندر کی ایک بات یہ بھی تھی کہ وہ دیکھنا چاہتا تھا۔ سونے کا سنہرا پن زیادہ جگ مگ کرتا یا اس کے وجود کی شعاعیں آنکھیں خیرہ کرتی تھیں۔ گندم کی پکی ہوئی بالی جیسی رنگت' معمولی لمبی چوٹی اور معصوم بے ریا چہرہ۔

اس بار اس کی ملازمت زیادہ اچھی تھی۔ وہ سوچنے لگا فائزہ کو بلا لے اپنے پاس مگر دبئی جیسے شہر میں ہمراہ فیملی رہنا بے حد مشکل تھا اگر آپ ایک خاص حد تک آمدنی نہیں رکھتے اور اسے تو ابھی گھر بھی پیسے بھیجنے تھے۔ گھر میں بہت سے کام ابھی باقی تھے بلکہ شروع بھی نہ ہوئے تھے۔

وہ پاکستان سے لوٹ کر ایک بار پھر خالی ہاتھ تھا' نئے سرے سے آغاز ـــ لیکن اسے لگتا کہ اس کے ریال اونٹ کے منہ زیرے کے مترادف ہو گئے ہیں۔

کیونکہ گھر والے بہت ڈیمانڈنگ ہو گئے تھے۔ پتا نہیں کون کون سی ضرورتیں اور وہ بھی از حد ضروری۔

اس بار وہ دو سال کے معاہدے پر آیا تھا۔ بیچ میں اسے اللہ نے دو بیٹے جڑواں بھی عطا کر دیے۔ وہ انہیں دیکھنے چھونے کو مچل گیا۔ مگر ـــ

دو سال بعد دو ماہ کی چھٹی پر جا آ۔ تو کمپنی کرایہ دیتی اور ایک تنخواہ بھی ـــ اور اگر درمیان میں چل دیتا تو کرایہ خود سے اور دوسرے خرچے اپنی جانب سے' یہ اتنا مہنگا سودا نہیں تھا مگر بابا اور تایا نے گھر کے اوپری پورشن کی تعمیر شروع کروا رکھی تھی۔

یہ ایک ضروری کام تھا۔ مگر اسے آرام سے بھی کیا جا سکتا تھا۔

"آپ آئیں گے تو تسلی سے سمجھاؤں گی کہ مسئلہ کیا ہے۔"

"ایک پورشن اور اتنے پیسے لگ رہے ہیں' وہ حیران تھا۔

"دونوں گھروں میں ایک ساتھ کام شروع ہوا ہے ناں۔" فائزہ کچھ شرمندہ تھی۔

"کون سے دو گھر ـــ؟" وہ چوکنا ہوا " ہمارا ایک ہی گھر ہے' جس میں عبدالقیوم اور عبدالجبار مل کر رہتے ہیں۔ دونوں گھر دوبارہ نہ کہنا جو یہاں ہو گا وہی وہاں ہو گا۔" اس نے یاددہانی کروا دی۔ " تایا ابا نے بیٹی کا گھر سمجھتے ہوئے دیوار اٹھوا دی ہے وہ ان کی سوچ مگر دل میں دیوار نہیں اٹھنا چاہیے۔ میں اس گھر کا اکلوتا بیٹا ہوں یار۔"

اس کے دل میں کوئی ملال نہیں تھا۔ لیکن جب وہ لوٹا تو نجانے کیوں دکھ کی ایک لہر اس کے دل و دماغ کے گرد گھیرا کسنے لگی۔ اور ہر بار یہ پکڑ سخت سے سخت ہوتی رہی۔

قیمتی پتھر' ٹائلز' کھڑکیاں' دروازے اور اندر بھرا ہوا فرنیچر۔ قیمتی ساز و سامان وہ دبئی سے کیا امپورٹڈ آئٹم لاتا۔

ریالوں کی بدولت گھر والوں کے لیے مسلم آباد ہی دبئی بن چکا تھا۔ وہ خوشحالی کی یہ لہر دیکھ کر خوش ہونے کے باوجود اندر کہیں افسردہ تھا۔

"تم تو خالی پورشنز کہہ رہی تھیں۔ یہاں تو جون ہی بدل گئی۔ ایسی بھی کیا ضرورت تھی۔"

فائزہ کے پاس جواب تھا مگر وہ دینے سے ہچکچاتی رہی۔ عتیقہ بیگم نے عذر بیان کیا۔

رائحہ' زائرہ کے رشتے کرنے ہیں' عارفہ ان سے چھوٹی ہے اور ایک بچی کی ماں بھی بن گئی۔

لوگ اب شرافت نجابت بعد میں دیکھتے ہیں۔ پہلے گھر گھاٹ کا حلیہ۔"

وہ تفصیل سن کر قائل ہو گیا' سر اثبات میں ہلانے لگا۔

"تو پھر بنی کوئی امید رشتے وغیرہ کی۔"

"حق ہا ـــ ابھی تو نہیں لیکن تم فکر نہ کرو' اللہ بہتر کرے گا بس تم یاد رکھنا بہنوں کو کتنی شان سے خدا حافظ کہنا ہوتا ہے۔"

"امی!" وہ خفا ہوا " یہ کوئی کہنے کی بات ہے۔"

فائق اور شائق کی پیاری صورتیں اس بار اکیلے جانا اسے بہت مشکل لگ رہا تھا۔

اگر میں تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں تو ـــ؟"

فائزہ کی آنکھیں چمکیں پھر بجھ گئیں۔

"کیا ہوا!" وہ اس کے چہرے پر ہی نگاہیں ٹکائے ہوئے تھا۔

گھر والے کبھی نہیں مانیں گے۔"

"یار! میری بیوی ہو' بچے ہیں میں ان کے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

"ہاں! ہیں بیوی بچے آپ کے ـــ مگر گھر والے ان میں آپ کی شبیہ کھوجتے ہیں" آپ کی کمی کو سہارا دیتے ہیں۔ ایسا تو خیال بھی ظاہر نہ کیجئے گا۔ ہنگامہ مچ جائے گا۔"

"نہیں۔" امی نے چیخ مار کے بچوں کو خود میں سمویا تھا۔ "یہی تو میرا جینے کا سہارا ہیں۔ تیرے بغیر رہ لیا اصدق ان کے بغیر تو میرا اگلا سانس بھی ختم۔"

اور سب کی ایسی ہی رائے تھی۔

"اچھا چار چھ ماہ کے لیے ـــ یونہی سیر و تفریح کے لیے لے جاؤں تو ـــ؟"

"ابھی تو کہہ رہے تھے ہاتھ تنگ ہے۔ تمہیں تو کمپنی ٹکٹ دے رہی ہے۔ ان کا کیا ہو گا۔" تائی آپا

بھی اعتراض کرنے والوں میں تھیں۔
"ابھی فوراً" ساتھ نہیں لے جاؤں گا۔ وہاں جا کر بلوالوں گا۔ امی میرا برا حال ہو جائے گا۔" وہ التجائیہ انداز میں بولا۔
سب ہی نے خاموشی اختیار کی۔ "اچھا جب بھیجے گا تب کی تب دیکھی جائے گی۔" اور اس بار وہ ڈھائی ماہ بچوں اور فائزہ کے ساتھ رہنے کے بعد وہ ان دونوں کے لیے زیادہ بے چین ہوا۔ بے قرار، بے کل۔
اور اس نے بڑے حساب کتاب کے بعد چھ ماہ بعد ٹکٹس بھیج ہی دیے۔ سب حیران رہ گئے اور فائزہ بھی مگر وہ خوشی خوشی تیاری کرنے لگی۔
وہ اکثر حیرت سے سوچتی تھی، وہ کتنی آسانی سے ایک دوسرے کے بنا دیے گئے تھے۔
وہ اب دکھ سے کرلائی کہ اتنی بڑی جدائی دونوں کے درمیان پھن پھیلائے بیٹھی تھی۔
"میں نے رہائش وغیرہ کا بندوبست کیا ہے اور فیملی کے ساتھ خرچا بہت زیادہ ہوتا ہے، آپ لوگ اسٹور کی آمدنی کو استعمال کریں ہمیں اتنے پیسے نہیں بھیج پاؤں گا۔" اس نے اپنے باپ سے کہا تھا۔
تم پریشان نہ ہو بیٹے۔۔۔ ہماری فکر نہ کرو۔ تم بیوی بچوں کا خیال رکھو اور انہیں خوب گھماؤ پھراؤ۔"
عبدالقیوم نے محبت سے تاکید کی تھی۔
(مگر دوسری جانب۔۔۔)

☼ ☼ ☼

ان کا آفاقی رشتہ فاصلے کے باعث اتفاقی سا لگتا تھا جب اس طرح پہلی بار وہ اتنے سکون سے اکٹھے تھے۔ تو اس رشتے کی تمام تر خوب صورتی نکھر کے سامنے آ گئی۔
"میں اب تمہیں جانے نہیں دوں گا۔" وہ فیصلہ سناتا۔
"میں جاؤں گی بھی نہیں۔" ارادہ اس کا بھی یہی تھا مگر وہ منہ سے نہ بولتی۔ مرد اظہار کے معاملے میں بے باک ہوتا ہے اور یہ بے باکی اس پر بجتی بھی ہے۔
عورت کی خاموشی میں سارے راز پنہاں ہوتے ہیں۔ وہ مبہم مسکراتی ہے اور بجتی ہے۔
اور اصدق اثبات بھری اس مسکراہٹ پر نثار ہو ہو جاتا۔
لیکن!
پاکستان سے آئی اطلاع امی پوتوں کے غم میں شدید بیمار پڑی تھیں اور سب کو منع کر رکھا تھا۔ اصدق تک خبر نہ دی جائے مگر جب حالت زیادہ غیر ہوئی تو۔
اور دوسری جانب حسنہ بیگم شائق کو یاد کر کے روتی تھیں۔ ان کی بپتا سب سے نرالی۔
"جب اس طریقے سے لے لینا تھا تو دیا ہی کیوں تھا لے کے چلے گئے میرا بچہ۔" "کسی کو جو ایک بار بھی میرا خیال آیا ہو؟"
کہانی یہ تھی کہ فائزہ کی نو عمری اور ناتجربہ کاری۔۔۔ اس پر جڑواں بچے۔۔۔ اسے کچھ سمجھ میں نہ آتا اور وہ ہلکان رہتی۔
دادی، نانی، بچے بخوشی سنبھالتیں۔
"یہ نواسا نہیں ہے، یہ تو میرا بیٹا ہے۔" حسنہ بیگم شائق سے لاڈ کرتیں۔
"امی! آپ لے لیں۔ آپ کا بیٹا ہی ہوا۔" فائزہ نے ایک دن اس کا چھوٹا سا بیگ بنا کر امی کے حوالے کر دیا۔
"کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔ وہی گھر وہی لوگ، وہی لاڈ۔۔۔ مگر حسنہ بیگم کا دل بڑا ہو گیا۔
مگر اب حسنہ بیگم کا کیا جانے والا شکوہ۔
"تم لوگوں کو سوچنا چاہیے تھا ناں۔ امی کتنی تکلیف سہ رہی ہیں۔ کھانا پینا چھوٹ گیا۔ ہر وقت "ہائے فائزہ سے یہ امید نہ تھی" کی گردان کرتی ہیں۔
عتیقہ خالہ تو سب کے سامنے رو لیتی ہیں۔ امی تو بس چھپ چھپ کر آنسو پونچھتی ہیں۔ سچ ہے اولاد اپنی ہی ہوتی ہے۔" عائزہ اور ناعمہ نے فون پر۔ فائزہ کو سنائیں۔
اصدق نے بھی حرف بہ حرف سنا۔

وہ دونوں خوش تھے، ایک دوسرے میں مگن اور بے پروا حال۔۔۔
نہ اصدق نے کہا کہ تم واپس جاؤ۔
نہ وہ بولی کہ مجھے جانا ہے۔
بس خاموشی سے بجٹ بند ہونے لگے۔
"گھر میں جو کچھ ہو رہا ہے۔ تعمیر آرائش ساز و سامان سب ضروری ہی تھا۔ مگر اتنا بھی نہیں، ہم بعد میں آرام سے کر لیتے۔"
فائزہ دبئی کی آخری رات میں اس سے کہہ رہی تھی۔
"مگر آپ گھر پیسے بھیجنے کے بجائے خود سے بھی جمع کریں۔ ہم وہاں جمع کر بھی لیں تو خرچے نکل آتے ہیں۔ میں جانتی تھی کہ میں یہاں آپ کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ آپ بس اتنا اکٹھا کر لیں، دو چار سالوں میں وہاں کوئی اچھا کاروبار شروع کر لیں۔ نصیب میں ہو گا تو رزق وہاں سے بھی ملے گا۔"
فائزہ زیادہ کچھ نہ بولی۔ مگر اسے اشارہ دے گئی۔ راہ بتا گئی۔

☼ ☼ ☼

فائزہ کی بات میں دم تھا۔ اسے یہاں رہتے ہوئے دوستوں کے حالات معلوم ہوتے ہی رہتے تھے۔ خاص طور پر ظفر کے تجزیے، تبصرے جن سے مستند کوئی اور شے نہیں۔
"او دو چوڑیاں بیچ کے بندے کو دبئی بھیج دیتی ہیں اور پھر ساری زندگی اس کا احسان جتاتی ہیں۔ کھانا تک سونے کی پلیٹ میں کھاتی ہیں۔ پچھلے سمجھتے ہیں ریال ادھر بانٹے جا رہے ہوتے ہیں۔ او کوئی ہزار میں سے ایک قسمت والا ہو گا جس کی کمائی سنبھل جاتی ہو ورنہ اڑا دیتے ہیں سب کچھ۔۔۔
عقل مند وہی ہے جو نک میں نکیل ڈال کر رکھے۔ اتنے ہی دے جتنی ضرورت ہے اور سارا سال یہ پیغام بھیجے کہ نوکری کا کچھ پتا نہیں کب جواب ہو جائے۔"
اور وہ اپنے گھر والوں سے اتنا بدگمان تو ہرگز نہیں تھا مگر۔۔۔
مگر اس نے ہاتھ روکا اور خود سے جمع کرنا شروع کیا اسے جلد از جلد پاکستان واپس جانا تھا۔ یہی کوئی چار پانچ سال کے اندر۔
اس نے سب طے کر لیا تھا۔ لیکن تب ہی دو مصیبتیں ایک ساتھ وارد ہوئیں۔
عتیقہ بیگم جو گھٹنے کے درد میں مبتلا رہتی تھیں۔ شدید ترین تکلیف کے زیر اثر آ گئیں۔ گھٹنے سے نیچے ان کی دونوں ٹانگیں جیسے بس کھال کے سہارے لٹکی رہ گئیں۔ شلوار میں جھولتی بے دم ٹانگیں۔ تکلیف کی انتہا۔
تشخیص سے پتا چلا۔ ہڈیوں کا سفوف بن گیا ہے اور گردے کی رطوبت کے ساتھ مکس ہو کر ستون بن گئے۔ واحد حل آپریشن۔
یہ مہنگا اور نو گھنٹے طویل آپریشن کامیاب رہا۔ ایک اذیت بے تحاشا اور خرچہ۔
1لاکھ سے پندرہ لاکھ تک کی گنتی۔
تین ماہ بعد لگنے والا ٹیکا Bone Viva جو دس ہزار کو چھو لیتا تھا اور مسلم آباد سے کراچی تک کا سفر ہوٹل کے اخراجات۔
"کوئی بات نہیں۔" وہ اللہ کا شکر گزار تھا کہ اسے اتنے وسائل دیے کہ اس نے اپنی ماں کو تکلیف سے بچا لیا۔ لیکن۔
فائزہ ایک بار پھر اس کے بے حد اصرار پر تین ماہ اس کے ساتھ رہ گئی تھی۔ پھر ماں کے آپریشن کے سلسلے میں وہ چھ ماہ کی رخصت پر آیا اور یہیں سے اس کی اذیت کا آغاز ہوا۔ وہ فائزہ کا عادی ہو چکا تھا۔ نہ گناہ نہ شرم نہ جھجک۔ ایک فطری ناتا مگر۔ وہ واپس لوٹا تو جیسے کچھ کھو آیا۔
خاموش، یا پھر چڑچڑا اپنے خول میں سمٹتا اپنی بیماری کا علاج وہ کس جگہ سے کروائے۔
اس کا جمع جتھا پھر ہوا برد ہو چکا تھا۔ نئے سرے سے

آغاز۔۔۔ وہ شدید ترین نفسیاتی دباؤ سے گزر رہا تھا۔ اس کی ساری پلاننگ دھری کی دھری رہ گئی تھی۔ جیسے کوئی کنارے پر آکر ڈوب جائے دکھ ڈوبنے کا نہیں کنارے کا ہوتا ہے۔

پھر دوبارہ ایک سے گنتی۔

اور اس کے طے کیے بہت سے کام ابھی باقی تھے۔

آصفہ نے ڈاکٹری کی پڑھائی کرنی تھی۔ وہ بہت قابل اور محنتی تھی۔

اور رائحہ زائرہ ہنوز کنواری تھیں۔

اور عائزہ خلع لے کر دوبارہ اسی گھر کے اندر۔۔۔ وہ ملازمت کرتی تھی (مگر اسی گھر میں رہتی تھی جو اس کے زیر کفالت تھا)

وہ سوچتا' وہ دوبارہ پر عزم ہو کر سب کچھ کرنے کو تیار ہے مگر یہ فائزہ کی غیر موجودگی؟ پہلے وہ آکر رہتی نہیں تھی اور اب آج کی مہنگائی میں اسے بچوں کے ہمراہ رکھنا اس کے لیے مشکل تھا۔

وہ ضبط نفس سے کام لے رہا تھا۔ وہ نمازیں پڑھتا روزے رکھتا خود کو خرابات سے بچاتا۔ مگر مرگی کے دورے جیسی بیماری۔۔۔

جس کا حل اس کے پاس نہیں تھا۔

انہی دنوں حسنہ بیگم کو بھی وہی بیماری ہو گئی جو عتیقہ بیگم کو ہوئی تھی۔ اس رات شدید دباؤ کے عالم میں اس کے ہاتھ پیر مڑ گئے۔ منہ سے جھاگ نکلنے لگا۔ دماغی پریشانی۔ جسمانی طلب۔ آہ۔

☼ ☼ ☼

چندرا سیاہ رنگ کے عبایا میں ملبوس تھی۔ نقاب چہرے کے گرد کسا تھا۔ حجاب کے کنارے پر لگی باریک نگوں والی بیل کے ہیرے کے جیسے نگ زیادہ چمک رہے تھے۔ یا اس کی آنکھوں کی چمک آنکھوں کو خیرہ کرتی تھی۔ فیصلہ بہت مشکل۔۔۔

اور وہ بھی اسے دیکھ کے اتنا حیران ہوا کہ گھونٹ گھونٹ جوس حلق سے اتار رہا تھا اچھو لگا۔

پیپسی کی بوتل سیاہ لفافے میں ملفوف تھی۔ وہ ایسا لباس بھی زیب تن کر سکتی ہے اور اور۔۔۔ اتنا بچ سکتی ہے اور اتنی پاکیزہ لگ سکتی ہے۔ ان چھوٹی متبرک کی۔

جب اس سے ملتا تھا تو مشکی شانوں' سیاہ صراحی دار گردن اور گردن کی گہرائیوں سے نگاہیں چراتا تھا۔ سارا وقت اسی کشمکش میں گزر جاتا تھا۔ وہ جانتا تھا وہ خوش رو ہے ہمکنار نین اور دھار ریتی پر رگڑی ہوئی۔

مگر سیاہ لبادے میں دمکتا اس کا چہرہ۔۔۔ وہ سحر زدہ سا تکے گیا۔

اور وہ بھی اس کا ارتکاز بھانپ گئی اور۔۔۔ اور اس کے چہرے پر ایک شرمگیں مسکراہٹ دوڑ گئی۔

(طوائف اور شرمیلی مسکان)

(طوائف ایک دھوکا۔۔۔ تو کیا مسکان بھی جھوٹی)

"تم یہ سب کیوں کرتی ہو چندرا۔۔۔؟" یہ پہلا موقع تھا۔ جب مخاطب کرنے میں اس نے پہل کی۔

"کیا سب؟"

"یہ۔۔۔ یہ تمہارا پیسہ۔۔۔"

"میرے پیسے کو برا نہ کہنا صاحب۔" وہ فلمی انداز میں گڑگڑائی تھی۔

"اسی کے سبب سے تو تم مجھے ملے۔۔۔ آتا تھا کبھی کبھی یہ خیال کہ یہ ہی کیوں دنیا میں کرنے کے سو کام۔ اوپر والا کہیں بھی ڈال دیتا۔ مگر اب کوئی شکوہ نہیں کوئی گلا نہیں۔" اس نے عالم جذب میں آنکھیں موندیں۔ "تم اسی کے ذریعے تو ملے ناں۔۔۔"

وہ نگاہیں چرا گیا۔ شیشے سے دور سمندر کی لہریں دیکھنے لگا۔

"یہ حرام کاری ہے۔۔۔ گناہ۔۔۔ جسم کی کمائی۔"

وہ اب تک ہوا میں اڑ رہی تھی۔ جیسے کسی نے پر کتر دیے وہ دھڑام سے نیچے۔ ناک پر' ماتھے پر' ٹھوڑی پر اور سب سے زیادہ چوٹ سینے پر لگی۔ جس کے اندر نازک دل تھا۔

کیا وہ اسے راہ راست پر لانے کے لیے تبلیغ کرے

گا۔ کیا اس نے اس لیے اسے بلایا۔ کہیں باہر دور۔

وہ کیا کیا نہ سوچ کر آئی تھی اور اتنا بڑا طعنہ۔۔۔ سچا طعنہ تھا۔ گڑ گیا سینے میں' وہ تکلیف کی شدت سے دہری ہو گئی۔

"تو یہاں کون ہے جو حرام کی کمائی نہیں کرتا صاحب! سیدھے راستے سے الٹا کام اور الٹے راستے سے سیدھی لکیر۔۔۔ ہوتا ہے کبھی ایسا۔ فہرست لگائی جائے تو طوائف سب سے اوپر۔۔۔ اس کے ہاتھ کس نے پکڑے ہوتے ہیں۔ شریفوں کے ہاتھ کا سہارا پا کر ہی طوائف فہرست میں نمبروں کی جگہ پاتی ہے۔ بنا سہارے کے کبھی عورت اوپر پہنچی ہے۔ پیروں میں رلتی عورت اور جسم کی کمائی۔" اس کی زبان لڑکھڑا رہی تھی اور ضبط گریہ سے آنسو حلق کے اندر ایسے جوش کھا رہے تھے جیسے۔۔۔ تیزاب کے بلبلے۔۔۔

"خریدار ہوتا ہے تو گاہکی بڑھتی ہے۔" وہ مسلسل رو رہی تھی۔ "دکان چوک پر لگائی جاتی ہے۔ ویرانے میں نہیں۔۔۔ نہ شمشان گھاٹ میں۔۔۔"

وہ سراسیمہ سا ان جملوں کو سن رہا تھا۔ خاک جو پلے پڑا ہو۔

"لاحول واللہ۔۔۔ استغفر اللہ۔۔۔ کس بات کو کس بات سے ملا دیا۔ تمہیں حرام حلال کے باریک فرق کا پتا نہیں۔۔۔ کس قدر فضول گوئی بلکہ گناہ۔۔۔ یا اللہ!" اس کی سمجھ نہ آیا وہ کیا کہہ رہا ہے یا کہنا چاہیے۔

"دنیا کا دستور ہے۔ سب اپنے اعمال کے لیے جواز گھڑتے ہیں اور یہ ہمارا جواز ہے۔ ضمیر ہمارے اندر بھی ہے۔ نشے کی پڑیا دے کر سلاتے ہیں مگر جب کبھی ذرا سی انگڑائی لے' بیداری کی کوشش کرے۔ تو ہمیں بس اسے بہلانا پڑتا ہے۔

اوپر والے کا خوف ہمارے اندر بھی ہے۔ زیادہ ڈر گئے تو ہم بھی دوسروں پر الزام دھر دیتے ہیں کہ ہم ایسے ہیں تو اگلے کون سے دودھ کے دھلے۔"

اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر جھٹکے سے اسٹول کھینچ کر دور پھینک دیا۔ ریشمی لچھے دائیں بائیں بکھر گئے۔

وہ بچوں کی طرح آنکھیں رگڑتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"چندرا!" اس نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ اور

یہ پہلی بار تھا کہ اس نے اسے چھوا تھا۔

☼ ☼ ☼

ادائیں دکھاتی' بے نیازی برتتی فضول گو' بے باک عورت' ہر جسارت میں پہل' اور روتی عورت' کتنی معصوم لگی تھی بے بس' بے چین' مجبور۔۔۔

پورا وجود گناہ کی دعوت کا اشتہار۔

مگر روح اتنی گھائل۔۔۔ جو قائل کرنا جانتی تھی اور مائل بھی۔۔۔ اور یہی ہوا تھا۔

دونوں کے درمیان ایک رشتہ استوار ہو گیا تھا۔

دوستی' نہیں

ہم مزاجی "قطعا" نہیں۔

جائز' سوال ہی پیدا ہوتا

تکمیل' لاحول۔۔۔

تو کیا تھا اس رشتے میں۔۔۔؟

کھچاؤ' ترغیب' کشمکش۔

وہ پتا نہیں اس کے پاس کیا کرنے آتا تھا کیا چاہتا تھا۔ نہیں جانتا تھا لیکن وہ واضح تھی۔

وہ اس سے وہی چاہتی تھی۔ جس کی دکان سجا کر بیٹھی ہے وہ اسی چیز کی خریداری نہیں کرتا' اسے دیکھتا بھی نہیں چھوتا بھی یوں جیسے غیر ارادی طور پر ہاتھ لگ جائے اور پھر چونک جاتا۔

آگ بھڑکا کر تماشا دیکھنے والا سنگدل۔۔۔

وہ اس سے نفرت نہیں کرتا تھا۔ لیکن محبت بھی نہیں اور وہ اس سے محبت کرنے لگی تھی۔

اور طوائف کی محبت۔۔۔ انتہا چاہتی ہے۔ تکمیل۔۔۔ آخری حد۔

طوائف ہی کیوں ہر عورت ہی۔۔۔

وہ جانتی تھی' وہ اسے معاشرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنا نہیں سکتا۔

لیکن اس ۔۔۔ اکیلے کمرے میں ۔۔۔ کیا امر مانع ہے۔

وہ قریب ہونے کی کوشش کرتی تو وہ کرنٹ کھا کر جھٹک دیتا تھا۔ مگر پھر ایسا وقت بھی آیا کہ وہ ساکت مجسمہ بن جاتا۔

اتنا بے جان کہ ۔۔۔ سرد' بے تاثر۔

اور وہ بھی ایسی ہی ایک رات تھی۔ سارا دیش جل تھل تھا۔ پانی پانی اور پانی بادلوں کی گھن گرج ۔۔۔ کڑکتی بجلیاں' ہوائیں جو اپنی زد میں ہر کمزور کو اڑائے دے رہی تھیں۔

اور چندرا بہت کمزور عورت۔

وہ کشمکش کی رات تھی۔ وہ اسے رجھانے کے سارے اوزار تیز کیے ہوئے تھی۔ وہ ہر بار اسے ٹھکرا جاتا تھا۔ وہ جو اس کے بارے میں کچھ نہ جانتی تھی کہ وہ کون تھا۔ کہاں سے آیا تھا۔ کیا چاہتا تھا۔

شمعوں کی روشنی' پھولوں کی خوشبو' آسمان سے برستا پانی کھڑکی کے شیشے جگمگا جاتے' آسمانی بجلی کے جھٹکے پر۔

آج وہ ۔۔۔ اس کے ارادے پختہ اور منہ زور تھے۔

طوائف ہو کر ناکام ۔۔۔ اب جیسے یہ خود اس کے لیے طعنہ تھا۔

طوفانی بارش سب کچھ بہالے جانے کا ارادہ رکھتی تھی۔ گندگی بھی اور صفائی بھی' برائی بھی اور اچھائی بھی تو کیا آج وہ بھی ۔۔۔ چندرا کے ارادوں کے آگے وہ شاید بادل کی گرج سے ڈر کر اس سے لپٹی تھی۔ وہ کانپ رہی تھی۔

ایک غیر ارادی عمل ۔۔۔ اس نے اسے سمیٹ لیا۔

وہ آج شکست نہ کھائے گی۔

بس کچھ پل ہی جاتے تھے۔

بجلی کڑکی' روشنی کا جھماکا۔ اور اس شخص نے خود کو بے خودی کے عالم میں پایا تھا۔ ہوش میں آگیا۔

اس نے ایک ہاتھ سے اسے بالوں سے پکڑ کر خود سے دور کیا اور دوسرے ہاتھ سے زوردار طمانچہ ۔۔۔

اس کے گال پر مشکی گھوڑے جیسی جلد ۔۔۔ جسے بس سہلانے کا دل کرتا ہے۔

وہ لڑکھڑا کر گری تو ۔۔۔ تپائی کا کونا ماتھے پر نہیں پیشانی پر لگا۔ اس نے ایک ہاتھ گال پر اور دوسرا تیزی سے ابھرتے گومڑ پہ رکھا۔ موم بتی کی روشنیاں کم تھیں مگر اس کے محبوب کا تربتر ہراساں چہرہ ۔۔۔

اور چندرا کا متحیر خوف زدہ ۔۔۔ بے رنگ چہرہ دونوں ایک دوسرے کو تک رہے تھے۔

"یہ ۔۔۔ گناہ ۔۔۔ ہے۔" وہ لڑکھڑاتی آواز میں بولا

اس نے اسے کچھ نہیں کہا تھا وہ نجانے کس سے ہمکلام تھا اور چندرا کو سکتہ ہو گیا تھا۔ وہ جملہ سن کر تڑپ کر سیدھی ہوئی۔ وہ کس طرح چیل کی طرح اس پر جھپٹا مارنے اٹھ آئی تھی۔ اس نے اس کا گریبان پکڑ لیا۔

"تو ۔۔۔ تو اب تک کیا کرتے رہے؟ یہاں آتے رہے۔ پوری پوری رات یہاں رہے۔ وہ سب گناہ نہیں تھا؟ وہ سب پھر کیا تھا؟"

وہ اس کے گریبان کو جھنجھوڑ رہی تھی۔

"ہر بار میرے عورت پن کی تذلیل کر کے گناہ اور ثواب کی بات کرتے ہو۔" وہ حلق کے بل چلائی۔ "اور ہم تو گناہ گار ہیں ہی ۔۔۔ جہنم کے مکینوں کو جلتا بلتا دیکھو گے تو خاک مزہ آئے گا جنت مل جانے کا۔ اور اب کس گناہ سے ڈرتے ہو بس ایک آخری انتہا ۔۔۔" وہ استہزائیہ ہنسی۔

"یہ ۔۔۔ زنا ہے۔" اس کے منہ سے ٹوٹ ٹوٹ کر نکلا' وہ اس کے جنون پر حیران تھا اور ادھر بہت تیزی سے جھاگ اڑاتے ہوئے وہ جو مسلسل بول رہی تھی۔ اسے جیسے کسی نے الیکٹرک شاک دیا۔

"نا ۔۔۔ نا۔" وہ کھینچ کر بولی اور پھر ہنستی چلی گئی۔

"تم سے کس نے کہا زنا بس وہ آخری حد ہے۔ تمہارا تو ہر قدم ہر عمل زنا رہا۔ اتنے علم والے اور ذہن والے تھے تو ادھر آئے ہی کیوں؟" اور وہ اس کے جملے پر بری طرح چونکا تھا۔ چندرا کے منہ سے ایسا جملہ اور

وہ بھی سمجھ گئی۔

"ہمیں بھی پڑھائے گئے تھے سارے سبق ۔۔۔ تمہیں کیا لگا چندرا پیدا ہی ایسی ہوئی تھی۔ باپ مسجد بھیجتا تھا اور ماں مندر ۔۔۔ دونوں کو سیکھ لیا۔ دونوں جگہ ہی غلط تھا وہ سب' جو میں اب کرتی ہوں اور تم کہتے ہو زنا ہے۔"

وہ ہنسی اور پھر رو پڑی ۔۔۔ "کیوں آئے تھے یہاں کس لیے ۔۔۔؟ مجھے بتا رہے ہو یہ کیا ہے؟"

"میں تو نہیں میرے دوست ۔۔۔" بس اس کے منہ سے نکلا۔

"پہلی بار۔ بعد میں تو تم خود ہی ناں ۔۔۔" اس نے جتایا۔ "کس چیز کی تلاش میں یہاں آئے تھے۔ کیا کرنا چاہتے تھے۔ میں تو تمہارے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی ۔۔۔ گڑ کھا کے گلگلوں سے پرہیز ۔۔۔؟ گناہ سے ڈرا رہے ہو۔ اب کس گناہ سے ڈرتے ہو۔ سارے گناہ تو ہو گئے پورا رجسٹر بھرا ہوا ہے۔ آخری خانہ خالی کیوں؟"

اس نے سنا نہیں۔ وہ کچھ بتانا چاہ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

دوشاخہ راستے پر پتھر کی بینچ پر تنہا اصدق عبدالقیوم —

کس گناہ سے بچتا رہا اور کون کون سے گناہ کرتا گیا۔ یہ اسے بتایا ایک طوائف نے ۔۔۔ وہ گناہ کی انتہا سے بچنے کے لیے نمازیں پڑھتا رہا۔ روزے رکھتا رہا۔ خود کو بچاتا رہا اور پھر جانے انجانے ایک طوائف کے گھر کا پھیری ڈالنے والا بن گیا تب بھی ۔۔۔

ہاں تب بھی ۔۔۔

وہ شدید جنون اور بے بسی کے زمانے میں ظفر کے بتائے راستے پر چل نکلا تھا۔ گھر آ کے بہت پچھتایا۔ قسم کھائی کہ دوبارہ رخ نہ کرے گا۔ لیکن!

وہ پھر ایک بار ۔۔۔ اور پھر کئی بار اس گھر تک چلا گیا۔ جاتے وقت وہ جیسے ہر شے کو فراموش کر دیتا تھا' کسی معمول کی طرح اٹھتا اور چل پڑتا۔ ڈرتا رہتا کہ کہیں گناہ میں نہ پڑ جائے۔

اور بہت ہی عجیب بات یہ تھی کہ وہ جس بے صبری تشنگی' بے بسی کی کیفیت میں گھر سے نکلتا تھا۔ چندرا کا چہرہ دیکھتے ہی وہ جیسے شانت ہو جاتا۔ سارے کھولتے جذبات و احساسات پر برف سی گر جاتی۔ چندرا کے پاس گزارے ہوئے پل' گھنٹے' منٹ ۔۔۔ وہ ہر بار واپسی کی راہ پر چلتے ہوئے سوچتا ۔۔۔ کہ گناہ سے بچ کر آگیا ہے اور قسم کھاتا کہ دوبارہ ادھر کا رخ نہ کرے گا اور اس پر اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ وہ ہر بار گناہ کی دلدل سے بچ نکلتا ہے۔

جاتے وقت اس پر فقط جانے کا جنون سوار ہوتا اور واپسی پر شرمندگی۔ خود پر غصہ' ملامت۔ وہ اپنا ہاتھ زور سے دیوار پر دے مارتا اپنا سر دیوار سے ٹکراتا کہ وہ کیوں چلا جاتا ہے۔

کیا وہ عورت جادوگرنی ہے جو ہر بار وہ کھنچا چلا جاتا ہے۔ وہ خود کو کوستا' دانت پیستا' اس نے فائزہ سے بات کرنا چھوڑ دی تھی۔ اس نے نوٹوں کا ڈھیر حسنہ خالہ کے آپریشن کے لیے بھیج دیا تھا۔ اس کے جذبات پر اوس تھی۔ واپسی کا راستہ بند ۔۔۔ وہ کب جا سکے گا اور وہ کبھی بھی فائزہ کو نہیں بلا سکے گا۔

یہ اذیت ۔ وہ کام میں دھیان نہ لگا پاتا۔

وہ کیا کرے اور وہ کیا کرتا۔

شدید طیش کے عالم میں چندرا کے گھر کی سیڑھیاں چڑھتا۔

اور واپس آکر سجدہ ریز ہو جاتا۔ توبہ کرتا گڑگڑاتا اور پھر شکر ادا کرتا کہ گناہ کرنے سے بچ گیا۔

اور آج اسے ایک طوائف نے بتایا کہ وہ فقط ارادہ کرنے بلکہ خیال آنے ہی سے گناہ گاروں کی فہرست میں کھڑا ہو جاتا تھا۔

ایک ایسی طوائف جس کا مذہب مشکوک تھا۔ ہندو یا مسلمان ۔۔۔

اس نے اسے اپنے گھر سے نکل جانے کو کہا بلکہ

دھکے دیے تھے۔ وہ ناسمجھی کی کیفیت میں اپنے گھر تک لوٹا تھا۔ وہ جوتے کپڑے بدلے بنا ننگے فرش پر بیٹھ گیا اس کا دماغ خالی تھا اور یہ خالی پن اتنا اذیت ناک تھا کہ وہ کسی مجذوب کی طرح سر کو زور سے جھٹک کر حاضر ہونے کی کوشش کرتا۔ اس کی یادداشت میں چہرے گڈمڈ ہو رہے تھے۔ گھر والے ' فائزہ ' ظفر اور چندرا ــــ چندرا سو روپ بدل کر اس کی آنکھوں کے پاس سے گزری تھی۔

اور وہ بہت زیادہ ہنس رہی تھی۔

اور وہ رو رہی تھی۔

وہ خالی پن سے ہر شے کو جانچ رہا تھا۔ کوئی نشانی ــــ جو یادداشت کو واپسی کی راہ دے۔ تب ہی اس کی نگاہ کتابوں کے اس ریک پر گئی۔ غائب دماغی کی کیفیت ہنوز تھی۔ مگر وہ چیل کی طرح اس کونے میں جھپٹا۔ گھٹنوں کے بل سرکا۔

اور نشانی رکھے صفحے ــــ

اور حاشیہ لگی لائنوں کو پڑھنے میں چند منٹ ہی لگتے ہیں۔ سیاق و سباق کو جانچے بنا۔

اور پھر اس نے شروع سے پڑھنے کی کوشش کی تھی۔

اور اس کی یادداشت واپس آنے لگی۔ یہ تو اسی کی کہانی تھی۔

اس نے کبھی چوری نہیں کی اور تہمت نہیں لگائی تہمت تو دور کی بات ' اس نے تو کبھی بھی کسی بھی انسان کے لیے برا گمان تک نہ کیا۔

اور شراب ــــ لاحول۔ ظفر جیسے دوست اور دبئی جیسی ریاست میں رہتے ہوئے اس نے کبھی اس حرام شے کو دیکھا بھی نہ اسے تو اس کی بو ہی سے کراہیت اور ابکائی آتی تھی۔

اور زنا ــــ اس نے کبھی زنا نہیں کیا ــــ کون کہہ رہا ہے کہ ــــ وہ چندرا جیسی عورت کے ساتھ تاریک راتوں کے پل بتا کر بھی بچ آیا تھا۔ لیکن چندرا کہتی ہے وہ جرم کر چکا تھا۔

وہ تو عبادتیں کرتا رہا اور بچتا رہا پراگندگی سے۔ مشکل سے روزے رکھ کے نفس کو سبق دیتا رہا۔

"نظر ایک زہریلا تیر شیطان کے تیروں میں سے ہے جو شخص باوجود دل کے تقاضے کے اپنی نظر پھیرے۔ تو میں اس کے بدلے اس کو ایسا پختہ ایمان دوں گا۔ جس کی لذت وہ اپنے قلب میں محسوس کرے گا۔"

وہ اب بھی دل جمعی سے سطر سطر حرف بہ حرف نہیں پڑھ رہا تھا۔ بس جہاں نگاہ ٹھہر جاتی اس چیز کو پڑھ لیتا۔

حضرت علی رضؓ نے فرمایا "پہلی نظر تو معاف ہے دوسری گناہ ہے۔"

کس چیز کی نظر ــــ؟ اس نے صفحہ پلٹا۔

الفاظ یوں لگ رہے تھے جیسے نامعلوم زبان میں لکھے ہوں ــــ اس نے بڑی دقت سے نگاہ ٹھہرائی۔

اصل زنا جس کو کہتے ہیں سب ہی کو معلوم ہے۔ لیکن زنا کے اسباب کو بھی زنا کہا گیا ہے۔

آنکھوں کا زنا دیکھنا ہے اور کانوں کا زنا سننا ہے اور زبان کا زنا بات کرنا ہے اور ہاتھ کا زنا پکڑنا ہے اور پاؤں کا زنا چل کر جانا ہے۔

"ہاں! اس کے ذہن و دل پر چھائی دھند کا پردہ کسی نے چاک کر دیا۔ وہ کانپنے لگا۔ اس کے لرزتے ہاتھوں سے کتاب چھوٹ گئی۔ وہ اوندھے منہ گر گیا۔ اس کا گال زمین پر لگا تھا اور پھڑپھڑاتے ورق ــــ اس نے اپنا پنجہ دھپ کر کے اوراق کو جمایا۔

"کسی مرد و عورت میں جب ناجائز کے تعلقات ہوتے ہیں تو یک لخت نہیں ہو جاتے بلکہ پہلے بہت سے ایسے کام کیے جاتے ہیں جو آپس میں ایک دوسرے کے قریب سے قریب تر کرتے چلے جاتے جاتے ہیں۔"

اس لیے شریعت مقدسہ نے ان محرکات و اسباب کو بھی زنا قرار دیا ہے۔

وہ اپنی بہتی آنکھوں سے ان جملوں کو پڑھ رہا تھا۔

وہ بدکاری سے تو بچنا چاہتا تھا۔

اور چندرا جیسی طوائف نے کہہ دیا کہ وہ سب گناہ کر چکا ہے۔ اسے کیسے پتا ــــ کیا اس نے ان کتابوں کو پڑھ رکھا ہے۔

شاید وہ ان میں سے تھی جو جانتے بوجھتے گناہ کرتے ہیں۔ وہی جن کے دلوں پر مہر لگ جانے کا اعلان ہو چکا ہے۔

لیکن اس کا دل و ضمیر ابھی زندہ تھا۔ مہر نہیں تھی۔ اسے پلٹا دیا گیا تھا۔ روک دیا گیا تھا۔ گھڑی کی سوئیوں نے کتنے ہی چکر پورے کر لیے وہ شاید ہوش و خرد سے بیگانہ تھا۔

"سو کوڑوں کی سزا صرف غیر شادی شدہ مرد و عورت کے لیے مخصوص ہے۔ شادی شدہ لوگوں کی سزا سنگساری ہے۔

وہ یکدم کھڑا ہو گیا۔ اس کے جوتے ہنوز پیروں ہی میں تھے۔ وہ زمین پر پڑی کتابوں کو چھوڑ کر تا پڑتا گھر سے نکلا۔ وہ سڑک پر آگیا۔ اس کے پاس نشان منزل نہیں تھا۔ وہ چلتا جا رہا تھا۔ بھوکا پیاسا ــــ

پہلے وہ خود کو گناہ گار نہیں مان رہا تھا اور اب جب حقیقت کی آنکھ سے دیکھا تو ــــ

وہ اپنے گناہوں کی گنتی کرتا۔ سورج کی تپش سے بے نیاز چلتا تھا اور ہر بار گنتی پلٹ جاتی ان گنت گناہ اور دوبارہ سے نئی ترتیب لگاتا۔

"میں کیا کروں میرے اللہ!" وہ اس تپتی بینچ سے اٹھ کھڑا ہوا وہ دوبارہ چل رہا تھا۔

"اے اللہ میرا فیصلہ آپ ہی کر دیجئے۔ میں کیا کروں کہاں جاؤں۔" وہ گرد میں اٹا ــــ کف سے آنسو رگڑتا چلتا جا رہا تھا۔

میں عبادتیں کرتا رہا' روزے رکھتا رہا۔ میں خوامخواہ کی فکریں اور بلاوجہ کا فاقہ۔ جب میں نے تجھے اور تیرے حکم کو ہی نہ سمجھا اور ایک طوائف نے کہا کہ ــــ

اسے چندرا کی دوسری بات اب یاد آئی تھی۔ وہ ایک بار پھر رک گیا۔ اس نے اپنے بال اتنی طاقت سے نوچے کہ مٹھیوں میں چپک کر باہر آگئے اور چندرا نے اسے حیران کر دیا تھا۔

وہ یہ بات جانتا تھا مگر یہ اسی پر لاگو ہو گی یہ تو اس نے کبھی نہ سوچا اور چندرا نے کہا تھا۔

☼ ☼ ☼

چندرا نے کیا کہا تھا۔ وہ اب قدم اٹھاتا تھا تو سر میں دھمک ہوتی تھی۔ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا رہا تھا وہ زیر تعمیر عمارت کی جانب آگیا۔

یہاں آگے جانا منع تھا۔ مگر وہ کچھ پڑھنے دیکھنے سے معذور تھا۔ وہ سوچ رہا تھا چندرا کی پہلی بات طمانچہ تھی اور دوسری ــــ دوسری کیا تھی۔ ہر مسلمان زناکار کے لیے ایک گالی جیسی یا تحفہ جیسی ــــ مگر وہ بات کیا تھی۔ اسے ذہن پر زور دینے پر بھی یاد نہ آرہی تھی۔

"اللہ مجھے معاف کر دے۔" وہ گڑگڑایا۔

"اے رکو ــــ رکو آگے مت جانا آگے جانا منع ہے۔"

ہیلمٹ والے شخص نے اچانک ہی اسے دیکھا تھا وہ پوری طاقت سے چلایا اور اس کے متوجہ نہ ہونے پر بھاگا۔ مگر۔

مگر تب تک۔

زیر تعمیر عمارت کے اوپر کرین سے کرش چھتوں پر پہنچایا جا رہا تھا۔

ٹرالی پہلے سے خراب تھی یا ابھی اسے دیکھ کر ــــ وہ عین نیچے تھا اور اوپر سے گرتا کرش ــــ

اسے چیخنے کی مہلت بھی نہ ملی۔ وہ پہلے ہی سے دم نیم جان تھا۔ وہ گر گیا سجدے کی سی حالت ــــ وہ بچ سکتا تھا۔ مگر جب خود ہی گر گیا کہ ــــ

لوگوں کا شور بڑھتا جا رہا تھا۔ بھاگ دوڑ' چیخ و پکار ــــ مگر وہ پرسکون ہو گیا تھا خاموش۔

کرش کی چھوٹی سی پہاڑی زمین پر نمودار ہو گئی۔

جس کی تہہ میں وہ پرسکون ہو چکا تھا۔ بے دم بے جان ' ــــ

سنگساری۔۔۔ عیب پوشی، انصاف، اس کے دماغ میں آنے والی آخری سوچ۔

☼ ☼ ☼

ایک موت سا سناٹا ہول سب ایک دوسرے سے نظریں چرائے اپنی اپنی سوچوں میں گم۔۔۔ یہ کیا ہو گیا تھا۔ کیوں اور کیسے جیسے سوال اب بے معنی تھے۔

سجا بنا گھر، قیمتی آرائش سامان، ہر شے سے جھلکتی امارت ایک مسلسل خوشی تھی جیسے مگر اب یوں لگتا جیسے گہن لگ گیا ہو۔

وہ بیرونی سیڑھی پر بیٹھی تھی۔ خاموش مگر آج آنکھوں میں خالی پن نہیں تھا جو ایک ماہ سے اسے مردہ بنا کر پیش کرتا تھا۔ آج ان آنکھوں میں حزن آرکا تھا۔ تکلیف، اذیت اور آخر میں ترحم۔۔۔

اس نے رو رو کر زمین آسمان ایک کر دیا۔ وہ بین ڈالنا چاہتی تھی اپنا منہ سر نوچ لینا چاہتی تھی۔

کسی کی نصیحت اس پر اثر نہ کرتی۔ اجڑی بپھری ویران آنکھوں کے ساتھ جہاں بیٹھ جاتی۔۔۔ سوچتی رہ جاتی کہ۔۔۔ کیوں کب کیسے؟

اور وہ ہی کیوں؟ اس کے ساتھ یہ سب کیوں ہوا؟

اتنا برا۔۔۔

کس لیے۔۔۔

کس لیے۔۔۔ کوئی ایسے بھی اجڑ جاتا ہے۔

☼ ☼ ☼

وہ سارا خط اذیت کی داستان تھی شرم و حیا کے مقام سے گزرتی سوچ کے در وا کرتی سچی کہانی۔

اصدق کا لکھا مکتوب دراصل ایک آئینے کی مانند تھا جس میں سب ہی اپنا چہرہ دیکھ سکتے تھے۔ اپنے عیب اور اپنے چہرے پر لگا ہر دھبا۔۔۔

اصدق نے ان گزرے سالوں کا پل پل بیان کیا تھا۔ تو خط پڑھ کر سب ہی کو گزرے سالوں کے پل یاد آ رہے تھے۔ ہر بندے کو اپنے پل۔ اپنی سوچ، اپنی کار گزاری۔۔۔

ہر شخص اپنی جگہ مجرم تھا۔ مگر کچھ بے ضمیر ہو نز کہہ کر پھر سے خود میں مگن ہو گئے اور کچھ باضمیر ہر سانس کے ساتھ اپنا جرم ترتیب وار لگاتے تھے۔ اپنی غلطی تسلیم کرتے تھے انہی میں ایک حسنہ بیگم بھی تھیں۔

وہ قطعاً "منصوبہ ساز نہیں تھیں۔ کبھی نہیں۔۔۔ لیکن۔

شریک کار تو بن گئی تھیں۔ جانے انجانے میں قصداً"۔۔۔ پتا نہیں کیسے مگر آج انہیں سارے قصور ماں وا پنے ہی لگ رہے تھے۔

اصدق عبدالقیوم فطرتاً" وہ شخص تھا جو فیملی مین ہوتے ہیں۔ وہ لوگ جو اپنے گھر اپنے شہر اپنے لوگوں سے دور رہ ہی نہیں سکتے۔

لیکن ارادہ کرنے میں انسان با اختیار ہے پر عمل کروانے والا مختار اپنی ڈھب سے چلتا ہے۔

اس کے پاس ہر شے طے شدہ ہوتی ہے۔ ہمیشہ۔

جیب میں پیسے گنتی کے ہوں تو ناک کی سیدھ میں چلنا سب کو آتا ہے۔ ذہن واضح۔۔۔ ٹارگٹ پر نگاہ، خریداری اور گھر واپسی۔۔۔ تھوڑی ہی دیر میں۔۔۔ چٹکی بجا کر۔۔۔

مگر۔۔۔

سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا کہ ہمیشہ سے تھا مگر ایک تبدیلی ماحول میں رچنے لگی تھی۔ گفتگو میں، لباس میں، اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے میں۔۔۔ طرز زندگی بدل رہا تھا۔

اصدق نے دو سال بعد گھر لوٹ کر جس طرح اپنی بہن عارفہ کی خواہش پوری کیں۔ جس شان و شوکت سے بہن کو بیاہا، وہ سب کی نظروں میں آ گیا تھا۔ اس نے اسٹور کے لیے بہت اچھے فیصلے کیے۔ وہ سب ہی کے لیے تحائف لایا تھا۔ منہ مانگے بھی اور اپنی پسند سے بھی۔۔۔

وہ سب پر جان نچھاور کرنے کو تیار رہتا تھا۔ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں تھا۔ مگر بعض لوگ محبت کا خراج مانگتے ہیں۔

ناعمہ نے منہ سے کچھ نہیں کہا مگر اس نے بچے آگے کر دیے۔ خواہشوں کو ضرورتوں کا روپ دے کر بچوں کے منہ سے کہلوانا شروع کر دیا۔ وہ اب اپنے اماں ابا سے کچھ نہ کہتی تھی۔ یونہی باتوں باتوں میں سرسری سا عتیقہ خالہ یا عبدالقیوم چچا کے کانوں میں کچھ بھی انڈیل دیا۔ جلد یا بدیر مگر بات پوری ہو جایا کرتی۔

دوسری جانب عائزہ تھی۔ وہ دھڑلے سے کچھ بھی مانگ لینے کو حق کہتی تھی۔

وہ سب محفل جمائے بیٹھے تھے۔

جب عائزہ نے ذکر چھیڑ دیا اس کے سرتاج کو موٹر سائیکل کی ضرورت ہے۔ موجودہ بائیک بہت زیادہ تنگ کرنے لگی ہے۔ اگر امی ابا لے دیں تو۔۔۔"

"بیٹا ابھی تو ہم عارفہ فائزہ کی شادی سے فارغ ہوتے ہیں۔۔۔ تھوڑا صبر کرو، اسی کو ٹھیک کرواؤ۔۔۔ ابھی تو ہم سب کا ہاتھ بہت تنگ ہے۔"

"لو تو آپ کو کون کہہ رہا ہے اسٹور سے رقم نکالیں۔ کریں ناں اصدق کو فون کہ وہ پیسے بھیج دے۔"

عبدالجبار اور حسنہ بیگم ہیں ہیں کرتے رہ گئے۔ آنکھوں سے اشارے کیے کہ چپ رہے مگر آگے عائزہ تھی۔

"اشارے کس بات کے کر رہے ہیں آپ لوگ۔۔۔؟ بھائی کہتا ہے ناں سب کو۔۔۔ تو بھائی بن کر دکھائے۔۔۔ عارفہ کے لیے تو پیسہ پانی کی طرح بہایا جا رہا تھا۔"

وہ تیر جیسے جملے پھینک کر خود پیر پٹختی روانہ ہو گئی۔ سب ہی ایک دوسرے سے نگاہیں چرائے بیٹھے تھے۔

عبدالقیوم ہی اٹھے۔ وہ فون پر اصدق سے کہہ رہے تھے۔

"فوری طور پر پیسے بھیجو۔ شاہد کو بائیک لے کر دینی ہے۔"

وہ شاید کچھ کہہ رہا تھا۔ اللہ جانے کیا؟ عبدالقیوم بہت تحمل سے اسے سن رہے تھے۔

"تمہاری ساری بات درست ہے اصدق۔۔۔ مگر میرا تقاضا اب بھی وہی ہے۔"

انہوں نے فون رکھ دیا۔

اس کے بعد۔۔۔

"ابھی تو وہ مل کر گیا۔ پیچھے بیوی بچے بلوا لیے کہ دل نہیں لگ رہا تھا۔ وزٹ ویزا۔۔۔ اور اب نئی سننے کو مل رہی ہے کہ وہ کوشش کرے گا کہ فائزہ مستقل وہاں رہے اور آپ غلطیوں پر غلطیاں کر رہی ہیں۔ ہونہہ!" ناعمہ ٹہل ٹہل کر مسلسل بول رہی تھی۔ حسنہ بیگم کو اس بلا سبب غصے کی وجہ سمجھ میں نہ آ رہی تھی۔

"پتا ہے آپ کو دبئی جیسے علاقے میں بیوی بچوں کے ساتھ رہنا کتنا مہنگا پڑتا ہے۔ پاکستانی لاکھوں ہوں تو وہاں متوسط طبقے والی رہائش رکھ سکتا ہے بندہ۔

وہیں کما کے وہیں لگانے ہوں، نا تو آٹے دال کا بھاؤ پتا لگ جاتا ہے۔ ہوش ٹھکانے آ جاتے ہیں۔

زندگی بھر کا ساتھ ہے۔ کوئی ایک دو سال کی کہانی نہیں۔۔۔ ساتھ ہی رہنا ہے انہیں، ادھر رہیں یا ادھر۔۔۔ مگر ابھی یہ چند سال۔۔۔ فائزہ کو ادھر ہی رہنے دیں اور اصدق ادھر ہاتھ پیر مارے۔۔۔ آج جوانی ہے تو کما لے گا۔ بچت بھی ہو گی تو کل کو سکھ سے کھاتے رہیں گے رائحہ زائرہ کا کیا ہو گا؟ انہیں کیسے بیاہیں گی آپ۔۔۔ اس اسٹور سے جو پہلے ہی سسک سسک کر چلتا ہے اور وہ بھی چچا کی شراکت کا۔۔۔ اس سے گھر چلائیں گی۔ بڑھاپے کا آسرا بنائیں گی یا بیٹیوں کو دیکھیں گی۔۔۔ آیا کچھ سمجھ۔"

"تو اصدق کرے گا ناں۔۔۔ اس نے خود کہا ہے وہ زائرہ، رائحہ کو عارفہ سے بھی اعلیٰ طریقے سے بیاہے گا۔

اصدق زبان کا پکا ہے اور چھوڑو اس بات کو فائزہ کے وہاں رہنے سے اس سب کا کیا تعلق۔"

"خاندان میں دور پرے تک زائرہ رائحہ کا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ غیروں کو رجھانے کے لیے گھر کا حلیہ اچھا ہونا ضروری ہے۔ پھر ان کی شادیاں اور دیگر اخراجات فائزہ وہاں رہ گئی تو کہانی یہ ہو گی کہ آپ کی ایک بیٹی تو عیش کر رہی ہو گی اور باقی حسرت پال رہی ہوں گی میرا مطلب۔۔۔ زائرہ رائحہ۔۔۔"

"تو اب ہم کیا کریں۔۔۔ کیا کرنا چاہیے؟ حسنہ بیگم کو انکشافات نے شل کر دیا تھا۔ اتنی بھیانک منظر کشی کی تھی ناعمہ نے۔۔۔

"کرنا ورنا کچھ نہیں ہے بس آپ فوری طور پر فائزہ کو بلوالیں۔" ناعمہ نے وہ بات کہہ دی جس کے لیے اس نے گھنٹوں مغز ماری کی تھی۔

"لیکن میں کیا کہہ کر بلواؤں کون۔۔۔ سی بات؟" حسنہ بیگم نے بچوں کی سی معصومیت سے ناعمہ کا چہرہ دیکھا۔

ناعمہ نے ٹھنڈی سانس بھر کے آنکھیں بند کیں اور کھولیں۔

"آپ کو فائق شائق یاد نہیں آتے؟" اس نے دکھتی رگ پہ ہاتھ رکھا تھا۔

"اے لو وہ بھولتے ہی کب ہیں۔ یہ کیا بات کر دی۔" حسنہ بیگم کی آنکھیں یک بیک بھر آئیں۔

"بس آپ بیمار پڑ جائیے۔۔۔ رونا ڈال دیں۔۔۔ اتنا زیادہ پڑ جائے کہ فائزہ خود الٹے قدموں دوڑ پڑے۔ بس جو ہم کہیں خاموشی سے کرتی جائیں۔"

"ہم۔۔۔ ہم کون۔" حسنہ بیگم ہم کے صیغہ پر چونکی تھیں۔

"افوہ امی۔۔۔ ہم مطلب میں اور عائزہ۔۔۔"

"تو۔۔۔ تو کیا عائزہ بھی وہی سب کہہ رہی تھی۔" حسنہ بیگم کی حیرانی کی حد نہ رہی "ہاں امی! عائزہ بھی۔" ناعمہ نے اپنے دکھتے جبڑے کو ہاتھوں سے دبایا تھا۔

☼ ☼ ☼

مگر کچھ لوگ فطرتاً" حاسد ہوتے ہیں۔ بے یقین بدگمان بدنیت۔۔۔ تنگ دل اور تنگ نظر اور عائزہ انہی سب خوبیوں کی مالک تھی اور اس پر بعد کے حالات نے اسے منتقم مزاج بھی بنا دیا وہ خود ناخوش ہے نا آسودہ ہے تو کوئی اور کیوں۔۔۔

شاہد نے اسے پسند کرنے میں اپنی مرضی چلائی تھی۔ تو زندگی کے ہر معاملے میں بھی وہ اپنی پسند کو اولیت دینے کی فطرت رکھتا تھا اور اسی پسندیدگی میں ایک شے ہڈ حرامی بھی تھی آرام طلبی۔

وہ ٹائن ٹو نائن کی ایک ملازمت کو حاصل سمجھ کر خوش تھا اور چاہتا تھا کہ عائزہ بھی اس خوشی کو جی بھر کے منائے۔

عائزہ میں بے صبری تھی۔ وہ جلد بھڑکنے سے اکھڑ جاتی۔ وہ کم پر ٹھہرنے پر تیار ہو ہی نہیں سکتی تھی اور اب تو اسے ہر شے کا تقابلی جائزہ لینے کی عادت پڑ گئی تھی۔ اور مقابل ایک ہی بندہ تھا یا۔۔۔ چلو دو بندے اصدق اور فائزہ

"تم باہر جانے کے لیے کیوں نہیں ٹرائی کرتے شاہد! اب اصدق کو دیکھو۔"

شاہد اتنا بھی برا آدمی یا نکما نہیں تھا۔ مگر عائزہ کی توقعات بہت زیادہ ہو چکی تھیں وہ ہر چیز کا موازنہ اصدق اور اور فائزہ کے حوالے سے کرتی۔

وہ بے صبری تو تھی ہی زبان دراز بھی ہو گئی اور ایک دن بکتی جھکتی اس گھر سے نکل آئی۔ بچے ہمراہ تھے۔ تعلق کی ڈور ٹوٹی تو نہیں۔۔۔ مگر تن ضرور گئی اور تنی ڈور کے ٹوٹنے میں دیر نہیں لگتی۔

مگر عائزہ کو قطعاً" احساس نہیں تھا۔ وہ اپنی زندگی کو مشکل بنا چکی تھی۔

وہ فائزہ کی زندگی کو مشکل ترین بنا دینا چاہتی تھی۔

☼ ☼ ☼

"بیٹا! اس طرح اچھا تو نہیں لگتا۔۔۔ گھر میں کنواری بہنیں ہیں پھر یہ بھی سوچو خواہ مخواہ اتنا خرچا۔"

اور فائزہ لب کچلتی جی بھر کے عرق عرق ہوتی اسکائپ پر جاتی۔

"میں کیسے آجاؤں اصدق۔۔۔ آپ سمجھتے کیوں نہیں۔" اور پھر اصدق کے لاکھ سمجھانے پر بھی اس کی نفی اثبات میں نہ بدلتی۔

"اچھا تو پھر میں آجاتا ہوں ابھی تین روز کی چھٹی پر۔"

"نہیں نہیں۔" وہ بول پڑتی۔ "اتنا خرچ ہو جائے گا۔ آپ پیسہ جمع کریں ناں۔"

"اس طرح۔ اس طرح تو میں شاید زندگی بھر واپس نہ آسکوں یونہی مشقت کرتا رہوں اور ابھی تو میرے سارے کام باقی ہیں۔ زائرہ رائحہ کی شادیاں اور آصفہ کی میڈیکل کی پڑھائی۔۔۔ اتنی اچھی لڑکیاں تو ہیں پھر آخر اب تک ان کے رشتے کیوں نہیں ہوتے؟

فائزہ چپ رہ جاتی۔ اتنی رشتے والی مائیاں گھر کے چکر کاٹتی تھیں۔ اب تو ہر شے ایک سے بڑھ کر ایک تھی۔ مگر بات آگے بڑھتی ہی نہیں۔

جواب یہ تھا کہ زائرہ، رائحہ نے اپنا معیار بہت بلند کر لیا تھا۔ گھر ذاتی ہو اور بہت بڑا ہو۔ علاقے کے سب سے پوش ایریا میں ہو۔ اعلا تعلیم یافتہ ہو اور سب سے اہم کسی گملے میں اگا ہو یعنی آگے پیچھے کم سے کم رشتے ہوں۔ اسمارٹ ہو۔

ان کو بھی فائزہ کی خوش حالی رشک میں مبتلا کرتی تھی۔

دوسری جانب آصفہ نے ڈاکٹری پڑھنے کی فرمائش کی تھی۔

سب نے ہنس کر ہامی بھری تھی۔ 8th کلاس کے بعد 9th میں جاتے وقت ہر بچہ سینہ تان کر ڈاکٹر اور انجینئر بننے کا اعلان کرتا ہے۔

مگر ایف ایس سی پاس کرنے میں دانتوں پسینہ آجاتا ہے

اور انٹری ٹیسٹ۔۔۔ لوہے کا چنا۔

حیران کن بات یہ ہوئی۔ آصفہ نے ایف ایس سی انٹری ٹیسٹ سب مکھن کی ٹکی کی طرح نگل لیا۔

یہ سب گھر والوں کے لیے اور اصدق کے لیے زندگی کی سب سے بڑی خوشی تھی۔ وہ بھی پڑھنا چاہتا تھا۔ اعلا تعلیم حاصل کرنا چاہتا تھا مگر حالات نے ساتھ نہیں دیا۔ اس نے سوچا کہ وہ اپنے بچوں کو بہت بہترین تعلیم دلوائے گا اور وہ جو بننا چاہیں گے، وہ ان خوابوں کو پورا کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دے گا۔۔۔ لیکن بچوں سے پہلے لاڈلی چھوٹی بیٹی جیسی بہن پیارا طوطا۔۔۔

اصدق اپنی بہت سی ضرورتوں، خواہشوں سے پہلو تہی کر جاتا لیکن آصفہ کی ڈاکٹری۔ نہیں کبھی نہیں۔

اصدق نے ایک بار ایک نیا لائحہ عمل ترتیب دیا۔

گھر از سر نو بنایا جا چکا تھا نوک پلک سے تیار۔ اسٹور کا شمار اب علاقے کے سب سے اچھے اسٹورز میں ہونے لگا تھا۔

آصفہ کی پڑھائی تو زندگی کا سب سے اہم مقصد تھی۔ وہ اتنے پیسے جمع کر چکا ہے کہ پاکستان جا کر کچھ بھی کر سکتا ہے۔

وہ کوئی پہلے کی طرح خالی ہاتھ تو نہیں۔

ظفر اور دیگر دوست اس کے ہم خیال تھے۔ صائب مشورہ دینے والے لوگ پر خلوص تنہائیوں کے ساتھی۔۔۔ اور اس نے اپنے اس ارادے سے کسی کو آگاہ نہیں کیا۔ اسے اپنے گھر والوں کے خلوص پر کوئی شک نہیں تھا۔ وہ سب اس سے محبت کرتے تھے۔ احساس مند تھے۔ احسان مندی کا خواہاں وہ کبھی رہا نہیں جو اس نے کیا وہ اس کا فرض تھا۔ لیکن دوستوں کے تلخ تجربات اور لاکھ پہلو تہی کرنے پر بھی کیا جانے والا مشاہدہ۔۔۔

اسے باور کراتا تھا کہ گھر کے حالات بہت بدل چکے ہیں۔

وہ جیسا گھر چھوڑ کر آیا تھا وہ بدل چکا تھا۔

مادیت پرستی، ظاہری شان و شوکت، مصنوعی قہقہے اسے سب کچھ اوپرا اوپرا لگتا۔

ناعمہ کے بچوں کے تعلیمی اخراجات۔۔۔ نانا نانی پورے کر رہے تھے۔

عائزہ گھر آکر بیٹھ گئی تھی۔ وہ اسکول میں ملازمت کرتی تھی۔ مگر اس کی آمدنی اس کے شاہانہ اخراجات سے میچ نہیں کرتی تھی۔ اس نے بیٹی کو اپنے اسکول میں داخل کروا دیا تھا۔ لیکن بیٹے کو فائق شائق والے اسکول میں۔۔۔

اور اصدق جانتا تھا۔۔۔ اس نے اپنے بچوں کے لیے ایک بہترین مگر مہنگا اسکول چنا ہے۔ لیکن اس معاملے میں وہ کسی کمپرومائز پر تیار نہیں تھا۔

"وہ اپنے ساتھ ہی رکھتی ناں بیٹے کو۔۔۔ اس نے کیوں اسکول بدلا۔۔۔ کیسے افورڈ کرے گی وہ۔ کتنی کم تنخواہ ہے اس کی فائزہ۔۔۔"

"وہ تو چچا افورڈ کر رہے ہیں۔ وہ فیس بھرتے ہیں۔" فائزہ نے کہا۔

"لیکن کیوں۔۔۔ وہ کیوں بھر رہے ہیں اور عائزہ کو بیٹھے بٹھائے کیا سوجھی ہمیں باہر سے ریال بھیج رہا ہوں پھر بھی پوری پلاننگ کر کے بچوں کا یہاں ایڈمیشن کروایا ہے۔ تین سال تک کی فیس علیحدہ نکال کر رکھی ہے اور یہ ایک دو بار کا خرچا نہیں ہے۔ تم پہلی فرصت میں عائزہ سے اس حوالے سے بات کرو۔"

فائزہ متامل نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔

"چلو ٹھیک ہے۔ تم نہیں کر سکتیں تو میں کروں گا۔ سمجھاؤں گا اسے۔"

"ہم اپنے دو بچوں کو افورڈ کر رہے ہیں ناں اصدق۔۔۔ ایک بچہ اور سہی کیا فرق پڑتا ہے۔"

"کہنے سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔۔۔ کرنے سے پڑتا ہے۔" اصدق نے ہارے لہجے میں کہا "ایک بار کی بات ہو ناں تو پتا نہیں چلتا مگر۔"

ادھر ناعمہ کے بچے تو سب سے آگے تھے۔ وہ خود ہی فون کر دیتے۔

ماموں یہ۔۔۔ ماموں وہ۔۔۔ لیپ ٹاپ اور نیو موبائل جینز۔

☼ ☼ ☼

فائزہ بے وقوف یا عقل کی اندھی نہیں تھی۔ اپنا اچھا برا سب سمجھتی تھی مگر یہاں مسئلہ یہ تھا کہ وہ اپنے اندر سے جتنی پر خلوص صاف دل تھی۔ وہ دوسروں کو بھی ایسا ہی سوچتی تھی۔

اور اس کی فطرت کی ایسی خوبی یا خامی عائزہ کا ہتھیار تھی۔

ناعمہ پیسے کے جوڑ توڑ میں لگی رہتی تھی۔ اسے فائزہ اور اصدق کی دوری کا ایک ہی فائدہ سمجھ آتا تھا۔

جبکہ عائزہ اپنی ناکام ناآسودہ ازدواجی زندگی کے بعد فائزہ اور اصدق کی نزدیکیاں اور عائزہ کی برداشت کا امتحان تھیں جیسے۔ وہ حسد کا شکار ہو گئی تھی اور دنیا کا سب سے خطرناک دشمن حاسد ہوتا ہے۔

سورہ خلق یونہی تو نہیں اتاری گئی؟

ماں کے آپریشن میں اس نے کراچی کے رہائشی ایک دوست کے ذریعے سارے انتظامات کروائے تھے۔ آخر میں وہ ماں کی محبت میں خود بھی کراچی آگیا۔

کامیاب آپریشن کے دو دن بعد وہ مسلم آباد کے لیے نکلا اس نے فون پر زائرہ کو اطلاع دی کہ وہ رات تک گھر آئے گا۔

عائزہ ناعمہ کے بیٹے کے ساتھ کراچی جانے کو تیار تھی۔ نجانے اسے کیا سوجھی۔۔۔ اس نے عین ٹائم پر اسکول کی اہم ورکشاپ کا ذکر کر دیا جہاں اس کا کل پہنچنا بہت ضروری تھا۔ قرعہ فال فائزہ کے نام نکلا اور بنا کسی رد و کد کے مان گئی۔

جس وقت اصدق نے گھر میں قدم رکھا تب فائزہ ٹرین کا آدھا سفر کر چکی تھی۔ اصدق بہت خوش تھا کامیاب آپریشن۔

آپریشن کی ٹینشن سے نکلنے کے بعد وہ پر سکون تھا۔ اس نے سوچا وہ گھر جا کر دو تین روز آرام کرے گا پھر فائزہ اور بچوں کو لے کر کراچی واپس آئے گا وہ گھومیں

پھریں گے۔ مگر۔۔۔

اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"اس اتنے بڑے پورے گھر میں کوئی اور نہیں تھا کہ جو تیمار داری کے لیے جاتا۔ فائزہ ہی کیوں؟" وہ چلایا۔

"جبکہ اتنے لوگ تھے۔ تم چلی جاتیں۔ یہ زائرہ رائحہ۔۔۔ تھیں۔"

"میں نے کہا تھا اصدق! وہ کہنے لگی زائرہ، رائحہ کنواری لڑکیاں انجان شہر۔۔۔"

"تو خالہ امی کیوں نہ گئیں۔۔۔ اور تم نے اسے بتایا نہیں تھا کہ میں پہنچ رہا ہوں۔" وہ زائرہ پر چلایا۔

"میں نے عائزہ آپا کو بتایا تھا کہ بھائی رات تک آجائیں گے۔" وہ منمنائی۔

"میں نے اسے آواز دے کر کہا تھا اصدق۔۔۔ مگر وہ گھر میں ہڑبونگ سی تھی ناں۔" عائزہ بولی۔

اس نے فائزہ کو فون کیا تو اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ "عائزہ نے تو اس سے کہا تھا کہ تم چلی جاؤ۔ اسی بہانے اصدق بھائی سے بھی مل لو گی اور وہ خوشی خوشی نکل پڑی تھی۔

"کس نے کس سے کیا کہا تھا۔ کون سچا اور کون جھوٹا۔ مگر ایک غلط فہمی تو حائل ہو گئی۔ ناراضی اور بدگمانی۔

وہ کیا صفائی دیتی اور کیا صفائی مانگتی؟

وہ اصدق سے خفا ہو گئی۔۔۔ اصدق اس سے خفا

☼ ☼ ☼

لیکن یہ چھوٹی موٹی ناراضی ان کے رشتے کے آگے کچھ نہیں تھی۔ مسئلہ یہ تھا کہ روٹھنے منانے کا خوب صورت عمل ٹائم مانگتا ہے اور وہی ان کے پاس نہیں ہوتا تھا۔

زائرہ کی شادی کا معاملہ تو نجانے کہاں گیا بیچ میں فارا کی آمد کا اعلان ہو گیا۔ اصدق سمیت عتیقہ بیگم اور عبدالقیوم بھی زیادہ بچوں کے خواہش مند تھے۔

عورت اور مرد کا رشتہ صرف میاں بیوی کا نہیں۔ اس رشتے کے اور بھی پہلو ہیں۔ ماں کا رشتہ، بہن کا رشتہ بیٹی کا رشتہ۔

نسوانیت کسی بھی روپ میں ہو۔ مرد کی زندگی میں رنگ بھرتی ہے۔

عمر کے ہر دور میں مرد ایک عورت ضرورت ہے ہاں بس اس کے روپ بدل جاتے ہیں۔

اور وہ اصدق عبدالقیوم۔۔۔ سالہا سال سے عورت کے بغیر رہ کر پاگل ہو گیا تھا۔

اسے سب سے زیادہ غصہ فائزہ پر آتا۔

اسے سب سے بڑی قصوروار وہی لگتی۔ اور وہ تھی بھی۔۔۔ ہمدردی۔ لگاؤ سب اپنی جگہ۔۔۔ مگر آنکھیں کھلی رکھنے میں کیا حرج تھا۔ اگر اصدق ان کی ذمہ داریاں پوری کرنے میں تن من دھن لٹا رہا تھا تو کچھ ذمہ داریاں فائزہ کی بھی تو تھیں۔ اسے سمجھنا چاہیے تھا۔

سب قصوروار تھے مگر سب سے بڑا قصور فائزہ ہی کا تھا۔ فائزہ نے بھی آسان راستہ منتخب کیا۔ پیار لاڈ اٹھاتے رشتے، بچے، بے فکری وہ اپنوں کے درمیان خوش تھی اور مطمئن بھی۔

اور اصدق کو لگا وہ کبھی واپس نہ جا سکے گا۔ وہ ہمیشہ یہیں رہ جائے گا۔ مایوسی اور بے یقینی نے اسے چندرا کے دروازے پر پہنچا دیا۔

چندرا جو عورت تھی۔ جو باتیں کرتی تھی۔ ایسی باتیں جو کبھی کسی نے نہیں کیں اور وہ جو۔۔۔ بس سننا چاہتا تھا۔ کہ وہ بولتی رہے یا کوئی بھی بولتی رہتی۔

اور پھر جو کچھ چندرا نے کہا۔

کیسے کہہ دیا اور اگر کہا بھی تو۔۔۔

چندرا کے منہ سے تو ہمیشہ غلاظت میں لتھڑے الفاظ نکلتے تھے۔

پھر اس دن۔۔۔

آئینہ دکھاتے جملے۔۔۔

لیکن وہ جملے چندرا ہی نے کیوں کہے۔

چندرا کہہ کیسے سکتی تھی۔

☆ ☆ ☆

"پتا نہیں کہاں کہاں کی عقلیں سمجھاتی رہیں تم لوگ..... مجھے تو بار بار وہی مثال یاد آتی یہ سونے کے انڈے دینے والی مرغی..... زیادہ لالچ میں اسے ہی ذبح کر دیا گیا تھا میرے دکھ کی انتہا کوئی نہ پوچھے..... نجانے کیسی پٹی آنکھوں سے باندھ دی نہ صحیح نظر آیا نہ غلط۔ اپنے ضمیر کی ماری سہمی سہمی ادھ مری ہو گئی میں۔ وہ گھر والوں کی محبت میں اندھی..... جسے کچھ عقل نہ آئی اور میں بھی غرض کی پتلی۔"

حسنہ بیگم بول رہی تھیں۔

ناعمہ کے چہرے پر افسوس کے ساتھ شرمندگی 'پچھتاوا تھا۔ خاموشی شاید اظہار تھا اور عائزہ کا چہرہ اس کے تاثرات پہچان میں نہ آتے تھے۔

وہ کچھ غصیلے پن سے ماں کو سن رہی تھی۔ حسرت آمیز افسوس پل کو چھب مارتا پھر دوبارہ میں کیا کروں جیسا تاثر آجاتا۔

اور فائزہ یونہی اس جانب نکل آئی تھی۔ ہر جگہ وہی موضوع گفتگو تھی۔ سو ہر جگہ سے اکتا کر اٹھ جاتی تھی ۔ یہ اس وقت ماں بہنیں کون سا قصہ لے کر بیٹھی تھیں اور اتنی محو سنجیدہ رنجیدہ 'مایوس بے بس۔ چلو کچھ تو موضوع بدلے ۔ وہ ان میں شامل ہونے کے لیے آگے بڑھی۔ مگر بڑھتے بڑھتے رک گئی۔

یہاں بھی اصدق اور فائزہ کا تذکرہ.....

مگر۔

کس انداز میں..... وہ کیا باتیں کر رہی تھیں۔ کسے لتاڑ رہی تھیں۔

اور یہ سب جو ہو گیا اس میں حسنہ بیگم کا یا کسی اور کا کیا قصور۔ یہ سب تو نصیب میں لکھا تھا اور ہو کر رہنا تھا اس کی بدنصیبی..... بس۔

اور وہ تینوں تسلی سے بیٹھی تھیں اور بس بولتی جاتی تھیں۔

ساری پلاننگ اور عمل اور طریقہ اور پیش بندیاں اور تادیب کب کیسے کیوں کر..... سب بیان کرتی جاتی تھیں۔ ایک چپ کرتی تو دوسری بولنا شروع کر دیتی۔

اور جب سب کچھ واضح ہو گیا تو پتا چلا۔

وہ اپنے ہی خونی رشتوں کے ہاتھوں مار کھا گئی تھی۔

خلوص اچھی خوبی ہے مگر عقل کے ساتھ..... کھلی آنکھوں کے ہمراہ۔

کسی کو کیا الزام دیتی' وہ خود ہر شے کی ذمے دار تھی۔

اور وہ اسے بلاتا تھا۔ اسے اپنی مجبوریاں بتاتا تھا۔ مگر وہ ایک کان سے سنتی اور دوسرے سے اڑا دیتی تھی۔

"ایسا بھی کیا اتاولا پن اور بے صبری۔ دنیا جہان کے لاکھوں مرد کمائیاں کرنے جاتے ہیں۔ دور دیس اصدق کوئی انوکھا ہے۔" کبھی دل کے بہت اندر اصدق کی پکاریں دستک دینے لگتیں تو وہ لتاڑ دیتی تھی۔

"ہاں واقعی اصدق عجیب ہی مرد ہے اور کتنا برا لگے کا شرم آئے گی کہ وہ تین روز کے لیے میاں سے ملنے جائے یا دس روز کے لیے۔

اور اصدق کی آمد پر بھی..... ناعمہ یا عائزہ گھورتیں۔

"تم کیا چوتھی کی دلہن بن کر گھومنے لگتی ہو۔ گھر میں جوان بہنیں ہیں۔"

کبھی کبھار حسنہ بیگم بھی ہنکارا بھرتیں۔

اور وہ کٹ کٹ جاتی۔ یہ اصدق بھی ناں ایک پل کے لیے بھی نظروں سے ہٹنے نہیں دیتے۔ عجیب مرد ہیں۔ ہر شخص کے پریشر سہنے کا میٹر الگ ہوتا ہے۔

اور کچھ نہیں سہہ سکتے۔

اور اصدق نہیں سہہ سکا تھا..... اس لیے..... آہ اسی لیے آج فائزہ اصدق..... اجڑ کر بیٹھی تھی۔ برباد..... ہاہ! اس نے آنکھوں میں آئی نمی کو ہتھیلیوں سے رگڑا۔ کیا آیا اس کے ہاتھ..... تہی داماں۔ سب کا سب کچھ سنور گیا۔ بس وہی رہ گئی حساب سود و زیاں کے لیے.....

"ایک بار اور کہہ کر دیکھ لیتے اصدق!" اس نے

آسمان کی جانب دیکھتے ہوئے فریاد کی۔
"لیکن اگر وہ کہہ دیتا تو کیا وہ چل پڑتی اس کے ساتھ؟"

"نہیں کبھی نہیں۔۔۔" وہ ہزار بار تو کہہ چکا تھا۔ اشارے کنائے میں بھی۔۔۔ اور صاف صاف بھی۔۔۔ مگر۔

شادی کے بعد فائزہ کی پہلی ترجیح اصدق کی منشا اور خوشنودی ہونا چاہیے تھا اور اس نے وہی اہم شق بھلا دی۔

☼ ☼ ☼

"امی کے آپریشن تک سب ٹھیک تھا اور۔۔۔ میرے پاس ہر شے کا پلان موجود تھا مگر۔۔۔ بعد میں خالہ امی کا بھی اسی بیماری میں مبتلا ہو جانا۔۔۔ میری ساری جمع پونجی ختم ہو گئی۔ میں مزدور ہی تو تھا ناں۔۔۔ قطرہ قطرہ سے دریا کرنے والا۔۔۔
میں تو اس سال کے آخر میں واپس آجانے والا تھا۔ مگر اب کیا خالی ہاتھ آتا۔۔۔ پھر سے زیرو۔
اور تمہاری بے اعتنائی۔۔۔ عائزہ کہتی تھی کہ تم۔۔۔ بازاروں میں نوٹ اڑاتی ہو۔۔۔ تمہیں پتا ہے۔ پردیس کی نوکری میں نوٹ ملتے تو ہیں مگر ایسے جیسے بھوسے کے ڈھیر سے سوئی ڈھونڈنا۔ ملے گی ضرور مگر تم نے کبھی بھوسہ کا ڈھیر دیکھا ہے۔
میں دن گن گن کر تم لوگوں کے پاس آتا۔ تمہارے پاس اور تم دامن بچا بچا کر بھاگتیں نجانے کہاں۔۔۔ مجھ سے جان بچاتیں فائزہ! مجھ سے، جس نے تمہارے سوا کسی کو نہ دیکھا۔
لیکن پھر وہ چندرا۔۔۔ وہ چندرا تھی۔
لیکن نہیں چندرا سے پہلے ظفر۔۔۔
تمہیں ایک نصیحت کروں۔ اپنے بیٹوں کے لیے۔۔۔ بلکہ نہیں اپنے بچوں کے لیے۔
ان کے دوستوں پر گہری نگاہ رکھنا۔
نائی کے بیٹوں سے دوستی ہو تو۔۔۔ تو دیگیں بنانی آجاتی ہیں۔
درزی کی دوستی ہو تو۔۔۔ بٹن ٹانکنا آجاتا ہے۔
اور ایسے ہی اگر ظفر کی دوستی ہو تو۔۔۔ سارا خلوص، محبت دردمندی اپنی جگہ لیکن اگر دوست ظفر ہو تو۔۔۔ آپ شرابی بن سکتے ہیں۔۔۔ آپ زانی ہو سکتے ہیں۔
ہاں!
میں نہیں ہوا۔ بچ گیا فائزہ۔
اور پتا ہے کیسے؟ تم یقین نہیں کرو گی۔ کوئی بھی نہیں کرے گا میں خود ابھی تک بے یقین ہوں کہ ہدایت آئی تو کہاں سے آئی۔
چندرا میری چتا بن کر بھر گئی تھی۔ پتا ہے اس نے کیا کہا۔
"تمہاری کہانی میں مجھے ذرا ترس نہ آیا۔۔۔ کوئی ہندو یا انگریز یہ داستان سناتا ناں۔۔۔ تو میں ساتھ ساتھ روتی کندھا دیتی۔ تمہارے لیے کب تھی ایسی کوئی مصیبت۔
یہ تو دوسرے مذہب کے لوگ ہیں جن کے لیے ایک عورت شرط ہوتی ہے۔ دوسری گناہ، سزا، جرم۔ تم تو نکاح کر سکتے تھے۔ ایک نہیں دو۔۔۔ دو نہیں تین اور تین نہیں چار۔۔۔ تمہارا مذہب تو تمہیں آسانی دیتا ہے۔ "مجھ جیسی کو سب کچھ پتا ہے۔ سب ہی پڑھ ڈالا۔۔۔ تو تمہیں کیوں نہیں پتا چلا تم نے کیا اپنی کتابیں نہیں پڑھیں۔"
اور ہم واقعی کتاب نہیں پڑھتے۔۔۔ ہمیں عیاشی کے لیے چار کا پہاڑہ یاد آجاتا ہے۔ مگر ضرورت کے وقت کا فتویٰ یاد نہیں رہتا۔
اور چڑھ جاتے ہیں چندرا جیسی کی سیڑھیاں۔
اور میں سوچتا رہا کہ گناہ سے بچ گیا ہوں بس یونہی جاتا ہوں۔
لیکن پتا ہے چندرا نے کہا۔
میں گناہ کر چکا ہوں۔ حیرت ہے کہ شعور نہیں رکھتا۔
تم حیران ہو رہی ہو ناں۔۔۔ چندرا اور ایسی باتیں۔ وہ ایسی ہی ہے اور میں نے تمہیں سب کچھ لکھ

کر تو دے دیا ناں۔۔۔ میں جب پہلی بار چندرا سے ملا۔ اس کا حلیہ، اس کا رنگ روپ۔۔۔ اس کا لباس اور اس کی باتیں۔ میں نے ایک لفظ بھی جھوٹ نہیں کہا۔
گناہ گار ہونے سے زیادہ خطرناک یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے گناہ کو گناہ سمجھتا ہی نہ ہو۔
اور میں نے۔۔۔
اور میں نے فائزہ! پہلے اپنے گناہ کو سمجھا اور پھر اس کی سزا کو دیکھا۔
پتا نہیں فرشتوں کے رجسٹر میں کیا درج ہے۔
مگر میں نے گناہ کیا۔۔۔ اور اگر چلو دل کی تسلی کے لیے کہہ دوں۔ نہیں بچ گیا ابھی کیا نہیں تو۔۔۔ زوؤ اگر یہ سب نہ کرتا تو خدا کی قسم اگلا قدم مجھے گناہ کی دلدل میں گھسیٹ لیتا۔
میں کوڑوں کی مار نہیں سہہ سکتا تھا۔ میں رجم و سنگسار ہونا نہیں چاہتا تھا۔ کیا تم چاہتیں کہ مجھے سنگسار کر دیا جاتا فائزہ۔
اور اس نے صبح فون پر بھی رو رو کر اس سے یہی کہا تھا۔ یہی پوچھا تھا۔
"اسی لیے۔۔۔ اسی لیے۔۔۔ بس میں نے اسی لیے دوسری شادی کر لی۔"
فائزہ نے اس آخری لائن کو ہزار بار پڑھا تھا اور ہر بار اس کے دل میں انی گڑ جاتی تھی۔
وہ اس کے نیچے والی لائن پڑھ ہی نہیں پاتی۔ ذہن کی رو پلٹ جاتی۔
وہ چندرا کے بارے میں سوچنے لگ جاتی۔
مشکی جلد والی ساحرہ۔۔۔ ایک تجربہ کار گھاگ عورت۔ کیسی دکھتی ہو گی وہ۔۔۔ کیسے جھیلا جائے گا اس کو۔
وہ ہارے جواری کی طرح آخری لائن پڑھے بغیر خط کو مٹھی میں بھینچ چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

سجے بنے اس کمرے میں آج تاریکی کا راج تھا۔

ایسا کہ ہاتھ کو ہاتھ نہ سجھائی دے۔ یکدم اندر آنے والے کو تو کچھ پتا نہ چلتا مگر وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے اسٹول پر بیٹھی تھی اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اپنے ہی عکس کو کھوج رہی تھی۔

سیاہ تاریک کمرے میں بیٹھی ۔۔۔ سیاہ عورت۔

اس کی نگاہیں اندھیرے سے مانوس تھیں۔ وہ اپنی ہی آنکھوں کو دیکھ کر دکھی تھی۔ بہتی ڈبڈبائی ویران سوچی نظریں ان کے خالی پن سے اسے خود خوف محسوس ہو رہا تھا۔ پپڑی زدہ لبوں پر پیاس ثبت ہو چکی تھی۔

وہ بار بار زبان پھیر کر انہیں تر کرتی مگر بے سود۔

ہونٹوں پر نمی تھی۔ آنسوؤں کا نمک ۔۔۔ اور زندگی میں مٹھاس پہلے ہی کب تھی۔ تلخی ۔۔۔ مگر تلخی کا احساس۔

کیا چلا گیا وہ شخص ۔۔۔؟

سچ کہتے ہیں۔ طوائف کو دل نہیں لگانا چاہیے۔ مگر اس نے دل تو نہیں لگایا تھا بس خود بخود ہی نجانے کب ۔۔۔ کیا ہو گیا اور کیوں ۔۔۔

طوائف کو انتظار نہیں کرنا چاہیے۔ کوئی آتا ہے تو آئے اور نہیں تو نہ سہی ۔۔۔ رنگ برنگے لوگ گھڑی بھر کے مہمان ۔۔۔

یونہی جیسے کوئی چلتے چلتے مل جائے سر راہ ۔۔۔

ہر رات کی پامالی اتنی اذیت ناک نہیں تھی بلکہ احساس بھی نہیں تھا۔

دہلیز پہ ٹوٹے ہوئے پیالے کی مانند
اک شخص نے پھینکا ہے مجھے پیاس بجھا کے

اور ہمیشہ یہی ہوا تھا چندرا کے گھر پر ۔۔۔ پھر اس بار یہ کیا کہ رونا اس بات کا تھا کہ وہ چھوئے بنا چلا گیا۔

کون تھا وہ۔

کہاں سے آ گیا۔

راستہ بھٹک جانے والا ۔۔۔ پتا نہیں کیوں آ گیا تھا۔ وہ ہنستی بستی خود میں مگن چندرا کی زندگی میں طوفان برپا کر دینے۔

کتنی مزے دار آسودہ زندگی تھی۔

بے فکری ہنسی نیند خوش باشی وہ من پسند لباس زیب تن کرتی۔ اپنی نیند سوتی اپنی جاگتی۔

نہ گناہ کا احساس نہ ثواب کی جستجو۔ زندگی بس جسم تھی۔ روح اور دل نہیں اور دل کے اندر صرف خوشی کا خانہ نہیں ہوتا۔

دل دکھتا ہی ہے۔

اور

چندرا کا دل دکھ گیا تھا

کیسا شخص تھا کہاں چلا گیا دوبارہ لوٹا ہی نہیں اور کتنی بڑی بے وقوفی ہو گئی چندرا تجھ سے ۔۔۔ آنے دیتی اسے ایسے ہی ۔۔۔ کیوں جھپٹ لینے کا قصد کر لیا ایک شخص کو دل کے لیے اور آنکھوں کے لیے بھی تو رہنے دیتی۔

کوئی ہو جاتی ہے ایسی بے وقوفی ۔۔۔ پورا کا پورا ہڑپ کر لینے کی خواہش ۔۔۔ ہمیشہ ہاتھ ملنے پر لے آتی ہے۔

اور باہر دمکتی گنگناتی رات محو رقص تھی۔

اور اندر وہ کیا شام غریباں منا رہی تھی۔

اور شام غریباں ہر روز تو منائی نہیں جاتی۔ تو پھر وہ کیوں سر شام بال کھول کر اجڑے اجڑے حالوں میں اندھیرا کر کے اپنے نقش کھوجنے لگتی تھی۔ اور خود کو کوسنے ۔۔۔ اور یاد کرنے۔

اور اس شخص کو ڈھونڈنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ رینو کا میاں رنگیلا (ظفر) تو اب بھی دہلیز پر آیا کرتا تھا۔

لیکن اگر وہ اسے ڈھونڈ بھی لے تو کیا کرے گی۔ کیا یہاں لے آئے گی۔ کیا اسے اپنے پاس رکھ لے گی؟ مگر رکھ کے کیا کرے گی؟

وہ رکھنے کی چیز ہی نہیں تھا۔

اسے چلے ہی جانا تھا۔

مگر ۔۔۔ گیا کیوں؟ اس نے جانے ہی کیوں دیا۔

وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

اور وہ ہر روز اسی طرح بے آواز روتی تھی۔ مگر رونے سے جانے والے واپس تھوڑی آتے ہیں۔ اور اگر جانے والا اصدق جیسا ہو ۔۔۔ جو آیا ہی نہیں تھا۔ بس یونہی خوامخواہ لایا گیا تھا۔ غلطی سے بھٹک گیا تھا۔ بھٹک گیا تھا لہٰذا احساس ہوا تو پلٹ گیا۔

وہ اب زندگی بھر ماتم مناتی رہے۔ مگر کیا حاصل ۔۔۔ چندرا کی زندگی میں کوئی نیکی نہ تھی۔ وہ گناہوں میں یوں لتھڑی تھی جیسے کیچڑ میں ڈبکی کھا کر آئی ہو۔

مگر اصدق کی واپسی کا ایک کارن تو وہ بھی تھی۔

اس کے جملے ۔۔۔

اور اللہ ہر شے لکھواتے رہتے ہیں۔ نیکی بھی بدی بھی فرشتوں کو سونپ رکھا ہے یہ کام۔

ہاں۔

مگر فیصلہ خود کرتے تھے۔ تو شاید چندرا بھی بخشش جائے۔

دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے جائیں۔ اتنا حق تو وہ رکھتی ہے ناں۔

☼ ☼ ☼

اور خدیجہ بہت اچھی ہے۔ وہ سالوں سے اسے جانتا تھا۔ وہ اس کی کمپنی میں کام کرتی تھی۔ وہ مینٹیننس ڈیپارٹمنٹ تھا اور وہ لیدر گارمنٹس میں سلائی کرتی تھی اور جب اس کی شادی ہوئی تب بھی وہ اسے دیکھتا تھا۔ خوش بے حد خوش ۔۔۔ اور پھر جب وہ بیٹے کی ماں بنی ۔۔۔ تب خوشی اس کے قدموں سے پازیب کی طرح بندھ گئی تھی۔ ہر جنبش پر بج اٹھتی۔

پھر اس نے یہ بھی دیکھا کہ وہ بیوہ ہو گئی۔

اس کی بھاری پپوٹوں والی آنکھوں میں غم کاجل کی لکیر کی طرح پھر گیا تھا اور پھر جب اس کا بیٹا ایک حادثے کا شکار ہو کر چٹ پٹ ہو گیا۔ تب ان سوچی آنکھوں میں میں دکھ سیاہ رات بن کر ٹھہر گیا۔

سفید اسکارف میں اس کا گول گیند چہرہ ۔۔۔ اور موٹی آنکھیں جو گالوں میں دھنس کر اور چھوٹی دکھتیں ۔۔۔ ناک پکلے عام سی تھی (ہاں اب لونگ کے بعد کچھ بہتر لگتی تھی)

وہ سر جھکائے آتی تھی اور جاتی تھی۔ خاموش اپنے کام میں مگن ۔۔۔ تنہا اداس بے بس ۔۔۔

لیکن اصدق کی زندگی میں شامل ہو کر وہ مسکرانے لگی تھی۔ وہ اب بھی کام کرتی تھی مگر اصدق کی غیر موجودگی میں۔ اسے ملیشیا میں رہنے والے اپنے بوڑھے والدین کو سپورٹ جو کرنا ہے اور اصدق نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔

ہاں مگر جب اصدق ہو تو وہ اس کے سامنے ہی رہے۔

اور فائزہ اصدق کے خط کو ہمیشہ ادھورا پڑھتی رہی۔ وہ تصور کی آنکھ سے چندرا کو دیکھتی اور سب باتوں پر یقین کرنے کے باوجود ڈگمگا جاتی کہ اصدق چندرا کی زلفوں کا اسیر ہو گیا تھا اور اس لیے اس نے اس سے ۔۔۔ وہ تمام حقیقتوں سے واقف ہونے کے باوجود ۔۔۔ اس بات پر آ کر متزلزل ہو جاتی۔

چندرا ۔۔۔ چندرا ۔۔۔

لیکن وہ بھونچکی رہ گئی۔

اسکائپ پر ڈری جھجکی موٹے موٹے نین نقش والی وہ عورت ۔۔۔ وہ تھی اصدق کی زندگی کی ساتھی۔

وہ سچ کہہ رہا تھا۔ خدیجہ کو دیکھ کر یقین آ گیا۔

زندگی پر پیچ ہوتی ہے۔ اونچے نیچے راستے پتھر جھاڑیاں ڈگمگا دینے کی سو تاویلیں۔

مگر انسان کو اشرف المخلوقات بنا کر یہ اختیار دے دیا گیا کہ وہ سب رکاوٹیں ہٹا کر اپنے لیے راستوں کو سیدھا کر لے۔

اور سیدھے راستے کی موجودگی میں گھاٹیوں پر قدم جمانے والے ۔۔۔ منہ کے بل گرتے ہیں۔ منہ اور سر پر خاک پڑتی ہے اور حصے میں آتی ہے لعن طعن ۔۔۔

مہم جوئی اچھی بات ہوتی ہے۔ مگر سیدھی سڑک کے ہوتے ہوئے کٹھنائیوں کو راہ گزر بنانے والے ذلیل و خوار ہوں نہ ہوں ۔۔۔ بعض اوقات گناہ گار ضرور ہو جاتے ہیں۔

☼

نگہت عبداللہ

میرے خواب لوٹا دو

توصیف احمد اور یاسمین کا ایک بیٹا حماد اور دو بیٹیاں سارہ اور اریبہ ہیں۔ یاسمین کی مستقل بد مزاجی اور بد زبانی سے تنگ آکر توصیف احمد نے اپنے بڑے بھائی کی سالی خالدہ سے دوسری شادی کرلی۔ اس بات پر یاسمین اپنے جیٹھ جٹھانی سے بھی شاکی ہے۔ اریبہ ماں سے قریب ہے، جبکہ سارہ اپنے باپ سے محبت کرتی ہے۔ اریبہ کی منگنی اس کے تایا زاد، اجلال رازی سے ہوچکی ہے جو اعلا تعلیم کے لیے امریکہ گیا ہوا ہے۔ یاسمین، اریبہ کو باپ اور ددھیالی رشتے داروں کے خلاف بھڑکاتی رہتی ہے۔ اریبہ کو جب باپ کی دوسری شادی کا پتا چلتا ہے تو وہ اپنے تایا اور تائی سے بھی بدظن ہوجاتی ہے اور اجلال سے منگنی بھی توڑ دیتی ہے۔ اجلال اریبہ سے محبت کرتا ہے اور یہ رشتہ ختم نہیں کرنا چاہتا۔

وہ اس بارے میں اریبہ سے بات کرتا ہے، مگر وہ خاصی روکھائی سے پیش آتی ہے، تاہم وہ تحمل سے کام لیتا ہے کیونکہ وہ یہ مسئلہ بردباری کے ساتھ حل کرنا چاہتا ہے۔ اریبہ بے حد خود سر ہوتی جارہی ہے۔ وہ ماں کی شہ پر سب کی مرضی کے خلاف موٹر سائیکل لے لیتی ہے۔ سارہ کا کزن سمیر اس سے اظہار محبت کرتا ہے۔ سارہ بھی اسے پسند کرتی ہے مگر وہ کھل کر اپنے جذبات کا اظہار نہیں کرتی۔

شمشیر علی شہر میں ملازمت کرتا ہے۔ اسے گاؤں میں مقیم اپنی بہن تاجور کی فکر رہتی ہے۔ کیونکہ وہ وہاں سوتیلی ماں کے ظلم و ستم اور باپ کی عدم توجہ کا شکار ہے۔ وہ تاباں کو پسند کرتا ہے۔ وہ اپنے باپ کو فون کرتا ہے کہ تاباں کے باپ سے رشتے کی بات کرے تاکہ وہ شادی کے بعد تاجور کو اپنے ساتھ رکھ سکے۔

تاباں کا باپ بدلے میں اپنے لیے تاجور کا رشتہ مانگ لیتا ہے۔ شمشیر غصہ میں تاباں سے اپنا راستہ الگ کر لیتا ہے اور تاجور کو اپنے ساتھ شہر لے آتا ہے۔ تاجور کو ٹی بی ہوتی ہے۔ وہ اسے اسپتال داخل کروا دیتا ہے۔

اریبہ 'یاسمین کو شہباز درانی کے ساتھ گاڑی میں دیکھ لیتی ہے۔ اسے ناگوار لگتا ہے 'مگر یاسمین جھوٹی کہانی سنا کر اسے مطمئن کر دیتی ہے۔ ٹی بی کے مریض کی کیس ہسٹری تیار کرنے کے سلسلے میں اریبہ کی ملاقات تاجور سے ہوتی ہے۔

اجلال رازی 'اریبہ سے ملنے اس کے گھر جاتا ہے۔ سارہ کو کھڑکی میں مگن کھڑے دیکھ کر شرارت سے ڈرا دیتا ہے۔ وہ اپنا توازن کھو کر گرنے لگتی ہے تو اجلال اسے بازوؤں میں تھام لیتا ہے۔

یاسمین اور شہباز درانی کی نازیبا گفتگو سن کر اریبہ غصے میں بائیک لے کر نکل جاتی ہے۔ اس کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے۔ شمشیر علی بروقت اسپتال پہنچا کر اس کی جان بچا لیتا ہے۔ اسی اسپتال میں تاجور بھی داخل ہے۔ اریبہ ہوش میں آنے کے بعد اپنے رویے اور سوچ پر نادم ہوتی ہے۔ شمشیر علی 'توصیف احمد کے آفس میں کام کرتا ہے۔ توصیف احمد اسے سیف سے ایک ضروری فائل نکال کر جیلانی صاحب کو دینے کے لیے کہتے ہیں۔ بعد میں انہیں پتا چلتا ہے کہ سیف میں سے فائل کے ساتھ ستر لاکھ روپے بھی غائب ہیں۔

وہ شمشیر پر رقم چوری کا الزام لگاتے ہیں تو وہ پریشان ہو جاتا ہے۔ اریبہ 'ماں کی اصلیت جان کر بالکل بدل جاتی ہے اور مضطرب رہنے لگتی ہے۔

رازی 'اریبہ سے ملنے جاتا ہے تو اریبہ اس کی باتیں سن کر کچھ الجھ سی جاتی ہے۔ تاجور کو اسپتال سے باہر روتے دیکھ کر اریبہ اسے اپنے ساتھ گھر لے آتی ہے۔

توصیف احمد کے سابقہ چوکیدار الیاس کی نشاندہی پر شمشیر کی بے گناہی ثابت ہو جاتی ہے۔ وہ رہا ہو کر دل گرفتہ سا اسپتال جا کر تاجور کا معلوم کرتا ہے مگر اسے صحیح معلومات نہیں مل پاتیں۔ اسپتال کا چوکیدار فضل کریم اسے اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ وہاں سے شمشیر اپنے گاؤں جاتا ہے۔ مگر ابا کو تاجور کی گمشدگی کے بارے میں نہیں بتاتا۔ تاباں کی شادی ہو جاتی ہے۔

یاسمین 'اریبہ کی جلد از جلد شادی کرنے کی فکر میں پڑ جاتی ہے۔ مگر اریبہ دوٹوک انداز میں منع کر دیتی ہے۔ یاسمین چالاکی سے اپنے گھر تمام رشتے داروں کو دعوت پر مدعو کرتی ہے۔ اجلال مضطرب سا دعوت میں شریک ہوتا ہے۔ اسے دیکھ کر اریبہ مزید الجھن کا شکار ہوتی ہے۔

بلال اسٹڈی کے لیے امریکہ چلا جاتا ہے۔ اجلال 'اریبہ سے محبت کا اظہار کرتے کرتے اچانک گریزاں ہو جاتا ہے۔ اجلال بے حد نادم ہوتا ہے۔ سارہ اسے سب کچھ بھولنے کا کہتی ہے۔ وہ ڈھکے چھپے لفظوں میں سمیر سے بات کرتی ہے۔ مگر اس کی طرف سے سخت جواب ملتا ہے۔ شمشیر کو اسپتال میں اریبہ نظر آجاتی ہے۔ وہ اس سے شدید نفرت محسوس کرتا ہے اور کالج سے واپسی پر اسے اغوا کر لیتا ہے۔

اریبہ کے اغوا ہو جانے پر سب پریشان ہو جاتے ہیں۔ اجلال 'ساجدہ بیگم سے کہہ دیتا ہے کہ اب وہ اریبہ سے شادی نہیں کرے گا۔ شمشیر اریبہ سے تمیز سے پیش آتا ہے۔ کچھ دن بعد اریبہ کو محسوس ہوتا ہے کہ اس نے شمشیر کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔

شمشیر علی کو اریبہ اچھی لگنے لگتی ہے۔ وہ اریبہ کو اپنا سیل فون دے دیتا ہے کہ وہ جس سے چاہے رابطہ کرلے۔ اریبہ اجلال کو فون کرتی ہے 'مگر وہ سرد مہری سے بات کرتا ہے تو اریبہ کچھ بتائے بغیر فون بند کر دیتی ہے۔ شمشیر علی نے ابراہیم نامی بچے سے اسکیچنگ سیکھ کر تاجور کی تصویر بنائی تو اریبہ اسے دیکھ کر فوراً" پہچان گئی۔ اس نے شمشیر کو بتایا کہ اریبہ اس کے گھر میں حفاظت سے ہے۔ شمشیر اب اریبہ کو واپس پہنچانا چاہتا تھا 'لیکن اریبہ نہیں چاہتی ہے کوئی شمشیر علی کو مجرم سمجھے۔ وہ ایک منصوبہ بناتی ہے۔ جس کے تحت شمشیر علی اسے اسپتال میں داخل کرا کے توصیف احمد کو اطلاع کر دیتا ہے۔ توصیف احمد اس کے ساتھ اسپتال جاتے ہیں اور اریبہ کو گھر لے آتے ہیں۔

اریبہ کو دیکھ کر اجلال کو محسوس ہوا کہ وہ اس کی محبت سے کبھی دستبردار نہیں ہو سکتا مگر پھر ساجدہ بیگم سے سارہ سے شادی کرنے کی خواہش کا اظہار کر دیتا ہے۔ وہ ناراض ہو جاتی ہیں۔ ثنا 'سمیر کو فون پہ بتا دیتی ہے۔ وہ سارہ سے پوچھتا ہے 'پھر جواب نہ پا کر اریبہ کو بتا دیتا ہے۔ اریبہ 'سارہ سے ناراض ہو جاتی ہے۔ اریبہ اپنے والد کے دفتر میں اجلال سے اشاروں 'کنایوں میں اس بات کی تصدیق کرتی ہے۔ اجلال کے چہرے کے تاثرات سے اسے جواب مل جاتا ہے۔ سارہ حالات سے خوف زدہ ہو کر خودکشی کرنے کی کوشش کرتی ہے۔

— ۲۰ —

بیسویں قسط

اریبہ نے چاہا کہ وہیں سے واپس پلٹ جائے لیکن اسی پل توصیف احمد کی نظر اس پر پڑی تھی۔ تب ناچار اسے رکنا پڑا۔

"السلام علیکم ڈیڈی!"

"وعلیکم السلام کیسی ہو بیٹا؟" توصیف احمد کا مخصوص انداز تھا۔

"جی!" اس کی نظریں بلا ارادہ شمشیر علی کی طرف اٹھ گئیں۔

"بیٹا! یہ شمشیر علی ہے۔" توصیف احمد تعارف کرانے جا رہے تھے کہ وہ بول پڑی۔

"جی ڈیڈی! میں جانتی ہوں انہیں۔ مجھے انہوں نے ہی اسپتال پہنچایا تھا۔" وہ بہت اعتماد سے بولی۔

"لیکن آپ یہ نہیں جانتی ہوں گی کہ جو لڑکی آپ کے زیر علاج رہی ہے 'وہ اس کی بہن ہے۔" توصیف احمد نے کہا تو وہ ذرا سا ہنس کر بولی۔

"یہ بھی جانتی ہوں ڈیڈی! ابھی کچھ دن پہلے ہی مجھے پتا چلا ہے اور ابھی غالباً" یہ اپنی بہن سے ملنے آئے ہیں۔" اس نے کہتے ہوئے شمشیر علی کو دیکھا تو اس نے یوں آہستہ سے نفی میں سر ہلایا جیسے بہن سے نہیں تم سے... وہ سٹپٹا گئی۔

"آپ بیٹھیں 'تاجور ابھی آرہی ہے۔"

"ہاں بیٹھو شمشیر علی! میں فریش ہو کر آتا ہوں۔" توصیف احمد نے کہا پھر جاتے جاتے اریبہ سے پوچھنے لگے۔

"آپ کی مما کا فون آیا بیٹا؟"

"جی ڈیڈی! مما خیریت سے پہنچ گئی ہیں۔"

"ہوں۔" توصیف احمد آگے بڑھ گئے تب وہ شمشیر علی کو دیکھ کر پوچھنے لگی۔

"کیا کہا ہے تم نے ڈیڈی سے؟"

"سب کچھ... اسیری سے رہائی تک کی ساری داستان سنا ڈالی پھر کہا مجھے اپنی غلامی میں لے لیں۔" اس کی سنجیدگی میں چھپی شرارت محسوس کر کے وہ بے ساختہ بولی تھی۔

"ڈیڈی نے کہا ہوگا' منہ دھو رکھو۔"

"نہیں' وہ بخوشی تیار ہو گئے جب ہی تو میرا ہاتھ پکڑ کر اندر لے آئے اور ابھی جاتے جاتے مجھے اشارہ کر گئے ہیں کہ تم سے بات کرلوں۔ بلکہ بات تو میں کرچکا ہوں۔ اب تمہارا جواب چاہتا ہوں۔" وہ کہتے ہوئے اطمینان سے بیٹھ گیا۔

اریبہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ شمشیر علی کے انداز اور اطمینان نے اسے مخمصے میں ڈال دیا تھا۔ واقعی سوچنے والی بات تھی تو صیف احمد اسے رہائشی خطے میں کیوں لے آئے تھے۔

"کیا سوچنے لگیں۔ میرا تو خیال تھا تم ہر پہلو سے سوچ چکی ہوگی اور اس انتظار میں ہوگی کہ کب میرا سامنا ہو اور تم۔۔۔"

"بس خاموش ہو جاؤ۔" وہ اس کی شوخی پر بند باندھ کر پلٹی اور پھر تاجور کو اس کے پاس بھیج کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

✲ ✲ ✲

سمیر نے مصلحتاً" اریبہ سے جھوٹ بولا تھا کہ وہ سارہ کے لیے امینہ سے بات کرچکا ہے۔ گو کہ اس کے لیے یہ کچھ مشکل نہیں تھا لیکن جس طرح سارہ قریب آتے آتے دور ہوتی جارہی تھی' اس سے وہ پریشان ہو گیا تھا اور اپنے طور پر ہی اس کوشش میں لگا ہوا تھا کہ پہلے سارہ سے اقرار کروالے پھر امینہ سے بات کرے گا اور سارہ پہلے تو اس کی باتوں کو مذاق میں اڑاتی تھی اور اب تو بات ہی نہیں کرتی تھی۔ اس کے خیال میں وہ نادان تھی اور رازی کے بہکاوے میں آگئی تھی۔ بہرحال اب جب اریبہ نے اس سے کہہ دیا تھا کہ وہ خالی باتیں کرنے کے بجائے عملی طور پر آگے بڑھے تو اسے کچھ اطمینان ہوا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اریبہ اپنی بات منوانا جانتی ہے اور وہ یاسمین کو اس کے حق میں ہموار کرلے گی' اس لیے وہ اس وقت امینہ کے پاس آبیٹھا تھا۔

"امی! وہ ایک بات کہنی ہے۔" اس نے کہا تو امینہ اس کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

"ہاں کہو' کیا بات ہے؟"

"وہ امی! میں سارہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔" وہ رکا ضرور لیکن صاف لفظوں میں اپنی بات کہہ کر امینہ کو دیکھنے لگا تھا۔

"سارہ سے!" امینہ سوچ میں پڑ گئیں۔

"سارہ اچھی ہے امی!" اس نے کہا تو امینہ ایک دم اسے دیکھ کر بولیں۔

"ہاں تو میں کب کہہ رہی ہوں اچھی نہیں ہے۔ بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے بھی تمہارے لیے یہی سوچ رکھا تھا۔"

"سچ امی!" وہ خوش ہو گیا۔

"ہاں۔ لیکن بیٹا! میں سوچتی ہوں یاسمین ہمارے خاندان میں نہیں رچی بسی تو پتا نہیں بیٹیوں کو بسنے دے گی کہ نہیں۔ اریبہ کا بھی دیکھو' رشتہ ختم کروا کے ہی دم لیا ہے اس نے۔" امینہ کا خدشہ غلط نہیں تھا۔

"ان باتوں کو چھوڑیں امی! آپ میری بات کریں اور آپ یاسمین آنٹی سے نہیں تو صیف ماموں سے بات کریں۔" سمیر نے ٹوکتے ہوئے کہا۔

"توصیف بھائی بھی یاسمین کی مرضی کے بغیر نہیں چلیں گے' کیونکہ یاسمین ماں ہے۔ شادی بیاہ کے معاملات توصیف بھائی اکیلے طے نہیں کرسکتے۔" امینہ قدرے مایوسی سے بولی تھیں۔

"تو ٹھیک ہے یاسمین آنٹی آجائیں تو پھر آپ۔۔۔"

"یاسمین کہاں سے آجائے؟" امینہ نے اس کی بات کاٹ کر پوچھا۔

"وہ اپنے میکے گئی ہیں۔" سمیر نے بتایا تو وہ اچھل پڑیں۔

"ہائیں! کون سا میکہ۔ ہم نے تو آج تک کسی کو نہیں دیکھا۔ توصیف بھائی بیاہ کرلائے تھے اسے' جہاں سے پھر نہ کوئی اسے پوچھنے آیا' نہ اس کے منہ سے کسی کا نام سنا۔"

"یہ سب میں نہیں جانتا۔" وہ اکتا کر بولا۔

"ہاں تم بس سارہ کو جانتے ہو۔" امینہ اپنی دھن میں کہہ گئیں۔

"سارہ کو آپ بھی جانتی ہیں امی! وہ آپ کا خون ہے اور آپ کو اپنے خون پر بھروسا ہونا چاہیے۔" اس نے کہا تو امینہ خاموش ہو گئیں۔

"پھر آپ بات کریں گی ناں توصیف ماموں اور یاسمین آنٹی سے۔"

"ہاں کیوں نہیں۔ ضرور کروں گی۔ آگے جو اللہ کو منظور۔۔۔ کب تک آئے گی یاسمین!" امینہ نے ہامی بھر کر پوچھا۔

"پتا نہیں۔ میرا خیال ہے ثنا کی شادی تک تو آجائیں گی۔"

"ہاں ثنا کی شادی میں اب کچھ ہی دن ہیں۔" ساجدہ بیگم نے کہا پھر ایک دم کچھ یاد آنے پر بولیں۔

"سنو! رازی بھی تو شادی کے لیے سارہ کا نام لے رہا تھا۔"

"رازی بھائی کا دماغ خراب ہے۔" سمیر ایک دم جذباتی ہو گیا تھا۔

"ہیں ہیں!" امینہ سمیر کی گستاخی پر سرزنش کرنے لگیں۔ "تمہارے برابر ہے رازی جو تم اس طرح بات کر رہے ہو۔"

"میرے برابر ہوتے تو مزا چکھا دیتا۔ آپ خود سوچیں امی! اریبہ سے منگنی توڑنے کے بعد رازی بھائی کو یہ زیب دیتا ہے کہ وہ سارہ کا نام لیں۔"

"اچھا تمہیں اس معاملے میں بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ساجدہ بھابھی خود رازی کی اس بات سے نالاں ہیں۔" امینہ نے نرم پڑتے ہوئے کہا تو وہ سر جھٹک کر اٹھ کھڑا ہوا۔

✲ ✲ ✲

ابھی اتنی زیادہ رات نہیں ہوئی تھی لیکن چھوٹے شہروں میں عشا کے بعد ہی سناٹا چھا جاتا ہے۔ یاسمین نے آنگن میں دو چارپائیاں ڈال دی تھیں اور اب اماں کے ساتھ لیٹی تھی۔ طویل مدت بعد وہ تاروں بھرا آسمان دیکھ رہی تھی۔ اسے لگا جیسے تارے بھی اسے دیکھ کر حیرت سے پلکیں جھپک رہے ہوں۔ کتنی دیر تاروں کے ساتھ خاموش گلے شکوے ہوتے رہے۔ پھر ایک تارہ ٹوٹنے پر اس نے گھبرا کر دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا لیا جیسے بچپن میں چھپایا کرتی تھی اور اسی طرح گھبرا کر پکارا تھا۔

"اماں۔"

"ہاں!" اماں غنودگی میں تھیں۔

"اماں! تارہ ٹوٹا ہے۔" اس کی سہمی آواز اماں کی بوڑھی کھلکھلاہٹ میں دب گئی۔

"اے پگلی! ابھی بھی ڈرتی ہے۔"

"ابھی بھی۔" وہ ہاتھ نیچے کھسکا کر اماں کو دیکھنے لگی۔ "کیا میں پہلے بھی ڈرتی تھی۔"

کے مجھے یاد نہیں۔" اماں نے کہا تو وہ خاموش ہو گئی۔ اس نے بھی پلٹ کر دیکھا ہی نہیں تھا۔

"یاسمین!" کتنی دیر بعد اماں نے اسے پکارا تو اس کے منہ سے ہوں کی آواز نکلی تھی۔

"جب تو بیاہ کر چلی گئی تھی تو میں تیرے ابا کے ساتھ بہت لڑی تھی کہ اس نے تجھ پر ظلم کیا ہے پر تیرے ابا بہت آرام سے کہتے تھے۔ یاسمین ابھی کم عقل ہے، اسے کھوٹے کھرے کی پہچان نہیں ہے، جب سیانی ہو گی تب اسے پتا چلے گا کہ میں نے ٹھیک کیا ہے یا غلط۔" اماں کہہ کر خاموش ہو گئیں تو تاروں کی مدھم روشنی میں یاسمین ان کا چہرہ دیکھنے لگی۔

"جب سال پر سال گزرے تو میں پریشان ہو گئی۔ اللہ سے پوچھتی، میری یاسمین کب سیانی ہو گی۔ اسے کب کھوٹے کھرے کی پہچان ہو گی۔ وہ کب آکر کہے گی کہ اس کے ابا نے ٹھیک کیا تھا۔" اماں پھر اپنے آپ بول کر خاموش ہو گئیں تو وہ ایک دم اٹھ بیٹھی۔

"ابا نے ٹھیک کیا تھا اماں!"

"پھر تو نے آنے میں دیر کیوں کر دی؟" اماں کی آواز میں کرب سمٹ آیا تھا۔

"کیونکہ میں ٹھیک کو غلط ثابت کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ میں نے اپنے ساتھ بہت ظلم کیا اماں! بہت ظلم کیا۔" وہ اعتراف کرتے ہوئے رو پڑی۔

"ابا نے میرے لیے خوش بختی کا در کھولا تھا لیکن میں بدبخت اپنے ہاتھوں سے در بند کرتی رہی۔ میں نے سب کچھ پا کر بھی کھو دیا اماں..... سب کھو دیا۔ شوہر کی محبت بچوں کا اعتماد میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ میں بالکل خالی ہاتھ ہوں۔" اس کے رونے میں شدت آگئی۔

"یہ تو کیا کہہ رہی ہے بیٹی؟" اماں لرز گئی تھیں۔

"ہاں اماں! میں نے آپ کو ابا کو اپنے لیے ترسایا تو اللہ نے میری قسمت میں بھی ترسنا لکھ دیا ہے۔ میرے بچے میرے سامنے ہیں لیکن میں انہیں نظر بھر کر دیکھ نہیں سکتی۔ میری لغزشوں نے ہمارے بیچ دیوار کھڑی کر دی ہے۔" وہ ہچکیوں سے رو رہی تھی۔

"یاسمین..... یاسمین!" اماں اس کا بازو پکڑ کر اپنی طرف کھینچنے لگیں "توصیف تو کہتا تھا۔ تو بہت خوش ہے۔"

"ہاں میں اسے جلا کر خوش ہوتی تھی۔ اس کی نفی کر کے خوش ہوتی تھی۔ اسے میں نے کوئی خوشی نہیں دی۔ پھر بھی اس نے مجھے برداشت کیا۔ وہ انسان نہیں فرشتہ ہے اماں! ابا نے مجھ پر نہیں اس فرشتے پر ظلم کیا تھا۔ میں اس کے قابل نہیں تھی اور میں نے اس کے قابل بننے کی کوشش بھی نہیں کی۔ میں بہت بری ہوں اماں! میں بہت بری ہوں۔ مجھے اللہ معاف نہیں کرے گا۔"

"نہ نہ بیٹی! ایسا نہ کہہ۔" اماں نے یاسمین کا سر اپنے سینے پر رکھ لیا اور اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولیں۔

"چل! چپ کر مجھے اور دکھ نہ دے۔"

"بہت دکھ دیے ہیں نا میں نے آپ کو۔" وہ تڑپ کر بولی۔

"چل بس چپ کر۔" اماں نے پھر ٹوکا۔

"پہلے آپ مجھے معاف کر دیں۔ دل سے معاف کریں مجھے۔" وہ اماں کے دونوں ہاتھ تھام کر منت کرنے لگی۔

"ہاں ہاں چپ کر جا کچھ نہیں ہوا۔ معافی مانگنی ہے تو توصیف سے مانگ۔ اسے خوش رکھ۔ سکھ دے اسے۔ وہ خوش ہو گا تو اللہ بھی خوش ہو گا تجھ سے۔ تیرا سائیں ہے۔ سائیں کو ناراض نہ کر۔"

اماں بولے جا رہی تھیں اور توصیف احمد کے سامنے جھکنے کے تصور سے یاسمین کا دل بیٹھنے لگا تھا۔

☼ ☼ ☼

گہری نیند سے اچانک اریبہ کی آنکھ کھلی تھی۔ ناسمجھی کے عالم میں وہ اپنے آس پاس دیکھنے لگی۔ گمان ہو رہا تھا کہ شاید کسی نے اسے اٹھایا ہے۔ لیکن کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ اس نے سیل فون اٹھا کر ٹائم دیکھا۔ رات کے تین بج رہے تھے۔ یہ غفلت کا وقت تھا۔ لیکن وہ یوں بیدار ہوئی تھی۔ جیسے ہمیشہ سے اس کا یہ ہی معمول رہا ہو۔ وہ پہلے حیران ہوئی۔ پھر اس کا دھیان یاسمین کی طرف چلا گیا۔ شاید اس کے لاشعور میں یہ بات تھی کہ گھر میں یاسمین نہیں ہے۔ اس لیے اسے خیال رکھنا ہے۔ جب ہی اس نے فوراً" دوبارہ سونے کی کوشش نہیں کی اور کمرے سے نکل آئی۔ پھر پہلے حماد کے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ وہ بے خبر سو رہا تھا۔ اس کی طرف سے مطمئن ہو کر اس نے سارہ کے کمرے کا رخ کیا تھا کہ لائی سے آتی آواز پر اس کے قدم رک گئے۔

"نہیں رازی! آپ سمجھ نہیں رہے۔" سارہ، رازی کو جانے کیا سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اریبہ نے اس وقت کچھ نہیں سوچا۔ تیزی سے پلٹ کر سٹنگ روم میں آئی اور بہت احتیاط سے کارڈلیس کا بٹن دبا کر کان سے لگا لیا۔

"میں سمجھتا ہوں سارہ!" رازی کہہ رہا تھا۔ "جب تک اریبہ کی شادی نہیں ہو جاتی۔ میری پیش رفت کا کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا۔ تم یہی کہنا چاہتی ہو ناں! کہ اریبہ کی شادی تک انتظار کروں۔"

"ہاں....."

"ٹھیک ہے! لیکن یہ میں تمہیں بتا دوں کہ اریبہ کی شادی ہو گئی۔ تب بھی وہ ہمارے رشتے میں رکاوٹ ضرور ڈالے گی۔ ابھی بھی وہ رکاوٹ بنی ہوئی ہے۔"

رازی نے کہا تو جہاں سارہ خاموش ہو گئی، وہاں اریبہ کے اندر محشر بپا ہو گیا تھا۔ آنکھیں بھی دھندلا گئی تھیں۔

"رکاوٹ؟" اس نے کارڈلیس رکھ دیا اور خود کو گھسیٹتے ہوئے اپنے کمرے میں آتے ہی بیڈ پر ڈھے گئی۔ وہ اپنی ہی نظروں میں بے وقعت ہو گئی تھی۔

"اور کتنے زخم لگنے باقی ہیں۔ کبھی بدکردار ٹھہرائی جاتی ہوں، کبھی رکاوٹ۔ سارہ بھی یہ ہی سمجھتی ہے۔ میں اس کے اور رازی کے درمیان رکاوٹ ہوں..... نہیں۔"

وہ تکیے میں منہ چھپا کر سسک پڑی۔ دکھ اپنی ماں جائی پر تھا، جو مسلسل اس کی آنکھوں میں دھول جھونک رہی تھی اور اب وہ اس سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتی تھی۔ جانے وہ اپنے ساتھ کیا کر ڈالے۔

"اپنے ساتھ کیوں سارہ! مجھے مار ڈالو..... مجھے مار ڈالو۔" اس کا دل چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔

پھر صبح وہ ناشتا کیے بغیر گھر سے نکل آئی۔ کیونکہ اپنی آنکھوں کی سرخی دیکھ کر وہ خود خائف ہو گئی تھی اور اسے یہ ہی ڈر تھا کہ کہیں سارہ کے استفسار پر وہ پھٹ نہ پڑے۔

اس لیے اسپتال پہنچ کر اس نے پہلے چائے پی۔ پھر ڈاکٹر کاشف سے مختلف مریضوں کی چارج شیٹ لے کر جنرل وارڈ میں آگئی۔ وہ خود کو مصروف رکھنا چاہتی تھی۔ لیکن اس کا ذہن بار بار بھٹک رہا تھا۔ تب اس خیال سے کہ کہیں میڈیسن دینے میں اس سے غلطی نہ ہو جائے، وہ بقیہ کام اپنی ساتھی ڈاکٹر پر ڈال کر گھر چلی آئی۔

"ارے! میں ابھی تمہیں فون کرنے والی تھی۔" سارہ نے اسے دیکھتے ہی کہا۔

"خیریت.....؟" وہ جو سیدھی اپنے کمرے میں جانا چاہتی تھی، رک گئی۔

"ہاں! وہ تائی امی کا فون آیا تھا۔ ثنا کی مایوں ہے۔ تائی امی کہہ رہی تھیں، ہم ضرور آئیں۔ کیا خیال ہے چلنا چاہیے؟" سارہ نے بتا کر پوچھا تو وہ بلاارادہ فوراً" بولی تھی۔

"تم چلی جانا۔۔۔"
"میں اکیلی۔۔۔" سارہ نے اسی قدر کہا تھا کہ وہ بول پڑی۔
"اکیلی کیوں؟ میرا خیال ہے ڈیڈی بھی اپنی فیملی کے ساتھ جائیں گے۔ تم ڈیڈی کے ساتھ چلی جانا۔" کہہ کر کچھ جتایا نہیں تھا۔ پھر بھی سارہ ٹھٹکی تھی۔
"کیوں؟"
"کیونکہ میں نہیں چاہتی' تائی امی یہ سمجھیں کہ ہمارا گھرانہ اب ان سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتا۔ یہ اتفاق ہے کہ مما یہاں نہیں ہیں۔ ورنہ وہ بھی ضرور جاتیں۔" اس نے کہا تو سارہ نے پھر اصرار کیا۔
"تم بھی چلو ناں۔"
"میں چلوں گی۔ میرا مطلب ہے' ثنا کی شادی پر جاؤں گی' ٹھیک؟" اس نے سارہ کو مزید کچھ کہنے کا موقع نہیں دیا اور اپنے کمرے میں آگئی۔
اس پر عجیب سی بے بسی طاری ہو رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی ذات بالکل بے معنی ہو کر رہ گئی ہو۔ یہ سوچ بھی نہیں پا رہی تھی۔ بس ایک لفظ اس کے ذہن پر مسلسل ہتھوڑے برسا رہا تھا۔
"رکاوٹ۔۔۔ رکاوٹ۔"
کان بند کرتی تو در و دیوار ہنستے ہوئے لگتے۔ تب ہی شام سے کچھ پہلے وہ گھر سے نکل آئی تھی۔ رش ڈرائیونگ کرتے ہوئے اسے پتا نہیں تھا کہ وہ کہاں جا رہی ہے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ دنیا کی آخری حد پار کر جائے گی۔ جانے کہاں کہاں بھٹکتے ہوئے جب اس نے گاڑی کو بریک لگائے تو خود سمجھ نہیں پائی کہ طویل مسافت کے بعد یہاں کیسے آگئی۔
سامنے شمشیر علی کا اپارٹمنٹ تھا۔
کچھ دیر وہ شش و پنج میں رہی۔ پھر گاڑی سے اتر کر اس نے بہت تیز قدموں سے کمپاؤنڈ پار کیا۔ لیکن سیڑھیاں چڑھتے ہوئے آپ ہی آپ اس کے قدم ست پڑ گئے۔ کیونکہ ذہن میں اچانک کسی سوچ نے جگہ بنائی تھی۔ جس پر گرفت کرتے ہوئے اس نے بیل کا بٹن جب دبا دیا تو پہلے "کون؟" کی آواز آئی۔ پھر دروازہ کھل گیا۔
"تم!" شمشیر علی نے حسب عادت پہلے اس کے عقب میں نظر دوڑائی۔ پھر سامنے سے ہٹ گیا۔
اریبہ نے اندر داخل ہو کر جب دروازہ بند ہونے کی آواز سن لی۔ تب ایک دم اس کی طرف پلٹی تھی۔
"سنو! میں آگئی ہوں۔ پہلے تم مجھے لے گئے تھے۔ اب میں خود آئی ہوں۔ مجھے لے چلو کہیں بہت دور۔ جہاں کسی کی رسائی نہ ہو۔۔۔ لے چلو شام! مجھے لے چلو۔ میں رکاوٹ نہیں بننا چاہتی۔ مجھ پر سے یہ الزام ہٹا دو۔" وہ کیا کہہ رہی تھی۔ شمشیر علی سمجھ کر بھی نہیں سمجھ رہا تھا۔
"اریبہ۔۔۔!"
"بس شام! میں بہت تھک گئی ہوں۔ میں ٹوٹنا نہیں چاہتی۔ مجھے ٹوٹنے سے بچا لو تم۔ تم مجھ سے شادی کر لو۔ کرو گے ناں؟ اس روز تم نے بھی کہا تھا۔ تم سیریس تھے ناں؟ مذاق تو نہیں کر رہے تھے؟" وہ بے بسی کی انتہا پر تھی۔ شمشیر علی نے آہستگی سے اس کا ہاتھ تھام کر اسے صوفے پر بٹھایا۔ پھر اس کے لیے پانی لے آیا۔
"اریبہ! تم جھکنے کے لیے نہیں جھکانے کے لیے پیدا کی گئی ہو۔" شمشیر علی نے کہتے ہوئے اس کے پیروں کے پاس گھٹنے ٹیک دیے تو اس نے صوفے کی پشت پر سر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ ایسا مان کون اسے دے سکتا تھا۔
"کوئی نہیں۔ کوئی نہیں۔" وہ پلکوں کے در کھول کر اسے دیکھنے لگی۔ پھر ایک دم اٹھ کر جانے لگی تو شمشیر علی پکار کر بولا۔

"اریبہ! میری بات سنو۔"

"ابھی کچھ مت کہو شام! میں پھر آؤں گی۔ ہاں پھر آؤں گی۔" وہ کہہ کر تیزی سے باہر نکلی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ کمرے میں باربار سارہ کا آنا جانا محسوس کر رہی تھی۔ لیکن قصداً" اس کی طرف متوجہ نہیں ہوئی اور فائل پر یوں نظریں جمائے رکھیں جیسے بہت ضروری لیکچر ذہن نشین کر رہی ہو۔ جب سارہ نے اسے پکارا تب اس نے چونکنے کی ایکٹنگ کی تھی۔

"ہاں....!"

"تم بھی چلو ناں اریبہ....!" سارہ یہ بات کتنی بار کہہ چکی تھی۔ وہ ان سنی کر کے سارہ کو سر تاپا دیکھ کر بولی۔

"اچھی لگ رہی ہو۔"

"میں تم سے کچھ کہہ رہی ہوں۔" سارہ عاجز ہو کر بولی تھی۔

"میں نے کہا ناں شادی میں چلوں گی ابھی تم جاؤ۔ ڈیڈی آگئے کیا؟" اس نے کہہ کر پوچھا۔

"آرہے ہیں۔ ابھی فون آیا تھا۔ گھر سے نکل چکے ہیں۔"

"بس تو تم جاؤ اور دیکھو کوئی میرا پوچھے تو کہہ دینا کہ۔" وہ سوچنے لگی کیا کہے۔

"کہہ دوں گی اریبہ اپنی مرضی کی مالک ہے۔" سارہ نے جل کر کہا۔ لیکن اس نے فوراً" تائید کی۔

"ہاں! یہ ہی کہنا۔ اب جاؤ پلیز! میں ڈسٹرب ہو رہی ہوں۔"

سارہ ناراض ناراض سی چلی گئی۔ تب اس نے کرسی کی پشت سے کمر نکالی۔ اس کے ذہن میں مختلف سوچیں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔ لیکن اس وقت وہ صرف ایک بات سوچنا چاہتی تھی۔ وہ جو شمشیر علی سے شادی کا کہہ آئی تھی۔ کیا صرف فرار کی خاطر یا جیسا کہ شمشیر علی نے کہا تھا۔

"کیا ہم ایک دوسرے کی ضرورت نہیں بن چکے؟"

"فرار.... ضرورت۔" وہ ان ہی دو باتوں میں الجھ رہی تھی کہ سیل فون کی ٹون نے اس کی توجہ کھینچ لی۔ اسکرین پر یاسمین کا نمبر دیکھ کر اس نے فوراً" کال لی تھی۔

"السلام علیکم مما!"

"وعلیکم السلام بیٹا! کیسی ہو؟" یاسمین کی آواز سن کر اس کا دل بھر آیا۔

"میں ٹھیک ہوں مما! آپ کو مس کر رہی ہوں۔" اس نے کہا تو یاسمین پیار سے بولی۔

"میری جان! ابھی تو مجھے دو دن ہی ہوئے ہیں۔"

"تو کیا آپ کا بہت زیادہ دن وہاں رہنے کا پروگرام ہے؟" اس نے فوراً" پوچھا۔

"میں کیا بتاؤں بیٹا! اصل میں تمہاری نانی اماں اکیلی ہیں۔ انہیں بھی نہیں چھوڑنا چاہتی۔ اور تم لوگوں کا خیال بھی ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا کیا کروں۔" یاسمین کی بے بسی اس کی آواز سے ظاہر تھی۔

"تو مما! آپ نانی اماں کو ساتھ لے آئیں ناں۔"

"میں تو یہ ہی چاہ رہی ہوں بیٹا! اور تمہاری نانی اماں سے بھی کہہ رہی ہوں۔ لیکن وہ مان ہی نہیں رہیں۔ اچھا تم بتاؤ! سارہ اور حماد کیسے ہیں۔ تمہیں تنگ تو نہیں کر رہے؟" یاسمین نے خود ہی بات بدل دی۔

"نہیں مما! سارہ ابھی ڈیڈی کے ساتھ تائی امی کی طرف گئی ہے ثنا کی مایوں میں۔" اس نے بتایا تو یاسمین نے بے اختیار پوچھا تھا۔

"تم نہیں گئیں؟"

"پھر مما! آپ کب تک آئیں گی؟" اس نے یاسمین کی بات کا جواب نہیں دیا۔

"آجاؤں گی بیٹا! جلدی آجاؤں گی۔ ٹھیک ہے۔"

"جی.... نانی اماں کو میرا سلام کہیے گا۔ میں پھر ان سے بات کروں گی۔ اللہ حافظ۔" وہ سیل فون رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا دھیان بٹ گیا تھا پھر بھوک بھی لگ رہی تھی۔ وہ کمرے سے نکل کر تاجور کو پکارتے ہوئے ڈائننگ روم میں آگئی۔

"کھانا لگاؤں بیٹا!" بی بی اسی انتظار میں بیٹھی تھیں۔

"جی بی بی!" وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی تب تاجور آتے ہوئے بولی۔

"میں نماز پڑھ رہی تھی باجی!"

"اچھا بیٹھو۔" اس نے بلا ارادہ اپنے سامنے اشارہ کیا تو تاجور وہیں بیٹھ گئی۔

"بھائی سے بات ہوتی ہے؟" تاجور کو دیکھتے ہی اسے شمشیر علی کا خیال آگیا تھا۔

"جی....!"

"کیا باتیں کرتے ہیں وہ تم سے؟" اس کے اندر اچانک تجسس جاگ اٹھا تھا۔

"حال چال پوچھتے ہیں۔ پڑھائی کا پوچھتے ہیں، پھر کہتے ہیں۔" تاجور ہنس کر چپ ہو گئی۔

"کیا کہتے ہیں؟" اس کے تجسس میں اشتیاق بھی شامل ہو گیا تھا۔

"کہتے ہیں وہ اب اپنی شادی پر ہی مجھے اپنے پاس لے جائیں گے۔" تاجور کی شرمیلی ہنسی پر وہ محظوظ ہو کر پوچھنے لگی۔

"اچھا! کب کر رہے ہیں تمہارے بھائی شادی؟"

"پتا نہیں باجی! میں تو دعا کرتی ہوں، جلدی بھائی کی شادی ہو۔" تاجور نے کہا تو وہ اس کی پلیٹ میں سالن ڈالتے ہوئے بولی۔

"تو پھر دلہن ڈھونڈو نا بھائی کے لیے۔"

"میں ڈھونڈوں۔" تاجور کے لیے جیسے یہ بات ناممکن تھی۔

"ہاں تو اور کون ڈھونڈے گا۔" اس نے کہتے ہوئے سالن کی ڈش ایک طرف رکھی پھر تاجور کو دیکھ کر پوچھنے لگی۔

"اچھا یہ بتاؤ۔ تم اپنے بھائی کے لیے کیسی دلہن لانا چاہتی ہو؟"

"وہ....!" تاجور اسے دیکھ کر جھجک گئی۔

"بتاؤ ناں؟" وہ جانے کیا جاننا چاہتی تھی۔

"آپ برا تو نہیں مانیں گی باجی؟" تاجور نے پوچھا تو وہ مسکرا کر بولی۔

"بالکل نہیں۔ تم بتاؤ۔"

"وہ میں۔ میں سوچتی ہوں آپ.... آپ جیسی۔" تاجور نے ابھی بھی جھجک کر بتایا تو وہ اسے دیکھے گئی۔ بولی کچھ نہیں۔

"آپ کو برا لگا باجی؟" تاجور خائف ہو گئی۔

"نہیں! کھانا کھاؤ۔" وہ تاجور کو کھانے کی طرف متوجہ کر کے خود بھی کھانے میں مصروف ہو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

سارہ بنّا کی مایوں میں آکر پریشان ہوگئی تھی۔ ایک طرف رازی تھا دوسری طرف سمیر اور دونوں ہی جیسے موقع کی تلاش میں تھے کہ کہیں وہ اکیلی مل جائے۔ بہانے بہانے سے اس کے پاس بھی آرہے تھے۔ اور یہاں وہ دونوں میں سے کسی سے بھی بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ جب ہی دونوں کی نظروں کے پیغام نظرانداز کرتے ہوئے وہ امیمہ کے پاس بیٹھ گئی۔ جس پر آتے جاتے ایک دو لڑکیوں نے اسے ٹوکا بھی کہ وہ کیا مہمانوں کی طرح بیٹھ گئی ہے۔ گوکہ اسے خود بھی عجیب سا الگ رہا تھا لیکن وہ کیا کرتی۔ عجیب مشکل میں پھنس گئی تھی۔

"کیا ہوا بیٹی! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔" امیمہ نے اسے چپ چپ دیکھ کر پوچھا۔

"جی پھوپھو! بس یہاں آتے ہوئے پیر مڑ گیا تھا۔ اسی میں درد ہو رہا ہے۔ ٹھیک سے چلا بھی نہیں جارہا۔" اسے بروقت بیٹھنے کا بہانہ سوجھ گیا تھا۔

"ارے! کہیں موچ تو نہیں آگئی۔ دکھاؤ۔" امیمہ نے تشویش ظاہر کرتے ہوئے اس کا پیر دیکھنا چاہا تو اس نے گھبرا کر پاؤں سمیٹ لیے۔

"نہیں پھوپھو! موچ نہیں ہے۔"

"پھر بھی گھر جاکر آیوڈیکس کی مالش کرلینا۔"

"جی۔۔۔!"

"اچھا بروہ یاسمین بھابھی سنا ہے' میکے گئی ہوئی ہیں۔" امیمہ کے انداز میں عجیب سی کھوج تھی۔

"جی! آپ نے کس سے سنا ہے پھوپھو۔؟" اس نے ناگواری چھپاتے ہوئے پوچھا۔

"سمیر بتا رہا تھا۔" امیمہ نے کہا تو وہ حیران ہوئی۔

"سمیر۔ سمیر کو کس نے بتایا' میرا مطلب ہے۔" وہ بات بنانے جارہی تھی۔ کہ ساجدہ بیگم نے امیمہ کو پکار لیا۔

"آؤ امیمہ! رسم شروع کرو۔" امیمہ اٹھ کر چلی گئیں تو وہ "سمیر کو کیسے پتا" سوچنے میں یہ بھول ہی گئی کہ وہ کن نظروں سے بچنے کی خاطر امیمہ کے ساتھ بیٹھی تھی۔ جب سمیر اس کے سر پر آن کھڑا ہوا تب چونکنے کے ساتھ وہ اٹھ کر جانے لگی تھی کہ سمیر اسے کلائی سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے لان کے آخری کونے میں لے آیا۔

"یہ کیا حرکت ہے؟" وہ بری طرح سلگ گئی تھی۔

"اور جو تم کر رہی ہو' وہ کیا ہے؟" سمیر نے اسی کے انداز میں کہا تھا۔

"کیا کر رہی ہوں میں؟" اس نے جھٹکے سے اپنی کلائی چھڑائی تھی۔

"تم۔ تم اریبہ کی محبت پر ڈاکا ڈال رہی ہو۔" سمیر نے ملامت بھرے انداز میں کہا۔

"ہاں ڈال رہی ہوں پھر؟" وہ بجائے نادم ہونے کے تنک کر بولی تو اس کی دیدہ دلیری پر سمیر چکرا گیا تھا۔

"تم تو بالکل ہی احساس سے عاری ہوگئی ہو سارہ! یا پھر میں ہی تمہیں غلط سمجھا تھا۔ تم کیا شروع سے ایسی ہی تھیں؟ بے حس' بے مروت۔" سمیر انتہائی تاسف سے بولتے ہوئے یکدم تیز ہوگیا۔ "ارے! چور بھی سنا ہے سات گھر چھوڑ دیتے ہیں۔ تم نے تو انہیں بھی مات دے دی۔ اپنے ہی گھر میں نقب لگاتے ہوئے تمہارا دل نہیں کانپا؟"

"نہیں۔!" وہ ہٹ دھرمی پر اتر آئی تھی۔ سمیر کا دل چاہا' اس کا منہ نوچ لے۔ ضبط کی کوشش میں اس کا چہرہ سرخ ہوگیا تھا' بمشکل ایک لفظ کہہ سکا۔

"تم!"

"ہاں میں۔ میں بہت بری ہوں۔ یہی ناں۔ ہوں میں بری۔ مجھے کسی کی پرواہ نہیں ہے۔ کوئی مرے جیے مجھے

فرق نہیں پڑے گا۔ بس یا اور کچھ بھی سننا چاہتے ہو؟" وہ سلگ سلگ کر بول رہی تھی۔

سمیر ہونٹ بھینچے اسے دیکھے گیا۔ ایسی سفاک تو وہ کبھی نہیں تھی۔

"یہاں ہر شخص کو اپنی پڑی ہے۔ پھر میں کیوں نہ اپنا سوچوں اور مجھے اپنے لیے جو ٹھیک لگے گا میں وہی کروں گی۔ سمجھے تم۔" وہ سمیر کو سناٹے میں چھوڑ کر تیز قدموں سے اس طرف آگئی جہاں توصیف احمد' خالدہ کے ساتھ بیٹھے تھے۔

"چلیں بیٹا؟" توصیف احمد نے سارہ کو دیکھ کر پوچھا تو خالدہ کہنے لگی۔

"توصیف! میں یہیں رکوں گی۔"

"ٹھیک ہے پھر میں سارہ کو لے کر جارہا ہوں۔" توصیف احمد اٹھ کھڑے ہوئے پھر ساجدہ بیگم کو اپنے جانے کا بتایا تو وہ سارہ سے رکنے پر اصرار کرنے لگیں۔ لیکن وہ اریبہ کے اکیلے ہونے کا بہانہ کرکے توصیف احمد کے ساتھ آگئی۔ اور چونکہ خالدہ وہیں رک گئی تھی اس لیے اس نے پہلے توصیف احمد کا سلیپنگ سوٹ نکال کر انہیں دیا پھر پانی کا جگ اور دودھ کا گلاس ان کے بیڈ روم میں رکھ کر اپنے کمرے میں جاتے ہوئے اس نے یونہی اریبہ کے کمرے میں جھانک کر دیکھا اور اسے ٹہلتے دیکھ کر پوچھنے لگی۔

"تم سبق یاد کر رہی ہو یا کوئی مسئلہ درپیش ہے؟"

"سبق یاد کر رہی تھی۔" اریبہ نے کہا تو سارہ شعر پڑھتے ہوئے اندر آگئی۔

مکتبِ عشق کا دستور نرالا دیکھا
اس کو چھٹی نہ ملی جس نے سبق یاد کیا

"تم جلدی نہیں آگئیں؟ میرا مطلب ہے مایوں مہندی وغیرہ میں تو کافی ہلا گلا رہتا ہے۔" اریبہ نے اس کے شعر پر کوئی تاثر دیے بغیر کہا۔

"ہاں تھا ہلا گلا لیکن میں ڈیڈی کی وجہ سے آگئی۔" سارہ کو باتیں بنانے میں کمال حاصل ہوگیا تھا۔

"ڈیڈی کی وجہ سے؟" اریبہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

"اصل میں خالدہ آنٹی کو وہیں رکنا تھا۔ اور ڈیڈی میری وجہ سے بیٹھے تھے' بے چارے بور ہو رہے تھے اس لیے میں ہلا گلا چھوڑ کر ڈیڈی کے ساتھ آگئی۔" سارہ نے بتا کر طویل جمائی لی۔

"ڈیڈی اب کہاں ہیں؟" اریبہ نے پوچھا۔

"اپنے کمرے میں۔ میں نے دودھ وغیرہ ان کے کمرے میں رکھ دیا ہے۔ اور اب میں سونے جارہی ہوں۔ تم بھی سو جاؤ۔ باقی سبق کل یاد کرلینا۔"

"کل تو امتحان ہے۔" اریبہ جانے کہاں کھو گئی تھی۔ سارہ نے محسوس ضرور کیا لیکن چھیڑنے سے باز رہی اور شب بخیر کہہ کر اس کے کمرے سے نکل آئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"یاسمین! تجھے اپنے بچے یاد نہیں آرہے؟" اماں نے یاسمین کو مگن دیکھ کر پوچھا۔

"آتے ہیں۔ یاد آتے ہیں اماں! بچے بھی مجھے یاد کر رہے ہیں۔" یاسمین اماں کا مقصد سمجھ کر بولی تھی۔

"پھر تو اتنے آرام سے کیسے بیٹھی ہے؟" اماں نے پوچھا تو وہ قصداً" آہ بھر کر بولی۔

"آرام سے تو نہیں ہوں اماں۔۔۔!"

"تو بیٹی جا اپنے گھر۔ بچوں کو اکیلا نہیں چھوڑتے۔ زمانہ خراب ہے۔ خدانخواستہ کوئی اونچ نیچ ہوگئی تو۔" اماں

نے اسے احساس دلانے کی کوشش کی۔

"یہی میں بھی سوچتی ہوں اماں! لیکن اب میں آپ کو یہاں چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔" یاسمین اپنے دل میں ٹھان چکی تھی کہ انہیں ساتھ لے کر ہی جائے گی۔

"کیوں ضد کرتی ہے یاسمین! میرا آخری وقت چل رہا ہے۔ مجھے ادھر ہی دفن ہونا ہے تیرے ابا کے ساتھ۔"

"ٹھیک ہے، جب وقت آئے گا۔ تو ابا کے ساتھ ہی دفن ہو جایئے گا' ابھی تو چلیں۔ کیا آپ کو میرے بچوں کو دیکھنے کا' ان سے ملنے کا شوق نہیں ہے؟" یاسمین نے زچ ہو کر کہا۔

"لے! یہ خیال تجھے اب آرہا ہے۔ جب بچے پیدا کیے تھے تب تجھے خیال نہیں آیا تھا کہ آکر نانا نانی کی گود میں ڈالتی؟ تیرے ابا ترستے رہ گئے۔" اماں اب اس پر بگڑ ہی گئیں۔

"کیوں ترستے رہ گئے؟ وہ خود آجاتے میرے پاس آپ کو لے کر۔" یاسمین برامان کر بولی تھی۔

"ہاں اب تو ہمیں الزام دے۔"

"میں الزام نہیں دے رہی اماں! خیر چھوڑیں یہ بتائیں' آپ میرے ساتھ چلیں گی کہ نہیں؟" یاسمین نے شکوے شکایت سے بچنے کی خاطر پوچھا۔

اماں نے جواب نہیں دیا تو کہنے لگی۔

"ٹھیک ہے مجھے بھی جانے کو نہ کہیں۔ اگر آپ اپنے گھر میں نہیں رکھنا چاہتیں تو میں جمیلہ آپا کے پاس چلی جاؤں گی۔"

یاسمین اماں کو یہ باور کرانا چاہتی تھی کہ وہ انہیں لیے بغیر اپنے گھر نہیں جائے گی۔ اسی کوشش میں جانے ذہن کے کس گوشے سے نکل کر جمیلہ آپا کا نام اس کی زبان پر آگیا تھا۔ جس پر وہ خود بھی حیران تھی۔

"تمہیں جمیلہ اب کہاں ملے گی۔ وہ بے چاری تو بچوں کی خوشیاں بھی نہ دیکھ سکی۔" اماں دکھ کر بولیں تو اس کا دل پھٹنے لگا۔

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں اماں! جمیلہ آپا..."

"ہاں گزر گئی' تو نے تو کسی کے مرنے جینے کی خبر ہی نہ رکھی۔ سب پوچھتے تھے تیرا۔ کہتے تھے کون سے دیس بیاہ دیا بیٹی کو کہ پھر پلٹ کر ہی نہ آئی۔" اماں بھرائی آواز میں بول رہی تھیں۔ اس کی نظروں میں جمیلہ سما گئی تھی۔

جمیلہ اماں کی بھتیجی تھی۔ اللہ نے جسے خاصی فرصت سے بنایا تھا۔ خوبصورتی کے ساتھ خوب سیرتی میں بھی یکتا۔ پورا محلہ اس کے گن گاتا تھا۔ سلیقہ' سگھڑاپا اس پر ختم تھا۔ ہر ایک کے کام آتی تھی۔ بے حد محبت کرنے والی۔ یاسمین کو وہ بہت اچھی لگتی تھی۔ زیادہ وقت اسی کے پاس رہتی اور جب جمیلہ بیاہ کر قریبی گاؤں جا رہی تھی تو یاسمین بہت روئی تھی۔ سارا محلہ اداس ہو گیا تھا۔

پھر جمیلہ کبھی کبھی آتی تھی۔ آخری بار جب یاسمین نے اسے دیکھا تھا تو اس کے ساتھ اس کا پانچ چھ سال کا بیٹا تھا جو جمیلہ ہی کی طرح سمجھ داری کی باتیں کرتا تھا۔ اس کی نظروں میں وہ خوبصورت ذہین بچہ آیا تو وہ تڑپ گئی۔

"اماں! کب ہوا جمیلہ آپا کا انتقال؟"

"بہت سال ہو گئے بیٹی!" اماں انگلیوں پر حساب لگانے لگیں پھر بولیں۔ "بارہ چودہ سال۔"

"بارہ چودہ سال۔" اسے وقت کا پتا نہیں چلا اور یہاں صدیاں بیت گئیں۔

"ایسی بھری جوانی میں گئی لڑکی!" اماں رونے لگیں تو اس کے آنسو بھی چھلک گئے۔

"اور اماں! جمیلہ آپا کا تو ایک بیٹا بھی تھا نا؟"

"ہاں پھر بیٹی ہوئی۔ سال دو سال کی تھی بیٹی کہ اوپر سے جمیلہ کا بلاوا آگیا۔" اماں نے آنسو پونچھتے ہوئے بتایا۔

"اف!" وہ لرز کر بولی تھی۔

"بس اللہ کے کام وہی جانے۔"

"اب کہاں ہیں جمیلہ آپا کے بچے؟ ماشاء اللہ بڑے ہو گئے ہوں گے۔" اس نے کہا تو اماں ٹھنڈی سانس کھینچ کر بولیں۔

"ہاں! بیٹی ہو گی پندرہ سولہ سال کی۔"

"آپ کا جانا ہوتا ہے؟"

"نہیں مدت ہو گئی۔ تیرے ابا کے بعد تو ہر جگہ جانا آنا رہ گیا۔ اب جمیلہ کے اماں ابا بھی نہ رہے ورنہ انہیں سے بچوں کی خبر مل جاتی تھی۔" اماں نے بتایا تو وہ پوچھنے لگی۔

"اور جمیلہ آپا کے میاں؟"

"ارے اس نے تو سال بھر بعد ہی دوسری کر لی تھی۔" اماں جل کر بولی تھیں۔

"وہ تو کرنی تھی اماں! سال دو سال کی بچی کو وہ کیسے سنبھال سکتے تھے۔ اگر ماموں مامی بچوں کو اپنے پاس لے آتے تب بھی مرد کو بیوی کی ضرورت ہوتی ہے۔" اس کا ذہن اب حقائق سوچنے لگا تھا۔

"ہاں یہ تو تو ٹھیک کہہ رہی ہے۔ مرد نہیں رہتا عورت کے بغیر۔" اماں نے تائید کی تو اچانک بے چین ہو کر بولی۔

"چلیں نا اماں! جمیلہ آپا کے بچوں سے مل کے آتے ہیں۔"

"ہائیں۔ وہ کوئی ادھر رہتے ہیں۔"

"کہیں بھی رہتے ہوں۔ گاڑی ہے ناں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ لگے گا۔ شام سے پہلے واپس بھی آجائیں گے۔ چلیں اماں! میرا بڑا دل چاہ رہا ہے۔ جمیلہ آپا کی روح خوش ہو جائے گی۔ اتنا پیار کرتی تھیں وہ مجھ سے۔" اس کی گم گشتہ محبتیں سر چڑھ کر بولنے لگی تھیں۔

اماں کو یاسمین کے اصرار سے زیادہ جمیلہ کی یاد نے مجبور کر دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

یاسمین ایک بار پہلے اماں کے ساتھ جمیلہ کے سسرال آچکی تھی۔ اس وقت جمیلہ کی نئی نئی شادی ہوئی تھی اور وہ چمکیلے کپڑوں میں ادھر ادھر آتی جاتی' کھلکھلاتی یاسمین کو بہت اچھی لگی تھی۔ ابھی بھی وہ اس وقت میں کھو گئی تھی۔ اسے لگا جیسے ابھی جمیلہ کچن سے شربت کے گلاس لیے نکلے گی پھر میاں کے پکارنے پر بھاگتی ہوئی جائے گی۔ اس کی نظروں میں کتنے منظر گھوم رہے تھے کہ اچانک سارے منظر گڈمڈ ہو گئے۔ اس کی سماعتوں نے یہ کیا سنا تھا۔

"ٹی بی!" وہ جمیلہ کی سوکن کو دیکھنے لگی جو اماں کو بتا رہی تھی۔

"ہاں بوا! ٹی بی ہو گئی تھی لڑکی کو خون تھوکنے لگی تھی۔"

"کون؟ جمیلہ آپا... جمیلہ آپا کو ٹی بی ہو گئی تھی؟" یاسمین نے متوحش ہو کر پوچھا۔

"ارے نہیں! میں جمیلہ کی بیٹی کی بات کر رہی ہوں۔" جمیلہ کی سوکن نے کہا۔

"پھر... میرا مطلب ہے آپ نے علاج نہیں کرایا؟"

"لے سارا پیسہ اس کے علاج پر لگ گیا' اپنے پاس تو کچھ بچا ہی نہیں۔"

"اور لڑکی؟" اس نے ڈوبتے دل کے ساتھ پوچھا۔

"اسے اس کا بھائی شہر لے گیا پھر وہیں علاج ہوا۔ اب تو چنگی موٹی تازی ہو گئی ہے۔ شہر کی ہوا بھی لگ گئی ہے

اسے آئی تھی پہچانی ہی نہیں جارہی تھی۔" خاتون کی بات سے یاسمین کی جان میں جان آئی تھی۔
"شکر ہے اور جمیلہ آپا کا بیٹا کیا کرتا ہے؟"
"پتا نہیں وہیں شہر میں کہیں نوکر ہے۔" خاتون نے جتایا تو یاسمین کو دھچکا لگا تھا۔
"نوکر... پڑھا لکھا نہیں ہے۔ جمیلہ آپا کو تو بہت شوق تھا۔ کہتی تھیں بیٹے کو پڑھا لکھا کر بڑا آدمی بنائیں گی۔ اور بچہ تھا بھی بہت ذہین۔"
"ہاں ہے تو چالاک۔" وہ اپنے انداز میں بول رہی تھی۔
"خیر میں تو اس لیے آئی تھی کہ جمیلہ آپا کے بچوں سے ملاقات ہو جائے گی لیکن شاید ان سے ملنا قسمت میں ہی نہیں تھا۔" یاسمین کو اب وہاں بیٹھنا دوبھر ہو گیا۔
"ہاں! تمہیں پہلے نہیں دیکھا۔ بوا تو خیر آتی جاتی تھیں۔ تم کہاں رہتی ہو؟" اس نے جتا کر پوچھا۔
"میں اماں کے ساتھ ہی ہوتی ہوں۔ چلیں اماں۔"
یاسمین اپنے بارے میں گفتگو نہیں کرنا چاہتی تھی۔ جب ہی غلط بیانی کر کے اٹھ کھڑی ہوئی اور اماں کا ہاتھ پکڑ کر انہیں اٹھانے لگی تھی کہ جمیلہ کے شوہر کو آتے دیکھ کر رک گئی۔
"السلام علیکم بھائی جی۔"
"وعلیکم السلام!" وہ یاسمین کو پہچاننے کی کوشش کرنے لگے تو ان کی بیوی بول پڑی۔
"بوا جی آئی ہیں۔ یہ ان کی بیٹی ہے۔"
"اچھا... اچھا السلام علیکم بوا جی! بڑی مدت بعد ہماری یاد آئی۔" وہ کہتے ہوئے اماں کے سامنے بیٹھ گئے۔
"بس بیٹا... تیرا چاچا نہیں رہا تو پھر کس کے ساتھ آتی جاتی۔ ابھی یہ یاسمین لے کر آئی ہے۔ جمیلہ کے بچوں سے ملنے آئی تھی۔ پر وہ تو یہاں نہیں ہیں۔" اماں کو خود بھی بچوں سے نہ ملنے کا افسوس ہو رہا ہے۔
"ہاں... وہ دونوں بہن بھائی شہر میں بس گئے۔ اصل میں تاج کو ٹی بی ہو گئی تھی۔ شمشیر اسے علاج کے لیے لے گیا تو پھر اپنے پاس ہی رکھ لیا۔ اچھا ہے وہ بھی وہاں اکیلا تھا۔" ابا شمشیر علی کے منہ پر اسے برا بھلا کہتے تھے۔ لیکن دل سے اس کے معترف تھے۔
"ہاں بتایا تیری بیوی نے۔ اب تو ٹھیک ہے نا تاجور۔" اماں نے پوچھا تو تاجور کے نام پر یاسمین چونکی تھی۔
"تاجور..." اس کی نظروں میں تاجور اور جمیلہ کا چہرہ ایک ساتھ آن سمایا تھا۔
"تاجور جمیلہ آپا کی بیٹی ہے؟" وہ حیرت و اشتیاق میں گھری پوچھ رہی تھی۔
"ہاں۔ تو ابھی اسے دیکھتی تو سمجھتی جمیلہ آگئی ہے۔ بالکل جمیلہ پر پڑی ہے۔ ناک، نقشہ، رنگ روپ۔" اماں نے کہا تو یاسمین دل ہی دل میں خود سے بولی تھی۔
"ہاں، وہ بالکل جمیلہ آپا کی طرح ہے۔"
"یوں ہی بیٹھی باتیں بنائے جائے گی یا بوا جی کو شربت بھی پلائے گی۔ چل اٹھ... لسی وسی لے کے آ۔" ابا نے بیوی کو ٹوکتے ہوئے گھر کا تو یاسمین بول پڑی۔
"نہیں بھائی جی! ابھی ہم راستے سے لسی پیتے ہوئے آئے ہیں۔ بس آپ اجازت دیں۔"
"اتنی دور سے آئی ہے۔ روٹی شوٹی کھا کے جانا۔"
"دیر ہو جائے گی بھائی! پھر آئیں گے تو ضرور کھائیں پئیں گے۔"
یاسمین کو اب جانے کی جلدی تھی۔ سہولت سے منع کر کے اماں کو بھی اٹھا دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

دس منٹ سے وہ دونوں خاموش بیٹھے تھے۔ اریبہ کی نظریں گلاس وال سے پرے سمندر کی جھاگ اڑاتی لہروں پر جمی تھیں اور شمشیر علی کی نظریں ادھر ادھر بھٹکتی ہوئی بار بار اریبہ کے چہرے پر بھی پڑ رہی تھیں۔ گو کہ جب دن میں اریبہ نے اسے فون کیا تھا کہ وہ آج شام میں اس سے ملے گی تو اس کے لیے شام تک وقت کاٹنا مشکل ہو گیا تھا اور اس عرصے میں اس نے کتنی باتیں سوچ ڈالی تھیں کہ وہ اریبہ سے یہ کہے گا۔ وہ کہے گا۔ لیکن اس کے سامنے آکر وہ سب بھول گیا تھا یا شاید اس کے اندر یہ خوف تھا کہ وہ جو شادی کی بات کر گئی تھی اس سے منحرف نہ ہو جائے۔ اس کے چہرے پر گزشتہ شام کا کوئی عکس نہیں تھا۔ اس کے برعکس وہ بہت پرسکون نظر آرہی تھی۔ یوں جیسے طوفان کے بعد ہر شے ساکن ہو جاتی ہے۔ کچھ وقت اور گزرا، پھر اریبہ نے اسے دیکھا تو وہ مسکرا کر گلاس وال کی طرف انگوٹھے سے اشارہ کر کے بولا۔
"اچھا منظر ہے۔"
"ہوں... !" اریبہ نے ہلکے سے اثبات میں سر ہلایا پھر خود کو بولنے پر آمادہ کر کے کہنے لگی۔
"شام... کل میں نے تم سے جو کچھ کہا تھا۔ وہ سب اچانک اور ایک وقتی خیال کے تحت کہی گئی باتیں تھیں۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے خود نہیں پتا کہ میں تمہارے گھر تک کیسے آگئی تھی۔ لیکن پھر میں نے سوچا تو مجھ پر ادراک ہوا کہ یہ سب قدرت کے کھیل ہیں۔ اس میں ہمارا کوئی عمل دخل نہیں۔ ہمارا عمل یہ ہے کہ ہم کہیں خود کو زبردستی منوانے پر تلے ہوئے ہیں اور کہیں کسی کی نفی کرتے ہیں اور جو عمل ہم سے انجانے میں ہو جاتا ہے اسے ہم کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ حالانکہ سب سے اہم وہی عمل ہوتا ہے۔ اگر ہم ہمیں تب..." آخری لفظ پر اس کے ہونٹ ایک دوسرے میں مدغم ہوئے تو وہ اسی حالت میں اسے دیکھے گئی۔
شمشیر علی سانس روکے بیٹھا تھا۔
"اور میں نے بھی شاید زندگی میں پہلی بار اپنے انجانے عمل کو سوچا تو مجھے اپنی زندگی میں آنے والے سارے موڑ سمجھ میں آنے لگے۔ سیدھی شفاف سڑک پر چلتے ہوئے اچانک کہیں پاؤں پھسل جائے تو ہمیں وہیں رک جانا چاہیے۔ کیونکہ یہ ہمارے لیے رکنے کا اشارہ ہوتا ہے۔ لیکن ہم نہیں سمجھتے اور زعم میں پھر اٹھ کر بھاگنے لگتے ہیں۔ یہ اندھا دھند بھاگنا ہمیں کھائی میں لے جاتا ہے۔" وہ پھر خاموش ہو گئی۔
شمشیر علی پر صدیاں بیت گئیں۔
"بہرحال!" اب وہ سانس کھینچ کر گویا خود کو کسی شکنجے سے آزاد کر کے گویا ہوئی تھی۔
"کچھ فیصلے صرف دل کے ہوتے ہیں۔ دماغ آمادہ نہیں ہوتا... اور کچھ فیصلے صرف دماغ کے۔ جن پر دل احتجاج کرتا رہ جاتا ہے۔ لیکن پائیدار فیصلے وہ ہی ہوتے ہیں جن پر دل اور دماغ دونوں متفق ہوں۔ میں نہیں جانتی، مجھے پرپوز کرنے کا تمہارا فیصلہ دل کا تھا یا دماغ کا۔ لیکن میں پوری سچائی سے اعتراف کر رہی ہوں کہ رات تمہارے بارے میں سوچتے ہوئے میرے دل اور دماغ نے تمہارے حق میں گٹھ جوڑ کر لی تھی۔ جب ہی اب میں تمہارے سامنے ہوں۔"
"ہا... ہا..." شمشیر علی نے پورا سر پیچھے گرا کر خود کو نئی زندگی ملنے کی مبارک باد دی تھی۔
باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ

ثمرہ بخاری

آج صبح سویرے دن کے بارہ بجے باجی فریدہ کی آمد ہوئی تھی۔ جوادی تو اس وقت گہری نیند کے مزے لوٹ رہا تھا۔ اسی لیے باجی فریدہ کو ایک گھنٹے کے لیے شہناز بیگم کے پاس بیٹھنا پڑا اور انہیں یہ یقین دلانا پڑا۔ وہ مظلوم عورت ہونے کی صرف اداکاری نہیں کرتی۔ بلکہ واقعی بڑی مظلوم عورت ہیں۔ اور مزے کی بات یہ کہ وہ شہناز بیگم کو یقین دلانے میں کامیاب بھی رہی۔

ایک گھنٹے کے بعد جب جوادی صاحب انگڑائیاں لیتے مندی مندی آنکھوں سے دنیا کو دیکھتے آنگن میں

ناولٹ

تشریف لائے تو والدہ صاحبہ فریدہ کے غم ناک قصوں کے زیرِ اثر اداس بیٹھی تھیں اور فریدہ صاحبہ موقع سے فائدہ اٹھا کر ان کی بنائی گاجر، مٹر اور آلو کی سبزی میں سے گاجریں آدھی کے قریب ہڑپ فرما چکی تھیں۔

"گڈ مارننگ اماں!" جوادی نے صحن میں رکھی کرسیوں میں سے ایک کو رونق بخشی۔

جواب میں اماں نے لال پیلی ہو کر گھورا۔

"میں نے تجھے سو بار منع کیا ہے۔ شکر دوپہر کو گڈ مارننگ کہہ کر میرا پارہ نہ چڑھایا کرو۔ وے کسی انے (اندھے) سے بھی پوچھ لے۔ اس ویلے کیا ٹیم ہو رہا ہے۔ وہ بھی بتا دے گا دوپہر ہو رہی ہے اور میں نے سبزی بھی کاٹ لی ہے۔ ہانڈی چڑھانے کی تیاری میں ہوں، تے کھوتیا تیری سویر ہی ختم ہونے کا نام نہیں لیتی۔"

"ناشتا... میرا مطلب ہے، لنچ ملے گا پیاری والدہ!" جوادی نے سب کچھ نظر انداز کر کے خوش گوار انداز میں پوچھا۔

"نہیں!" پیاری والدہ نے جواب دینے میں لمحے کی بھی تاخیر نہیں فرمائی۔

"میں بھی آئی بیٹھی ہوں۔ کچھ مجھ سے بھی حال احوال پوچھ لو۔" شہناز کی رشتے کی بھانجی فریدہ کو یاد دلانا پڑا۔

"فریدہ باجی! اتنے سویرے سویرے آئی ہو۔ اندازہ ہو رہا ہے۔ حالات سازگار نہیں ہیں۔"

"صدقے جاؤں اندازوں کے۔ جب اتنا درست اندازہ لگا ہی لیا ہے تو پھر چلو میرے ساتھ۔ حالات کو میرے حق میں ہموار کرنے کی کوشش کرو۔ پتا ہے جوادی! مجھے پورا یقین ہے صرف تم اور شبلی ہی میرے راستے کے کانٹے چن سکتے ہو۔"

"جوادی! فریدہ واقعی بہت دکھی ہے۔ مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا۔ اس کی ساس اتنی مکار، اتنی تنگ دل، اتنی ظالم، اتنی بے حس..."

"بس بس اماں ڈیر! مجھے اندازہ تھا۔" جوادی نے شہناز بیگم کو دل کی بھڑاس بھی نہیں نکالنے دی۔

"تم گھر چلو فریدہ باجی! میں دادی کے گھر جا کر بتا کر لوں۔ شاید انہوں نے لنچ بنا لیا ہو۔ بڑی بھوک لگ رہی ہے۔"

"آہو! تیری دادی نے آج تیرے اور شبلی کے لیے جوتیوں کا حلوہ بنوایا ہے۔ جاؤ تے کھاؤ... شاباشے۔" شہناز طنز کا کرارا سا تیر برسا کر کچن سدھاریں۔

"ہائے! بڑی بھوک لگی ہے۔" جوادی نے سویرا کے گھر کی جانب دیکھ کر دہائی دی۔

"شبلی کو بلوانا ہے۔ بلوالو۔ میں ادھر ہی بیٹھی ہوں۔"
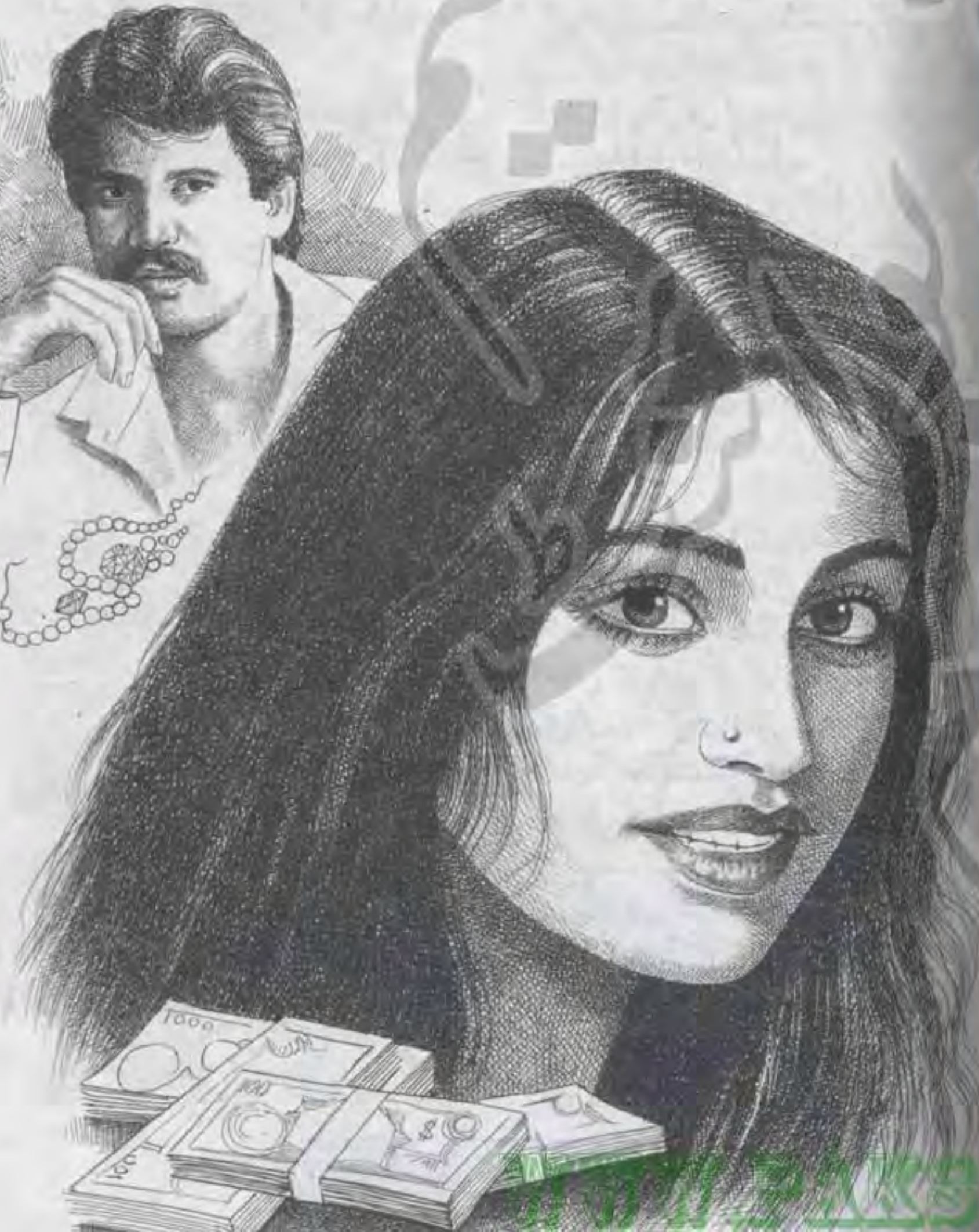
فریدہ باجی نے خوامخواہ لہجے میں رقت پیدا کرتے ہوئے اطلاع دی۔ مگر جوادی پھر بھی ادھر ہی ٹکا رہا۔

فریدہ کو شہناز نے کچن میں بلوالیا۔

"نی فٹے منہ گاجریں تو ساری کی ساری کھا گئی ہے۔ چل ادھر آ۔ اب آلو ہور کٹ۔ یہ ہی ڈال لوں ہانڈی میں۔"

فریدہ نے خالہ کی ڈانٹ مسکرا کر وصول کی اور آلو کاٹنے لگی۔

ادھر صحن میں جوادی مطمئن بیٹھا تھا۔ کوئی دس منٹ بعد دیوار پار سے آہٹ ابھری۔ پھر ایک ٹرے دیوار پر رکھ دی گئی۔

یعنی جنہیں سنانے کو دہائیاں دی جا رہی تھیں، انہوں نے سن لی تھیں۔ سویرا نے ناشتا تیار کرکے دیوار پر رکھ دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

کچھ دیر کے بعد شبلی بھی جوادی کے گھر آچکا تھا۔ باجی فریدہ، شبلی، جوادی تینوں جوادی کے کمرے میں بیٹھے تھے۔

فریدہ بتا چکی تھی۔ اس کے کالے توے جیسے منہ والے شوہر نے اب اس پر توجہ دینا بالکل چھوڑ دی ہے۔ سارا دن موبائل پر مصروف رہتا ہے اور جو میں قریب جاتی ہوں تو جھٹ موبائل جیب میں ڈال لیتا ہے۔

"میرا خیال ہے، موبائل جیب میں ہی ڈالا جاتا ہے گلے میں نہیں ـــــ" جوادی کے گھورنے پر شبلی کو سنبھل کر بیٹھنا پڑا۔

"یہ سنجیدہ نہیں ہے۔ اس کو لگ رہا ہے۔ میں بکواس کر رہی ہوں۔" فریدہ برا مان گئی۔

"آپ تو دلوں کے حال بھی جان لیتی ہیں۔" جوادی اور شبلی متاثر ہوئے۔

"میں اتنی پریشان ہوں۔ تمہیں مخول سوجھ رہا ہے اور جوادی! توبہ نہ بھول کہ میرا بھائی ہے۔ سگی خالہ کا پتر ہے اور تجھ پہ بڑا حق ہے میرا۔"

"جی جی فریدہ باجی! یہ صدمہ تو تاحیات ہی میں نہیں بھول سکتا۔"

"تو بس! پھر تجھے میرا ایک کام کرنا ہے۔" اپنے جوش میں فریدہ نے جوادی کی بات پہ غور کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔

"جوادی! کام زیادہ مشکل بھی نہیں ہے۔ بلکہ میں تو کہتی ہوں۔ بہت ہی آسان ہے۔ بس تو ایسا کر میری چنڈال نند نھی سے شادی کرلے۔ پھر دیکھ میرا میاں کس طرح میرے اشاروں پر ناچتا ہے۔"

"اپنے میاں کا ناچ دیکھنے کے لیے آپ مجھے جیتے جی مار دینا چاہتی ہیں فریدہ باجی! یہ کہاں کا انصاف ہے؟" جوادی کی آواز بھیگ گئی۔

"یہ تو زیادتی ہے فریدہ باجی!" شبلی کو بھی حالات کی سنگینی کا اندازہ اب جا کے ہوا تھا۔

"ناں! کیا زیادتی ہے۔ مرد ہو تم دونوں ـــــ مردوں کی طرح جینا سیکھو۔"

"کیا مردوں کی طرح جینے کے لیے عزیزہ ننھی بیگم سے عقد ضروری ہے؟" جوادی نے احتجاج کرنے کی کوشش کی۔

"او پاغلو! میری زندگی میں خوشیاں بھرنے کے لیے ننھی سے تیری شادی ضروری ہے۔ ویسے جوادی لکھ لعنت ہے۔ بھائی ہو کے تو نے اپنی بہن کا یعنی میرا احساس نہیں کیا۔ شبلی! تجھ سے رشتہ تھوڑی دور کا سہی، پر ہے تو بھی میرا بھائی۔ یہ جوادی تو شروع سے احسان فراموش ہے۔ یہ قربانی تو ہی دے دے۔"

"جی جی فریدہ باجی! کیوں نہیں ـــــ کیوں نہیں ـــــ آپ کے لیے جان، مال، عزت، آبرو کے علاوہ باقی سب حاضر ہے۔"

"فریدہ باجی! ہتھیلی پہ سرسوں کیوں جما رہی ہیں؟ چھری تلے دم تو لیں۔ ہم آئیں گے آج شام کو آپ کے غریب خانے پر اور اپنی آنکھوں سے حالات کا جائزہ لینے کے بعد ہی کوئی فیصلہ کریں گے۔"

اب کے جوادی نے کچھ سوچتے ہوئے تسلی دی۔

"اچھا! چلو ٹھیک ہے۔ اب آجانا۔ ایسا نہ ہو میں انتظار کرتی رہ جاؤں اور تم دونوں یہ بات بھول کے کہیں اور ہی نکل جاؤ۔"

"آپ چکن والے رول بنانے کا وعدہ کریں۔ ہم سر کے بل آئیں گے۔"

"چکن والے رول ـــــ یہ تو بڑا مشکل کام ہے۔" کام چور فریدہ بے زار ہوگئی۔ پھر بولی۔

"میں آلو کے چپس بنا کر رکھوں گی۔"

"آلو کے چپس کھا کے ہمارا دماغ کام کرنا چھوڑ دیتا ہے۔" شبلی نے غصہ دبا کر آرام سے بتایا۔ انہیں ناچار چکن رول کی ہامی بھرنا پڑی۔

☼ ☼ ☼

شام کو جب یہ دونوں فریدہ باجی کے گھر پہنچے، فریدہ کی بڑی نند بھی اپنے دو عدد بد تمیز بچوں کے ساتھ تشریف لائی ہوئی تھی۔ ساتھ میں خوش مزاج میاں جی بھی موجود تھے اور فریدہ کی ساس داماد کو سامنے بٹھائے لیکچر پلا رہی تھی۔

"دنیا میں وہی مرد چین اور سکھ پاتے ہیں، جو بیوی کو سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔"

دوسری طرف ان ہی محترم خاتون کی بہو یعنی فریدہ باجی قسمت پر لکھ لعنت بھیجتے ہوئے بریانی، قورمے بنا بنا کر بے حال ہو رہی تھیں۔

اور ان کے شوہر موبائل ہاتھ میں لیے پتا نہیں کس چنڈال سے میسج میسج کھیلنے میں مصروف تھے۔

"السلام علیکم!" دونوں نے لاؤنج میں داخل ہو کر سلام کیا۔

اگر فریدہ کی محترم ساس کی عقابی نگاہیں جوادی کی سعادت مندی بھانپ کر اسے اپنی چھوٹی میسنی بیٹی کے لیے پسند نہ کر چکی ہوتیں۔ تو یقیناً "بہو کے میکے والے ہونے کی حیثیت سے ان کا استقبال بالکل جداگانہ نوعیت کا ہوتا۔ مگر اب ـــــ؟ اب تو ایسے لگتا تھا گویا ساس اماں کی عقابی نظریں برسوں سے دید کی پیاسی تھیں۔ لپک کر ان دونوں کے قریب آئیں۔ چٹاچٹ بوسے لے کر انہیں واش روم میں جا کر منہ ہاتھ دھونے پر مجبور کیا اور پھر جب یہ واش روم سے لوٹے تو ان دونوں کے لیے اپنے برابر میں دو کرسیاں بھی رکھوا چکی تھیں۔

"پتر جوادی! آج ادھر کا راستہ کیسے بھول پڑے؟ میں نمانی (بے چاری) انتظار کر کر کے ہار جاتی ہوں۔ پر تو صورت ہی نہیں دکھاتا۔"

ساس صاحبہ دکھڑے رو رہی تھیں۔ فریدہ کی بڑی نند حیرت سے آنکھیں اور منہ بیک وقت کھولے یہ عجیب منظر دیکھ رہی تھی۔ ماں بھابھی کے میکے والوں پر واری صدقے جا رہی ہے۔ کہیں ماں کا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا۔

"ننھی او ننھی پتر! ادھر آ ـــــ دیکھ تو کون آیا ہے۔" ساس نے یہیں بیٹھے بیٹھے لاؤڈ اسپیکر کھول دیا۔

"اوہو! تو یہ خوبرو جوان ننھی چڑیل کے لیے پھانسا جا رہا ہے۔ میری واری تے اماں نے ایسی جلدی مچائی تھی۔ یہ جامنی رنگ کا بلٹخا پسند کر کے مجھے اطلاع دے دی تھی۔ اگلے مہینے تیری شادی ہے۔ ابھی سے منہ پہ

"میں اسے جانے کی اجازت نہیں دے رہا۔" نواز کو شاید اپنی شامت جلدی بلوانے کی بے قراری تھی جوان دونوں کو دیکھ کر شان بے نیازی سے روایتی چول داماد والی اکڑ سے فرمادیا۔

"لے! میرے جیتے جی یہ فیصلہ کرنے والا تو کون ہوتا ہے؟ فریدہ 'پتری! میری طرف سے اجازت ہے۔ تو جا کے کچھ روز میکے رہ آ۔"

ساس اماں نے یہ اجازت دے کر نواز میاں کو حیران و پریشان کردیا۔

☼ ☼ ☼

فریدہ 'جوادی کے گھر میں موجود تھی اور اس کے آنسوؤں کے سیلاب میں یہ گھر شدید خطرے سے دوچار تھا۔

"پتا ہے مجھے 'یہ تو نظر باز' بدذات 'کمینہ... پریوں لڑکیوں سے فون پر عشق لڑاتا ہوگا۔ ہائے! لکھ لعنت اے۔" اس کے بعد بولنے میں وقفہ۔ کیونکہ رونے کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا تھا۔

"آہو باجی فریدہ! اب یہ چیخیں مارنا بند کرو اور ہماری بات سنو۔"

"روتے ہوئے میرے کان بند نہیں ہوجاتے۔ میں سن رہی ہوں۔ بولتے جاؤ۔ اب مجھے رونے سے نہ روکنا... اور پہلے یہ نمبر تو دو ناں مجھے۔ میں اس کمینی کی طبیعت تو صاف کروں۔"

"اس کی طبیعت کی صفائی کے لیے ہم ہیں ناں۔ آپ تو بس اپنے بے وفا شوہر کو بے وفائی کا سبق سکھانے کی تیاری کرو۔"

"پر کس طرح؟ میرا بس نہیں چلتا۔ نہیں تے میں نے پتا تھیں کیا کردینا تھا۔"

"ہم بتاتے ہیں۔ کیا کرنا ہے۔" شبلی اس وقت جیمز بانڈ کا پتر لگ رہا تھا۔

"کھانے میں جمال گوٹا ملا کے دے دوں؟" فریدہ نے تیزی سے کہہ کر داد طلب نظروں سے دونوں کو دیکھا۔

"بور نہ کرو باجی فریدہ! زبان بند 'کان کھلے رکھو۔ غور سے ہماری بات سنو۔ آواز بدلنے کی پریکٹس کرو۔"

"کیوں 'میری آواز اچھی نہیں ہے؟"

"او ہو باجی! سمجھنے کی کوشش کرو... آواز بدلو۔ کسی ینگ 'بدتمیز' کڑی کا لہجہ اپناؤ 'تے اپنے میاں جی کو فون کھڑکاؤ۔" جوادی نے اب کھل کر بتایا۔ وہ چونکی۔ شبلی مسکرایا۔ پھر ہچکچائی۔

"اگر پکڑی گئی تو...؟"

"تو بھی کچھ نہیں ہوگا۔ مگر یاد رکھیں! آپ کو پکڑے نہیں جانا۔ انہیں پکڑنا ہے... سزا دینی ہے۔"

کچھ گھنٹے پریکٹس کروانے میں لگے۔ انہیں خود بھی اندازہ نہیں تھا کہ فریدہ اتنی اچھی 'ایسی پکی ایکٹنگ کرے گی۔

شبلی کو دادی بار بار کال کر کے گالیوں پر گالیوں سے نواز رہی تھیں۔ اسے گھر جانا پڑا۔ اب کمرے میں جوادی اور فریدہ موجود تھے اور جس وقت جوادی صاحب کے بتائے فقرے زور شور سے یاد کرتی فریدہ بار بار دہرا رہی تھی۔

"دبلیو بی! دیوانی ہوگئی ہوں میں تمہاری۔ بہت پیار کرتی ہوں تم سے۔ آئی لو یو۔ آئی لو یو جانی!"

اسی نازک وقت میں عزیزی سویرا کی خوش گوار موڈ کے ساتھ آمد ہوئی تھی۔ الفاظ تھے کہ نوکیلے پتھر۔ وجود زخمی ہوا ہاتھ میں پکڑی بریانی کی پلیٹ اپنی آمد کا پتا دینے کے لیے زور سے میز پر پٹخی۔ یہ دونوں چونکے۔

"ارے سویرا تم!" فریدہ مسکرائی۔ مگر ادھر مسکراہٹ کا شائبہ تک نہ تھا۔ آنکھوں میں آنسو اور قہر بیک وقت دیکھے جاسکتے تھے۔ فریدہ نے نوٹ نہیں کیا۔

مگر جوادی گڑبڑ کو تاڑ گیا تھا۔

سویرا نے پلیٹ اپنے ہاتھ میں پکڑی۔ جھٹکے سے مڑی اور چل پڑی۔

"ہائیں ناں! تو کیا یہ بریانی کی خوشبو سنگھانے کے لیے لائی تھی؟" فریدہ حیران تھی۔ جوادی وقت ضائع کیے بغیر پیچھے لپکا۔

"او ہو! بات تو سنو 'کہاں بھاگی جارہی ہو؟" گیٹ کے قریب پہنچ کر اس نے راستہ روک لیا۔

"مجھے کسی سے کوئی بات نہیں کرنی۔ میں جارہی ہوں۔"

"میری بات سنے بغیر جاؤگی۔ ساری رات بستر میں کروٹیں بدلوگی۔ نیند کو ترسوگی۔ بہتر نہیں 'میری بات سنتی جاؤ؟"

"اب مجھے کوئی جھوٹ نہیں سننا۔ جوادی! تم نے بے وقوف بنایا ہے مجھے۔ کھیلے ہو تم مجھ سے۔ مگر سویرا اتنی بھی ارزاں نہیں ہے۔ میرے جذبات بہت قیمتی ہیں۔"

"چلو! اسی بہانے تمہاری اردو تو اچھی ہوگئی ہے۔ اب یہ بھی سن لو فریدہ باجی یہ سب مجھ سے نہیں کہہ رہی تھیں۔"

"ہاں! وہاں جن بھوت موجود تھے۔ شرم کرو۔ باجی بھی کہتے ہو۔ عشق بھی لڑاتے ہو... توبہ توبہ۔"

"باجی 'فریدہ کو کہتا ہوں۔ عشق تم سے لڑاتا ہوں۔"

مگر سویرا نے سنا نہیں۔ ہچکیاں لیتی گھر کو روانہ ہوگئی۔

☼ ☼ ☼

ادھر کمرے میں فریدہ نے پریکٹیکل کا آغاز کردیا تھا۔ موبائل میں نئی سم ڈالے وہ مجازی خدا کو کال کر رہی تھی۔

"ہیلو! کیا آپ شیزی بول رہے ہیں؟"

"اچھا! آپ شیزی نہیں ہیں۔ اللہ آپ کی آواز کتنی گمبھیر ہے۔ بالکل... بالکل وہ عامر خان جیسی۔ کیا آپ کی صورت بھی عامر خان جیسی ہے؟"

ان سوالوں کے جواب نواز میاں جس خلوص اور مروت سے دے رہے تھے۔ فریدہ کا جی چاہ رہا تھا فون میں ہاتھ ڈال کر زبان گدی سے کھینچ لے۔

"بے وفا! بدذات! بیوی سے تو کبھی اتنے پیار سے بات نہیں کی۔"

"کیا سوچنے لگیں آپ؟" نواز نے اس طویل خاموشی پر سوال کیا تھا۔

فریدہ چونکی۔

"میں... ؟ہاں میں سوچ رہی تھی کہ آپ بزی ہوں گے میں خواہ مخواہ آپ کا ٹائم ضائع کر رہی ہوں۔"

"ارے! نہیں نہیں۔ میں بزی نہیں ہوں اور آپ کے لیے تو بالکل بھی نہیں ہوں۔ ہاں کیا نام بتایا تھا آپ نے؟" نواز کا لہجہ پھول برسا رہا تھا۔

"یہ تو اس کام میں خاصا ایکسپرٹ ہو چکا ہے۔ پتا نہیں کب سے میری آنکھوں میں دھول جھونک رہا ہے۔" اس نے سوچا پھر بولی۔ "میرا نام... نام معصومہ ہے۔"

اپنی معصومیت کی مناسبت سے یہی نام سوجھا اور جھٹ سے کہہ دیا۔

"معصومہ... !لگتا ہے کسی نے بہت سوچ کے یہ نام رکھا ہے آپ کا۔"

"اور آپ نے اپنا نام تو بتایا ہی نہیں۔" فریدہ بمشکل شرما کر بولی۔

"میرا نام وکی ہے۔" نواز نے بتایا۔

"وکی! لو یہ بھی بھلا کوئی نام ہے۔ وکی تو میں اپنے بالتو بلے کو کہتی ہوں۔" غصہ کسی طرح تو نکالنا تھا' سو کہہ دیا اور نواز صاحب کو رج کے شرمندہ کر دیا۔

"وہ... نہیں... اصل میں نام میرا شاہ میر ہے۔ پیار سے دوست وکی کہتے ہیں۔" جھٹ سے تصحیح کی۔

"یہ کیسا پیار ہے۔ سچ بتاؤں' وہ پیار سے نہیں مذاق سے کہتے ہوں گے۔ سچ بتائیں۔ آپ کی شکل کتے' بلے سے تو نہیں ملتی؟"

"کیا کہہ رہی ہیں آپ!" نواز کو پہلی کال پہ یقیناً" ایسی بے تکلفی کی امید نہیں تھی۔

"ہاں' ہاں! ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ دوست اس طرح کے نام کسی نہ کسی خصوصیت کو دیکھ کے ہی رکھتے ہیں۔"

"چھوڑیں ناموں کو۔ یہ بتائیں معصومہ! آپ کرتی کیا ہیں؟"

"کرنا کیا ہے۔ مووز' شاپنگ' ہلا گلا اور بس۔" فریدہ نے وہ کچھ گنوایا' جواب حسرت بن چکا تھا۔

پہلی کال پر ہی اچھی دوستی ہو گئی۔

سیل بند کر کے فریدہ نے نواز کے اگلے پچھلوں کو جو ٹاک ٹاک کے سنانی شروع کی ہیں۔ جوادی کو خاموش کرانا مشکل ہو گیا تھا۔

"بس بھی کرو اب۔ یہ سوچو۔ کیسا الو بنا دیا ہے اب وہ حضرت آپ کو سامنے پا کر تو منہ بگاڑ کر حکم چلایا کریں گے اور فون پر آپ کی محبت کے گیت گاتے نہیں تھکیں گے۔" جوادی نے تصویر کا خوب صورت رخ دکھایا۔

"اب میں کبھی اس دوغلے انسان کی عزت نہیں کر سکوں گی۔" فریدہ نے سسکی لی۔

"اچھا! اب جا کر سو جائیں۔ آپ کو نہیں پتا' آپ کی وجہ سے میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔"

☼ ☼ ☼

صبح شبلی کی آمد پر جوادی نے سویرا کی خفگی کے بارے میں بتایا۔ پوری بات سن کر شبلی نے خوب انجوائے کیا اور جوادی نے اس پر خوب ہی غصہ کیا۔

"اوہو یار! اب کیا میرے خوش ہونے پر بھی پابندی ہے؟ ویسے پریشان نہ ہو۔ محبت میں اکثر ایسے مقام آجاتے ہیں۔ مان جائیں گی مس سویرا بھی۔ ویسے میں تو یہ سوچ کے آیا تھا۔ فریدہ آپا کی سسرال چلتے ہیں مزے کا ناشتا بھی کریں گے اور نواز صاحب کے درشن بھی کر آئیں گے۔"

"چھوڑو دفع کر یار! یہ فریدہ آپا کی ساس اچھی خاصی چنڈال لیڈی ہے۔ کوئی نواں تماشا ہی نہ شروع کر دے۔"

"ہیلو فریدہ آپا!" بکھرے بال! سوجی آنکھوں کے ساتھ فریدہ ادھر آئی تو شبلی نے حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ اس نے جواب نہیں دیا۔

"کیا یہ رات کو گھر کی چوکیداری کے فرائض انجام دیتی رہی ہیں؟ بری بات ہے جوادی! مہمان سے یہ سلوک اور تمہارے گھر میں ایسا ہے ہی کیا جس کی حفاظت کے لیے چوکیدار کی ضرورت پیش آجائے؟"

"جی! اسی لیے چوکیداری نہیں کروائی۔ ان کا منہ شوہر کی بے وفائی کی وجہ سے فٹے منہ ہو گیا ہے۔"

"لعنت بھیجیں اس نامراد شوہر پر۔ جائیں! ہمارے لیے اچھا سا ناشتا تو بنا کر لائیں۔"

"یہاں کلیجہ جل کے راکھ ہو گیا ہے۔ تمہیں ناشتے کی پڑی ہے۔ میں نہیں بنا رہی ناشتا۔" آواز بھرا گئی۔

اسی وقت شہناز کی آمد ہوئی۔ تینوں کو منہ لٹکائے بیٹھے دیکھا۔ کچھ چونکیں' کچھ خفا ہوئیں۔

"سویرے سویرے نحوستیں سجا کے کیوں بیٹھ گئے ہو؟"

"پسند کا ناشتا چاہیے۔" جوادی نے بتایا۔

"پر مجھے ناشتا نہیں چاہیے۔" فریدہ بسوری۔

"کیا ہوا؟ ان دونوں نے کچھ کہا ہے؟" شہناز قریب آبیٹھیں۔

"یہ دونوں معصوم کسی کو کیا کہیں گے۔ میری زندگی تو اس نے برباد کی ہے۔ جس کے نام پہ اب مجھے ساری عمر گزارنی ہے۔"

"کون۔ نواز؟" شہناز جھٹ پہچان گئیں۔

"آہو!" فریدہ سسکی۔

"دیکھا! میری گل سچ ثابت ہو گئی ناں! میں تو پہلے ہی کہتی تھی۔ اے پورا سنپ (سانپ) کا بچہ ہے پر میری کسی نے سنی ہی نہیں۔ کر دیا تیرا رشتہ پکا۔ اب بھگتو۔ یہ سب میری نافرمانی کا نتیجہ ہے۔"

"بھگت ہی تو رہی ہوں... ہور کیا کروں۔"

"اچھا... ناں پر ہوا کیا ہے؟" اب تجسس نے سر ابھارا۔

"فون پر غیر لڑکیوں سے عشق لڑاتے ہیں دولہا بھائی۔" جوادی نے بتایا۔

"ہائیں؟ تے فیر تم دونوں کیسے بھائی ہو۔ پکڑ کر پٹائی کیوں نہیں کرتے اس کی؟ ہائے ربا! ایسا بے غیرت ہے وہ۔ میں خود جاتی ہوں اس کے گھر۔ کرتی ہوں اس کی اماں سے بات۔"

"رہنے دیں آنٹی! ہم ہیں ناں۔ سب سنبھال لیں گے۔"

"اچھا! فیر سنبھال لینا۔ ایسا نہ ہو۔ کہیں وہ کسی فون والی کو ویاہنے سہرا باندھ کے نکل جائے۔"

"شہناز!... شہناز بیگم! میں نے رات کو الماری میں دس ہزار روپے رکھے تھے۔" ہیڈ ماسٹر صاحب پریشانی کے عالم میں آواز دیتے ہوئے آئے۔

"رکھے تھے' تے میں کیا کروں؟ تاں مجھے بتایا تھا کہ میں ادھر الماری میں دس ہزار روپے رکھ رہا ہوں۔ ان روپوں کے پیر لگے ہوئے ہیں۔ رات کو نگرانی کرنا کہیں دوڑ نہ جائیں۔"

"اوہو ہر گل الٹی ہی کرنا او میرا مطلب تھا گر اٹھا کے کہیں سنبھال لیے ہیں تو نکال کے دے۔"

"سنبھال لیے ہیں تو یوں کہہ رہے ہو جیسے دس ہزار نہیں دس لاکھ تھے۔"

"او معاف کر دے مجھے۔" ہیڈ ماسٹر صاحب تلملاتے ہوئے گھر سے رخصت ہو گئے۔

"دس ہزار غائب ہیں۔ اب الزام آئے گا مجھ معصوم پہ۔" جوادی کو اپنی فکر ہوئی۔

"او نئیں گھبرانہ۔ دس ہزار میرے پاس ہیں۔ ماسٹر صاحب ایسے ہی ادھر ادھر خرچ کر لیتے۔ میں نے رکھ لیے ہیں۔ بازار جاؤں گی۔ لان کے نئے جوڑے لے لوں گی۔ روپے کمانا آسان تھوڑی ہے۔ سمجھ داری سے خرچ کرنا چاہیے۔ تو بھی چلنا فریدہ! پزا بھی کھلاؤں گی' تے نالے آئس کریم بھی۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔ اس دوغلے بے وفا کا غم اپنی جگہ ... پر اس کا یہ مطلب تھوڑی ہے' دنیا کی رونقوں سے بالکل ہی منہ موڑ لوں۔ گھر سے چلتے وقت نواز کے بٹوے سے میں بھی چھ ہزار نکال لائی تھی۔ جب تک خرچ نہیں کروں گی۔ طبیعت میں بے چینی ہی رہے گی۔"

"ہم بھی چلیں؟" شبلی کا انداز سکھی سہیلی والا تھا۔

"دے رہن دیو۔ کوئی ضرورت نہیں۔ گھر میں بیٹھو آرام سے۔" صاف جواب ملا تھا۔

☼ ☼ ☼

نواز صاحب فریدہ کو لینے آئے تھے۔ اس وقت دامادانہ نخرے سے دادی کے آنگن میں کرسی پر بیٹھے بار بار گھڑی دیکھ کر انہیں ان کی لڑکی کی نااہلی کا احساس دلا رہے تھے۔ مگر دادی ایسے نخروں کو کہاں خاطر میں لاتی تھیں۔

"لگتا ہے نوازے! تو نے بیوی کو بالکل ہی گھر کا قیدی بنا کے رکھا ہوا ہے۔ اسی لیے آج بازار گئی ہے تے گھر کا رستہ ہی بھول گئی ہے۔"

بے نیازی سے فرمائی گئی یہ بات تھی یا دھماکا۔ نواز صاحب تو کرسی سے اچھل ہی پڑے۔

"میں... یعنی کہ میں اسے شاپنگ نہیں کرواتا؟ میں نے اسے گھر میں قید کیا ہوا ہے؟ آپ کو کیا پتا کس قدر گھومتی پھرتی ہے وہ۔"

"جی جی! سارا وقت لاؤنج اور کچن کے درمیان چکر لگاتی رہتی ہے۔" شبلی کی گواہی نے نواز صاحب کو گڑبڑا بھی دیا اور طیش بھی اچھا خاصا دلایا۔

جوادی نے ایک نظر نواز کے سرخ پڑتے چہرے پر ڈالی۔ پھر شوشا چھوڑا۔

"میرا جی چاہتا ہے جس گھر میں کھوتے کے پتر بیوی پر ظلم کرتے ہوں۔ اسی گھر سے بیوی لے کر آؤں تاکہ بہن کے آنسو کچھ انسانیت بیدار کرنے میں مدد دے سکیں۔"

"ٹھیک کہتے ہو جوادی! جب تک دل پر ہاتھ نہ پڑے۔ انہیں عقل کہاں آسکتی ہے۔"

"میرا خیال ہے۔ میں چلتا ہوں۔" داماد صاحب کی اکڑ نکل گئی تھی۔ اب بھاگنے کے چکر میں تھے۔

"چائے پی کے جانا۔" دادی نے کچھ ڈپٹنے کے انداز میں آداب میزبانی نبھائے۔

"نہیں! اس کی ضرورت نہیں۔ مجھے کچھ کام ہے۔"

"رہن دے۔ بڑا آیا کامی (کام کرنے والا)۔ چائے نہیں پینی تھی تو پہلے بتانا تھا۔ اب تو چولہے پر چڑھا دی ہے۔ پی کے ہی جانا مکے گا۔ ہاں! تو کیا کہہ رہا تھا فریدہ کے بارے میں؟" تیور ایسے تھے جیسے ایک لفظ بھی فالتو کہا تو طمانچہ گال پر ہوگا۔

"کچھ نہیں جی۔ میں نے کیا کہنا ہے۔"

"شاباشے! خاموشی اچھی عادت ہے۔" دادی نے بغور دیکھ کر سنجیدگی سے کہا۔

☼ ☼ ☼

رات کو ان دونوں کے رٹائے جملے یاد کرنے کے بعد نواز سے گھنٹہ بھر بات کی تھی۔ اور اس کے بعد تقریباً" دو گھنٹے تک آنسو بہائے تھے۔

"میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی میرا نصیب جس بندے سے پھوٹا ہے وہ ایسا گھٹیا بھی ہو سکتا ہے۔"

"انسانی سوچ بڑی محدود ہے آپا! رب کی رب ہی جانے۔" جوادی نے فلسفہ جھاڑا۔

"میں سویرے ہی گھر جا رہی ہوں۔ ایسے بے دید کو اکیلا نہیں چھوڑا جا سکتا۔"

"مرضی ہے آپ کی۔ لیکن یہ ڈراما جاری رکھیے گا۔ اس وقت تک جب تک کہ ایک خوب صورت انجام سے دوچار نہ ہو جائے۔"

"ٹھیک ہے۔ اور تم دونوں آتے جاتے رہنا۔ اسی بہانے بدذات منھی بھی کچن میں جھانک لیتی ہے۔"

"ارے! منھی سے یاد آیا۔ آپ کے چکروں میں میری ننھی سی دنیا تو برباد ہونے کو ہے۔" جوادی کو سویرا کا خیال آیا۔ پھر وہ رکا نہیں۔ اٹھ کر بھاگنے کے انداز میں نکل گیا۔

"اسے کیا ہوا ہے؟" فریدہ حیران تھی۔

"ادھار لیا تھا کسی سے۔ اس کے آنے کا ٹائم ہو رہا ہے۔" شبلی نے بتایا۔

"اچھا؟ ہائے! بے چارہ میرا ویر (بھائی)۔ دو تین ہزار تو ہیں میرے پاس۔ ویسے ادھار کتنا لیا تھا؟"

"یہی کوئی دو تین ہزار۔" بے نیازی سے کہا گیا۔

"چلو! فیر تے اس کا مسئلہ حل سمجھو۔ میں ابھی لے کے آتی ہوں۔"

☼ ☼ ☼

فریدہ کی گلی کے پچھواڑے یہ دونوں شکیل کے گھر تھے۔ شکیل کی والدہ نے بلوایا تھا۔ دادا جی جتنے بڈھے ہوتے جارہے تھے۔ اتنے ہی بے قابو ہوتے جارہے تھے۔

جس وقت یہ دونوں شکیل کے گھر پہنچے۔ شکیل کی اماں سر ہاتھوں میں تھامے اور شکیل چہرے پر اداسی طاری کیے بیٹھا تھا۔

ان کے جاتے ہی شکیل کی اماں دکھڑے رونے شروع ہوگئیں۔

"کیا بتاؤں تم دونوں کو... بابے نے بڑا تنگ کیا ہوا ہے۔ ہور کچھ نہیں تو بندہ اپنی عمر کا ہی لحاظ کرلیتا ہے۔ اس کی وجہ سے اب تک میرا پتر کنوارا ہے۔ اس کا رشتہ کہیں پکا نہیں ہو رہا۔" ماں کی دہائی پر شکیل صاحب کے چہرے کے تاثرات مزید بھیانک ہوگئے۔

"کیا دادا پوتے کی خوشیوں کا قاتل بن گیا ہے؟" جوادی نے ابرو اچکا کر پوچھا۔

"صدقے جاؤں۔ کتنے ذہین ہو۔ بالکل یہی بات ہے۔ کہتے ہیں میرا بھی ویاہ کراؤ۔ میں تنہائی نہیں جھیل سکتا۔ شکیل کا رشتہ لے کے گئی تھی۔ مجھے لڑکی پسند آگئی تھی۔ پھر لڑکی کی ماں اور نانی شکیل کو دیکھنے آئیں اور ابا جی نانی کو پسند کر بیٹھے۔ ہائے! کچھ نہ پوچھو کتنی شرمندہ ہوئی ہوں میں۔"

"مسئلہ تو گمبھیر ہے۔" شبلی نے افسوس کیا۔

"اب کیا کروں؟ کہاں سے ان کے لیے مائی ڈھونڈ کے لاؤں؟ تمہیں پتا ہے نا' پاکستانی عورتیں عمر کے اس حصے میں ویاہ کو جرم قرار دیتی ہیں۔"

"آپ پریشان نہ ہوں۔ اگلی بار اس مسئلے کے خوب صورت حل کے ساتھ حاضر ہوں گے۔ اب اجازت دیں۔ کچھ اور کام بھی ہیں۔" دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔

"دیکھو! بھول نہ جانا۔"

"اوہو آنٹی! یہ بھی کوئی بھولنے والی بات ہے۔ فکر نہ کریں اور شکیل چندا! ذرا دو ہزار ادھار تو دینا۔ بڑی سخت ضرورت ہے۔"

اور ضرورت بلکہ سخت ضرورت تو اس وقت شکیل چندا کی یہ دونوں تھے۔ کیسے انکار کرتا۔ گھر کے گیٹ سے باہر آتے آتے جتا دیا۔

"یہ قرض حسنہ ہے۔ اگر کبھی ہوں گے تو ادا کردیں گے۔ ویسے تم واپسی کی امید نہ ہی رکھنا۔" شانے پر ہاتھ رکھ کر جوادی نے محبت سے اطلاع دی اور دونوں گھر سے باہر آگئے۔

"کتنی خوشی کی بات ہے۔ اب اس ملک کے بابے بھی باشعور ہوگئے ہیں۔" شبلی کا انداز تعریفی تھا۔

"پتا نہیں عورتیں کب باشعور ہوں گی۔" جوادی خواتین کی حالت زار پر افسردہ تھا۔

"یہ جو گیٹ سے لٹکی ہوئی ہے۔ یہ ننھی ہے نا؟" شبلی نے سامنے دیکھ کر کہا۔ جوادی ٹھٹک گیا۔

"لٹکی ہوئی ہے... زندہ یا مردہ؟"

"لگ تو زندہ ہی رہی ہے۔"

شبلی کا اندازہ درست تھا۔ واقعی ننھی گیٹ سے تقریباً" لٹکی سامنے والے گھر کی کھڑکی میں ایستادہ سہیلی حور بانو سے باتیں کر رہی تھی۔ یہ قریب گئے۔ نظر جوادی پر پڑی تو ستاروں میں روشنی نہ رہی۔

"ہائے اللہ! آپ ادھر؟"

"کیوں' ادھر کوئی غیر قانونی کام ہوتا ہے کیا؟ شریف آدمی کا ادھر سے گزرنا جرم ہے؟"

"نہیں' نہیں! میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ میں تو خوش ہو رہی تھی۔"

"ان کی تعریف؟" ایسے خوبروؤں کو دیکھ کر حور بانو کے دل میں بھی ہلچل ہوئی۔

"پھر بتاؤں گی۔" ننھی شرم سے دوہری ہوئی۔ یہ دونوں حیران ہوگئے۔

"آپ تو شرما بھی لیتی ہیں۔" جوادی تعریف کیے بغیر رہ نہ سکا۔

"ہاں جی! اداکارہ بڑی اچھی ہے۔" سہیلی آستین کا سانپ بن کر راز فاش کر رہی تھی۔

"تیرے سے میں بعد میں پوچھوں گی۔" ننھی نے بمشکل ضبط سے کام لیا۔ پھر ان دونوں کو گھر میں آنے کی دعوت دی۔ جسے انہوں نے قبول کرلیا کہ یہ وقت شام کی چائے کا تھا۔

فیصلہ سود مند ثابت ہوا۔ ننھی نے جھٹ پٹ گلی کے نکڑ سے قیمے والے سموسے' قریبی بازار سے چاکلیٹ والا کیک اور پڑوس کے گھر سے پکوڑے منگوا لیے تھے۔

جب میز سج گئی تو فریدہ کی ساس اماں کا اصرار تھا۔

"یہ سب میری ننھی نے بنایا ہے۔"

انہیں اختلاف کرکے بھلا کتنے نفلوں کا ثواب ہو جانا تھا۔ سو بظاہر ان کی بات پر یقین کرلیا۔ ہاں! قیمے والے سموسے کھاتے ہوئے شبلی جھوم جھوم کر کہہ رہا تھا۔

"ننھی کے ہاتھ میں تو سموسے والے کا سا مزا ہے۔ واہ' واہ کیا بات ہے۔"

"آتے جاتے رہا کریں۔" ننھی نے بظاہر چائے کا کپ اٹھانے کو جھکتے ہوئے جوادی کے کان کے قریب سرگوشی کی۔

"فریدہ! او کام چور عورت!" نواز صاحب کی دھاڑ سنائی دی تھی۔

ایسے نازک وقت میں نواز کی یہ بے وقوفی۔ ساس اماں جی کا جی چاہا' سر پیٹ لیں (نواز صاحب کا)

"بھائی غصے کے ذرا تیز ہیں۔ دل کے برے نہیں۔" ننھی نے مسکرا کر راز افشا کیا۔

اتنے میں نواز صاحب ادھر آنکلے۔ یہاں سے وہاں تک سجی میز' اس پر موجود سسرال کے جوان جہان لڑکے اور برابر میں چھیل چھبیلی بہن اور اماں۔ ٹھٹکتے نہ تو کیا کرتے۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟"

"بھائی جان! ہم چائے پی رہے ہیں۔ آپ بھی آئیں ناں... اور یہ بھابھی کو اتنی بدتمیزی سے کیوں بلا رہے تھے؟ اتنی اچھی بیوی ملی ہے آپ کو۔ قدر کریں اس کی۔ اگر آئندہ آپ نے ایسی بدتمیزی سے انہیں پکارا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔"

"اماں! اٹھو میری بات سنو۔" انہیں جوادی' شبلی کی آمد پر سخت اعتراض تھا۔

اماں کے اٹھنے سے پہلے فریدہ چلی آئی۔

"کہاں تھیں تم؟" نواز صاحب اب کے گرجے تو نہیں۔ مگر انداز کڑا تھا۔

"کہاں جانا ہے مجھے۔ ادھر ہی تھی صحن میں اصل میں وہ برابر والی دیوار سے باتیں کرنے لگی تھی۔ اس لیے دیر ہوگئی۔"

"تم عورتوں کو کوئی کام بھی ہے باتوں کے علاوہ؟"

"وہ بھی مجھ سے یہی کہہ رہی تھی کہ تمہارے میاں کو باتوں کے علاوہ کوئی کام نہیں ہے؟ سارا دن سیل فون پر مس کالیں مارتا رہتا ہے۔ اسے بتا دو ہمیں مس کالیں نہیں مارنی۔ کسی دن اسے پکڑ کے مارنا ہے اور بہت برا مارنا ہے۔"

"بکواس کرتی ہے۔" نواز صاحب منمنا کر اسی قدر کہہ سکے۔

"اس کا پیغام پہنچانا میرا فرض تھا۔ باقی آپ کی مرضی۔"

"میری لال شرٹ کدھر ہے؟" نواز صاحب کو وہ کام یاد آگیا۔ جس کے لیے پکار پڑ رہی تھی۔

"وہ لال شرٹ؟" فریدہ نے گھور کر شوہر کے چہرے پر خباثت کی مقدار چیک کی۔ وافر مقدار کی موجودگی دیکھ کر گہرا سانس لیا۔ پھر بولی۔

"وہ تو واشنگ مشین میں ڈالی ہے دھونے کے لیے۔"

"کیا... ؟ وہ دھلی ہوئی نہیں ہے؟ بیڑا غرق مجھے تو چاہیے تھی۔ اچھا! ایسا کرو۔ گلابی والی لے آؤ۔"

"گلابی والی؟" فریدہ نے بمشکل غصہ ضبط کیا۔ پھر بولی۔

"وہ میں نے پریس کرکے رکھی تھی۔ اماں کی پالتو مرغی کمرے میں آئی۔ اس پر چڑھی اور بیٹ کرکے یہ

جاوہ جا۔"

"اُو! اس گھر میں کوئی کام سیدھا بھی ہے کہ نہیں؟"

"سفید کرتا شلوار پریس کیا رکھا ہے۔ وہ پہن جائیں۔"

"میں نے مشورہ نہیں مانگا۔" اتنے میں سیل کی منحوس سی بیپ بجی۔ نواز صاحب کا چہرہ کھل اٹھا۔ فون کو ہاتھوں میں لے کر نگاہوں سے چوما اور تیزی سے باہر نکل گئے۔ فریدہ کا بگڑا موڈ مزید خراب ہوا اور وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔

"سمجھاؤ اپنی بہن کو۔ اسی طرح منہ پھلائے پھرتی رہتی ہے۔ اتنا اچھا شوہر ملا ہے۔ مگر اسے ذرا بھی قدر نہیں ہے۔" فریدہ کی ساس نے محتاط انداز میں کہا۔

"کیک بالکل فریش اور خاصا ٹیسٹی ہے۔" جوادی کی طرف سے ان کی بات کا یہ جواب تھا۔

☆ ☆ ☆

"یار! شکیل کے دادا کو لاروں پر لگائے رکھنا ہے یا ان کے لیے کچھ کرنا ہے؟" رات کو سونے سے پہلے شبلی، جوادی سے پوچھ رہا تھا۔

"آخری عمر ہے بے چاروں کی۔ میرا خیال ہے۔ کوئی امید کی کرن، کوئی آرزو کی کلی ان کے دامن میں ڈال دینی چاہیے۔ تم یہ بتاؤ! الزتھ ٹیلر ٹھیک رہے گی یا صوفیہ لورین؟"

"کیا مطلب؟" شبلی پہلی بار اس کے اشارے کو سمجھ نہیں سکا تھا۔

"یار! اب پاکستانی مائیاں تو ماننے سے رہیں۔ میرا خیال ہے سمندر پار والیوں کی تصویروں سے بابا جی کے دل کی دنیا آباد کی جاسکتی ہے۔ ویسے یار! یہ باجی فریدہ کی ساس بھی تو ہیں۔ ان کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"خدا کو مانو یار! فریدہ کی ساس کے پیچھے نواز کے روپ میں خونخوار بیٹا بھی تو موجود ہے۔ بابا اپنی آرزوؤں سمیت ویاہ سے پہلے جہنم رسید ہو جائے گا۔ نہیں، نہیں اس خیال کو دل سے نکال دو۔"

"ہوں! یہ بھی ہے۔ چلو پھر! صوفیہ لورین کو شکیل کی دادی بنانے کی تیاری کرو۔ خیال رہے تصویر اس کے بڑھاپے کی ہونی چاہیے۔"

"رشتہ پکا ہونے پر دادا سے مٹھائی کے لیے کم از کم بیس ہزار تو لینے چاہئیں۔"

"بالکل یہ ہمارا حق بنتا ہے۔ ویسے بھی سویرا بڑی ناراض ہے۔ اسے بھی منانا ہے۔ کوئی گفٹ شفٹ بھی دینا پڑے گا۔"

آسمانی کلر کے دوپٹے میں میڈم صوفیہ لورین کی باوقار سی تصویر اس وقت جوادی کے بیڈ پر پڑی تھی جبکہ یہ دونوں خود کمرے سے غائب تھے۔

نانا ماموں آئے تو ان کی تلاش میں تھے۔۔۔ اور ظاہری سی بات ہے، جب وہ ان کی تلاش میں آئے تھے تو ان کے مزاج کیا ہوں گے، یہ بتانے کی ضرورت ہی نہیں۔ مگر آہ ظالم! تیری ادا نے مارا۔ ایک نظر۔۔۔ پھر دوسری نظر۔۔۔ اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔

دونوں آگے پیچھے بڑے جوش کے ساتھ کمرے میں آئے تھے۔ مگر نانا ماموں کے بت کو دیکھ کر ٹھٹک کر رک گئے۔

"نانا ماموں! خیریت تو ہے ناں؟ کیا آپ کے اسکول میں پڑھنے والے نونہالوں نے اسکول سے نام خارج کروانے کا فیصلہ کر لیا ہے؟"

"یہ حسین خاتون کون ہیں یہ؟"

"او تو! فساد کی جڑ یہ فسادن ہے۔" دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ جوادی کھنکھارا۔

"یہ یہ آنٹی دل ربا ہیں۔"

"دلربا، ہاں! واقعی وہ تو ہے۔"

"نانا ماموں، وہ شکیل کے دادا ہیں ناں! انہوں نے شادی کا فیصلہ کر لیا ہے۔۔۔ تو یہ تصویر دادا کی ہونے والی دلہن کی ہے۔"

"کیا بکواس کر رہے ہو؟ قبر میں پیر لٹکا کر بیٹھا وہ بڈھا اور کہاں یہ چاندنی میں نہائی جل پری۔ یہ شادی نہیں ہو سکتی۔ اگر تم نے یہ ظلم کیا تو میں آپا سے تمہاری

شکایت لگا دوں گا۔"

"آپ کو ان خاتون سے اتنی ہمدردی کیوں ہے؟ کیا یہ آپ کی منہ بولی بہن ہیں؟" شبلی دور کی کوڑی لایا تھا۔

"لگتا ہے تمہارا خون میرے ہاتھوں لکھا جا چکا ہے۔" نانا ماموں کا طیش بے مثال تھا۔

"میں نے فیصلہ کیا ہے تمہاری نانی ممانی یہی حیا کی پتلی بنے گی۔" نانا ماموں نے شرما کر فیصلہ سنایا۔

"حیا کی پتلی صوفیہ لورین؟" دونوں نے بمشکل ہنسی روکی۔

"کسی کو میرے فیصلے پر اعتراض تو نہیں ہے۔"

"نہیں، نہیں نانا ماموں! اعتراض بھلا کیوں ہوگا؟ ہاں! ایک مسئلہ ضرور ہے۔" جوادی نے اٹک اٹک کر کہا۔

"کیسا مسئلہ؟ جلدی بولو۔"

"نانا ماموں! یہ تصویر ہم شکیل کے دادا کو دکھا چکے ہیں اور انہوں نے رشتہ اوکے کر کے ہمیں مٹھائی کے لیے پانچ ہزار بھی تھما دیے تھے۔"

"تم یہ پانچ ہزار فوراً واپس کر کے آؤ۔ کہہ دینا لڑکی والوں کو بوڑھے بیمار گدھ پسند نہیں۔"

"مسئلہ یہ ہے کہ ہم پانچ ہزار خرچ کر چکے ہیں۔"

"او ہو! ایک تو تم لوگوں کی شاہ خرچیاں۔ جاؤ! کہہ دو چند دن میں واپس کر دیں گے۔" نانا ماموں کی کنجوسی صوفیہ لورین کی پیاری صورت دیکھنے کے باوجود برقرار تھی۔

"مگر چند دن بعد ہم پانچ ہزار کہاں سے لائیں گے؟" شبلی نے معصومیت اور بے چارگی سے چہرہ سجا کر پوچھا۔

"محنت مزدوری کر کے اکٹھے کر لینا۔" مشورہ لاجواب تھا۔

دونوں نے داد دینے والے انداز میں نانا ماموں کو دیکھا۔ پھر ایک دوسرے کو۔

"جائیے نانا ماموں! بر دکھوے کی تیاری کیجیے۔"

اور نانا ماموں جھومتے، شرماتے کمرے سے روانہ ہو گئے۔

"واہ واہ! کیا بات ہے۔ نانا ماموں جان آپ کی۔۔۔ پاگل ہیں ناں ہم۔ چلو جی! اٹھاؤ تصویر۔۔۔ چلتے ہیں شکیل کے گھر۔" جوادی کو نانا ماموں کی کنجوسی پر شدید غصہ تھا۔

"ویسے یار! یہ تصویر کچھ زیادہ ہی سوہنی ہے۔ سر پر دوپٹا لے کر صوفیہ بڑھاپے میں بھی حسن کی دیوی لگ رہی ہے۔ کہیں مارے خوشی کے شکیل کی دادا مر ہی نہ جائیں۔" شبلی کے خدشات بے جا نہیں تھے۔

☆ ☆ ☆

جوادی شبلی کے کہنے کے مطابق فریدہ باجی دن میں کئی کئی بار نواز صاحب سے معصومہ بن کر باتیں مٹھارتیں اور جواب میں جیسے جیسے ڈائیلاگ نواز صاحب مارتے تھے۔ انہیں جوتوں سے مارنے کو دل بے قرار ہونے لگتا۔

"معصومہ! تمہیں دیکھنے کو دل ترس رہا ہے۔ تم سے ملنا چاہتا ہوں۔ یقین کرو، آمنے سامنے بیٹھ کر تمہارا ایک ایک نقش حفظ کرنے کو جی چاہتا ہے۔"

"نہ۔۔۔ میں ملنے نہیں آ سکتی۔" غصہ دبا کر فریدہ نے ادا سے کہا تھا۔

"مگر کیوں بے بی؟" نواز صاحب افسردہ ہوئے۔

"اکثر مرد بڑے کھوتے کے کھر ہوتے ہیں ناں۔ پاپا! میری نانی نے منع کیا ہوا ہے۔ میں نہیں آؤں گی۔"

"میں بہت نیک شریف لڑکا ہوں بے بی! ایک بار۔۔۔ صرف ایک بار آجاؤ۔ دیکھو انکار کر کے میرا دل نہ توڑنا۔"

"اچھا! نانی سے پوچھ کر بتاؤں گی۔"

اور اگلے روز وہ دو "نانیوں" سے مشورہ کر رہی تھی۔

دونوں نانیاں بہت خوش تھیں۔ کیونکہ شکیل کے دادا نے ان کے لائے رشتے کو جی جان سے قبول کر لیا تھا۔

اور انہوں نے شکیل کی امی سے کہہ دیا تھا کہ ایسی

حسین مائی کی تصویر ہی ابا بے کو بے قابو کرنے کو کافی ہے۔ دن رات اسی کے خوابوں میں کھوئے رہیں گے۔ اس دوران آپ اطمینان سے شکیل کا رشتہ تلاش کریں۔ بلکہ شادی بھی کر ڈالیں۔

"ابا جی بڑے ضدی ہیں۔ اب تو جب تک تصویر والی مل نہیں جائے گی۔ چین سے نہیں بیٹھیں گے۔ ویسے ترکیب تمہاری لاجواب ہے۔" شکیل کی اماں خوب ہنسی تھیں۔

"بس! پھر بے فکر رہیں۔ ہم آگے بھی معاملہ سنبھال لیں گے۔"

اور اب وہ دونوں فریدہ کے روبرو تھے۔ فریدہ غصے میں بھی اور رو بھی رہی تھی۔

"میری طرف تو مسکرا کے دیکھتے بھی جان نکلتی ہے اور بے بی کے لیے مکالمے بولتے نہیں تھکتا بے حیا!"

"دل چھوٹا نہ کرو باجی! سزا جزا کا دن قریب آنے کو ہے۔" شبلی نے تسلی دی۔

"میرا خیال ہے آج کی رات وہ جو مکالمے بولیں گے۔ وہ آخری ہوں گے۔"

"ہائے اللہ! کیا اس کے بعد وہ بولنے کے قابل نہیں رہیں گے؟" فریدہ کو آخر کار شوہر کا احساس تو تھا۔

"فون پر ڈائیلاگ مارنے کے قابل نہیں رہیں گے۔" جوادی جانے وضاحت کی تو اطمینان ہوا۔

"ویسے آپا! تمہاری ساس بھی خاصی ناقابل برداشت قسم کی خاتون ہیں۔ ان کی رخصتی کے بارے میں کبھی نہیں سوچا تم نے؟" شبلی کو ایک نیا خیال سوجھا تھا۔

"لو! کوئی ایک بار... بہت بار سوچا ہے۔ پر رب کی مرضی، پتا نہیں ابھی کتنے سال ہور انہوں نے دنیا والوں کی چھاتی پہ مونگ دلنا ہے۔"

"اوہو! میرا مطلب تھا۔ انہیں رخصت کریں۔ مطلب شادی کر دیں ان کی۔"

اس بات پر اتنے خراب موڈ کے باوجود فریدہ کو جو ہنسی آئی تو آتی ہی چلی گئی۔ بمشکل ہنسی رکی تو بولی۔

"میں سوچوں گی۔ کس خاندان سے مجھے جانی دشمنی ہے۔ پھر وہاں بھی انہیں گھسانے کی سوچوں گی۔ فی الحال ان کے بیٹے کو سمجھانے اور سبق سکھانے کی سوچو۔"

"سبق تیار ہے۔ بس آپ انہیں سنانے کی کرو۔"

"کہہ دیں! کل شام آپ ان سے ملنے کے لیے پارک میں آئیں گی۔ آپ نے گلابی رنگ کا لباس پہنا ہو گا۔"

"گلابی نہیں میں نیلے رنگ کا جوڑا پہنوں گی۔"

"چلو! ٹھیک ہے۔ جیسے آپ کی مرضی۔ ویسے یہ ٹھیک بھی رہے گا۔ آپ کا نیلا جوڑا اور ملاقات کے بعد ان کا نیلا چہرہ۔"

"ہائے! کیا قسمت ہے میری بھی۔ دن رات اس آدمی کا گھر سنبھالتی ہوں۔ اس کی بد زبان اماں، کام چور بہن کے نخرے اٹھاتی ہوں۔ اس بد مزاج آدمی کی ہر بات مانتی ہوں اور یہ...؟ یہ جو مجھ پہ اتنا رعب جماتا ہے غیر عورتوں کے سامنے پالتو جانور کی طرح بچھا جاتا ہے۔ اسے کوئی گل تے نہ ہوئی۔"

"ٹھیک کہتی ہو فریدہ باجی! ہمارے ملک کے بہت سارے مرد نیک اور مخلص بیویوں کی قدر نہیں کرتے۔ لیکن سارا قصور مردوں کا بھی نہیں ہے۔ ان لڑکیوں کے بارے میں بھی سوچو ناں، جو غیر مردوں سے فون پر گھنٹوں باتیں کرتی ہیں۔ انہیں یہ احساس ہی نہیں، وہ غیر مرد سے اس طرح باتیں کر کے گناہ گار تو ہو رہی ہیں۔ مگر ایک گھر کی تباہی میں بھی ان کا ہاتھ ہے۔ اگر لڑکیاں یہ شغل ترک کر دیں تو پھر مرد زبردستی تو نہیں کر سکتے ناں۔"

"ہاں! ٹھیک کہتے ہو تم۔ پتا نہیں، یہ آج کل کی کڑیاں چند میٹھے بولوں کے عوض مرد کو اتنا آگے بڑھنے کی اجازت کیوں دے دیتی ہیں؟"

"اس بات کا جواب کوئی کڑی ہی دے سکتی ہے۔ ہم تو صرف دعا ہی کر سکتے ہیں۔"

☆ ☆ ☆

اور ادھر زیبا اور سویرا ان کی بے وفائی کا سوگ منا رہی تھیں۔ ان کے راہ راست پر آنے کی دعائیں زور و شور سے جاری تھیں۔
سویرا نے زیبا کو بتایا تھا۔ جوادی بے وفائی پر تلا ہوا ہے اور زیبا نے یہ خود سے فرض کرلیا تھا۔ شبلی بھی یقیناً "یہی کچھ کر رہا ہوگا۔
"خوبرو لڑکے بڑے لعنتی ہوتے ہیں۔" یہ دل جلی زیبا کا خیال تھا۔
"اور وہ جن کی صورت پہ پھٹکار برستی ہے۔ انہیں تم شریف اور باکردار کہہ سکتی ہو کیا؟ سچ تو یہ ہے کہ اس ملک کے سارے منڈے نکمے، نالائق اور لعنتی ہو چکے ہیں۔"
"پھر اب کیا کریں؟" زیبا نے پوری طرح اتفاق کرنے کے بعد پوچھا تھا۔
"یہی تو سمجھ میں نہیں آرہا۔ میں جوادی کے بغیر ـــ" آواز بھرا گئی۔
"اگر جو ہم جوادی کی ہٹلر اماں کو بیٹے کے کارناموں سے آگاہ کردیں تو کیسا رہے گا؟" زیبا دور کی کوڑی لائی تھی۔ ایسی عمدہ ترکیب پر سویرا کا دل باغ باغ ہوگیا۔
"ٹھیک کہتی ہو۔ جوادی کی اماں آنٹی شہناز سے بات کرنا ہوگی۔ بلکہ مرچ مسالا لگا کر کرنا ہوگی۔" دونوں نے آنسو پونچھ لیے۔
اور دوسری طرف فریدہ نیلا جوڑا پہنے ،اداس چہرہ بنائے اپنے ہی سرتاج سے ملنے پارک میں جا رہی تھی۔ جوادی اور شبلی دو غیور پٹھانوں کا روپ دھارے خاصے چارمنگ لگ رہے تھے۔
"بس! تم نواز صاحب کے قریب جا کر چادر کا کونہ چہرے سے ہٹا دینا۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹیں گے۔ مگر بھاگنے نہ دینا۔ ہاتھ پکڑ لینا ان کا۔ باقی کا کام پھر ہمارا ہوگا۔"

"ہک ہا! یہ وقت بھی آنا تھا میرے پہ۔"
"اوہو باجی فریدہ! اگر ارادہ بدل رہا ہے تو ابھی بتادو۔"

☼ ☼ ☼

شام کا سہانا سماں تھا۔ نواز صاحب شوخ رنگ کی ٹی شرٹ اور نئی نکور جینز پہنے بڑھے ہوئے پیٹ پر کس کر بیلٹ باندھے ،ہزاروں خواہشیں دل میں دبائے ،دیے ہوئے وقت سے ایک گھنٹہ پہلے پارک میں آگئے تھے۔ اس دوران دو مرتبہ فریدہ کا فون آیا تھا۔ پوچھ رہی تھی۔
"آپ کہاں ہیں؟ بہت زیادہ ٹائم ہو رہا ہے۔ مجھے بڑی فکر ہو رہی ہے آپ کی۔" دونوں بار نواز نے بری طرح جھاڑ پلائی تھی۔
ایک بار معصومہ کا فون آیا تھا۔ پوچھ رہی تھی۔
"آپ آرہے ہیں ناں پارک میں؟"
"جان! میں تو ادھر آچکا ہوں۔ تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔"
"بڑے بے صبرے ہیں آپ۔" معصومہ نے شرارت سے کہہ کر انہیں بے ساختہ ہنسنے پر مجبور کردیا تھا۔
اس دوران دو پٹھان لڑکے ان کے قریب سے گزرے اور ان میں سے ایک ان سے اس بری طرح ٹکرایا کہ نواز صاحب لڑکھڑا کر دھڑام سے نیچے گر گئے۔ اگر وہ دونوں ڈیل ڈول ،صحت ،تندرستی میں ان سے زیادہ نہ ہوتے تو ضرور مزا چکھاتے۔
"سوری! ہم سے غلطی ہوگئی۔" پٹھان نے شائستگی سے کہا تھا۔
"یہ تمہارا موبائل بھی گر گیا۔ تم شاید اپنی بہن سے بات کر رہا تھا۔"
انہیں خاموشی میں عافیت لگی تھی۔ لڑکے آگے بڑھ گئے۔ انہیں گیٹ سے ایک حسینہ نیلے سوٹ میں ملبوس خود کو چادر میں لپیٹے ادھر آتی دکھائی دی۔ وہ تیزی سے ادھر لپکے۔
"معصومہ! تم معصومہ ہو ناں۔" بے تابی سے سرگوشی کی۔
"نام تو میرا فریدہ ہے۔ اگر آپ معصومہ کہنا چاہتے ہیں تو مجھے اعتراض نہیں ہے۔" فریدہ نے یہ کہتے ہوئے چادر چہرے سے ہٹا دی اور نواز صاحب کی

آنکھوں میں خون اتر آیا۔
"تم بدچلن ،آوارہ ـــ تم مجھ سے معصومہ بن کر باتیں کرتی رہیں۔ وہ بھی اس قدر بے باکی سے۔ میں تمہیں اس کا مزا چکھاؤں گا۔"
"چلیں! اب قسمت سے پارک میں آہی گئے ہیں تو کہیں بیٹھ کر آئس کریم کھاتے ہیں۔" فریدہ نے ہاتھ پکڑ لیا۔
"آئس کریم اور تمہیں؟ تم گھر چلو! دیکھو آج میں تمہارا حشر کیا کرتا ہوں۔" وہ اپنا قصور بھول کر اس پر چڑھ دوڑے تھے۔ مگر یہ کیا؟ غیور پٹھان اچانک سامنے آگئے۔
"اوئے! عورت سے بدتمیزی کرتے ہو ہم تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔" اچانک کیا گیا حملہ شدید تھا۔
"کک ـــ کیا کر رہے ہو؟ یہ میری گھر والی ـــ میری بیگم ہے۔ معصومہ! تم بتاؤ ناں ان کو ـــ فریدہ خاموش کیوں ہو؟"
"واہ واہ! گھر والی ہے ـــ بیگم ہے اور تمہیں اس کا نام بھی نہیں آتا۔ کبھی بولتے ہو معصومہ کبھی فریدہ ـــ ہم سمجھ گیا تم اول درجے کا فراڈ ہو۔"
مار کٹائی میں مزید تیزی آگئی۔ فریدہ ڈرنے کی اداکاری کرتی گھر کو بھاگ گئی۔
جوادی اور شبلی نے اتنی ٹھکائی کردی کہ اب تقریباً" ایک ہفتے تک انہیں قدم قدم پر فریدہ کے سہارے کی ضرورت تھی۔
"اب پتا چلے گا ،بیوی کتنی اہم ہوتی ہے۔ دکھ سکھ میں کتنی ضرورت ہوتی ہے اس کی۔" دونوں ہاتھ جھاڑ کر چل پڑے۔

☼ ☼ ☼

سب کام ٹھیک ٹھاک ہوگئے۔ نواز صاحب کو سبق مل گیا۔ شکیل کے دادا کو مائی کا لارا لگا دیا۔ کہہ دیا تھا کڑی امریکا میں ہے۔ آپ کی تصویر ہم نے اسے دکھا دی ہے۔ اس نے آپ کو دل و جان سے پسند کرلیا ہے جلد آئے گی۔ دادا آج کل نئے دور کے رومانٹک گانے خاص کر "تیرا ہونے لگا ہوں" بڑے زور شور سے سن رہے تھے۔
اور اس موقع سے فائدہ اٹھا کر شکیل کی اماں اب اطمینان سے شکیل کے لیے رشتہ تلاش کر رہی تھیں۔
دونوں ہنستے مسکراتے گھر آئے تھے۔ مگر گھر کے حالات سازگار نہیں تھے۔
شہناز بیگم بڑی دیر سے منتظر تھیں۔ سویرا اور زیبا بھی بے وفاؤں کو سزا ملتے دیکھنے کے شوق میں سامنے بیٹھی تھیں۔
اماں ،مگر اماں کچھ سننے کے موڈ میں نہیں تھیں۔

☼

فرحی نعیم

"صالحہ ..... اے صالحہ بات سننا۔" شائستہ دو پیٹیوں پر احتیاط سے چڑھی دیوار کے پار اپنی پڑوسن کو آوازیں دے رہی تھی۔ "صالحہ! اری حکیمہ! کہاں ہو تم لوگ۔" وہ پھر وقفہ سے آوازیں لگا رہی تھی۔

"نام تو دیکھو کیا رکھے ہیں صالحہ اور حکیمہ نہ تو صالح میں کوئی صالح پن اور نہ ہی حکیمہ بیگم کوئی حکمت سے بھری ہیں۔ لیکن ابا نے نام ایسے رکھ دیے ہونہہ۔" شائستہ منہ ہی منہ میں بڑبڑا رہی تھی۔ یہ سوچے بغیر کہ اس کا اپنا نام شائستہ تھا۔ لیکن شائستگی سے اس کا دور دور تک کوئی واسطہ نہ تھا۔ وہ ہر بات لٹھ مارنے کے انداز میں کرتی تھی۔

"ارے اِنتی ہوئی نہ جانے کہاں جا کر دونوں بہنیں گھس گئیں۔ ارے اِنہیں ہمیشہ کی طرح کسی بات پر ہنگامہ نہ کھڑا ہوا ہو پھر کہاں ان کو میری ہلکی سی آواز پہنچ رہی ہو گی۔ اماں ابا خود تو دوسرے محلے چلے گئے پر ان دونوں فسادنوں کو یہیں ہمارے پڑوس میں چھوڑ گئے۔ ارے دے دیتے کہیں اور گھر۔"

وہ بڑبڑاتی ہوئی پیٹی پر سے اتر گئی اور بےزاری سے اپنے چھوٹے بچے کو آواز دینے لگی کہ بازار سے ہی دہی اور گرم مسالا منگوا لے پڑوس کا آسرا تو ختم ہو گیا تھا۔

"وہ تمہاری ہمسائی آوازیں دے رہی ہے۔" حکیمہ نے جل کر صالحہ سے کہا۔ دونوں اندر تھیں اور اپنا پسندیدہ ڈراما تیز آواز میں دیکھ رہی تھیں، اس لیے ان کو شائستہ کی آواز پہلے تو آئی نہیں، پھر آئی بھی تو ایک دوسرے پر ڈال گئیں۔ معلوم تھا کہ وہ صرف مطلب کو ہی دیوار سے آواز لگاتی ہے یا پھر کن سوئیاں لینے کو۔

"ارے! میری ہی کیوں تمہاری بھی تو ہمسائی ہے تم دیکھ لو جا کر۔ خدا کرے کسی دن اس کی دونوں پیٹیاں ٹوٹ کر گر جائیں اور یہ ۔۔۔" وہ یہ منظر تصور میں لا کر ہنس پڑی۔

"ہائے سچ۔ کتنا مزا آئے گا جب یہ شائستہ کی بچی پیٹیوں پر سے گرے گی، بس پھر تو ٹانگ کی خیر ہی نہ ہو گی۔"

دوسری نے بھی فوراً "اس کی تائید میں ہاں میں ہاں ملائی اور دونوں اس تصور میں کھو گئیں جب شائستہ اپنی ٹوٹی ٹانگ سمیت بستر پر پڑی ہو گی۔ وہ دونوں ہی ہر وقت اس کے دیوار سے سر نکالے کچھ نہ کچھ مانگنے کی عادت سے تنگ تھیں۔ جب دیکھو اپنی منڈیا نکالے ان دونوں کے تماشے دیکھتی رہتی۔ اپنے گھر کی پروا نہیں تھی، لیکن محلے کے ایک ایک گھر کی فکر اسے رات دن کھاتی رہتی۔ وہ اپنا فارغ وقت تیرے میرے گھر میں گزارتی اور سن گن لیتی رہتی۔

"ایک تو یہ ابا نے بھی نا، بیچ کی دیوار اتنی نیچی رکھی کہ وہ لڑاکن ہر وقت ٹنگی رہتی ہے۔" حکیمہ جل کر بولی۔

"میں نے ابا سے کہا بھی تھا کہ اتنی چھوٹی دیوار نہ رکھیں، لیکن ۔۔۔ حالانکہ پتا بھی تھا کہ پڑوس کیسا ہے۔

بی جمالو کہیں کی۔" صالحہ نے بھی آگے سے ٹکڑا لگایا۔

"سارے محلے کی خبریں لیتی پھرتی ہے۔" حکیمہ مزید بولی۔

ابا نے جب دونوں بیٹیوں کی شادی کی تو دونوں ہی کے سسرال کرائے کے گھر میں رہتے تھے۔ ایک کا تو گھر بہت چھوٹا تھا لہٰذا انہوں نے پہلے ہی سے کہلوا دیا تھا کہ شادی کے بعد الگ گھر لے کر دیں گے۔ لیکن بہت کوشش کے باوجود بھی جب اکمل کو مطلوبہ معیار کا گھر نہ مل سکا تو مجبوراً "صالحہ بیاہ کر سسرال ہی چلی گئی۔ شادی کے بعد بھی اگرچہ اکمل نے اپنی کوشش جاری رکھی لیکن اس میں اب وہ شدت نہیں تھی۔

دوسری طرف ساس، جٹھانی، صالحہ کے سامنے ہر وقت جگہ کی کمی کا رونا لے کر بیٹھ جاتیں، پھر صالحہ یہ رونا میکے آ کر روتی چنانچہ ابا نے بیٹی کو اپنا گھر دینے کا فیصلہ کیا کیونکہ ویسے بھی وہ دوسرے نسبتاً "بہتر علاقے میں جانے کا ارادہ کیے بیٹھے تھے۔ سو اپنا گھر بیٹی داماد کو دے گئے کہ ان کی پریشانی ختم ہو۔ اکمل کو بھی جانتے تھے کہ زیادہ کرایہ برداشت نہیں کر سکتا۔

دوسری طرف حکیمہ کا سسرال جس مکان میں رہائش پذیر تھا وہ اگرچہ گنجائش رکھتا تھا۔ لیکن وہاں

کے مکینوں کے دلوں میں گنجائش نہیں تھی۔ لہٰذا شادی کے صرف چھ ماہ بعد ہی نصیر بھی علیحدہ گھر دیکھنے لگا۔ لیکن جب اس کے گھر والوں نے اس کو یہ صلاح دی کہ تم احمق ہو جو یہ پریشانی مول لے رہے ہو۔ سسر سے کیوں نہیں کہتے' جہاں ایک بیٹی کو گھر دیا' وہاں دوسری کو بھی دیں۔ نصیر میں اتنی غیرت تھی کہ وہ سسر سے یہ سب نہیں کہہ سکتا تھا۔ لیکن حکیمہ نے جب صبح شام یہ طعنہ سنا تو ابا سے آکر کہہ دیا۔ اس کا حل انہوں نے یہ نکالا کہ اسی مکان میں اسے بھی آنے کی پیشکش کردی۔

روزانہ کی چخ چخ سے بچنے کے لیے آخر کار حکیمہ راضی ہوگئی۔ دوسری طرف صالحہ نے جب یہ سنا تو دل پر ہاتھ رکھ دیا اس کے تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ابا یہ فیصلہ دے دیں گے۔ ابھی صرف دو مہینے ہی تو ہوئے تھے اسے اس گھر میں آئے ہوئے اور ابھی سے اس کی راجدھانی میں شرکت کے دعوے دار آگئے تھے۔ لیکن ابا کے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکتی تھی سو دل پر پتھر رکھ کر اس نے حکیمہ کی آمد کو برداشت کرلیا۔

چونکہ دونوں دامادوں کی اتنی آمدنی اتنی نہیں تھی کہ وہ کرایہ' بجلی' گیس کابل اور دوسرے لوزامات بھریں لہٰذا وہ بھی خاموشی سے ایک دوسرے کو برداشت کررہے تھے اور ویسے بھی اکمل اور نصیر بنیادی طور پر شریف انسان تھے۔ اپنے کام سے کام رکھنے والے پرائے معاملے میں دخل اندازی کرنا دونوں ہی ناپسند کرتے تھے۔

اس طرح یہ دو فیملیاں پچھلے چند سالوں سے ایک ساتھ رہ رہی تھیں۔

دونوں بہنیں چونکہ اسی گھر سے بیاہ کر گئی تھیں اور ایک عمر اسی محلے میں گزاری تھی لہٰذا ایک ایک گھر سے واقف تھیں۔ دوسری طرف محلے دار بھی ان کے دوبارہ یہاں آنے سے خوش نہیں تھے۔ خاص طور پر ہمسائی شائستہ' وہ تو ابا (نعمت علی) کے گھر چھوڑنے کے بعد نئے پڑوسیوں کے استقبال کو بے چین تھی۔ لیکن ہوا کیا؟

"لوٹ کے بدھو گھر کو آئے۔" ان دونوں بہنوں کے آنے کا سن کر اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا۔

☼ ☼ ☼

ابا کو ناموں کے اثر پر بڑا یقین تھا۔ خود ان کا نام نعمت علی تھا اور وہ اس بات کا دعوا کرتے تھے کہ گھر کی ساری نعمتیں ان ہی کی محنت اور قسمت کا نتیجہ ہیں بلکہ وہ تو یہاں تک کہتے کہ ان کی پیدائش کے بعد ہی ان کے والدین کے گھر آسودگی آئی تھی۔ پھر جب ان کی شادی ہوئی اور بیوی رحمت مراد ان کے آنگن میں آئیں تو ایک طرف تو ان کی من کی مراد پوری ہوئی اور دوسری طرف رحمت بھی گھر میں آگئی۔ پھر جب اولاد ہوئی تو بڑے بیٹے کا نام انہوں نے خوب سوچ کر کرم علی رکھا' بڑی بیٹی صالحہ تاکہ گھر میں اور خود صالحہ میں صالح پن ہو۔ پھر دوسری بیٹی کا نام حکیمہ رکھا کہ اب گھر میں حکمت اور دانائی بھی آجائے گی۔ اس کے بعد دوسرے بیٹے کا نام فیاض علی رکھا اور تیسری اور آخری بیٹی کا نام صابرہ۔

"لیکن صالحہ' حکیمہ اور صابرہ میں ان کے نام کا کوئی اثر نہیں آیا تھا۔" یہ محلے والوں کا خیال تھا جس سے اور لوگ بھی اتفاق کرتے۔ کرم علی کو محلے والے جل کر کرم کلّہ کہتے کیونکہ وہ مزاج کا انتہائی خراب تھا۔ نہ جانے محلے والوں کو اس کے مزاج اور کرم کلّہ میں کیا مطابقت نظر آتی تھی کہ انہوں نے اس کا یہ نام رکھ چھوڑا۔

ہاں فیاض علی ضرور اسم بامسمّٰی تھا۔ وہ بچپن ہی سے اپنے باپ کا پیسہ فیاضی سے خرچ کرتا لیکن صرف اپنے اوپر' کسی اور پر ایک دھیلا بھی خرچ کرنا حرام سمجھتا۔

☼ ☼ ☼

صالحہ کے ہاں بیٹی ہوئی تو اس نے بچی کا نام ایمان رکھا۔ جب شائستہ بچی دیکھنے گھر آئی تو کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد گویا ہوئی۔

"چلو' اسی طرح تمہارے گھر کم از کم "ایمان" تو آیا۔" اس نے تاک کر تیر پھینکا تھا۔

"اب کے اگر تمہارے ہاں بھی بیٹی ہوئی تو تم بھی یہی نام رکھ لینا' پھر تمہارے گھر میں بھی ایمان آجائے گا۔" صالحہ نے اس کا تیر اسے واپس لوٹایا۔ "اگر نہ ہوئی تو خیر ہے۔ میں اپنی ایمان کو کبھی کبھی تمہارے گھر بھیج دیا کروں گی۔ اسی طرح کچھ نہ کچھ' کبھی نہ کبھی ہی سہی فیض تو ہوگا۔"

صالحہ نے مزید جلتی پر تیل ڈالا اور شائستہ جل بھن کر رہ گئی۔ وہ جو سو روپے کا لفافہ بچی کے ہاتھ پر رکھنے کے لیے لائی تھی واپس لے گئی۔ گھر آکر اس کی آئس کریم منگوا کر کھائی۔ تب کہیں جاکر اس کے کلیجے میں ٹھنڈ پڑی اور دل کی جلن میں کمی آئی۔

☼ ☼ ☼

"ارے حکیمہ۔" صالحہ نے کچھ سوچتے ہوئے بہن کو آواز لگائی۔

"ہاں کیا ہے؟"

"اس شائستہ سے تو میں تنگ آچکی ہوں۔"

"میں بھی۔"

"کیوں نہ تم اپنے (شیطانی) ذہن میں کوئی ایسا آئیڈیا لاؤ کہ یہ یہاں سے چلی جائے۔"

"ہائیں کہاں چلی جائے؟" حکیمہ حیران تھی۔

"ارے میرا مطلب ہے کہ کسی دوسرے علاقے میں' میں کوئی دنیا سے تھوڑی بھیج رہی ہوں۔" صالحہ اس کی کم عقلی پر تلملا کر بولی۔

"ارے پر کیوں؟" حکیمہ بناوٹی لہجہ میں بولی۔ اگرچہ وہ خود عرصہ سے یہی چاہتی تھی۔

"بس۔" صالحہ یہ کہہ کر خاموش ہوگئی۔ لیکن پھر چارہ نہ پاکر بولی۔ "اصل میں آج میری اور اکمل کی ذرا ہوسکیں میں ہوگئی تھی۔"

"ہائیں کب؟ مجھے تو پتا بھی نہ چلا۔" حکیمہ بے ساختہ بولی۔

"پر شائستہ کی بچی کو سب پتا چل گیا۔ کمبخت کے کان ہر وقت یہیں تو لگے رہتے ہیں۔" صالحہ جل کے کباب ہو رہی تھی۔

"لیکن تمہاری اور اکمل بھائی کی لڑائی ہوئی کب؟ مجھے تو خبر نہ ہوئی۔" وہ اپنی بے خبری پر حیران تھی۔

"نہیں لڑائی تو نہیں' بس یوں ہی ذرا سی۔" اب صالحہ بات بنا رہی تھی۔

"لیکن کب؟" حکیمہ کی سوئی ایک ہی جگہ اٹکی تھی۔

"ارے بھئی صبح ہوئی تھی نا۔" آخر اسے بتانا ہی پڑا۔

"اچھا! اچھا ٹھیک ہے۔" اب حکیمہ مطمئن ہوئی۔

"کیا ٹھیک ہے۔" صالحہ نے گھور کر دیکھا۔

"ہاں' اس وقت تو میں سوئی ہوتی ہوں۔" حکیمہ کو اب قرار آیا۔

"پر شائستہ کو کیسے خبر ہوئی۔" حکیمہ نے اب تجسس سے پوچھا۔

"وہ پٹی پر چڑھی کن سوئیاں لے رہی تھی۔ وہ تو اتفاقاً" میری نظر پڑ گئی کھڑکی سے بڑے معنی خیز طریقے سے سر ہلاتی اتر گئی۔ مجھے یقین ہے اس نے ساری باتیں سن لیں۔" صالحہ آخری جملہ آہستہ سے بولی۔

"کون سی ساری باتیں۔" حکیمہ ذرا سا کھسک کر اس کے قریب ہو کر بولی۔

"ارے تمہیں کیا' تھیں وہ ہماری آپس کی باتیں۔" اب کے صالحہ چیخ کر بولی۔

"تو جب آپس کی باتیں تھیں تو اتنی بلند آواز میں کیوں اظہار فرمایا جارہا تھا کہ پڑوس تک پہنچنے لگیں۔" حکیمہ کو بھی غصہ آگیا۔

"ایک تو یہ نیچی دیوار' پھر یہ لکڑی کی پٹیاں' یہ پٹیاں آخر اس کا اتنا وزن کیسے سہار لیتی ہیں؟" صالحہ ہاتھ ملتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"کیوں نہ دیوار اونچی کرادی جائے۔" حکیمہ نے کئی دفعہ کا مشورہ دہرایا۔

"معلوم تو ہے ابا کتنے خلاف ہیں۔ خوامخواہ پھر اپنا کئی دفعہ کا دیا لیکچر شروع کردیں گے کہ اپنی دیوار اتنی نہ

کرو کہ پڑوسی کی ہوا رک جائے۔"

"اس شائستہ کے سسر نے یہی تو کہہ کر دیوار اتنی نیچی رکھوائی تھی۔ اب یہ اس کا پورا پورا فائدہ اٹھاتی ہے۔ خود تو مر گئے۔ اس کو یہیں چھوڑ گئے۔" وہ کلس کر بولی۔

"لیکن پڑوسی بھی تو اس قابل ہوں' خود تو جو چاہے کریں۔ لیکن ہمیں ہمسائے کے حقوق ازبر کرائے جاتے ہیں۔" حکیمہ بھی جلی بھنی تھی۔

"کچھ سوچو حکیمہ! کچھ سوچو ایسا کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔"

"اچھا سوچوں گی۔" حکیمہ اٹھ گئی گھر کا بہت سا کام اس کا منتظر تھا۔

☆ ☆ ☆

"شائستہ' شائستہ!" حکیمہ اپنے صحن سے پڑوس میں آواز لگا رہی تھی۔ تیسری آواز پر شائستہ نے دیوار کے پار سے سر نکالا۔

"ہاں کیا بات ہے' کیوں صبح صبح آواز دے رہی ہو' چائے کی پتی چاہیے تو وہ میرے پاس بھی ختم ہو گئی۔"

"اے مجھے کیا ضرورت پڑی پتی کی۔ میرا میاں ہر چیز گھر پر لا کر رکھتا ہے۔" وہ جتاتے ہوئے بولی۔

"ہاں... تمہارے تو چائے کے باغات ہیں اپنے۔" شائستہ نے کلس کر سوچا۔

"میں تو یہ پوچھ رہی ہوں کیا تمہارے گھر مہمان آئے ہیں جن کے ساتھ چھوٹے بچے ہیں اور دوسری بات یہ صبح نہیں ہے دن کے گیارہ بج رہے ہیں۔"

"تو بھلا کیا تمہیں آوازیں آرہی ہیں غل غپاڑے کی۔ میرے خیال سے تم اپنے کان چیک کروالو اور کیا یہی پوچھنے کے لیے آواز دے رہی ہو' صبح صبح۔" وہ صبح پر دانت جما کر بولی۔

"اچھا تعجب ہے رات کو تمہارے گھر سے بچوں کے شور کی' پھر رونے کی بھی کچھ آوازیں آرہی تھیں کل بھی اور اس سے پہلے بھی... مگر تم کہہ رہی ہو تو... اچھا کمال ہے۔" وہ حیران ہوتی اندر کی طرف مڑ گئی اور شائستہ بھی ہونہہ کہتی اتر گئی۔

اگلے ہفتے حکیمہ نے پھر شائستہ سے باتوں باتوں میں یوں ہی پوچھا۔

"کیا بات ہے شائستہ! گھر میں کچھ کام کروا رہی ہو۔"

"یہاں اپنی ہی پوری نہیں پڑتی تم کام کی بات کرتی ہو۔" وہ جل کر بولی۔

"اچھا حیرت ہے' پھر یہ تمہارے گھر سے ٹھوکا پیٹی کی آوازیں کیوں آنے لگی ہیں۔"

"کب؟"

"پچھلی دو راتوں سے۔"

"باؤلی تو نہیں ہوئی بھلا رات کو بھی کوئی مستری کام کرتا ہو گا سارا دن چھوڑ کر۔"

"اچھا۔ یہ دو گلی پیچھے دن رات کام نہیں کروایا ملک صاحب نے اپنی ملک منزل میں۔" حکیمہ تیزی سے بولی۔

"ہاں... وہ تو... وہ تو الگ بات ہے۔ انہیں تو وقت پر کام مکمل کروا کر کرائے پر اٹھانا تھا۔ ارے کہیں وہی تو آوازیں نہیں آرہی ہوں اور تم کو یہاں کا دھیان رہا۔"

"بھلا بتاؤ! برابر کی آواز اور پیچھے کی آواز میں کیا فرق محسوس نہیں ہو گا۔ یہ صالحہ بھی کہہ رہی تھی۔ تمہارے گھر سے اکثر عجیب و غریب آوازیں آتی رہتی ہیں۔ پہلے تو میں نے اس کو ٹال دیا تھا۔ اس کا وہم سمجھ کر لیکن اب کچھ دنوں سے مجھے بھی... دیکھو تم میری پڑوسن کم بہن زیادہ ہو ہمیں تو خدا لگتی کہوں گی۔ تم اپنے گھر کو کسی عالم صاحب سے دکھوالو' کہیں کسی مخلوق..."

"ارے... ارے تم کیا اول فول بکے جا رہی ہو ہم پچھلے بیس سال سے یہاں رہ رہے ہیں۔"

"تم نہیں' تمہارا سسرال' تم تو دس سال سے ہو۔" حکیمہ شائستہ کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔

"ہاں... ہاں یہ ہی سہی۔ آج تک کچھ نہ ہوا۔ تم بلاوجہ ہی۔" شائستہ غصہ میں تھی۔

نہیں بلاوجہ نہیں کہہ رہی بلکہ تمہاری ہمدردی میں۔"
"بس رہنے دو میری ہمدردی۔"
شائستہ خطرناک تیوروں کے ساتھ اٹھ گئی۔
شائستہ واقعی وہمی تھی اگرچہ اس نے حکیمہ کو جھاڑ دیا تھا لیکن اس کے بعد اسے یہ خیال بار بار آیا اور آخر کار اس نے اس کا تذکرہ اپنے شوہر سے کردیا۔ کیونکہ وہ بھی بال بچوں والی تھی۔ خدانخواستہ کوئی ایسی ویسی بات ہوگئی تو... اور اس سے آگے شائستہ سے کچھ نہ سوچا گیا۔

☼ ☼ ☼

"آپ یہ آج کل کیا سوچتے رہتے ہیں۔" حکیمہ پچھلے کئی دنوں سے دیکھ رہی تھی کہ نصیر خلاف معمول چپ چپ سا ہے۔ "کچھ پریشان ہیں؟"
"ہاں پریشانی تو ہے۔" وہ واقعی آہستہ سے بولا۔
"کیا پریشانی ہے، مجھے بھی تو بتائیں۔"
"یاد ہے دس بارہ دن پہلے میرے ساتھ ایک صاحب آئے تھے رات کے وقت۔ وہ داڑھی والے، ظہیر نام تھا۔" نصیر نے اسے یاد دلاتے ہوئے کہا۔
"آں... کچھ ٹھیک سے یاد نہیں آرہا۔"
"ارے وہی جن کو ناشتا پانی کراتے ہوئے تم بہت ناک بھوں چڑا رہی تھیں۔" آپ کے جو حوالہ دیا گیا تھا اس سے اگرچہ حکیمہ چڑ گئی تھی لیکن یاد بھی فوراً" آگیا تھا۔
"آپ تو بس، اچھا پھر... کیا وہ پھر آرہے ہیں ناشتا پانی کرنے؟"
"ارے خدا کی بندی! وہ کیوں دوبارہ آنے لگے، پہلی دفعہ آنے کے بعد ہی وہ جو کہہ گئے ہیں۔ اسی سے بڑا پریشان ہوچکا ہوں۔"
"ہائیں! کیا کہہ گئے، آخر یہ پہیلیاں کیوں بجھوا رہے ہیں، کھل کر بتائیں۔"
"کھل کر کیا بتاؤں، بس اتنا سمجھ لو کہ اب ہمیں یہ گھر فوری خالی کرنا ہے۔"
"کیا آ... آ... پر کیوں؟ مجھے ٹھیک ٹھیک بتائیں آخر معاملہ کیا ہے۔"
"مجھے تو خود سمجھ میں نہیں آرہا آخر کئی سال گزر گئے یہاں رہتے ہوئے لیکن... اصل میں ظہیر کوئی عام سا بندہ نہیں ہے۔ اس کے پاس کچھ خاص علم بھی ہے اور اس خاص علم کے ذریعے ہی اسے اس گھر میں کچھ اوپری اثرات کا بھی اندازہ ہوا اور پھر اسی نے مجھے یہ مشورہ دیا ہے کہ جتنی جلد ہوسکے یہ گھر خالی کردیا جائے۔" نصیر یہ کہہ کر خاموش ہوگیا۔
"غلط، بالکل غلط، اس گھر میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم لوگوں کو تو یہاں رہتے پچیس سال سے بھی زیادہ عرصہ گزر گیا۔ آج تک تو کچھ ہوا نہیں۔" اس کا اشارہ اپنے والدین اور بہن بھائیوں کی طرف تھا۔
"ہاں... ہاں... میں جانتا ہوں لیکن ظہیر نے مجھے یہی بتایا ہے کہ وہ مخلوق بھی پچھلے ایک سال سے ہی یہاں رہائش پذیر ہے اور وہ لوگ پرسکون ماحول چاہتے ہیں۔ جبکہ یہاں آئے دن کا... بہرحال ان کا کہنا ہے کہ ہم لوگ یہاں سے چلے جائیں۔ ورنہ اگر انہوں نے ظاہر ہونا شروع کیا یا ان کے بچوں نے شرارتیں کیں تو پھر وہ ذمہ دار نہیں ہوں گے۔" نصیر کے لہجے میں فکرمندی ہویدا تھی۔
"ارے کیا ہوگیا۔ آپ تو بہکی بہکی باتیں کررہے ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ آپ کے دوست ظہیر کو ہمارا گھر پسند آگیا ہے اور اب وہ بہانے سے..."
"کیوں بے کار کی باتیں کرتی ہو۔ یہ گھر اسے پسند آئے گا؟ اس کا اپنا گھر اس سے کہیں اچھا ہے۔ وہ تو میری ہمدردی میں یہ سب کہہ رہا ہے۔ آخر ہمارا بھی بچوں والا گھر ہے۔ پھر اکمل بھائی الگ یہ سن کر..."
"ہائیں کیا صالحہ اور اکمل بھائی کو بھی یہ سب معلوم ہے؟"
"صالحہ کو تو نہیں، ہاں اکمل بھائی کو میں نے پہلے دن ہی سب بتایا تھا اور تمہارے ابا کو بھی۔"
"ہائیں! ایک میں ہی انجان بیٹھی ہوں گھر میں۔ ابا... ابا نے کیا کہا اس سلسلے میں۔"

"وہ کیا کہیں گے۔ وہ بھی معاملے کی نزاکت کو سمجھ رہے ہیں۔ انہوں نے تو ہم دونوں پر ہی چھوڑ دیا سارا اختیار۔"
"کیا میرے اور آپ کے اوپر۔" حکیمہ نے یقین سے پوچھا۔
"نہیں میرے اور اکمل بھائی کے اوپر۔" نصیر نے اس کی غلط فہمی دور کی اور وہ منہ بنا کر رہ گئی۔ وہیں کرسی پر سر ہاتھوں میں دیے وہ ڈھے سی گئی۔ کیا سوچا تھا اور کیا ہوگیا تھا۔ اس کا اور صالحہ کا تو پروگرام تھا کہ شائستہ کو اس طرح وہم میں ڈال کر ڈرا دھمکا کر یہاں سے چلتا کریں گے۔ یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ وار خود ان پر ہی چل جائے گا۔ یعنی کیا خبر تھی شکاری آپ اپنے جال میں پھنس جائے گا۔

☼ ☼ ☼

اور پھر اکمل اور نصیر نے بیویوں کی مخالفت کے باوجود کیسے گھر تبدیل کیا۔ یہ ایک الگ کہانی ہے۔ دونوں بہنیں اس نئے علاقے میں آکر ناخوش تھیں۔ یہ ایک نیا ٹاؤن تھا۔ ابھی کئی گھر آس پڑوس کے ویران تھے۔
"یہی ایک علاقہ رہ گیا تھا سارے شہر چھوڑ کر۔" حکیمہ تنگ کر کہتی میاں سے۔ ادھر صالحہ بھی اٹھتے بیٹھتے میاں سے شکوہ کرتی۔ مہینہ سے زیادہ ہوگیا تھا ان لوگوں کو یہاں آئے ہوئے لیکن دونوں میں سے کسی کا دل نہیں لگ رہا تھا۔ آج بھی دونوں دل کی بھڑاس نکال کر بیٹھی تھیں۔
"یہ ابا بھی کیسے ان کی باتوں میں آگئے۔" صالحہ حیرانی سے کہہ رہی تھی۔
"ہاں نہیں تو۔" حکیمہ نے بھی تائید کی۔ "نہ صرف باتوں سے آگئے۔ بلکہ یہاں گھر بھی دلا دیا۔ اپنے کسی جاننے والے کے توسط سے۔ بہرحال شائستہ سے تو جان چھوٹی۔"
"یہ پڑوس میں کیسی آوازیں آرہی ہیں۔" صالحہ نے کان لگائے۔ کچھ لوگوں کی باتوں کی آواز آرہی تھی۔
"میرے خیال سے نئے لوگ آرہے ہیں اور آتے ہی رہتے ہیں دیکھنے۔ یہ کون سی نئی بات ہے۔" حکیمہ بیزاری سے بولی۔
"کچھ سامان رکھنے کی بھی آواز لگ رہی ہے۔" صالحہ نے غور سے سننے کی کوشش کی۔
"ہاں تو گھر جو اتنے ملے ملے ہیں، پھر دیواریں بھی چھوٹی چھوٹی کوئی بات مخفی ہی نہیں رہتی یہاں نہیں تو۔" حکیمہ بھی تنگ تھی۔
"السلام علیکم۔" کسی نے زوردار آواز سے سلام کیا۔
دونوں نے چونک کر سلام کرنے والی کو دیکھا اور ششدر رہ گئیں۔
"شائستہ تم!" حکیمہ کی آواز خوف میں ڈوبی تھی۔
"تم یہاں کیسے؟" صالحہ نے بھی لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔
شائستہ اپنی عادت کے مطابق دیوار کے پار پٹی پر چڑھی سر نکالے دونوں کو مسکراتی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔
"ارے بہن! کیا بتاؤں تمہارے جانے کے بعد جن شور اور آوازوں کا تم کہہ رہی تھیں۔ وہ میرے میاں نے بھی محسوس کرنی شروع کردی تھیں اور مجھے بھی کبھی کبھی شک گزرتا۔ چنانچہ میرے میاں نے تو بھئی فوراً" بوریا بستر باندھنے کا اشارہ کردیا اور اپنے دوست کے توسط سے یہ گھر خرید لیا۔ آج میں یہاں دیکھنے ہی تو آئی ہوں۔ سامان بھی آرہا ہے۔ تم دونوں کی باتوں کی آواز سنی تو میں نے دل میں کہا۔ یہ آوازیں تو جانی پہچانی لگ رہی ہیں۔ اب جو پٹی پر چڑھی تو تم دونوں! واہ کیا اتفاق ہے۔"
اور صالحہ اور حکیمہ کی تو حالت ایسی ہو رہی تھی جیسے ان کے جسم سے سارا خون ہی نچڑ گیا ہو۔

☼

نگہت سیما

زمین کے آنسو

"امریکا نہ صرف ہم سے بیگار لے رہا ہے بلکہ ہمارے ایمان سے بھی کھیل رہا ہے اور ہماری تعلیم و تہذیب کو بھی سبوتاژ کر رہا ہے۔ اسلام ہمارا کلچر ہے۔ قانون اور نصاب کا اسلامی تعلیم کے مطابق ہونا ہمارا دستور ہے۔ مغرب نے اسلام اور عالم اسلام پر کام کرنے والے بے شمار تھنک ٹینک بنا رکھے ہیں۔ لیکن اسلامی دنیا میں بین الاقوامی سطح پر ایسا کوئی ادارہ نہیں ہے۔"

احمد حسن بول رہا تھا اور اس کے ڈرائنگ روم میں موجود پندرہ بیس لڑکے لڑکیاں بہت انہماک سے اسے سن رہے تھے۔ یہ سب مختلف یونیورسٹیوں اور کالجوں کے اسٹوڈنٹس تھے اور اکثر احمد حسن سے ملنے آتے رہتے تھے۔ لیکن آج کے۔ای سے دو لڑکیاں پہلی بار آئی تھیں۔ ایک لڑکی نے عبایا پہن رکھا تھا اور اس کا پورا چہرہ نقاب میں چھپا ہوا تھا۔ صرف آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ دونوں کا تعارف مونا رشید نے کروایا

مکمل ناول

۱۰ دسویں قسط

تھا۔ مونا بھی کے۔ای کی طالبہ تھی اور اس کے والد بریگیڈیر تھے اور وہ پہلی بار اپنے ایک کزن الطاف حیدر کے ساتھ آئی تھی۔ وہ احمد حسن کی بہت فین تھی۔ مونا نے دونوں لڑکیوں کے نام نہیں بتائے تھے بس مختصریات کی تھی کہ یہ دونوں اس کی کلاس فیلو ہیں اور احمد حسن کے پروگرام بہت شوق سے دیکھتی ہیں۔

"سر! آپ کے خیال میں ہمیں ایسا کوئی ادارہ قائم کرنا چاہیے جو اسلامی دہشت گردی، خواتین کے حقوق، اقلیتوں سے بدسلوکی، انسانی حقوق کی پامالی وغیرہ کے حوالے سے جو حملے مغرب، اسلام پر کر رہا ہے اس کا جواب دے؟"

نئی آنے والی لڑکیوں میں سے ایک لڑکی نے پوچھا تو حسن کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

"آف کورس مس......"

"مرینہ...... مرینہ عثمان شاہ!" لڑکی نے اپنا نام بتایا تو احمد حسن کے لبوں پر بکھری مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

"تو کیا آپ ایسا کوئی ادارہ قائم کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟"

"فی الحال تو میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ ہاں! میری خواہش ضرور ہے کہ کوئی تو ہو جو ان کی سازشوں کو کھول سکے اور جواب دے سکے۔"

"تو وہ کوئی آپ کیوں نہیں ہو سکتے سر؟" ایک

لڑکے نے کہا تو احمد حسن اس کی طرف متوجہ ہو گیا لیکن اس کی طرف رخ کرتے ہوئے ایک لمحے کے لیے اس کی نظریں مرینہ کے ساتھ بیٹھی ہوئی لڑکی کی طرف اٹھیں۔ اس نے پتا نہیں کب دھوپ کا چشمہ لگا لیا تھا۔ ایک لمحہ کو اسے لگا جیسے سیاہ شیشوں کے پیچھے سے اس کی آنکھیں اسے دیکھ رہی تھیں۔ لیکن اسے اپنی طرف متوجہ پا کر شاید اس نے نظریں جھکا لی تھیں۔ اور گود میں دھرے اپنے ہاتھوں کے دستانے درست کرنے لگی تھی۔ اس نے اکثر عبایا پہننے والی لڑکیوں کی طرح سیاہ دستانوں سے اپنے ہاتھ چھپا رکھے تھے۔ ایک طرف تو یورپی کلچر ترقی کر رہا تھا۔ لڑکیاں جینز اور ٹی شرٹ پہنے دوپٹے کے بغیر نظر آ رہی تھیں اور دوسری طرف اتنی سختی سے عبایا اور نقاب کی پابندی کرنے والی لڑکیاں تھیں۔ شاید یہ اتنی شدت اس حد سے زیادہ بڑھی ہوئی آزادی کا ردعمل تھی۔ وہ اس لڑکے کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"میں اتنے وسائل نہیں رکھتا ینگ مین! لیکن میں چاہتا ہوں کہ ایسا ہو۔۔۔ اتنے چینل ہیں ہمارے لیکن کوئی ایک چینل بھی ایسا نہیں ہے جو بین الاقوامی سطح پر اپنا موقف واضح کر سکے۔ ہمیں اس کی بہت ضرورت ہے کہ ہم اپنے خلاف ہونے والے پروپیگنڈ کا مثبت جواب دے سکیں۔ کہیں سے بھی چاہے الیکٹرانک میڈیا ہو یا پرنٹ میڈیا۔ لیکن ہم نے تو آج تک کہیں سے بھی کچھ نہیں کیا۔ ہم تو آج تک کسی کو یہ بھی یقین نہیں دلا سکے کہ ہم مسلمان دہشت گرد نہیں ہیں۔"

"ہم یقین دلا بھی کیسے سکتے ہیں سر!" مرینہ کے بالکل سامنے بیٹھا ہوا لڑکا جنید علی تھا۔ جو کسی کالج یونیورسٹی کا طالب علم تو نہیں تھا مگر وہ احمد حسن کے گھر ہمیشہ ہی نظر آتا تھا۔

مونا نے آہستگی سے مرینہ کو بتایا تھا' جب وہ احمد حسن کے انتظار میں اس کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔

"غالباً" کسی غیر ملکی کمپنی میں جاب کرتا ہے۔"

"ہم کیوں یقین نہیں دلا سکتے۔ اگر ہمارے پاس کوئی ایسا چینل ہو' جہاں سے بیک وقت عربی اور انگریزی میں پروگرام ہوں۔ پھر دنیا کو پتا چلے کہ کیا ہو رہا ہے ہمارے ساتھ۔ اگر انڈیا پراپیگنڈہ کر سکتا ہے ہمارے خلاف تو ہم کیوں نہیں کر سکتے۔" مرینہ نے احمد حسن کے بجائے جواب دیا تھا۔

"محترمہ مرینہ شاہ! یہی نام بتایا تھا نا آپ نے۔ ہم اس لیے نہیں کر سکتے کہ ہم دہشت گرد ہیں۔ ہم میں کچھ لوگ ہیں ایسے جو پڑوسی ملک میں جا کر دہشت گردی۔۔۔"

"غلط۔۔۔ غلط کہہ رہے ہیں آپ!" مرینہ کا رنگ غصے سے سرخ پڑ گیا تھا۔ "مجھے لگتا ہے جیسے آپ انڈیا کے جاسوس ہیں اور یہاں آ کر انڈیا کی زبان بول رہے ہیں۔" وہ تیز تیز بول رہی تھی۔

پاکستان کے خلاف تو وہ کوئی بات برداشت ہی نہیں کر سکتی تھی اور صرف وہی نہیں "الریان" کے ہر فرد کے دل میں پاکستان کے لیے محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

"وہ آپ جیسے ہی نام نہاد مسلمان ہیں جو اس ملک کے امن کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ جو غیروں کے ساتھ مل کر اپنے ہی ملک کو تباہ اور بدنام کرنا چاہتے ہیں۔"

مونا رشید نے ہولے سے اس کا ہاتھ دبایا۔ "پلیز کول ڈاؤن۔"

مرینہ نے بات کرتے کرتے ذرا سا رخ موڑ کر مونا رشید کو دیکھا۔ مونا نے اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا کہ وہ خاموش ہو جائے۔ محفل میں موجود سب طلبا خاموشی سے مرینہ کو سن رہے تھے۔ یقیناً انہیں بھی اس کی بات سے اختلاف نہیں تھا۔

احمد حسن نے اسے ایک لمحہ کے لیے خاموش ہوتے دیکھا تو اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب آیا۔

"ہر شخص کا اپنا اپنا نقطہ نظر ہوتا ہے مس مرینہ شاہ! ہمیں دوسروں کا موقف سن کر اسے دلیل سے قائل

کرنا چاہیے۔" احمد حسن کا لہجہ بہت خوب صورت اور نرم تھا۔ مرینہ متاثر ہوئی۔

"سوری! لیکن میں پاکستان کے خلاف کوئی بات' کوئی الزام نہیں سن سکتی۔ چاہے وہ صحیح ہی کیوں نہ ہو۔"

احمد حسن کے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"ہر پاکستانی کو اتنا ہی محب وطن ہونا چاہیے۔ لیکن ہمیں اپنی غلطیوں کی اصلاح بھی کرتے رہنا چاہیے تاکہ ہم ایک اچھی اور بہترین قوم کے طور پر ابھر کر دنیا کے سامنے آئیں۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں سر! لیکن میں بہت متعصب پاکستانی ہوں۔" احمد حسن مڑتے مڑتے ایک دم پلٹا تھا۔

"میں سخت متعصب پاکستانی ہوں رضی! آئندہ میرے لیے انڈیا کی بنی کوئی چیز مت لانا۔"

اس کے کانوں میں سمیرا کی آواز آئی تھی اور پھر ہلکی سی ہنسی۔

"یہ اپنی کسی گرل فرینڈ کو دے دینا۔"

"بکو مت۔ میری کوئی گرل فرینڈ نہیں ہے۔"

"تو تمہارا کیا خیال ہے میں صرف اس لیے یہ لے لوں گی کہ تمہارے پیسے خرچ ہوئے ہیں۔ تو تیور ایک بار آدمی کمزور پڑ جائے تو پھر کمزور پڑتا ہی چلا جاتا ہے۔"

"ہاں۔۔۔ ایسا ہی ہوتا ہے سمو! تم نے صحیح کہا تھا۔ میں بھی اگر۔"

اس نے ایک گہری سانس لی۔ اس کی نظر مرینہ کے ساتھ بیٹھی عبایا والی لڑکی پر پڑی' اس کے ہاتھ ہولے ہولے کانپ رہے تھے۔ وہ چونکا۔

"آپ ٹھیک تو ہیں نا مس!"

عبایا والی نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے گود میں رکھے ہاتھ یکدم اٹھا کر سائیڈ پر کر لیے تھے۔

"آئی ایم سوری مس!" جنید علی نے اپنی جگہ سے اٹھ کر معذرت کی "میرا مقصد آپ کو ہرٹ کرنا نہیں تھا۔ میں تو حقائق بیان کر رہا تھا کہ ہمیں اپنی غلطیوں کو ایڈمٹ کرنا چاہیے۔"

"آپ حقائق نہیں جانتے مسٹر! یا پھر آپ کے پیچھے بھی کوئی اور ہاتھ ہے' جو آپ سے اس قسم کی باتیں کہلواتا ہے۔"

مرینہ وہ سب دہرا رہی تھی جو چند دن قبل اس نے ایک سے سنا تھا۔

"آپ کو چاہیے کہ آپ اپنا وژن درست کریں اور سچ میں حقائق جاننے کی کوشش کریں۔"

مونا رشید نے ایک بار پھر مرینہ کا ہاتھ پکڑ کر دبایا تھا۔ مرینہ نے ناک پر پھسل آنے والی عینک کو درست کرتے ہوئے اس کی طرف معذرت خواہانہ انداز میں دیکھا۔ وہ آج پہلی بار یہاں آئی تھی اور اسے اس طرح ان کی باتوں کے درمیان دخل نہیں دینا چاہیے تھا۔ اس نے کبھی احمد حسن کا پروگرام نہیں دیکھا تھا۔ اپنی ٹف پڑھائی کی وجہ سے اسے ٹی وی دیکھنے کا وقت نہیں ملتا تھا' کبھی کبھار منیبہ اور حفصہ کے کہنے پر وہ ان کے ساتھ مل کر کوئی ڈراما دیکھ لیتی تھی ٹاک شو وغیرہ سے اسے کبھی دلچسپی نہیں رہی تھی۔

احمد حسن اور اس کے پروگرام کے متعلق کالج میں اکثر لڑکیاں بات کرتی تھیں کہ وہ ایک محب وطن شخص ہے۔ لیکن اس نے کبھی اتنی توجہ نہیں دی تھی۔ مگر کل شام جب سمیرا نے اس سے کہا کہ وہ احمد حسن سے ملنا چاہتی ہے تو وہ ایک لمحہ کو حیران رہ گئی تھی۔

"کیوں؟"

"میں نے اس کے پروگرام دیکھے ہیں اور میں اس کے خیالات سے متاثر ہوں۔ میں نے سنا تھا کہ ہر سنڈے کو کچھ طلبا طالبات اور ینگ لوگ اس کے گھر جاتے ہیں۔ میں بھی جانا چاہتی ہوں مرینہ!"

"او کے چلیں گے۔" مرینہ' سمیرا کو بالکل بھی انکار نہیں کر سکتی تھی۔ اداس آنکھوں والی یہ لڑکی اسے بے حد عزیز تھی۔ اس نے آج تک کوئی دوست نہیں بنائی تھی اور سمیرا کو وہ اپنی واحد دوست کہتی تھی۔

"ریتا...... ریتا پلیز' اب گھر چلیں۔" اس کے پاس عبایا میں ملبوس بیٹھی سمیرا نے آہستگی سے کہا تو مرینہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

"ہاں ٹھیک ہے۔ چلتے ہیں۔"

سمیرا نے یہاں آنے کے لیے عبایا خریدا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ کوئی اسے ادھر آتے ہوئے دیکھے۔

"میں نے ابو سے صرف تمہارے گھر آنے کی اجازت لی ہے مرینہ! اگر انہیں پتا چلا کہ میں ادھر آئی ہوں تو شاید ان کا اعتبار ختم ہو جائے مجھ پر۔"

اس نے محسوس کیا تھا کہ سمیرا جب سے راولپنڈی سے آئی ہے، بہت بے چین اور مضطرب سی ہے اور اس کی گفتگو میں اکثر احمد حسن کا ذکر آجاتا ہے۔

"میں نے مونا رشید سے بات کرلی ہے۔ اسی سنڈے کو چلیں گے۔ میں تمہیں ہاسٹل سے پک کر لوں گی اور پھر وہاں سے مونا رشید کی طرف چلیں گے اور اسے ساتھ لے کر احمد حسن کے گھر چلیں گے۔"

اس کی رضامندی پر سمیرا کے چہرے پر اطمینان سا بکھر گیا تھا۔

پروگرام کے مطابق وہ مونا رشید اور سمیرا کے ساتھ اس وقت یہاں موجود تھی۔ مونا ان کی گاڑی میں ہی آئی تھی۔

"سر! آپ اپنے چینل "سچل" سے پروگرام کیوں نہیں کرتے۔ کوئی ایسا پروگرام جو اسلام کی صحیح تشریح کرتا ہو۔" کسی لڑکے نے کہا تھا۔ موضوع گفتگو بدل چکا تھا اور کیا باتیں ہوئی تھیں۔ مرینہ نے سنی نہیں تھیں۔

"وہ میرا چینل نہیں ہے بھائی! میں وہاں صرف پروگرام کرتا ہوں۔ میں کسی پروگرام کے لیے انہیں مجبور نہیں کر سکتا۔" احمد حسن کے لہجے میں بے تکلفی تھی۔

"آپ مشورہ تو دے سکتے ہیں۔" وہی لڑکا کہہ رہا تھا۔

"ضرور......"

سمیرا ایک دم کھڑی ہو گئی تھی۔ "مرینہ چلو۔"

"ارے بیٹھو نا۔ ابھی چلتے ہیں۔ چائے آرہی ہے۔" مونا رشید نے حیرت سے اسے اٹھتے ہوئے دیکھا۔

"چائے کوئی اتنی ضروری تو نہیں ہے۔ مونا اٹھو۔" مرینہ نے آہستگی سے کہا تب ہی احمد حسن ان کی طرف متوجہ ہوا۔

"آپ لوگ بیٹھیں پلیز' چائے پی کر جایئے گا۔"

"نہیں شکریہ۔ ہم بس اب چلتے ہیں..... آئندہ بھی آتے رہیں گے۔ چائے پھر کبھی سہی۔"

"مجھے خوشی ہو گی۔" احمد حسن اپنی جگہ سے اٹھا تھا "لیکن میں آپ کو چائے پیے بغیر تو نہیں جانے دوں گا ڈاکٹر مرینہ شاہ!"

"میں ابھی آدھی ڈاکٹر ہوں سر!"

"تو میں کیا کہوں' مستقبل کی ڈاکٹر صاحبہ پلیز تشریف رکھیں۔"

احمد حسن نے ہلکا سا سر خم کیا تھا اور مرینہ کے ساتھ کھڑی سمیرا نے مرینہ کے بازو پر ہاتھ رکھا تھا۔ جیسے کوئی گرنے سے بچنے کے لیے سہارا لے۔

"تو آپ ہیں مستقبل کی ڈاکٹر مس سمیرا احسن رضا!" رضی نے اس کے سامنے ہلکا سا سر خم کیا تھا "پلیز تشریف رکھیں۔"

اس نے نظریں اٹھائیں..... وہ دایاں ہاتھ تھوڑا سا پھیلائے مرینہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سمیرا کی نظریں اس کی انگلیوں سے الجھ رہی تھیں۔ شہادت کی انگلی کی دائیں پور کے ساتھ موجود تل صاف نظر آرہا تھا۔

"لیجیے چائے بھی آگئی۔"

"میں چائے نہیں پیوں گی۔ مرینہ چلو۔"

"میری دوست کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ آپ کی چائے پھر کبھی سہی۔"

مرینہ نے مونا رشید کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"تم چلی جاؤ مرینہ! میں حیدر کے ساتھ چلی جاؤں گی۔ بے فکر رہو وہ مجھے ڈراپ کر دے گا۔"

"ٹھیک ہے پھر ہم چلتے ہیں۔"

ملازم لڑکا چائے سرو کر رہا تھا جب وہ ڈرائنگ روم

سے باہر نکلی تھیں۔ احمد حسن پورچ تک انہیں چھوڑنے آیا تھا اور معذرت کی تھی۔ "میں جنید علی کی طرف سے آپ سے معذرت کرتا ہوں مس مرینہ عثمان شاہ! ضروری نہیں کہ ہر آدمی ہماری طرح سوچے مجھے آپ کے خیالات جان کر بہت خوشی ہوئی۔ ہر پاکستانی کو ایسا ہی ہونا چاہیے' متعصب پاکستانی۔"

وہ انہیں خدا حافظ کہہ کر چلا گیا تو مرینہ نے سمیرا کی طرف دیکھا جو پتا نہیں کس سوچ میں گم کھڑی تھی۔

"چلو سمیرا......!"

"ہاں......!" اس نے چونک کر قدم اٹھایا۔

"اماں سچ کہتی ہیں۔" اس نے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے سوچا" ایک ماں بھلا اپنے بچے کو پہچاننے میں کیسے غلطی کر سکتی ہے۔

یہ رضی تھا سوفی صد رضی۔ لیکن اسے نام اور شناخت بدلنے کی کیا ضرورت تھی۔ کیا وہ ہم سے بھاگ رہا ہے۔ ہم سے چھپنا چاہتا ہے اور کیا وہ ہم سے کبھی ملنا نہیں چاہتا۔

اور اگر میں امی کو بتا دوں۔ وہ رضی ہے..... اور وہ انکار کر دے کہ وہ احمد رضا نہیں ہے تو امی کو کتنا شاک لگے گا..... تو مجھے ابھی امی کو نہیں بتانا چاہیے۔ اور ابو کو تو پہلے ہی یقین نہیں ہے۔" اخبار میں چھپی خبر کی سطریں اس کی آنکھوں کے سامنے آرہی تھیں۔

"بی بی کہاں چلنا ہے ہاسٹل یا گھر؟"

گاڑی حسین روڈ پر لانے کے بعد یاسین نے پوچھا تو مرینہ نے سمیرا کی طرف دیکھا۔

"سمیرا! گھر چلیں یا تم ہاسٹل جاؤ گی؟" سمیرا نے چونک کر اسے دیکھا۔

"گھر میں بہت رونق ہے، بہت مزا آئے گا تمہیں بھی۔ حفصہ کی شادی ہے نا تو رات میں سب اس کے کمرے میں اکٹھے ہو جاتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" سمیرا نے سر ہلایا۔

"یاسین بھائی! گھر چلیں۔" مرینہ اسے بتا کر سمیرا کی طرف دیکھنے لگی تھی جس نے اب چہرے سے حجاب ہٹا لیا تھا اور ہاتھوں سے دستانے اتار رہی تھی۔

"بہت گھبراہٹ ہو رہی ہے۔" اس نے دستانے بیگ میں رکھتے ہوئے آہستگی سے کہا۔

"تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" مرینہ نے پریشانی سے اسے دیکھا۔

"ہاں ۔۔۔! یہ تو بس یونہی۔" اب وہ اسے کیا بتاتی کہ یہ گھبراہٹ اسے احمد حسن کو دیکھ کر ہو رہی تھی۔

احمد حسن یا احمد رضا۔

اگر وہ احمد رضا تھا تو اسے اپنی شناخت چھپانے کی کیا ضرورت تھی۔

وہ ایک اسپینش ماں اور پاکستانی باپ کا بیٹا ہے۔

اسے وہ انٹرویو یاد آگیا تو وہ ایک بار پھر تذبذب کا شکار ہو گئی۔

"کیا ایسا ممکن ہے کہ دنیا میں دو انسان بالکل ایک جیسے ہوں۔ حتیٰ کہ نام بھی ملتے جلتے ہوں احمد حسن ۔۔۔ احمد رضا۔

وہ پھر الجھ رہی تھی اور گاڑی تیزی سے "الریان" کی طرف جا رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

ملازم لڑکا تیزی سے خالی کپ اور پلیٹیں ٹرالی میں رکھ رہا تھا۔ احمد رضا صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے اسے دیکھ رہا تھا۔ ہمیشہ چائے کے ساتھ کچھ نہ کچھ ہوتا تھا۔

صوفوں کے سامنے چھوٹی چھوٹی تپائیاں تھیں جن پر خالی کپ وغیرہ پڑے تھے۔ لڑکے لڑکیاں رخصت ہو چکے تھے سوائے جنید علی کے، جو احمد رضا کے سامنے والے صوفے پر بیٹھا بہت غور سے احمد رضا کو دیکھ رہا تھا۔ جب ملازم لڑکا ٹرالی دھکیلتا ہوا ڈرائنگ روم سے نکل گیا تو جنید علی ہولے سے کھنکارا تو احمد رضا نے جو کسی گہری سوچ میں کھو گیا تھا، چونک کر اسے دیکھا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟"

"کچھ نہیں۔ بس کچھ تھکن محسوس کر رہا ہوں۔"

وہ رات ہی رحیم یار خان سے ایک ہفتے بعد آیا تھا لیکن جب دس بجے کے قریب الطاف حیدر حسب معمول کچھ لڑکوں کے ساتھ آگیا تو اسے ان سے ملنا پڑا تھا۔ وہ اپنا امیج خراب نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسے مزید آگے بڑھنا تھا۔ یہ رچی کی تاکید تھی۔ سو اسے مجبوراً بستر سے اٹھنا پڑا تھا۔ پتا نہیں وہ اس سے کیا کام لینا چاہتا تھا۔ کیا وہ اسے کوئی لیڈر بنانا چاہتا تھا۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "یہ مسکراہٹ کیوں۔" جنید علی اسے بغور دیکھ رہا تھا۔

"بس یونہی ایک خیال آگیا تھا۔" وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"کیا اس لڑکی کا جو بغیر رکے بولے چلی جا رہی تھی اور اسی رفتار سے اپنی عینک کو بھی بار بار ناک پر جما رہی تھی۔ میں تو کہنے ہی والا تھا۔ بی بی! اپنے لیے مناسب سائز کی عینک بنوا لو۔" وہ ہنسا تو پتا نہیں کیوں احمد رضا کو بہت برا لگا۔ "تم اتنے غور سے اسے دیکھ رہے تھے۔"

"کیا دیکھنے پر پابندی ہے۔" وہ پھر ہنسا۔

"ویسے اس کی چھوٹی سی چینی ناک پر کوئی عینک ٹک ہی نہیں سکتی۔ اگلی بار وہ آئی تو میں اسے لینس لگوانے کا مشورہ ضرور دوں گا۔ تم چاہے کچھ بھی کہو۔"

"بکو مت۔"

احمد رضا نے ناگواری سے اسے دیکھا۔ اسے یہ شخص پہلے دن سے ہی اچھا نہیں لگا تھا۔ وہ جب پاکستان آیا تھا تو اسی نے اسے ایئرپورٹ پر ریسیو کیا تھا اور وہ اس گھر میں آئے تھے۔ یہ وہی گھر تھا جو پاکستان جانے سے پہلے رچی نے اسے گفٹ کیا تھا۔

پھر گھر کی چابیاں اور وہاں موجود ملازموں سے اس کا تعارف کروا کے چلا گیا تھا۔ ایک دو سال سے وہ اس کے ساتھ ہی تھا۔ ٹی وی پر بھی اسے وہی لے کر گیا تھا۔

اخبارات میں کالم بھی لکھنا اسی کی وساطت سے ہوا تھا اور مختلف حلقوں میں اسی نے اسے متعارف کروایا تھا اور پہلی بار چند طلبا کو بھی وہی لے کر آیا تھا۔

"وہ لڑکی ۔۔۔ ارے وہی برقعے والی لڑکی ۔۔۔ مجھے تو وہ کوئی دہشت گرد لگ رہی تھی۔" وہ اب بڑی بے تکلفی سے عبایا والی لڑکی پر تبصرہ کر رہا تھا۔

"مجھے تو لگ رہا تھا جیسے اس نے کوئی بم چھپا رکھا ہو۔ طالبان کی کوئی ساتھی لگ رہی تھی مجھے۔"

"تم کتنی فضول باتیں کرتے ہو جنید علی!" احمد رضا نے بمشکل اپنی ناگواری اور غصے کو چھپایا تھا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے اگر اب اس نے اس لڑکی کے متعلق مزید کچھ کہا تو وہ اسے مار بیٹھے گا۔

"یہ باتیں فضول نہیں ہیں میری جان! تم کیا سمجھتے ہو کہ یہ جو امریکا قبائلی علاقوں میں القاعدہ اور اسامہ کی تلاش کے بہانے گھس آیا ہے۔ کیا اس کا کوئی ردعمل نہیں ہو گا ۔۔۔ میری جان! بہت جلد تم دیکھو گے کہ ہمارے اور اس پاکستان کے ہر شہر میں خودکش حملے اور دھماکے ہوں گے۔ سڑکیں خون سے لال ہوں گی۔"

"کیا تم کوئی نجومی ہو۔" احمد رضا نے چڑ کر کہا۔

اس کے اندر کہیں گہرائیوں میں پاکستان اور پاکستانیوں کے لیے بہت گہری محبت چھپی ہوئی تھی۔ وہ محبت، جس کی جڑیں کہیں بچپن سے ہی اس کے اندر موجود تھیں۔ شاید اس لیے جب رچی یا کوئی اور پاکستان ختم ہونے کی بات کرتا تھا تو اندر سے وہ کانپ اٹھتا تھا اور کتنی دیر تک اس کا دل روتا رہتا تھا اور "نہیں نہیں" کی تکرار کرتا رہتا تھا۔

"نجومی ہوں یا نہیں۔" جنید علی نے ٹانگ پر ٹانگ رکھتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ "لیکن تمہاری طرح آنکھیں بند کر کے نہیں بیٹھا ہوا۔ میں وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔"

"مثلاً ۔۔۔؟" احمد رضا نے منہ پر ہاتھ رکھ کر جمائی روکی۔

"فی الحال تو میں چلتا ہوں۔ تمہیں نیند آرہی ہے۔" وہ یکدم اٹھ کھڑا ہوا۔ "شام کو تو تمہارا پروگرام بھی ہے شاید۔"

"ہاں لائیو پروگرام ہے۔"

"ٹھیک ہے تمہیں یاد ہے کہ آج کے پروگرام میں تمہیں کس بات کا ذکر کرنا ہے۔ اپنے اصل موضوع کے درمیان یوں ہی سرسری سا ذکر کر دینا۔"

احمد رضا نے بیزاری سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سر ہلایا۔

"ویسے آج تمہاری گفتگو اچھی رہی۔ تمہیں اس لڑکے کے مشورے پر عمل کرنا چاہیے۔ کیا نام تھا اس کا ۔۔۔ وسیم۔ جو کہہ رہا تھا کہ تمہیں اپنے چینل سے اس طرح کا کوئی پروگرام شروع کرنا چاہیے ۔۔۔ تم آج بات کرنا اور ہاں! کل شام کو میں تمہاری ملاقات دو ماڈرن مولویوں سے کرواؤں گا۔ کوشش کرنا کہ اگلے چند پروگراموں میں انہیں مہمان بناؤ۔"

اب کے احمد رضا خاموش رہا تھا۔

"میرا خیال ہے اب مجھے چلنا چاہیے۔ باقی باتیں کل ہوں گی۔ اس سے پہلے کہ تم مجھے دھکے دے کر نکال دو۔ تمہارے تیور مجھے کافی خطرناک لگ رہے ہیں۔" اس نے قہقہہ لگایا اور مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو احمد رضا نے یوں ہی بیٹھے بیٹھے ہاتھ ملا لیا۔ اسے رخصت کرنے کے لیے اٹھا ہی نہیں۔ وہ خود ہی ڈرائنگ روم سے باہر چلا گیا۔

احمد رضا نے اس کے جانے کے بعد ایک گہرا سانس لیا اور صوفے کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے ٹانگیں پھیلا لیں۔ وہ واقعی بہت تھکن محسوس کر رہا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ آج دیر تک سوئے گا لیکن ممکن نہیں ہو سکا تھا یوں ہی صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے لگائے اس نے آنکھیں موند لی تھیں۔ وہ ایک ہفتہ رحیم یار خان میں رہا تھا۔ حالانکہ وہاں کوئی ایسا خاص کام بھی نہیں تھا۔ بس رچی یوں ہی اسے اپنے ساتھ لگائے پھرتا رہا تھا۔ وہ دو دن تک چک نمبر 151 میں رہے تھے۔ اس زیر تعمیر عمارت کے نزدیک ہی ایک چھوٹا سا مکان رچی نے خرید رکھا تھا جس کے اندر سب سہولتیں تھیں۔ تین کمروں کو بیڈ روم بنا دیا گیا تھا ۔۔۔ اور ایک بڑا کمرا سٹنگ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ اس روز اسفندیار اور عظمت یار کے ساتھ کچھ دیر گفتگو کرنے کے بعد رچی، ارباب حیدر کے ساتھ کچھ معززین کے ساتھ ملنے چلا گیا تھا۔ جو اس سے ملاقات کے لیے آئے تھے عظمت یار بھی اس

کے ساتھ ہی چلا گیا تھا۔

"ہم بھی پہلے رحیم یار خان بہت جاتے تھے۔ میری نانی رہتی تھیں وہاں۔ ان کی وفات کے بعد بس دو تین دفعہ ہی گیا ہوں' وہ بھی اریب فاطمہ کو لینے۔۔۔ اریب فاطمہ میری بہن ہے وہ پہلے رحیم یار خان میں رہتی تھی۔ پڑھنے کے لیے۔" اسفند نے بتایا تھا۔

اس نے سر ہلا دیا۔

"میں ایک بار یہاں بھی آیا تھا آپ کے گاؤں میں۔ دس گیارہ سال پہلے کی بات ہے' میٹرک میں تھا تب میں۔۔۔ ہمارے ایک جاننے والے تھے حسن رضا صاحب' ان کے ساتھ آیا تھا۔"

اس نے ذرا سا رک کر اسفندیار کے چہرے کی طرف دیکھا تھا۔ وہ اس نام کا ردعمل دیکھنا چاہتا تھا لیکن اس کا چہرہ سپاٹ تھا اور وہ بہت توجہ سے اس کی بات سن رہا تھا۔

"حسن رضا صاحب کا بیٹا میرا دوست تھا احمد رضا نام تھا اس کا۔ حسن رضا صاحب یہاں اپنی کسی کزن سے بھی ملے تھے۔ وہ اسی گاؤں میں رہتی تھیں۔ پتا نہیں اب بھی رہتی ہیں یا نہیں۔ دراصل میں ملک سے باہر تھا۔ کچھ عرصہ پہلے ہی آیا ہوں اور بہت جی چاہتا ہے اپنے دوست سے ملنے کا۔ لیکن معلوم نہیں وہ لوگ اب کہاں ہیں۔ احمد رضا کہتا تھا' تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ رحیم یار خان چلا جائے گا۔"

"اب پتا نہیں آپ کا دوست رحیم یار خان میں کہاں رہتا ہے۔ ایسے کیسے ڈھونڈا جا سکتا ہے کسی کو؟"

"ہاں یہ تو ہے۔" احمد رضا مایوس ہوا۔ اس نے سوچا تھا شاید اسفندیار کو کچھ علم ہو حسن رضا صاحب کا۔ کیا پتا وہ لاہور چھوڑ کر یہیں بس گئے ہوں۔ دل خوش فہم چھوٹی سی کرن پا کر دل میں امیدوں کے چراغ جلا لیتا ہے۔

"ویسے آپ کے دوست کے والد کیا نام بتایا تھا آپ نے؟"

"حسن رضا۔" وہ فوراً بولا تھا۔

"اور حسن رضا صاحب کی کزن کا نام کیا بتایا تھا آپ نے۔"

"نام تو مجھے معلوم نہیں۔"

"او خیر۔۔۔ میں اماں سے پوچھوں گا۔ کیا پتا وہ حسن رضا صاحب کی کزن کو جانتی ہوں۔ ہمارے ننھیال والے بھی رحیم یار خان سے ہیں۔"

"ہاں ضرور پوچھیے گا۔ کیا خبر وہ جانتی ہوں اور برسوں سے بچھڑے دوست سے ملاقات ہو سکے۔"

بجھتا ہوا چراغ پھر جھلملانے لگا تھا اور اس جھنجلاہٹ میں ایک امید دمکتی تھی۔ بچھڑوں سے ملنے کی امید۔

اس روز وہ چک نمبر 151 میں ہی ٹھہرے تھے۔ رچی نے جب بتایا کہ اسے آج یہیں ٹھہرنا ہے۔ کل کسی وقت وہ صادق آباد جائیں گے تو اسے بے حد خوشی ہوئی تھی۔ کچھ دیر پہلے ہی تو اس نے دعا کی تھی۔ کاش! آج رچی یہیں رہ جائے اور کبھی کبھی دعائیں یوں اچانک پوری ہو جاتی ہیں۔

رات وہ بہت دیر تک جاگتا رہا تھا۔ ایک امید کی لو تھی جو جلتی بجھتی اور بھڑکتی تھی۔ ارباب حیدر اور رچی نے اس سے کیا کیا کہا تھا۔ اس نے دھیان سے نہیں سنا تھا۔ بس رچی کے دیے کاغذات سنبھال لیے تھے۔ آئندہ آنے والے دنوں میں اسے یہ سب بولنا تھا۔ اپنے پروگرام میں اور گھر میں طلبا اور دوسرے جوانوں کے سامنے۔ آج تک اس نے جو بھی لکھا اور جو بھی بولا تھا' سب اسے لکھا ہوا ملتا تھا۔ ہر پروگرام میں ایک یا دو جملے ہائی لائیٹ کیے ہوتے تھے۔

رچی نے اس کی بیزاری محسوس کر لی تھی۔

"کیا بات ہے احمد رضا! تم ہماری بات دھیان سے نہیں سن رہے ہو۔"

"سب جانتا ہوں۔ سب علم ہے مجھے! رچی آخر ڈیڑھ دو سال سے یہی کچھ تو کر رہا ہوں۔"

"اور تمہیں یہی کچھ کرنا ہے احمد رضا!" رچی کا موڈ آف ہو گیا تھا۔ "صبح تم سے بات ہو گی فی الحال آرام کرو۔"

وہ خاموش رہا تھا۔ اس نے سنا باہر نکل کر رچی نے ارباب حیدر سے کہا تھا۔

"ابھی کچھ دن احمد رضا یہیں رہے گا اور تم اس کے ساتھ رہو۔ مجھے اس کا لہجہ پسند نہیں آیا۔ میں اس کا ریزن جاننا چاہتا ہوں۔"

اور بستر پر لیٹ کر آنکھیں موندتے ہوئے اسے بڑی شدت سے احساس ہوا تھا کہ وہ ہمیشہ کے لیے ان کا غلام بن چکا ہے۔ وہ رات گزر ہی نہیں رہی تھی اتنی لمبی رات۔۔۔ صبح اٹھا تو اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ ناشتا بھی اس نے برائے نام ہی کیا تھا۔ اسے رچی کی نظریں مسلسل خود پر محسوس ہو رہی تھیں۔

"آج الوینا بھی آ جائے گی۔ میں نے سوچا ہے۔ وہ یہاں کی خواتین کو کچھ ٹریننگ دے دے کہ اس سینٹر کو کیسے چلانا ہے۔"

اس نے سر ہلایا تھا۔ الوینا کے آنے کا سن کر اس نے کسی قسم کے ردعمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔ وہ مسلسل اسفندیار کے متعلق سوچ رہا تھا۔ پتا نہیں اس نے اپنی اماں سے حسن رضا کے متعلق پوچھا تھا یا نہیں۔ حالانکہ جانے سے پہلے اس نے بہت تاکید کی تھی۔

"میں سوچ رہا ہوں احمد رضا! کہ تم کچھ دن یہاں الوینا کے ساتھ رہو۔ تم مجھے کچھ تھکے تھکے لگ رہے ہو۔ چینج ملے گا۔" رچی اب بھی بغور اسے دیکھ رہا تھا اور اسے رچی کے اس طرح دیکھنے سے خوامخواہ الجھن ہو رہی تھی۔

"الوینا کہہ رہی تھی تم نے اسے پروپوز کیا ہے۔ کیا تم واقعی اس کے لیے سنجیدہ ہو احمد رضا!"

"اب کے وہ چونکا تھا۔ "ہاں"

"تو ٹھیک ہے میں بات کروں گا الوینا کے پیرنٹس سے۔" رچی نے اس کے کندھے پر تھپکی دی تھی۔

"وش یو گڈ لک۔"

[illegible] گھر میں پہلی بار وہ مسکرایا تھا۔ رچی کو کسی [illegible] وہ چلا گیا تو وہ ایک بار پھر اسفندیار کے

اسفندیار کوئی گیارہ بجے کے قریب آیا تھا اور اسے دوران اس نے سینٹر کے کوئی چار چکر لگائے تھے اور پھر وہیں۔ آفس میں بیٹھ گیا تھا۔

"کیا الوینا کا انتظار کر رہے ہو؟" ارباب حیدر نے شرارت سے اسے دیکھا۔

"پتا نہیں۔۔۔" اس کی نظریں دروازے کی طرف لگی تھیں۔

"وہ تو شام تک آئے گی۔ نتاشا کے جانے کے بعد دراصل وہ یہاں آنے کے لیے تیار نہیں ہے اور واپس سوات جا رہی ہے۔ نتاشا کے والدین نے اسے بڑی مشکل سے سوات میں کام کرنے کی اجازت دی تھی۔ شاید اس لیے۔"

"شاید۔" اس نے سر ہلایا تھا۔

"الوینا اچھی لڑکی ہے مجھے خوشی ہو گی اگر وہ تمہاری شریک زندگی بن جائے۔"

"الوینا کون ہے۔۔۔ کہاں کی رہنے والی ہے۔ مسلم ہے یا رچی کی طرح غیر مسلم؟"

"رچی مسلمان ہو چکا ہے تم جانتے ہو۔"

"پتا نہیں۔" اس نے کندھے اچکائے تھے۔

"یہاں سب لوگ ابھی تک اسے رچی کہہ کر بلاتے ہیں اور اسے کوئی اعتراض بھی نہیں ہوتا۔"

"سب نہیں صرف چند لوگ۔" ارباب حیدر نے تصحیح کی تھی اور وہ بھی اس لیے کہ ان کی زبان پر چڑھا ہوا ہے۔ اس کا مسلم نام عزیز ہے۔"

"شیخ عبدالعزیز۔" اس کے لبوں پر طنزیہ سی مسکراہٹ ابھر کر معدوم ہو گئی تھی۔

ارباب حیدر نے کسی قدر حیرت سے اسے دیکھا۔

"کیا بات ہے احمد رضا! تم کچھ شکوک و شبہات کا شکار نظر آ رہے ہو۔ اگر تمہارے دل میں رچی وغیرہ کے متعلق کچھ بدگمانی ہے تو نکال دو۔ یہ واقعی بہت مخلص لوگ ہیں اور ہم لوگوں کے لیے کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ بلکہ تیسری دنیا کے تمام افراد کے لیے وہ جو غربت اور بے بسی کا شکار ہیں۔"

"بغیر کسی غرض کے؟" اس کے لبوں سے بے

اختیار نکلا تھا۔

"ہاں بغیر کسی غرض کے۔ جیسے تمہارے عبدالستار ایدھی۔"

اس بار اس نے صرف سر ہلایا تھا۔ اس کی نظریں کھلے دروازے سے گیٹ کھول کر اندر آتے اسفندیار کو دیکھ رہی تھیں۔۔۔ کافی بڑا احاطہ تھا اور پھر کمرے تھے۔ اسفندیار احاطہ طے کر کے آفس کی طرف ہی آ رہا تھا۔

"تم اس بے وقوف لڑکے سے گپ لگاؤ۔ میں فون سن کر آتا ہوں۔"

اس نے فون اٹھایا اور کمرے سے باہر نکل کر اسفندیار کو دور سے ہی ہاتھ ہلاتا ہوا کسی اور کمرے میں گم ہو گیا۔ وہ بے چینی سے اسفندیار کو آتے دیکھ رہا تھا۔ پتا نہیں اس نے اپنی اماں سے بات کی یا نہیں۔۔۔ پتا نہیں اس کی اماں کو امی ابو کے متعلق بھی کچھ معلوم ہے یا نہیں۔

اسفند بڑی گرم جوشی سے اسے ملا تھا۔ احمد رضا نے بھی گرم جوشی ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی۔

"شیخ عبدالعزیز صاحب کہاں ہیں؟" اسفندیار نے بیٹھنے سے پہلے کھوجتی نظروں سے چاروں طرف دیکھا تھا۔

"کسی کام سے گئے ہیں۔ آتے ہیں۔" اس نے اپنی بے تابی چھپاتے ہوئے آہستگی سے کہا۔

"کیا شخصیت ہے شیخ صاحب کی بھی۔ میں نے اپنی زندگی میں ایسے دل والے اور ہمدرد انسان نہیں دیکھے کیوں احمد حسن صاحب! صحیح کہہ رہا ہوں نا میں؟"

"جی۔۔۔ جی ہاں بالکل۔ آپ نے ٹھیک کہا۔" اس نے بے چینی سے پہلو بدلا تھا اور پھر خود ہی پوچھ لیا۔ مزید انتظار اب ممکن نہیں تھا۔

"وہ آپ نے اپنی اماں سے پوچھا تھا حسن رضا کے متعلق۔"

"جی ہاں بالکل پوچھا تھا۔" وہ ہنسا۔

وہ سانس روکے اسفندیار کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"اور دیکھو ذرا میری اماں ہی تو آپ کے حسن رضا صاحب کی کزن ہیں۔ لیکن اماں کو نہیں پتا ان کا کہ وہ کہاں ہوتے ہیں آج کل۔ وہ بھی کوئی دس گیارہ سال پہلے ملی تھیں ان سے۔ اماں دراصل ان کی فرسٹ کزن نہیں ہیں۔"

"تو کیا مجھے کبھی اب ان کا پتا معلوم نہیں ہو سکے گا۔" ایک گہری مایوسی اس کے اندر اترنے لگی تھی۔

"اماں کہہ رہی تھیں، پہلے تو وہ لاہور میں ہی رہتے تھے ان کا لاہور والا ایڈریس تو ہے اماں کے پاس لیکن میں نے اماں سے کہا کہ وہ اب وہاں نہیں ہیں۔ اماں بتا رہی تھیں کہ ایک بار دو تین سال پہلے وہ رحیم یار خان گئیں تو پتا چلا کہ ان کا بیٹا مرتد ہو گیا ہے اور وہ اپنا گھر چھوڑ کر چلے گئے ہیں کہیں۔"

"نہیں۔۔۔!" احمد رضا کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔ ایک لمحہ کو اسے اپنا دل ڈوبتا ہوا سا محسوس ہوا۔

"وہ ایسا نہیں تھا۔"

"ہاں۔۔۔!" اسفندیار نے لاپروائی سے کہا۔

"اماں بھی کہہ رہی تھیں کہ وہ غلط خبر تھی۔۔۔ وہ تو اعلا تعلیم کے لیے باہر چلا گیا تھا۔ ہو سکتا ہے اب تک آگیا ہو۔ اماں کبھی رحیم یار خان گئیں تو پتا کریں گی۔ آپ مجھے اپنا نمبر دے دیں نا میں بتا دوں گا آپ کو۔۔۔ لگتا ہے، بہت گہرے دوست تھے آپ کے وہ؟"

اور احمد رضا نے سر ہلا دیا تھا۔

ساری رات اس کے اندر امیدوں کے دیے جلتے رہے تھے۔ ساری رات وہ اس آس میں جاگتا رہا تھا کہ شاید صبح اسفندیار سے ان کے متعلق کچھ معلوم ہو سکے۔

"آپ چلیں نا گھر۔۔۔ اماں سے ملواؤں گا آپ کو اماں کہہ رہی تھیں۔ احمد کا دوست ہے تو گھر کھانے پر بلا لو۔"

"ہاں ضرور۔ کسی روز چلوں گا۔"

ایک دم ہی تھکن اور نیند نے اسے گھیر لیا تھا۔ وہ اب گھر جا کر سونا چاہتا تھا۔ تب ہی ارباب حیدر واپس آ گیا تو وہ ایک دم کھڑا ہو گیا۔

"ارباب حیدر! میں رات کو ٹھیک سے سو نہیں

سکا۔ کیا میں گھر جا کر کچھ دیر سو سکتا ہوں۔"

"کیوں نہیں اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے؟"

ارباب حیدر نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"میں نے سوچا شاید کوئی کام ہو۔"

"نہیں فی الحال تو تمہارے کرنے کو ایسا کچھ نہیں ہے۔"

"او کے پھر میں چلتا ہوں۔" اس نے اسفند سے ہاتھ ملایا۔

"ان شاء اللہ آپ سے پھر ملاقات ہو گی۔"

وہ باہر نکلا تو اس نے سنا۔ ارباب حیدر پوچھ رہا تھا کہ کیا باتیں ہو رہی تھیں اور جیسا کہ دو ملاقاتوں میں اس نے جانا تھا۔ اسفندیار غیر ضروری تفصیلات تک بتانے کا عادی تھا۔ وہ اپنی اور اس کی گفتگو کے متعلق سب کچھ بتا چکا ہو گا اور اگر ایسا ہو بھی تو کیا ہوا۔ اپنے والدین کو تلاش کرنا کوئی جرم تو نہیں ہے اور رچی نے خود اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ان کے متعلق پتا کروا لے گا اور اس نے کوشش بھی کی تھی انہیں ڈھونڈنے کی۔

کمرے میں آتے ہی وہ بیڈ پر گر گیا اور اس کی آنکھیں نم ہونے لگی تھیں۔ "پانچ سال۔۔۔ پانچ سال میں جانے کیا کچھ ہو چکا ہو گا۔۔۔ پتا نہیں امی ابو۔۔۔ نہیں انہیں کچھ نہیں ہو سکتا۔۔۔" آنسو اس کی آنکھوں سے نکل نکل کر تکیے میں جذب ہو رہے تھے۔

آج بہت سارے دنوں بعد وہ پھر ان سب کو یاد کر کے رو رہا تھا۔ پھر وہ یوں ہی انہیں یاد کرتے اور روتے سو گیا تھا۔ جب اس کی آنکھیں کھلی تو گھر میں کھانے کی اشتہا انگیز خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ وہ منہ ہاتھ دھو کر باہر نکلا تو رچی اور ارباب حیدر کھانے کی ٹیبل پر بیٹھے تھے اور ملازم لڑکا ٹیبل پر کھانا لگا رہا تھا۔

"آؤ۔۔۔ آجاؤ۔ میں نے سمجھا۔ تم سو رہے ہو اس لیے اٹھایا نہیں۔"

رچی کا لہجہ بے حد خوشگوار تھا۔ وہ اس وقت بھی عربی لباس میں تھا۔ اسے بھی بھوک محسوس ہو رہی تھی، وہ خاموشی سے آ کر ٹیبل پر بیٹھ گیا تھا۔

"تم کچھ پریشان ہو احمد رضا! سوری یار میں نے۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ میں نے پھر پتا ہی نہیں کروایا کہ وہ لوگ کہاں گئے۔" غالباً ارباب حیدر اسے سب کچھ بتا چکا تھا۔

"کوئی بات نہیں۔ جب مقدر میں ہو گا۔ ملاقات ہو جائے گی۔"

"نہیں یار! میری غلطی، میں نے اگنور کر دیا۔ میں سمجھا شاید تم انٹرسٹڈ نہیں رہے۔"

احمد رضا نے بے حد حیرت سے اسے دیکھا تھا۔

"رچی! کیا تم اپنی زندگی سے گزرے تیس سال خارج کر سکتے ہو۔۔۔ کیا تم بھول سکتے ہو کہ تمہیں جنم دینے والے کون تھے۔ وہ گھر جہاں تم نے آنکھ کھولی، جہاں تم پلے بڑھے؟"

"میری بات چھوڑو۔" رچی مسکرایا تھا۔ "لیکن میں جانتا ہوں۔ تم نہیں بھول سکتے۔ وعدہ! سب سے پہلا کام مجھے اب یہی کرنا ہے۔"

مایوسی نے پھر امید کا لبادہ اوڑھ لیا تھا۔ تب ہی ملازم لڑکے نے گو بھی گوشت کا ڈونگا آ کر رکھا۔

"تو سارے گھر میں اس کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔" وہ مسکرایا۔

اس کی امی بھی جب گو بھی گوشت پکاتی تھیں تو سارے گھر میں یونہی خوشبو پھیل جایا کرتی تھی۔

"یار! تمہارے ہاں کے کھانے بندے کو اسیر کر لیتے ہیں۔" رچی اب ارباب حیدر سے مخاطب تھا۔

"یورپ جاتا ہوں تو وہاں کے پھیکے کھانے اچھے نہیں لگتے۔ ہر جگہ پاکستانی اور ہندوستانی ہوٹل ڈھونڈتا پھرتا ہوں۔"

احمد رضا بہت رغبت سے کھا رہا تھا۔ جب اچانک رچی نے اسے مخاطب کیا تھا۔

"احمد رضا۔۔۔؟" اس کی عادت تھی، وہ یونہی باتوں کے دوران اچانک کوئی بہت اہم بات کہہ جاتا تھا۔

"سنو! تم اپنے کسی پروگرام میں طیب خان کو انوائیٹ کرو۔"

"کس حیثیت سے؟"

"ایک عالم اور متقی شخص کی حیثیت سے۔"
احمد رضا نے حیرت سے اسے دیکھا تھا اور اس کی نظر ارباب حیدر پر پڑی تھی۔ جو اپنی مسکراہٹ چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔
"میں اپنی مرضی سے کسی کو انوائیٹ نہیں کر سکتا۔ ہاں رائے دے سکتا ہوں۔ فائنل اقدام تو چینل والوں کا ہی ہوتا ہے۔"
"اس کی تم فکر مت کرو۔ آئندہ چند پروگراموں کے لیے مہمانوں کی لسٹ میں تمہیں دوں گا۔ ڈائریکٹر کو دے دینا۔۔۔ باقی کام مجھ پر چھوڑ دو۔"
"ٹھیک ہے لیکن طیب خان۔ میرا مطلب ہے وہ تو۔" وہ الجھ رہا تھا۔
"کھانا کھالو اطمینان سے پھر میں تمہیں کچھ دکھاتا ہوں۔" رچی کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔
کھانے کے بعد رچی نے اسے جو وڈیو کلپ دکھایا تھا' وہ اسے دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔
وہ یقیناً "طیب خان" تھا۔ اس کی داڑھی پہلے کے مقابلے میں کافی لمبی تھی۔ وہ اپنے اسی ڈریس میں تھا۔ سبز افغانی جیکٹ' کلاشنکوف اور سر پر پکول وہ شاید کسی کوٹھی کا گیراج تھا اور لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ ایک طرف زمین پر آلتی پالتی مارے وہ بیٹھا تھا۔ لوگ آ آ کر اس کے ہاتھ چوم رہے تھے اور جگہ نہ ہونے کے باعث عقیدت کے باعث ہاتھ باندھے سر جھکائے کھڑے تھے۔
"کیا یہ بھی نبوت کا دعوا کرنے والا ہے؟" اس کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا اور رچی اور ارباب نے ایک ساتھ قہقہہ لگایا۔
"نہیں۔۔۔ یہ حقیقتاً "ایک نیک شخص ہے۔ جہاد افغانستان میں شرکت کی وجہ سے دنیا سے محبت نہیں رہی اسے اور اس کا مذہب کی طرف جنون زیادہ ہو گیا ہے۔۔۔ پشاور اور حیات آباد میں ہزاروں مرید ہیں اس کے۔"
اس نے کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اگلے چند دن الوینا اس کے ساتھ ہی رہی تھی اور اس نے ڈسٹرکٹ رحیم یار خان کی کئی جگہیں دیکھی تھیں۔ بلاشبہ یہ ایک خوب صورت علاقہ تھا۔ الوینا کے ساتھ گھومتے' باتیں کرتے بار بار اس کے دل میں خیال آتا تھا کہ وہ الوینا کے ساتھ مل کر ایک گھر کی بنیاد رکھ لے شاید اندر جو اتنے گہرے خلا بن گئے ہیں۔ وہ پُر ہو جائیں امی' ابو' سمیرا سے وہ کبھی نہ مل سکے شاید۔۔۔
کبھی کبھی وہ بالکل مایوس ہو جاتا اور کبھی کوئی امید سی جاگ اٹھتی تھی کہ شاید کبھی اچانک وہ اسے مل جائیں ۔۔۔ راہ چلتے میں وہ اسے نظر آ جائیں کہیں شاپنگ کرتے کسی مارکیٹ کسی گلی میں اس روز وہ مسجد ھونگ صادق آباد دیکھ کر واپس اپنی قیام گاہ پر آئے تھے۔
الوینا اس کے سامنے کرسی پر بیٹھی تھی اور وہ اپنے بیڈ پر نیم دراز اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ شلوار قمیص میں ملبوس تھی اور بڑا سا دوپٹا شانوں پر پڑا تھا۔ سنہری بالوں کے گچھے سے بنے کندھوں پر جھول رہے تھے۔ وہ میک اپ سے بے نیاز بہت دلکش لگ رہی تھی۔
"کیا دیکھ رہے ہو؟" الوینا نے پوچھا تھا۔
"تمہیں دیکھ رہا تھا الوینا۔ پاکستانی ڈریس تم پر بہت سوٹ کرتا ہے۔ کیا تم پاکستانی ہو؟" اس نے بالکل رچی کی طرح درمیان میں بات کی تھی۔۔۔ وہ چونکی تھی۔
"ہاں۔۔۔ نہیں۔ میرا مطلب ہے' میری والدہ امریکن ہیں اور والد پاکستانی۔"
"میری طرح کیا؟" اس کے لبوں سے نکلا تھا۔
"کیا مطلب؟"
"کچھ نہیں۔ بس یونہی۔"
"یونہی نہیں احمد رضا۔۔۔ مجھے پتا ہے' رچی نے تمہارا جو بایو ڈیٹا تیار کیا تھا۔ اس میں تمہاری والدہ کا تعلق اسپین سے لکھا تھا۔۔۔ لیکن میری ممی سچ مچ امریکن ہیں اور فادر۔۔۔
"لیو اٹ یار! میں نے تو یونہی پوچھ لیا۔"
"کیا تم مجھ سے محبت کرنے لگے ہو احمد رضا۔"
"پتا نہیں' لیکن میں اپنا گھر بسانا چاہتا ہوں اور میری

سوچ پلٹ پلٹ کر تمہاری طرف آتی ہے کہ تم میری زندگی میں آنے والی پہلی عورت ہو شاید اور میں چاہتا ہوں، صرف تم ہی رہو میری زندگی میں۔ کل رات میں نے بہت ایمان داری سے غور کیا تھا جب ارباب حیدر نے مجھ سے پوچھا تھا کہ فرض کرو اگر الوینا کی شادی تمہارے ساتھ نہ ہو سکی تو تم کیا محسوس کرو گے تو مجھے لگا تھا جیسے میں کچھ خاص محسوس نہیں کروں گا۔ شاید تھوڑا سا افسوس ہو۔ یا زیادہ ہو۔ ابھی میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ شاید ایک وقت میں جب ہم مل کر ایک گھر کی بنیاد رکھیں گے تو مجھے تم سے بہت شدید محبت ہو جائے۔ ایک وقت ایسا تھا جب مجھے لگا تھا کہ میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔ بہت شدید محبت۔"

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

"جب ہم پہلی بار ملے تھے اور وہاں اس گھر میں تم مجھ پر بہت مہربان تھیں تو مجھے لگا تھا کہ میں تم سے بہت محبت کرنے لگا ہوں اور میں نے سوچا تھا۔ میں پہلے تمہیں سمیرا سے اور پھر امی سے بھی ملواؤں گا۔ تب میں نے بہت سے پلان بنائے تھے۔ لیکن پھر سب کچھ غلط ہو گیا۔

یہ صرف تم تھیں الوینا! جس کی کشش نے مجھے باندھ رکھا تھا۔ صرف تمہاری وجہ سے۔۔ ورنہ میں جیل اور مارے جانے کے خوف کے باوجود وہاں سے بھاگ جاتا۔ مجھے یقین تھا کہ جب میں ابو کے پیر پکڑ لوں گا تو وہ مجھے معاف کر دیں گے۔ سمیرا اور امی ضرور میری سفارش کریں گی۔ لیکن تب میں تمہیں کھونے کے تصور سے ڈرتا تھا۔ مجھے واقعی لگتا تھا جیسے میں تمہاری محبت میں بری طرح مبتلا ہو گیا ہوں۔ تب میں نے سوچا تھا۔ تم کھو گئیں تو شاید میں پھر تمہیں کبھی نہ پا سکوں۔

امی، ابو کا کیا ہے کسی بھی وقت انہیں منا لوں گا۔۔۔ تب میں کتنا غلط تھا الوینا۔ اتنا عرصہ تم مجھے نہیں ملیں۔۔۔ تو میں نے جانا کہ وہ شاید محبت نہیں تھی وقتی کشش تھی۔"

"ہاں تب ہی تو جب تم دو سال بعد امریکہ میں ملے تو کوئی خاص گرم جوش نہیں تھے۔"

"ہو سکتا ہے تمہیں ایسا لگا ہو الوینا! لیکن ایسا نہیں تھا۔۔۔ میں تم سے مل کر بہت خوش ہوا تھا۔۔۔ ہاں۔ تم نے زیادہ لفٹ نہیں کروائی تھی۔ صرف چند ملاقاتیں اور وہ بھی اجنبیت لیے ہوئے تھیں۔"

"میں ایئرپورٹ پر تمہیں خدا حافظ بھی کہنے آئی تھی۔ تم اندر لاؤنج میں جا چکے تھے۔"

"ہاں۔ بعد میں رچی نے مجھے بتایا تھا لیکن میں نے اس آخری ملاقات کے بعد۔۔۔ پھر بھی مجھے یقین ہے کہ ہم ایک خوشگوار زندگی گزاریں گے اور ایک دن آئے گا جب ہمیں لگے گا کہ ہم ایک دوسرے سے شدید محبت کرتے ہیں۔ ایسا ہی ہو گا نا الوینا؟"

اس نے اپنا ہاتھ الوینا کے ہاتھ پر رکھا تھا۔ لیکن الوینا نے یکدم ہی اپنا ہاتھ پیچھے ہٹا لیا اور تیزی سے باہر نکل گئی تھی۔ وہ حیران سا اسے باہر جاتے دیکھتا رہا تھا۔۔۔ ان کے درمیان اتنی قربت رہی تھی کہ وہ کم از کم اس بات پر ناراض نہیں ہو سکتی تھی کہ اس نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ کیوں رکھا۔ پھر یکایک اسے کیا ہوا تھا کہ وہ اٹھ کر باہر چلی گئی تھی۔ کچھ دیر وہ سوچتا رہا پھر بیڈ سائیڈ ٹیبل سے وہ فائل نکال کر دیکھنے لگا جس میں اس کے پروگراموں کی تفصیل تھی۔ یہ سب اسے رچی نے لکھ کر دیا تھا۔

شروع شروع میں وہ تنہا ہی پروگرام کرتا تھا لیکن پچھلے دو ماہ سے مہمان بلانے کا سلسلہ شروع ہوا تھا اور یہ اس کے ڈائریکٹر نے کہا تھا۔ لیکن رچی کو بہت پسند آئی تھی یہ بات۔

وہ سرسری نظروں سے ان موضوعات کو دیکھ رہا تھا جس پر اسے بولنا تھا کہ یکدم ٹھٹک گیا۔ یہ ٹاپک تھا نائن الیون کے بعد پاکستان کے حالات۔

پاکستان کے حالات کا ذکر کرتے ہوئے کچھ شخصیات کے نام تھے جن کا تعلق الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا سے تھا۔ یہ حضرات سی آئی اے کے ایجنٹ ہیں موساد انہیں نوازتا ہے۔ را سے ان کے تعلقات ہیں۔

"نہیں۔۔۔ یہ بھلا کیسے ممکن ہے۔ یہ میں کیسے کہہ سکتا ہوں۔ میرے پاس کیا ثبوت ہے کہ میں ان معزز

لوگوں پر الزام لگاؤں۔ لوگ تو مجھے پتھر ماریں گے۔"

وہ فوراً" فائل ہاتھ میں لے کر اٹھا تھا۔ تاکہ رچی سے اس کے متعلق بات کر سکے۔ آج تک اس نے جتنے بھی پروگرام کیے تھے اس میں ایسا کچھ نہیں تھا جسے بولتے ہوئے اسے ڈر لگا ہو۔ بلکہ اسے وہ سب سچ ہی لگتا تھا اور اسے رچی پر حیرت ہوتی تھی جو حالات کا اتنا صحیح تجزیہ کرتا تھا۔ رچی کے کمرے کا دروازہ نیم وا تھا اور اندر سے باتوں کی آواز آرہی تھی۔ وہ دروازے پر دستک دیتے دیتے رک گیا تھا۔

"آخر تمہیں اعتراض کیا ہے احمد رضا سے شادی کرنے میں؟" یہ رچی تھا۔

"تم نہیں جانتے۔" الوینا کے لہجے میں حیرت تھی۔ "میں شادی شدہ ہوں۔ میرا شوہر ہے، بچے ہیں۔"

"تو کیا ہوا؟" رچی نے لاپروا سے انداز میں کہا تھا۔ "تمہاری شادی کو کیا ہوتا ہے۔ پہلے بھی تو تم اس کے ساتھ رہتی رہی ہو۔ اب شادی کے نام پر رہ لینا۔ رہے تمہارے بچے اور شوہر تو انہیں کیا پتا۔ وہ کچھ اپ سیٹ اور اکھڑا اکھڑا سا ہے الوینا! اور میں چاہتا ہوں، وہ ریلیکس رہے۔ ہمیں اس سے بہت کام لینے ہیں۔ تم نہیں جانتیں، وہ کتنی پسندیدہ شخصیت بن چکا ہے۔ ہمیں ان کے اندر گھس کر ہی کام کرنا ہے۔"

اس کی آواز دھیمی ہو گئی تھی۔ وہ مرے مرے قدموں سے واپس پلٹا تھا اور فائل بیڈ پر پھینک کر کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ وہ، وہ نہیں تھا جو لوگ اسے سمجھ رہے تھے۔ وہ کتنے لوگوں کو دھوکا دے رہا تھا۔ لیکن جو کچھ وہ کہہ رہا تھا وہ سب سچ تھا۔ پاکستان کو تباہ کرنے کی سازشیں کی جا رہی تھیں وہ عالم اسلام کو ختم کرنا چاہتے تھے۔

وہ اس سے کیا کام لینا چاہتے تھے۔۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ وہ پہلے اسے نوجوانوں کا ہیرو بنانا چاہتے تھے اور پھر

اس روز وہ پھر کمرے سے باہر نہیں نکلا تھا۔ حالانکہ الوینا کا پروگرام قلعہ منٹو دیکھنے کا تھا۔

"میرے سر میں بہت درد ہو رہا ہے الوینا پلیز، تم ارباب کے ساتھ چلی جاؤ۔"

"میں تمہارا سر دبا دیتی ہوں۔" الوینا نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا تھا۔

"نہیں پلیز۔" اس نے آہستگی سے الوینا کا ہاتھ ہٹا دیا تھا۔

الوینا کی آنکھوں میں ایک لمحہ کے لیے حیرت ابھر کر معدوم ہو گئی تھی لیکن اس نے الوینا کی طرف نہیں دیکھا تھا اور آنکھیں موند لی تھیں۔ شاید کوئی اور وقت ہوتا تو الوینا کے ہاتھوں کا لمس اس کا سارا درد ختم کر دیتا لیکن اس وقت اسے الوینا کی موجودگی اچھی نہیں لگ رہی تھی۔

"او کے پھر ریسٹ کرو تم۔"

اس کے پاس سوچنے کے لیے بہت کچھ تھا۔ لیکن کسی ایک نکتے پر اس کی سوچ مرکوز نہیں ہو پا رہی تھی۔ کیا رچی نے اس کے ساتھ کوئی کھیل کھیلا تھا۔ کیا وہ کسی سازش کا شکار ہوا ہے۔ وہ تو رچی کو اپنا محسن سمجھ رہا تھا کہ وہ اسے یہاں سے بچا کر لے گیا تھا۔ اس نے آج تک وہی کیا تھا جو رچی نے کہا تھا۔ لیکن اس میں غلط کیا تھا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

یہ رچی تھا جس کی وجہ سے اسے اتنی دولت اور شہرت ملی تھی۔

یہ شہرت اسے احمد رضا کے نام سے نہیں ملی تھی۔ احمد حسن کے نام سے ملی تھی لیکن احمد حسن بھی تو وہ ہی تھا نا۔ آنکھیں موندے موندے اسے یاد آیا کہ ایک بار اس نے سمیرا سے کہا تھا۔

"دولت اور شہرت اسے جس طرح سے بھی ملی، قبول ہو گی۔"

"بھلے وہ شہرت ہٹلر جیسی ہو یا چنگیز خان جیسی؟"

اور اس نے تب سمیرا کو چڑانے کے لیے کہا تھا۔

"ہاں بھلے ہٹلر اور چنگیز اور ہلاکو جیسی ہو۔ شہرت تو ہو گی نا۔ تاریخ میں نام زندہ رہے گا۔"

اور تب سمیرا خفا ہو کر اس کے کمرے سے چلی گئی تھی۔

آخری دو دن اس نے پھر چک نمبر 151 میں گزارے تھے۔ الوینا اور رچی کے ساتھ وہ وہاں گیا تھا اس نے الوینا کی طرف دیکھنے اور بات کرنے سے گریز کیا تھا۔ بلکہ اس روز کے بعد سے اس کی الوینا سے بہت کم بات ہوئی تھی۔

"کیا بات ہے احمد رضا! تم مجھ سے بھاگ رہے ہو۔"

"نہیں تو۔" اس نے چک نمبر 151 میں آنے سے پہلے پوچھا تھا۔ وہ اس پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ وہ اس کی اور رچی کی بات سن چکا ہے۔ کیسی عورت تھی یہ۔ شوہر اور بچوں کے ہوتے ہوئے۔ وہ حیران ہوتا تھا اور الوینا بار بار اس کے قریب آنے کی کوشش کرتی تھی۔ شاید رچی نے اس سے کہا تھا۔

چک نمبر 151 کے سینٹر میں کام شروع ہو گیا تھا۔ اس نے دیکھا ہال نما کمرے میں دس بارہ سلائی مشینیں آگئی تھیں اور دوسرا سامان بھی تھا۔ رچی کے آفس میں بیٹھے ہوئے اس نے عورتوں اور لڑکیوں کو چادریں اوڑھے احاطے میں سے گزر کر ہال میں جاتے دیکھا۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ رچی کو یہاں کافی پسند کیا جاتا تھا۔ جو لوگ بھی اس سے ملنے آتے تھے۔ وہ بہت عقیدت سے ملتے تھے اسے...... اور پھر یہ جو کچھ وہ کر رہا تھا' اس میں کیا برائی تھی۔ وہ ان لوگوں کی مدد کر رہا تھا۔

اس نے دیکھا تھا' ایک کمرے میں بچوں کی کاٹ بھی تھی۔ تاکہ بچوں والی عورتوں کو سہولت رہے۔ سلائی اور دوسرے ہنر سیکھنے کے بعد ان کا کام شہر میں فروخت کے لیے بھیجا جائے گا۔ اس طرح انہیں گھر بیٹھے روزگار مل جائے گا۔

آخر اس کے پیچھے کیا مقصد ہو سکتا ہے۔

وہ سوچ رہا تھا۔ اور الوینا کی باتوں سے کچھ بھی اخذ نہیں کر پایا تھا۔ وہ بہت کچھ جاننا اور سمجھنا چاہتا تھا۔ لیکن کیسے؟

پہلی بار جب وہ ابراہیم کے ساتھ اسماعیل کے گھر گیا تھا۔ کاش! وہ دن اس کی زندگی میں کبھی نہیں آتا۔

"کیا تمہیں کوئی بات پریشان کر رہی ہے احمد رضا۔"

اس نے محسوس کیا تھا کہ رچی ان دنوں اسے بغور دیکھتا رہتا تھا۔

"نہیں تو...... بس ایسے ہی میں اس سینٹر کے متعلق سوچ رہا تھا۔ ایسے ہر سینٹر ہر گاؤں میں ہونے چاہئیں۔ یہ بہت اچھا کام کر رہے ہو تم۔"

"ہاں! ہم دنیا سے غربت اور جہالت ختم کرنے کا عزم رکھتے ہیں۔" رچی مسکرایا۔ "تمہارے اس ملک میں عورتوں کے ساتھ بہت ناانصافی ہوتی ہے۔ بہت ظلم ہوتا ہے ان پر۔ ہم اس پر بھی کام کریں گے۔"

"ایسا نہیں ہے رچی! ہمارے دین نے عورت کو جو مقام اور مرتبہ دیا ہے وہ کسی اور دین نے نہیں دیا۔"

"تم اپنے دین پر کتنا عمل کرتے ہو احمد رضا؟" رچی کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ تھی۔

"خیر! چھوڑو۔ میں نے الوینا سے بات کی ہے تمہاری شادی کی...... ذرا یہاں کے کام سے فارغ ہو جاؤں تو پھر کچھ کرتے ہیں۔"

"نہیں رچی! فی الحال میں نے شادی کا ارادہ کینسل کر دیا ہے۔"

"کیوں؟ کیا الوینا سے کوئی ناراضی ہو گئی ہے؟" وہ ہنسا۔ وہ بھی مسکرا دیا اور بات بنائی۔

"ارے نہیں...... بس میں نے سوچا۔ انتظار کر لوں کچھ اور۔ شاید مجھے اپنے والدین مل جائیں۔ تم نے کہا تھا نا' تم کوشش کرو گے ان کو ڈھونڈنے کی...... تو پھر......"

"ہاں ہاں! ٹھیک ہے۔"

رچی کے چہرے پر اطمینان نظر آیا تھا۔

"یہ ٹھیک ہے۔ والدین کے ملنے کے بعد ہی شادی کا پروگرام بناتے ہیں اور......"

وہ بات ادھوری چھوڑ کر باہر دیکھنے لگا۔ احاطے میں سے اسفندیار آتا دکھائی دیا۔

"بیوقوف۔" رچی کے لبوں سے نکلا۔

پھر وہ احاطے میں ہی رک گیا اور مڑ کر گیٹ کی طرف دیکھنے لگا۔ تب ہی گیٹ میں سے اس نے اندر قدم رکھا۔ سیاہ چادر جس پر لگے چھوٹے چھوٹے شیشے دور سے ہی چمک رہے تھے اور سیاہ چادر کے ہالے میں چھپا وہ دلکش چہرہ۔ رچی اپنی سیٹ سے تھوڑا سا اٹھ کر اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر اشتیاق تھا اور آنکھوں میں عجیب سی چمک۔

احمد رضا کو اس کا اس طرح دیکھنا برا لگا تھا۔

اسفندیار وہیں رک کر لڑکی کا انتظار کر رہا تھا۔ لڑکی اس کے قریب آکر رکی۔ اسفندیار نے ہال کی طرف اشارہ کیا۔ لڑکی ادھر مڑ گئی تو اسفندیار آفس کی طرف بڑھا۔ احمد رضا نے رچی کی طرف دیکھا۔ وہ اب اپنی کرسی پر بیٹھا تسبیح کے دانے گرا رہا تھا۔ اسفندیار نے اندر آکر گرم جوشی سے سلام کیا۔

"السلام علیکم شیخ صاحب!"

اور پھر احمد رضا سے ہاتھ ملایا۔

سر کے اشارے سے رچی نے اس کے سلام کا جواب دے کر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور پھر تسبیح مکمل کر کے اسے کلائی پر لپیٹتے ہوئے اسفندیار کی طرف دیکھا۔

"کیسے ہو اسفندیار! اور عظمت صاحب کہاں ہیں۔ صبح سے نظر نہیں آئے۔"

"وہ تو آپ کے کام سے ہی گئے ہیں۔"

"اوہ! ہاں اچھا...... اور یہ لڑکی کون تھی تمہارے ساتھ...... سینٹر میں داخلہ لینے آئی ہے۔"

"نہیں...... نہیں۔" اسفندیار نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ تو میری بہن ہے' اریب فاطمہ...... بتایا تھا نا میں نے لاہور میں پڑھتی ہے۔"

"اوہ! ہاں ہاں یاد آیا۔ اچھا ہوا یہ آگئی ہے۔ ہمارے پاس کام سکھانے والی اور نگران لڑکیوں کی بہت کمی ہے۔"

"نہیں...... یہ تو بس چند دنوں کے لیے آئی ہے۔ اماں کہتی ہیں کہ اسے اپنی پڑھائی مکمل کرنا ہے۔ بی اے کر کے پھر آئے گی۔ بس تقریباً" ایک سال ہی رہتا ہے۔" اسفندیار تفصیل سے بات کر رہا تھا۔

"یہاں تو وہ زینب آپا سے ملنے آئی ہے۔ زینب آپا وہی' جو نگران ہیں سینٹر کی۔ عظمت بھائی نے ہی رکھوایا ہے انہیں یہاں۔ اریب فاطمہ سے بہت پیار کرتی ہیں وہ...... اور اریب فاطمہ بھی جب گاؤں آئے تو ان سے ضرور ملتی ہے۔ میں نے بتایا تھا اسے کہ اب زینب آپا ادھر رہتی ہیں شام تک۔"

احمد رضا نے دیکھا' رچی بے زار سا کرسی پر پہلو بدل رہا تھا۔ پھر وہ ایک دم اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"تم لوگ بیٹھو۔ میں ابھی آتا ہوں۔ ذرا زینب آپا سے پتا کر لوں ٹیلرنگ مشینیں کتنی کافی ہوں گی۔"

"سر...... سر!" احمد رضا نے چونک کر دیکھا۔ دروازے کے پاس ثمینہ حیدر کھڑی تھیں۔ "لنچ میں آپ کیا لیں گے۔"

"جو جی چاہے۔"

"اور کیا آپ کو شام کو ٹی وی اسٹیشن پر جانا ہے؟ آپ کے کپڑے وغیرہ نکال دوں؟"

"ہاں! جانا ہے۔"

"آپ یہاں لیٹے ہیں۔ بیڈ روم میں جا کر سو جائیں آرام سے۔ تھکے ہوئے لگ رہے ہیں۔"

"تھینک یو مس! میں یہاں بے آرامی محسوس نہیں کر رہا۔"

ثمینہ حیدر باہر چلی گئیں تو وہ کچھ دیر یوں ہی بے دھیانی سے سامنے دیوار پر لگی پینٹنگ کو دیکھتا رہا اور پھر اسے عبایا والی لڑکی کا خیال آگیا۔ جب وہ یہاں سے گیا تھا۔ تب بھی اکثر پردہ دار لڑکیاں نظر آتی تھیں۔ خود ان کے محلے میں بھی کئی گھرانوں میں پردہ کیا جاتا تھا۔ لیکن اب جبکہ وہ تین سال بعد واپس آیا تھا تو اسے لگا تھا' جیسے کالجوں اسکولوں میں جانے والی اکثر لڑکیاں عبایا یا حجاب لینے لگی تھیں...... اور ان مزید دو سالوں میں تو یہ رجحان اور بھی بڑھا تھا۔ اسے اچھی لگتی تھیں باپردہ لڑکیاں۔ اگر وہ کبھی سمیرا سے ملا تو اسے بھی عبایا لینے کو کہے گا۔ اپنے ہی خیالات کی تبدیلی پر وہ ہولے سے ہنسا۔

پانچ سال پہلے وہ ایسا نہیں سوچتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ پردہ ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ کیا اس کے خیالات

میں تبدیلی ابھی کچھ دیر پہلے ملنے والی اس باپردہ لڑکی کو دیکھ کر آئی تھی یا بتدریج پیدا ہوئی تھی۔ شاید بتدریج ان دو سالوں میں باپردہ لڑکیوں کو ہر شعبے میں کام کرتے دیکھ کر۔

فون کی بیل ہو رہی تھی کچھ دیر وہ میز پر پڑے فون کو دیکھتا رہا۔ جب اس نے ہاتھ بڑھایا تو بیل بجنا بند ہو گئی اس نے جھک کر نیچے گرا ہوا کشن اٹھایا اور اسے سر کے پیچھے رکھ ہی رہا تھا کہ بیل پھر ہونے لگی۔

اب کے اس نے بغیر توقف کے فون اٹھا لیا۔ رچی کا نمبر تھا۔ یقیناً "جنید علی نے اسے رپورٹ دے دی ہو گی۔ یہ جنید علی بھی رچی نے غالباً" اس کی نگرانی کے لیے مقرر کر رکھا تھا۔ اپنے آپ سے الجھتے ہوئے اس نے فون آن کیا اور رچی کی بات سننے لگا۔

☼ ☼ ☼

"الریان" میں بالکل خاموشی تھی۔ صرف مائرہ تھیں، جو صوفے پر خاموش بیٹھی تھیں۔ ان کی گود میں ایک میگزین کھلا ہوا تھا۔ لیکن وہ میگزین نہیں پڑھ رہی تھیں۔ ان کا سارا دھیان "ملک ہاؤس" کی طرف تھا۔ ملک ہاؤس جسے عبدالرحمن شاہ نے خرید لیا تھا۔ لیکن جب بھی اس کا ذکر ہوتا اسے ملک ہاؤس ہی کہا جاتا۔

اس وقت ملک ہاؤس میں رونق لگی تھی۔ عبدالرحمن شاہ تو فلک شاہ اور عمارہ شاہ کے آتے ہی ادھر منتقل ہو گئے تھے۔ باقی لوگ دن بھر وہاں رہتے اور پھر رات کو اپنے اپنے ٹھکانوں پر آ جاتے تھے۔ عثمان بھی دبئی سے آ گئے تھے۔ شاہ کی تیاریاں زوروں پر تھیں۔ مرتضیٰ بھی ایک لمبے عرصے بعد فرانس سے کل شام ہی اپنی بیوی کے ساتھ آئے تھے۔ بچوں کا پروگرام بعد میں آنے کا تھا۔

صرف مائرہ احسان شاہ اور رابیل تھیں، جو ملک ہاؤس نہیں گئی تھیں۔ احسان شاہ اس وقت گھر پر نہیں تھے۔ جبکہ رابیل اپنے کمرے میں تھی۔ عمر اور زبیر ملک ہاؤس میں تھے۔

ان کے منع کرنے کے باوجود بھی وہ ملک ہاؤس میں چلے جاتے تھے۔ زبیر نے تو صاف کہہ دیا تھا کہ "عادل کی اور حفصہ کی شادی دوبارہ نہیں ہو گی۔ آپ کے کسی سے جو بھی اختلافات ہوں۔ ہم عادل اور حفصہ کی شادی کو پوری طرح انجوائے کرنا چاہتے ہیں۔ پلیز! ہمیں مت روکیں۔" تب احسان شاہ نے کہا تھا۔

"بچوں کو مت روکو مائرہ! یہ بچپن سے عادل اور حفصہ کے ساتھ ہیں۔ سگے بہن بھائیوں کی طرح رہے ہیں۔ انہیں ان کی شادی انجوائے کرنے دو۔"

اور انہیں احسان شاہ پر بہت غصہ آیا تھا۔

"میں نے کہا بھی تھا' بابا جان کو منع کریں۔ وہ انہیں یہاں مت بلائیں۔ وہ بہاول پور چلے گئے۔ عمارہ یہاں ہاسپٹل میں آئی۔ پھر شیر دل کے گھر میں ان کے ساتھ رہیں۔ کیا ضروری تھا کہ اسے اب یہاں بھی بلایا جاتا؟ میں نے کہا بھی تھا' بابا جان سے کھل کر بات کریں۔"

"کی تو تھی میں نے بات۔" احسان شاہ کا لہجہ مدھم تھا۔

اس روز جب وہ مائرہ کے کہنے پر عبدالرحمن شاہ کو کہنے آئے تھے کہ فلک شاہ اور عمارہ کو حفصہ کی شادی پر مدعو نہ کریں تو ان کی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ وہ بابا جان سے بات کریں۔ وہ کتنی خوشی خوشی ملک ہاؤس کی ڈیکوریشن کروا رہے تھے۔ ان کی بوڑھی آنکھوں میں کیسی چمک سی آ گئی تھی اور جب انہوں نے بلایا تھا کہ "بابا جان! میری بات سن لیں" تو چھڑی پر رکھے ان کے ہاتھوں کی لرزش احسان شاہ سے چھپی نہیں رہ سکی تھی.... اور جس طرح ان کے چہرے پر زردی چھائی تھی۔ وہ ساری ہمت کھو بیٹھے تھے۔ ان کے کانوں میں عبدالرحمن شاہ کی آواز آئی تھی۔

"عمو بھی میری ایسی ہی پیاری بیٹی ہے۔ جیسے رابیل تمہاری ہے۔"

اور تب وہ بات کہنے کے بجائے ان کے لبوں سے نکلا تھا۔

"بابا جان! مرتضیٰ بھائی کب تک آ رہے ہیں؟" اور عبدالرحمن شاہ کے چہرے پر اطمینان چھا گیا تھا۔

دروازے کے پاس کھڑی مائرہ کا دل غصے سے پیچ و تاب کھا کر رہ گیا تھا اور وہ احسان شاہ سے ناراض ہو گئی تھیں۔

"دیکھو مائرہ! میں اس عمر میں بابا جان سے ان کی یہ خوشی نہیں چھین سکتا۔ زارا اس دنیا میں نہیں.... اور عمارہ جیتے جی ان سے جدا ہو گئی تھی۔ صرف اتنا سوچ لو مائرہ! اگر ہماری رابی ہم سے یوں جدا ہو جائے تو....؟ ہم نے بابا جان اور اماں جان کے ساتھ بہت ظلم کیا۔ "الریان" کے دروازے تو خود مومی نے اپنے اور عمو کے لیے بند کر دیے تھے۔ کیا تھا اگر بابا جان اور اماں جان عمو سے ملتے رہتے' بہاول پور جا کر۔"

اور مائرہ حیرانی سے انہیں دیکھتی رہ گئی تھیں۔

"شانی! یہ تم کہہ رہے ہو؟"

اور احسان شاہ نے نظریں چرا لی تھیں۔

"مائرہ! میں یہ نہیں کہہ رہا کہ ہم دونوں فلک شاہ کے سامنے جائیں یا اس سے بات کریں۔ لیکن بابا جان...."

"تو بابا جان صرف عمارہ سے ملیں۔ اس سے بات کریں۔ نہ کہ مومی سے۔ تمہیں منع کرنا چاہیے تھا احسان شاہ کہ وہ کم از کم فلک شاہ کو تو مت بلائیں۔"

"میں کیسے منع کرتا مائرہ! عمارہ شاید اس کے بغیر نہ آتی۔"

"یہ.... یہ صرف اس لیے ہے احسان شاہ! کہ کوئی بھی فلک شاہ کے کرتوت نہیں جانتا' سوائے ہمارے۔ کاش! تم مجھے بابا جان کو ساری حقیقت بتانے دیتے۔ پھر میں دیکھتا' کیسے بابا جان فلک شاہ سے ملتے۔ لیکن جب بھی کسی نے پوچھا تم نے منع کر دیا۔"

"لیکن اب میں ضرور بابا جان کو بتاؤں گی کہ ان کا چہیتا فلک شاہ' ان کی لاڈلی بیٹی کا شوہر ان کی بہو پر نظر رکھتا تھا۔"

"مائرہ!" احسان شاہ کی آواز بلند ہو گئی۔ "تم بابا جان سے کچھ بھی نہیں کہو گی۔ ایک لفظ بھی نہیں۔ مجھے اپنی اور اپنے خاندان کی عزت بہت عزیز ہے۔ کیا عزت رہ جائے گی بچوں کی نظر میں ہماری؟"

تب مائرہ خاموش ہو گئیں۔ لیکن ان کا موڈ بہت خراب تھا۔ دیوار کے اس پار مومی فلک شاہ تھا اور عمارہ تھی اور "الریان" کے سب باسی۔

مومی فلک شاہ' جس نے مائرہ کو ٹھکرا دیا تھا۔ اس مائرہ حسن کو' جسے اپنے حسن' اپنی دلکشی پر بہت ناز تھا اور کالج میں لڑکے اس کے گرد پروانوں کی طرح چکراتے تھے۔ مگر وہ کسی کو گھاس بھی نہیں ڈالتی تھی۔ لیکن مومی فلک شاہ نے پہلی ہی نظر میں اسے اسیر کر لیا تھا۔

ٹھکرائے جانے کا دکھ اس کے دل میں گڑ گیا تھا.... مائرہ حسن سے مائرہ احسان شاہ بن کر بھی اس دکھ کی تکلیف ویسی ہی رہی تھی۔ ماہ و سال نے اس زخم پر جو کھرنڈ جما دیا تھا' وہ چھل گیا تھا اور اس زخم سے پھر خون رسنے لگا تھا۔ یہ زخم پھر اذیت دے رہا تھا۔

اتنے سال کتنے سکون سے گزر گئے تھے۔

چند سال تو ہر لمحے اسے لگتا رہا کہ جیسے ابھی عمارہ شاہ "الریان" میں آئے گی اور کہے گی کہ اس نے فلک شاہ کو چھوڑ دیا۔ اماں جان' بابا جان اور سب کے لیے۔ ان سب کے لیے' جن سے اس کا خون کا رشتہ تھا اور تب وہ فلک شاہ سے ضرور پوچھے گی کہ فلک شاہ تم نے اس کے لیے مجھے ٹھکرایا تھا۔ آج اس نے تمہیں ٹھکرا دیا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔

عمارہ شاہ نے پلٹ کر "الریان" کی طرف نہیں دیکھا تھا اور زندگی کے اتنے سارے سال بتا دیے۔ مائرہ سے عمر یا زبیر نے آ کر کوئی بات نہیں کی تھی نہ فلک شاہ کی۔ نہ عمارہ کی۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ لان میں موجود دروازہ پار کریں اور فلک شاہ کے سامنے جا کھڑی ہوں۔ ان کے منہ پر تھوک دیں۔ کچھ ایسا کریں کہ وہ تڑپ اٹھے اور کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہے۔ لیکن ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیسے....؟ کیسے وہ اسے اذیت پہنچائیں؟ وہ عمر اور زبیر کو روک نہیں پائی تھیں.... عمر تو رک بھی جاتا شاید۔ وہ ان سے ڈرتا بھی بہت تھا' روتا رہتا۔ مگر ان کی حکم عدولی نہ کرتا۔ لیکن یہ زبیر تھا' جو اسے اپنے ساتھ لے

گیا تھا۔ سارا قصور احسان شاہ کا تھا۔

انہیں پھر احسان شاہ پر غصہ آنے لگا۔ ٹھیک ہے، فنکشن ہال میں ہوئے تھے۔ لیکن کیا وہاں فلک شاہ نہیں ہو گا؟ آخر وہ اتنی دور سے شادی میں شرکت کے لیے ہی آیا ہے اور اگر وہ ہو گا تو کیا میں اور احسان وہاں جائیں گے؟ ہرگز نہیں۔ بابا جان کو فیصلہ کرنا ہو گا۔ ہم یا مومی؟ اس کی بیوی اور بچے بھلے شریک ہوں۔ لیکن وہ نہیں۔

لاؤنج کے کھلے دروازے سے ڈھولکی کی ہلکی سی تھاپ کی آواز کانوں تک آئی تو مائرہ نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

"اب اگر یہ عمارہ اور فلک شاہ کی مصیبت نہ ہوتی تو یہ ساری رونق یہاں ہوتی "الریان" میں۔" وہ تو یہ بھی نہیں جانتی تھیں کہ وہاں حفصہ کی شادی کی کیا کیا تیاریاں ہو رہی ہیں۔ ثنا بھائی اور مصطفٰے نے بھی رات کتنی منتیں کی تھیں کہ وہ حفصہ اور عادل کی خاطر ساری رنجشیں بھول جائیں۔

وہ ثنا اور مصطفٰے کو ناراض نہیں کر سکتی تھیں۔ کیونکہ ہمدان کے ساتھ رابیل کی شادی کی شدید خواہش تھی انہیں۔ اگرچہ رابیل نے سختی سے منع کر دیا تھا۔ پھر بھی ان کا خیال تھا کہ وہ رابیل کو منا لیں گی۔

لیکن اس سے پہلے کوئی ایسا طریقہ ہو کہ فلک شاہ اور عمارہ واپس جانے پر مجبور ہو جائیں۔ لیکن ان کا دماغ کام نہیں کر رہا تھا۔

"کیسے؟ کس طرح...."

انہوں نے دونوں ہاتھوں میں سر تھام لیا۔ تب ہی سیڑھیوں سے رابیل اتر کر ان کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔

"کیا ہوا ماما... سر میں درد ہے کیا؟" مائرہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

وہ کہیں جانے کے لیے تیار تھی اور بے حد خوب صورت لگ رہی تھی۔ مائرہ نے چونک کر بغور اسے دیکھا۔

"کہیں جا رہی ہو کیا؟"

"ہاں! رات مونی نے بتایا تھا۔ آج وہ ڈھولکی منگوائیں گی۔ میں ذرا ادھر جا رہی ہوں۔ پھر میں ابھی تک عمارہ پھپھو سے بھی ملنے نہیں گئی۔ عمر کہہ رہا تھا، پھپھو پوچھ رہی تھیں میرا اور رابی کا بھی۔ مجھے خود بھی بہت اشتیاق ہو رہا ہے ابجی کو دیکھنے کا۔"

مائرہ نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھا۔

"رابی! میں نے تمہیں منع کیا تھا۔"

"کیا مطلب ہے ماما! آپ کا۔ ہم آپ کی کسی نام نہاد ناراضی کی وجہ سے حفصہ اور عادل بھائی کی شادی بھی انجوائے نہ کریں؟"

"تو یہ بات اپنے بابا جان اور تایا جان سے کہو۔ جنہوں نے محض عمارہ اور فلک شاہ کی خاطر ہمیں الگ کر دیا ہے۔"

"نہیں ماما! ایسا ہرگز نہیں ہے۔ آپ خود الگ ہو کر بیٹھ گئی ہیں۔ حتیٰ کہ آپ انکل مرتضیٰ سے بھی ملنے نہیں گئیں۔ وہ آپ سے اور پاپا سے ملنے آئے "الریان" میں۔"

"تو انہیں "الریان" میں ہی آنا تھا۔" مائرہ جھنجلا رہی تھیں۔

"آپ چلیں گی ماما میرے ساتھ؟" رابیل نے جلتی پر تیل پھینکا۔

"نہیں! نہ میں جاؤں گی نہ تم۔"

"فضول ضد نہ کریں ماما۔ بہت ہوا تو آپ ان لوگوں سے بات مت کیجیے۔ حالانکہ ہاسپٹل میں تو آپ کی عمارہ پھپھو سے بات ہو چکی ہے اور پیچھے رہ گئے انکل فلک شاہ تو...."

"بکو مت رابی!" اور رابیل کے چہرے کا رنگ بدلا تھا۔

"ماما! مجھے آپ کی بالکل سمجھ میں نہیں آتی۔ یہ وقت ان باتوں کے لیے نہیں ہے۔ آپ کو جو بھی گلے شکوے یا لڑائی جھگڑا ہے عمارہ پھپھو اور انکل سے وہ بعد میں حل کر لیجیے گا۔ ابھی تو شادی میں ہنسی خوشی شریک ہو جائیں۔"

مائرہ کے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ دروازے کی

طرف بڑھ گئی۔ مائرہ صوفے پر بیٹھی اسے لاؤنج سے باہر اور پھر لان کی طرف جاتے دیکھتی رہیں۔

وہ بچوں کو نہیں روک سکتی تھیں۔

اور کیا احسان شاہ بھتیجے اور بھتیجی کی شادی میں شرکت نہیں کرے گا۔ ابھی شادی میں بہت دن تھے۔ اس سے پہلے کچھ ایسا ہو کہ فلک شاہ اور عمارہ واپس چلے جائیں۔ لیکن کیا اور اس کیا کے آگے بڑا سارا سوالیہ نشان تھا۔ فی الحال ان کا دماغ کام نہیں کر رہا تھا۔ وہ پھر سوچ میں کھو گئی تھیں۔

اور جب مرینہ اور سمیرا لاؤنج میں داخل ہوئیں تو تب بھی وہ یونہی لاؤنج میں صوفے پر بیٹھی کچھ سوچ رہی تھیں۔ سمیرا اور مرینہ کے سلام کا جواب سر کے اشارے سے دے کر وہ اپنے کمرے میں چلی گئی تھیں۔

مرینہ نے معذرت طلب نظروں سے سمیرا کی طرف دیکھا۔ سمیرا اپنے ہی خیالوں میں گم مرینہ کے کمرے کی طرف جا رہی تھی۔ کمرے میں آکر اس نے عبایا اتارا اور بیڈ پر بیٹھ گئی۔

"میں تمہارے لیے کچھ لاؤں سمیرا! جوس، چائے یا کچھ فروٹ لے آؤں۔"

"نہیں کچھ بھی نہیں۔ کچھ بھی جی نہیں چاہ رہا۔"

"چلو میں چائے کے لیے کہہ دیتی ہوں اور میرا خیال ہے سب لوگ دوسرے گھر میں گئے ہوئے ہیں۔ تم تھوڑا ریسٹ کر لو پھر چائے پی کر ہم چلتے ہیں۔ میں دیکھتی ہوں کچن میں کوئی ہے۔" سمیرا نے اس کی اتنی لمبی چوڑی بات میں سے صرف چائے کی بات سنی تھی۔

"نہیں پلیز مرینہ! چائے مت بنواؤ۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ میں تمہارے لیے فریش جوس لے کے آتی ہوں۔"

اب کے سمیرا خاموش رہی تھی۔ مرینہ باہر چلی گئی تھی۔ سمیرا نے اس کے جانے کے بعد آنکھیں موند کر سر بیڈ کراؤن سے ٹیک لیا تھا۔

"وہ احمد رضا ہی تھا۔" اس کا فیصلہ اس نے اس پر پہلی نظر ڈالتے ہی کر لیا تھا۔

اتنی زیادہ مشابہت کہ انگلیوں پر بھی تل۔

اور اس تل پر انہوں نے کتنی بحث کی تھی۔

وہ کہتا تھا "ایسے شخص کے پاس بہت دولت آتی ہے۔ بہت شہرت ملتی ہے۔"

اور وہ کہتی تھی "یہ سب فضول باتیں ہیں۔"

اور کیا ممکن ہے کہ اس دنیا میں دو انسان بالکل ایک جیسے ہوں۔ بس ایک کی ماں رحیم یار خان میں پیدا ہونے والی سیدھی سادھی پاکستانی عورت اور دوسرے کی ماں ایک مصورہ جس نے اسپین کی سرزمین میں جنم لیا۔

لیکن نہیں وہ احمد رضا ہی ہے۔

اس کے دل نے پھر کہا تو وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اس نے پاس پڑا اپنا ہینڈ بیگ کھول کر فون نکالا۔

مجھے ابو کو بتا دینا چاہیے کہ احمد حسن ہی احمد رضا ہے۔

"نہیں ابھی نہیں۔۔۔ ابھی ایک دوبار اور اس کی طرف جاؤں گی جب مجھے یقین ہو جائے گا۔"

"یقین تو تمہیں اب بھی ہے سمیرا رضا! لیکن تم ڈرتی ہو وہ، جو اپنی شناخت بدل چکا، کہیں تمہیں پہچاننے سے انکار نہ کر دے۔"

آنکھوں کے کونے میں اٹکے آنسو کے ایک قطرے کو اس نے انگلی کی پور سے پونچھا۔ تب ہی مرینہ جوس لے کر اندر آئی۔

"تھینک یو مرینہ!" جوس لے کر اس نے ممنونیت سے مرینہ کی طرف دیکھا۔

"جوس پی لو تو ذرا ساتھ والے گھر میں چکر لگا آتے ہیں۔ میں کچن میں گئی تھی تو وہاں ڈھولکی کی آواز آ رہی تھی۔ لگتا ہے مونی نے ڈھولکی منگوالی ہے۔"

اپنے جوس کا گھونٹ بھرتے ہوئے مرینہ نے سمیرا کی طرف دیکھا جو چھوٹے چھوٹے گھونٹ لے رہی تھی۔

"شادی کب ہے؟" سمیرا نے اپنی سوچوں کو جھٹک کر پوچھا۔

"شادی میں تو ابھی پندرہ سولہ دن ہیں۔ بس یونہی شغل کے لیے۔ پھپھو بھی بہت عرصہ بعد آئی ہیں نا۔"

"سنو! تم نے شادی کے سارے فنکشنز میں شریک ہونا ہے۔ ابھی سے تیاری کر لو۔ کسی دن چلیں گے اکٹھے دونوں شاپنگ کرنے۔"

"او کے!" سمیرا نے جوس کا خالی گلاس سائیڈ ٹیبل پر رکھا۔

"پتا ہے وہ اریب کی بچی بھی اپنے گاؤں گئی ہوئی ہے اپنے گھر سب سے ملنے۔ تاکید تو میں نے بلکہ سب نے کی ہے کہ شادی سے پہلے آ جانا۔ اب پتا نہیں آئی بھی ہے یا نہیں۔ اس کے کالج میں اسٹوڈنٹ ویک کی وجہ سے اسے چھٹیاں تھیں۔ کچھ خود لے لیں۔"

"اریب بہت پیاری ہے خصوصاً اس کی آنکھیں۔" سمیرا مسکرائی تھی۔

"ہاں اس کی آنکھیں بہت پیاری ہیں تمہاری آنکھوں کی طرح۔ ہمدان بھائی کہتے ہیں تمہاری اور اریب کی آنکھیں ایک جیسا تاثر دیتی ہیں۔ اداسی اور غم کا، پتا ہے ایک روز وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا تمہاری دوست کو کیا دکھ ہے۔ میں نے کہا بھلا اسے کیا دکھ ہو سکتا ہے۔"

"ہاں بھلا مجھے کیا دکھ ہو سکتا ہے۔" سمیرا نے اس کی بات دہرائی تھی۔ "میں بچپن سے ایسی ہی ہوں خاموش طبع سی شاید اس لیے۔۔۔ اور اریب کو کیا دکھ ہے بھلا؟"

"نہیں بھلا اریب فاطمہ کو بھی کیا دکھ ہو سکتا ہے، تین بھائی ہیں، والدین زندہ ہیں۔ اچھے خاصے خوشحال لوگ ہیں۔ چلیں۔" مرینہ نے اپنا گلاس خالی کر دیا تھا۔

اور سمیرا نے سوچا کہ شاید اس طرح کچھ دیر کے لیے احمد حسن اور احمد رضا کا خیال ذہن سے نکل جائے۔

"لیکن زیادہ دیر نہیں رکیں گے وہاں راولپنڈی جا کر میں ذرا بھی تو نہیں پڑھ سکی۔" سمیرا نے اٹھتے ہوئے کہا۔

کچن میں گلاس رکھ کر وہ دونوں کچن کے پچھلے دروازے سے ہی لان میں آ گئی تھیں۔

اور ابھی وہ دروازے تک پہنچی ہی تھیں کہ اندرونی دروازہ کھول کر برآمدے میں آتی مائرہ نے وہیں سے ہی آواز دی۔

"مرینہ سنو! ذرا رابیل کو بھیج دینا۔"

"جی چچی جان! بھیج دوں گی۔"

مائرہ دروازہ کھول کر واپس اندر مڑ گئیں۔

"ملک ہاؤس" کے لاؤنج میں قدم رکھتے ہی سمیرا کو احساس ہوا کہ مرینہ نے سچ کہا تھا کہ ساری رونقیں تو اس وقت ملک ہاؤس میں اتری ہوئی ہیں۔ تب ہی الریان تو بے رونق ہو گیا ہے۔

"ارے واہ! آج تو ملک ہاؤس کی قسمت جاگ اٹھی ہے پہلے شہزادی رابیل صاحبہ نے یہاں قدم رنجہ فرمایا اور اب شہزادی مرینہ مع ڈاکٹر سمیرا کے تشریف لائی ہیں۔"

منیبہ نے کھڑے ہو کر سر خم کرتے ہوئے ان کا استقبال کیا۔

"اور میں شہزادی عاشی ہوں۔ بابا جان کی پرنسز اور الریان کی سب سے خوب صورت لڑکی۔"

عمارہ کے پہلو میں بیٹھی عاشی چہکی۔

عمارہ کے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ نمودار ہوئی انہوں نے ایک بازو حمائل کر کے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

"بلاشبہ اس میں کوئی شک نہیں ہے میری بیٹی سب سے زیادہ پیاری ہے۔"

سمیرا کے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"بیٹھو بیٹا!" عمارہ نے تھوڑا سا کھسک کر اس کے لیے جگہ بنائی۔

"مرینہ نے بتایا تھا کہ تم پڑھتی بہت ہو اور اپنی صحت کا خیال نہیں رکھتی۔ بیٹا! اپنا خیال رکھا کرو۔ صحت ہو گی تو پڑھ بھی سکو گی اور ڈاکٹر بھی بن سکو گی۔"

سمیرا کچھ نہ کہہ سکی۔ اس محبت پر اس کا دل بھر آیا

تھا۔ مرینہ صحیح کہتی تھی کہ "الریان" کا ہر فرد محبتوں کی مٹی سے گوندھا گیا ہے اور اس مٹی میں اللہ تعالیٰ نے خلوص، بے غرضی اور چاہت کے سارے رنگ بھی گوندھ دیے ہیں۔

مرینہ نیچے کارپٹ پر بیٹھ گئی تھی۔ رابیل، منیبہ، حفصہ، ثنا آنٹی، مرینہ کی مما سب نیچے بیٹھی تھیں۔ جبکہ عمارہ اور عاشی صوفے پر تھیں۔

منیبہ نے اور ڈھولکی اپنی طرف کھینچتے ہوئے تھاپ لگائی۔

"میں بجاتی ہوں تم لوگ گاؤ۔"

"ہمدان کتنی اچھی ڈھولکی بجاتا ہے۔ یاد ہے نا اس نے رانیہ اور فرحان کی شادی میں کتنی اچھی ڈھولکی بجائی تھی۔" حفصہ یکدم بولی تھی۔ منیبہ نے پھر ڈھولکی پر تھاپ لگائی۔

"مونی بیٹا! ہاتھوں کو کیوں تکلیف دے رہی ہو۔ ایک ڈنڈا اٹھالو اور ڈھولکی کو پیٹنا شروع کردو۔"

"تو مومی بھیا کو بلوائیں نا وہ کہاں ہیں۔"

مرینہ کو بالکل یاد نہ رہا کہ ابھی وہ "الریان" کے لڑکوں کا لاؤنج میں موجود نہ ہونے پر شکر ادا کر رہی تھی

"اور وہ عمر اور زبیر کہاں غائب ہیں؟ عمر تو ڈانس بھی غضب کا کرتا ہے۔ یاد ہے نا، اس نے کیسا غضب کا ڈانس کیا تھا۔ رانیہ کی شادی پر۔"

اور عمارہ کو لگا جیسے بیتے سالوں میں "الریان" میں ہونے والی کتنی خوشیاں ان کے بغیر آکر چلی گئی تھیں۔ کاش، انسان کے اختیار میں ہوتا کہ وہ وقت کا پہیہ الٹا چلا سکتا تو آج وہ بھی۔۔۔

"عمر اور زبیر کا تو پتا نہیں کہاں گئے ہیں۔ ہومی البتہ اندر پھوپھا جان کے پاس ہے اور بابا جان بھی وہیں ہیں۔" منیبہ نے مرینہ کی بات کا جواب دیا۔

"بابا، مصطفیٰ انکل اور عثمان انکل ہال وغیرہ کی بکنگ کے سلسلے میں گئے ہوئے ہیں۔"

منیبہ نے پھر ڈھولکی پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ ثنا چچی نے ڈھولکی اس کے ہاتھوں سے لے لی۔

"نہ۔۔۔ نہ مونی بیٹا! ہمارے کانوں میں مزید ہمت نہیں ہے اس تھپ تھپ کو سننے کی۔"

"ارے ہاں عمو!" ثنا نے ایک دم چونک کر عمارہ کو دیکھا۔

"یہ عمو تو بہت خوب صورت ڈھولکی بجاتی ہے۔ زارا کی شادی میں تو اس نے کمال کا گایا تھا۔ آؤ عمو آؤ۔"

"لیکن میں؟" عمارہ چونک گئیں "زارا کی شادی کے بعد تو زندگی ہی بدل گئی ثنا بھابھی! اب تو کچھ یاد نہیں۔"

"آجاؤ بھئی۔۔۔ ڈھولکی ہاتھ میں لوگی تو خود ہی سب یاد آجائے گا۔"

"ہاں پھپھو! آئیں نا۔" منیبہ نے ہاتھ پکڑ کر انہیں اٹھایا۔

عمارہ نے ثنا کے پاس بیٹھتے ہوئے ڈھولکی سنبھالی تو جانے کیا کیا کچھ یاد آگیا۔ سمیرا بھی حفصہ کی طرح سر جھکائے بیٹھی تھی اور سب اسے چھیڑ رہے تھے۔

"کنکاں لمبیاں نی مائے کیوں جمیاں مائے"

ثنا نے گیت کے بول اٹھائے تو منیبہ نے بھی ان کی آواز میں آواز ملائی۔ لاؤنج میں ایک دم خاموشی چھا گئی تھی۔ سب ساکت بیٹھے ثنا اور منیبہ کو سن رہے تھے۔ چند بولوں کے بعد ثنا نے ایک دم نیا گیت شروع کر دیا تھا۔

ساڈا چڑیاں دا چنبا وے
بابل! اسیں اڈ جانا

حفصہ ایک دم اٹھ کر ثنا سے لپٹ گئی۔ سب کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

ثنا چچی! یہ ٹھیک نہیں ہے۔۔۔ ابھی سے رخصتی کے گیت شروع کر دیے۔"

منیبہ نے آنسو پونچھتے ہوئے ثنا سے شکوہ کیا۔ تو مرینہ نے حفصہ کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے اس کے رخسار کو چوما۔

میری پیاری سی حفصہ بھابھی کو سسرال میں اتنا پیار ملے گا کہ انہیں میکے کی کبھی یاد نہیں آئے گی۔"

"سسرال میں کتنا بھی پیار ملے۔ میکے کی یاد تو دل میں بسی ہوتی ہے میری جان!" عمارہ نے ہاتھوں کی پشت سے آنسو صاف کیے۔

میکہ، میکے کی گلیاں، وہ کمرے، وہ درو دیوار، گڑیاں اور میکے سے وابستہ رشتے کبھی نہیں بھول پاتے مرینہ بٹی کبھی نہیں۔ اللہ نہ کرے کہ کسی کا میکہ اس سے بچھڑے۔ کبھی بھائی کی چھیڑ چھاڑ، شرارتیں، محبتیں دامن تھامتی ہیں تو کبھی ماں کی گود رلاتی ہے۔ دل کے آنگن میں ہر کونے کھدرے سے یادیں لپٹی ہوتی ہیں۔"

صوفے پر بیٹھی خاموشی سے آنسو بہاتی سمیرا کی ہچکیاں بندھ گئیں۔

رضی کی شرارتیں، محبتیں، چھیڑ چھاڑ روٹھنا منانا ۔ اس سے تو یہ سب سسرال جانے سے پہلے ہی بچھڑ گیا تھا۔ وہ جو ان سب کی محفل میں بیٹھ کر کچھ دیر کے لیے بھول گئی تھی کہ ابھی وہ احمد حسن کے گھر پر تھی۔

احمد حسن جو ہر طرح سے احمد رضا لگتا تھا۔ وہ جو بہت سارا رونا چاہتی تھی۔ رو نہیں پائی تھی۔ اب ان آنسوؤں کو راستہ مل گیا تھا۔

"سمیرا، سمو!" مرینہ نے سمیرا کی طرف دیکھا تھا اور تیزی سے اس کے پاس آئی "اتنا چھوٹا دل ہے تمہارا سمیرا۔"

وہ اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو پونچھ رہی تھی۔ جب ہمدان، فلک شاہ کی وہیل چیئر دھکیلتا لاؤنج میں آیا اور اس کی نظریں سمیرا پر پڑیں۔ اس کے دل نے بے اختیار خواہش کی تھی کہ کاش! مرینہ کے بجائے وہ ہوتا اور سمیرا کے آنسوؤں کو اپنی انگلیوں کی پوروں سے چن لیتا۔۔۔ اور کچھ ایسا کرتا کہ ان ہر دم بند رہنے والے ہونٹوں پر ہنسی کے پھول کھل اٹھتے اور نم آنکھوں میں خوشیوں کے چراغ جل اٹھتے۔ کاش! وہ اس لڑکی کا دکھ جان پاتا۔

سمیرا نے مرینہ کا ہاتھ تھام کر آہستگی سے کہا۔

"سوری! بس پتا نہیں کیوں دل پر اس گیت نے اتنا اثر ڈالا۔"

"کہیں تمہاری رخصتی بھی نزدیک تو نہیں ہے سمیرا؟"

منیبہ نے بے اختیار پوچھا اور ہمدان کو لگا جیسے اس کا دل ڈوب جائے گا۔ اس نے چیئر کی پشت کو مضبوطی سے پکڑا۔

"ارے نہیں! سمیرا کی تو ابھی منگنی بھی نہیں ہوئی۔" ہمدان نے ایک گہرا سانس لیا اور دل ہی دل میں مرینہ کا شکریہ ادا کیا۔

"تھینک یو مرینہ! مائی سوئیٹ سسٹر! اس زندگی بخش بات پر میں تمہارا ممنون ہوں بے حد۔" اور تب ہی ثنا کی نظر ان پر پڑی تھی۔

"ارے فلک! تم۔۔۔ اور ہمدان! وہاں کیوں رک گئے ہو؟ آجاؤ نا۔"

فلک شاہ کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی اور آنکھوں میں ایک غم ناک سا تاثر۔ شاید انہوں نے عمارہ کی باتیں سن لی تھیں اور اس کے لیے دکھی ہو رہے تھے۔

یہاں اتنے سالوں بعد آکر وہ بہت خوش تھے۔ عمارہ کے ساتھ سب اس کے اپنے تھے عبدالرحمن شاہ نے کہا تھا۔

"گھر تو انسانوں سے وجود پاتے ہیں مومی بیٹا! اور یہ گھر ہی اب عمارہ کا میکہ ہے۔" یہاں سب تھے۔ گلے شکوے، پرانی یادیں کتنی بار دہرائی جاتی تھیں اور وہ خود سے پوچھتے رہ جاتے تھے۔

"کیا یہاں سب ہیں۔۔۔ کیا شانی کے بغیر عبدالرحمن شاہ کا گھرانہ مکمل ہے؟"

دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں کئی لمحے ایسے آتے تھے کہ زخموں کے ٹانکے ادھڑ جاتے تھے اور وہ بے چین سے دیواروں کے اس پار "الریان" کو دیکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ بند آنکھوں میں "الریان" کے کمرے، لان سب گھوم جاتے۔ وہ شانی کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر "الریان" کے لان میں ٹہلتے۔ زارا کو اونچی پینگ دیتے اور۔۔۔"

"مومی! دیکھو یہ کون آیا ہے آج؟" ثنا نے کہا تو انہوں نے چونک کر دیکھا۔

"کون؟"

"رابی۔۔۔ رابیل احسان۔"

اور ہمدان خود ان کی کرسی دھکیلتا اندر آگیا۔ ساکت بیٹھی رابیل کو حیرت سے دیکھا۔ رابیل کی آنکھوں میں حیرت تھی اور تاسف بھی۔ وہ فلک شاہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"تو کیا عمر اور زبیر نے اسے پھوپھا جان کے متعلق کچھ بھی نہیں بتایا؟"

"تو یہ فلک شاہ ہیں۔ الریان والوں کے موی۔" رابیل کو یہ سنجیدہ اداس آنکھوں والا شخص بہت بے ضرر اور متاثر کن شخصیت کا مالک لگا۔ پھر پتا نہیں کیوں مما اتنے خلاف ہیں ان کے؟ اور مما تو عمارہ پھپھو کے بھی خلاف ہیں۔ حالانکہ یہ وہیل چیئر پر بیٹھا شخص بھلا کسی کو کیا تکلیف پہنچا سکتا ہے۔

"رابیل بیٹا! ادھر آؤ میرے پاس۔" فلک شاہ کی آواز میں شفقت تھی، محبت تھی اور ان کی آنکھوں میں بھی محبت کے وہی رنگ تھے، جو احسان شاہ کی آنکھوں میں اس کے لیے ہوتے تھے۔ وہ بے اختیار اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے قریب آئی تھی فلک شاہ نے اس کے جھکے سر پر پیار کیا۔

"جیتی رہو بیٹا! بہت حسرت تھی تم سب سے ملنے کی۔ عمر اور زبیر سے ملا تو شانی کا پرتو نظر آیا ان میں۔۔۔ تھینک یو بیٹا! تم آئیں ہم سے ملنے۔"

"انکل! مجھے آنا تھا۔ بس طبیعت ٹھیک نہ تھی۔" وہ شرمندہ ہوئی۔

"ارے! کیا ہو گیا تھا ہماری بیٹی کو؟"

"بس! سر میں درد تھا۔"

وہ ان کی چیئر کے سامنے ہی صوفے پر بیٹھ گئی اور فلک شاہ اس سے ہولے ہولے اس کے متعلق پوچھنے لگے اس کی تعلیم، اس کے مشاغل۔ سمیرا نے پاس بیٹھی مرینہ سے درخواست کی۔

"پلیز مرینہ! اب چلیں؟ میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔ تم مجھے چھوڑ کر واپس آجانا۔"

"ہاں! ہاں چلو۔" مرینہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی اور منیبہ کے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے تھوڑا سا جھکتے ہوئے اسے بتایا کہ وہ سمیرا کو "الریان" چھوڑ کر ابھی آرہی ہے اور جھکتے ہوئے اس کی عینک پھسل کر گرنے ہی لگی تھی کہ اس نے اسے ہاتھوں میں سنبھالا۔ عاشی کھلکھلا کر ہنس دی اور فلک شاہ سے ہولے ہولے کچھ بات کرتے ہوئے رابیل نے چونک کر اسے دیکھا۔ منیبہ نے حفصہ کے کندھے پر تھوڑی رکھتے ہوئے سرگوشی کر رہی تھی۔

"فصی! یہ اپنی رابی اس حادثے کے بعد کتنا بدل گئی ہے نا۔۔۔ ہے نا۔"

"ہاں۔" حفصہ نے تائید کی۔

"لیکن اپنی یہ تبدیلی شاید اسے بھی الجھا رہی ہے۔ تم نے دیکھا، کبھی یہ بہت مہربان نظر آتی ہے، پہلی رابی سے بالکل مختلف اور کبھی پہلے سے زیادہ تلخ۔" حفصہ نے بھی مدھم آواز میں تجزیہ کیا۔

حفصہ نے انٹری ٹیسٹ میں ناکام ہونے کے بعد بی ایس سی سائیکالوجی کے ساتھ کر کے پڑھائی چھوڑ دی تھی۔ کبھی کبھی بالکل صحیح تجزیہ کرتی تھی۔

اور ناک پر عینک اچھی طرح جماتے ہوئے مرینہ کو مائرہ چچی کا پیغام یاد آیا تو مڑ کر پیچھے دیکھتے ہوئے اس نے رابیل کو آواز دے کر بتایا کہ مائرہ چچی اسے گھر بلا رہی ہیں۔ تب ہی وہ اندر آتے ایبک ــــــ سے ٹکرا گئی۔

"ارے ایبک بھائی! آپ کہاں گئے تھے؟"

"میں انجی کو شاپنگ کرانے لے گیا تھا۔"

مرینہ اور سمیرا چلی گئیں تو سب انجی کی شاپنگ دیکھنے لگے۔ جبکہ ایبک فلک شاہ کی طرف بڑھا اور ایک نظر فلک شاہ کے قریب بیٹھی رابیل پر ڈالی۔

"کیسی ہیں آپ؟"

"فائن!" رابیل نے آہستگی سے کہا۔ ایبک، فلک شاہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"بابا! کیا بات ہے آپ ٹھیک تو ہیں نا۔"

"ہاں۔" انہوں نے سر ہلایا۔ لیکن ایبک کو جیسے یقین نہ آیا تھوڑا سا جھکتے ہوئے ان کا ہاتھ تھام کر اس

نے بغور انہیں دیکھا۔

"نہیں بابا! آپ مجھے ٹھیک نہیں لگ رہے۔"

"ٹھیک ہوں یار!" ایک افسردہ سی مسکراہٹ ان کے لبوں پر بکھری۔ لیکن ایبک بے یقینی سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

"میری جان! قریب آکر دور رہنے کا عذاب کیا ہوتا ہے۔ کیا تم نہیں جان سکتے؟" بے حد آہستگی سے انہوں نے کہا۔

ایک گہری سانس لیتے ہوئے ان کا ہاتھ چھوڑ کر وہ سیدھا ہو گیا۔

"بہت سی باتیں انسان کے اختیار میں نہیں ہوتیں بابا اور وقت کے ساتھ خود بخود بہت سی باتیں درست ہو جاتی ہیں۔"

"کیا اللہ کو مجھ سے پھر کوئی آزمائش مقصود ہے ایبک؟"

"بابا! آپ کیوں پریشان ہوتے ہیں؟ سب ٹھیک ہو جائے گا ان شاء اللہ۔"

اس نے ان کا بازو تھپتھپایا اور رابیل کی طرف دیکھا۔ جو انجی کی شاپنگ سے بے نیاز ان کی مدھم گفتگو کو سمجھنے کی کوشش میں بار بار ان دونوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"آپ کو شاپنگ سے کوئی دلچسپی نہیں رابیل؟"

"ہاں ہے۔" رابیل نے چونک کر ایبک کے چہرے سے نظریں ہٹائیں اور حفصہ کی طرف دیکھنے لگی۔ جو انجی کے لائے ڈریس خود سے لگا کر دیکھ رہی تھی۔

"ایبک! تمہاری چوائس بہت اچھی ہے۔" منیبہ نے قمیص تہہ کرتے ہوئے ایبک کی طرف دیکھا۔

"دریں چہ شک است" (اس میں کیا شک ہے۔) ایبک صوفے پر بیٹھ گیا۔

"یہ اس بیگ میں کیا ہے؟ یہ تو دکھایا ہی نہیں تم نے۔" حفصہ کی نظر اس بیگ پر پڑی، جو انجی نے ایک طرف رکھ دیا تھا۔ سب ہی ادھر دیکھنے لگے۔

"یہ۔" انجی نے سٹپٹا کر ایبک کو دیکھا۔ "یہ ایبک بھائی کا ہے۔"

"اچھا! ایبک بھائی نے بھی کچھ خریدا ہے اپنے لیے۔" منیبہ تہہ شدہ ڈریس واپس شاپنگ بیگ میں رکھ چکی تھی۔

"دکھاؤ! کیا لیا ہے؟"

"اپنے لیے نہیں۔ کسی کا ہے۔"

"کسی کو گفٹ دینا ہے کیا؟" عاشی نے پوچھا تو ایبک نے بے اختیار سر ہلا دیا۔

"کوئی لڑکی ہے کیا؟" عاشی کو کسوٹی کسوٹی کھیلنے کا بہت شوق تھا۔

"اتنے ذاتی سوال نہیں پوچھتے گڑیا رانی!"

ایبک مسکرایا اور رابیل کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔

"ویسے اتنے پاپولر ہو ایبک! لڑکیاں تو بہت دوست ہوں گی تمہاری۔"

یہ بات صرف مرتضیٰ کی بیوی ہی کر سکتی تھیں۔ وہ اتنے سالوں سے فرانس میں رہ رہی تھیں۔ ایبک جھینپ گیا۔

"نہیں تو ممانی جان! ایسی کوئی خاص دوست نہیں ہیں۔ وقت نہیں ہوتا میرے پاس۔"

"ایک تو خاص ہو گی نا۔" وہ ہنسیں اور رابیل کا جی چاہا کہ وہ کہہ دے کہ "نہیں! کوئی ایک بھی خاص نہیں ہے۔"

لیکن ایبک نے ایسا کچھ نہیں کہا۔ بلکہ اس کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ بکھر کر معدوم ہو گئی۔

"ہر ایک کی زندگی میں کوئی تو خاص ہوتا ہی ہے۔" منیبہ نے فلسفہ جھاڑا۔

"اور ایبک کی زندگی میں بھی وہ ایک خاص ہو گی، جو ان کی شریک زندگی بنے گی۔"

"اللہ وہ وقت جلد لائے۔" عمارہ کے لبوں سے نکلا۔

"ایبک بھائی کی شادی تو بہاول پور میں ہو گی نا۔ پھر ہم سب وہاں آئیں گے۔ خوب مزا آئے گا۔" عاشی نے خوش ہو کر کہا۔

"ہاں! ضرور، سب آنا۔ دعا کرو! اللہ یہ دن جلد لائے۔"

"کیا ایبک بھائی کی دلہن بہاول پور میں ہے خالہ۔"

"وہیں ہی کہیں آس پاس تلاش کر لیں گے گڑیا! اب اتنی دور لاہور آنے سے تو رہے۔" ایبک نے اس کے بال بکھرائے اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"بابا جان آرام کر رہے ہیں کیا؟"

"سو گئے تھے۔ جب میں انکل کو لے کر باہر آیا تھا۔"

اتنی دیر میں ہمدان نے پہلی بار بات کی تھی۔ انجی اپنے بیگ سمیٹ کر کھڑی ہو گئی۔

"میں یہ سب سامان کمرے میں رکھ کر آتی ہوں۔"

"جلدی آنا۔ یہاں تو گانے کی محفل جمی تھی۔ ثنا چچی گا رہی تھیں اور عمارہ پھپھو نے ڈھولکی بجائی تھی۔"

"اچھا۔!" انجی کو حیرت ہوئی۔

"رابیل بیٹا! آپ کی ممی نے بلایا تھا۔" فلک شاہ نے جو بہت دیر سے رابیل کے چہرے کے تاثرات دیکھ رہے تھے، کہا تو رابیل نے چونک کر انہیں دیکھا۔

"ہاں! چلتی ہوں۔" وہ کھڑی ہو گئی۔ کھڑے ہونے سے پہلے اس کی نظریں ایک بار پھر ایبک کی طرف اٹھی تھیں۔ فلک شاہ ادھر ہی دیکھ رہے تھے۔

اس کی نظروں میں کیا تھا ایسا۔ اس کے چہرے کے بدلتے تاثرات کیا بتا رہے تھے۔

"کیا تاریخ اپنے آپ کو دہرائے جا رہی ہے۔" وہ سوچ میں پڑ گئے۔

"نہیں۔" انہوں نے ہولے سے سر جھٹکا۔ "یہ میرا وہم بھی تو ہو سکتا ہے۔ ایبک، اریب کو پسند کرتا ہے۔" اریب انہیں بھی بہت اچھی لگی تھی۔ "ایبک کے لیے ایسی لڑکی ہی ہونی چاہیے تھی۔ سادہ، بے ریا اور معصوم سی۔"

اگرچہ اریب فاطمہ ان کے آنے کے بعد دوسرے دن ہی گاؤں چلی گئی تھی اور ان کی ملاقات اس سے ذرا دیر کے لیے ہوئی تھی۔ لیکن اس ذرا سی دیر میں ہی انہوں نے اریب فاطمہ کو جان لیا تھا کہ ایبک ایسی ہی لڑکی کے ساتھ خوش رہ سکتا ہے۔

"بیٹھ جاؤ نا آپی! کھڑے کیوں ہو۔" ہمدان نے اسے مخاطب کیا تو فلک شاہ چونکے اور انہوں نے رابیل کے چہرے سے نظریں ہٹالیں۔

"نہیں یار! میں بس جا رہا ہوں۔ کچھ ضروری کام ہے۔ رات کو چکر لگاؤں گا۔"

"تم یہیں کیوں نہیں آجاتے آپی؟ جب تک پھپھو اور مومی انکل یہاں ہیں، تم بھی یہیں رہو۔"

"آجاؤں گا ایک، دو روز تک۔" اس نے فلک شاہ کی طرف دیکھا۔ "بابا جان اگر جاگ رہے ہیں تو میں ان سے مل کر چلوں گا۔ رات کو پھر ملاقات ہوتی ہے۔"

"ٹھیک ہے! مجھے بھی لے چلو۔ میں کچھ گھبراہٹ محسوس کر رہا ہوں۔" فلک شاہ نے آہستگی سے کہا تو ایبک نے ان کی وہیل چیئر کی پشت پر ہاتھ رکھتے ہوئے رابیل کی طرف دیکھا۔ جو ابھی تک کھڑی تھی۔

"احسان ماموں کی طبیعت کیسی ہے اب؟"

"ٹھیک ہیں۔ آج صبح سے کہیں گئے ہوئے ہیں۔" رابیل نے بتایا۔

اور ایبک فلک شاہ کی چیئر کو دھکیلتا ہوا ان کے کمرے میں آگیا۔ اس کے لاؤنج سے نکلتے ہی منیبہ نے ہمدان کو ڈھولکی بجانے پر لگا دیا ہمدان نے ڈھولکی سنبھال لی۔

"رابی! چچی جان کی بات سن کر آجانا۔ دیکھو نا! یہاں کتنا مزا آرہا ہے۔"

رابیل نے لاؤنج سے باہر نکلتے ہوئے منیبہ کی بات سنی۔

"یہ محفل "لریان" میں بھی تو سجائی جا سکتی تھی۔ بلکہ "لریان" میں ہی سجنی چاہیے تھی۔ لیکن۔"

بات ادھوری چھوڑ کر وہ چلی گئی۔ عمارہ نے بے حد شدت سے اس کی بات محسوس کی۔ اس کا لہجہ تو نارمل تھا۔ لیکن اس میں چھپی تلخی نے عمارہ کو شرمندہ کر دیا۔ صرف ان کی وجہ سے مائرہ اور وہ حفصہ کی

شادی کو انجوائے نہیں کرپارہے تھے۔
"ثنا! میرا خیال ہے کہ یہ سب تم "الریان" میں ہی کرو۔ ہم تو یہاں مہمان ہیں اور مہمانوں کے لیے اتنا تردد۔" وہ کھڑی ہو گئیں۔
"بکو مت۔" ثنا چچی نے عمارہ کا ہاتھ پکڑ کر بٹھایا۔
"رالی کی باتوں کا برا مت مانو عمو! وہ یوں ہی بلا سوچے سمجھے بول دیتی ہے۔"
"نہیں! میں نے برا نہیں مانا۔ لیکن وہ صحیح کہہ رہی تھی کہ۔۔۔"
"بس اور کچھ مت کہنا عمارہ! ہاں ہومی! اچھا سا گیت گاؤ۔ کوئی خوشی کا۔" وہ ہمدان کی طرف متوجہ ہو گئیں۔
اور ہمدان نے سچ مچ ہی ایسا گانا شروع کردیا تھا کہ سب کے لوگوں پر مسکراہٹ آگئی۔
میرا یار بنا ہے دولہا اور پھول کھلے ہیں دل کے
میری بھی شادی ہوجائے ' دعا کرو سب مل کے
"آمین۔۔۔ آمین کی آوازوں سے لاؤنج گونجنے لگا تھا۔ ہنسی' شور' مذاق' لاؤنج میں ایک بار پھر زندگی مسکرا اٹھی۔
اور اندر بیڈ روم میں ابیک' فلک شاہ کے پاس بیٹھا پوچھ رہا تھا۔
"بابا! آپ بہت ڈیپریس ہیں۔۔۔ کیوں؟"
"بتایا تو تھا یار! قریب رہ کر دوری کا عذاب سہنا بہت مشکل ہے۔ ہر روز سوچتا ہوں' شاید آج رات وہ آجائے۔ رات ہوتی ہے تو صبح اس امید پر جاگتا ہوں کہ شاید آج صبح وہ ساری ناراضیاں بھلا کر گلے سے آکر لگ جائے۔ دیوار کے اس طرف وہ بڑے اطمینان سے سوتا ہے اور میں۔۔۔ پوری نیند سو نہیں پاتا۔ اتنے قریبی' اتنے عزیز لوگ بھی یوں لمحوں میں اجنبی بن جاتے ہیں۔ یقین نہیں آتا۔"
"بابا! سچ کبھی نہ کبھی ضرور ظاہر ہوتا ہے۔ وہ وقت بھی ضرور آئے گا۔ آپ یقین رکھیں۔"
"ایسا کرو آبی! کچھ دنوں کے لیے مجھے شیر دل کی طرف لے چلو۔"
"ٹھیک ہے بابا! ابھی لے چلتا ہوں۔"
"نہیں! ابھی تو کوئی بھی گھر پر نہیں ہے۔ بابا جان بھی سو رہے ہیں۔ رات بابا جان سے بات کرلوں گا تو صبح چلیں گے۔"
"سنو آبی! ایک بات پوچھوں۔"
"جی بابا! پوچھیے نا۔"
"یہ جو رابیل ہے' احسان کی بیٹی۔ یہ تمہیں پسند کرتی ہے کیا؟"
"ارے نہیں بابا۔" ابیک بے اختیار ہنس پڑا۔
"رالی اور مجھے پسند کرے؟ ناممکن ہے بابا! مائرہ آنٹی اور وہ مجھے سخت ناپسند کرتے ہیں۔ رابیل کا بس چلتا تو وہ میرے "الریان" میں داخلے پر پابندی لگادیتی۔"
اور رابیل جو لان سے یہ سوچ کر پلٹ آئی تھی کہ اتنے دن ہوگئے اسے بابا جان سے ملے اور یہ کتنی غلط بات تھی کہ ملک ہاؤس میں آکر بھی وہ بابا جان سے نہ ملے۔
ابیک کی بات سن کر وہیں دروازے پر ٹھٹھک کر رک گئی۔ کچن کی طرف پانی پینے جاتی عاشی نے اسے بتایا تھا کہ بابا جان اس کمرے میں ہیں۔
"تو ابیک ایسا سمجھتا ہے" ناب پر ہاتھ رکھے رکھے اس نے سوچا۔
"اور کچھ غلط بھی تو نہیں سمجھتا۔" اس نے دل ہی دل میں کہا۔ "ابیک جب "الریان" میں آتا تھا۔ سب اس کے گرد اکٹھے ہوجاتے تھے اور اس کے جانے کے بعد بھی عمر اور منیبہ اس کے قصیدے پڑھتے رہتے تو وہ بہت چڑتی تھی ابیک سے اور اسے عمر کا اس کی تعریف کرنا زہر لگتا تھا۔ لیکن اب۔۔۔ اب۔۔۔"
اس کا دل بہت تیزی سے دھڑکا۔
اب ابیک فلک شاہ نے جانے کب بہت خاموشی سے اس کے دل میں جگہ بنالی تھی۔ اسے پتا بھی نہیں چلا تھا اور دل اس کے نام پر دھڑک اٹھتا تھا۔ وہ "الریان" میں آتا تو اس کا بھی دل چاہتا کہ وہ بھی اس سے جاکر باتیں کرے اور ابیک اس سے بھی اتنی ہی بے تکلفی سے بات کرے۔ جیسے باقی سب سے کرتا

ہے۔ لیکن وہ جھجک جاتی۔
"ابیک ایسا ہے کہ اس کی ہمراہی کی خواہش کوئی بھی لڑکی کرے۔" منیبہ کی اس بات کا اس نے دل ہی دل میں کتنی بار اعتراف کیا تھا۔ حالانکہ جب منیبہ نے یہ بات کہی تھی تو اس نے کتنا مذاق اڑایا تھا۔
"بھلا کیا ہے ایسا خاص ابیک میں؟ اس سے زیادہ خوب صورت اور اسمارٹ لڑکے ہماری یونیورسٹی میں بھرے ہوئے ہیں۔"
"جب آنکھوں کے سامنے نفرتوں کی دبیز چادر ہو تو اس کے پار سے کچھ نظر نہیں آتا۔"
منیبہ ان دنوں ابیک کی بہت وکالت کرتی تھی اور "الریان" کے باقی سب لوگ اس کی تائید کرتے تھے۔ ان دنوں پہلی بار تو "الریان" والوں نے اپنے اس کزن کو دیکھا تھا اور کزن بھی وہ' جو ایک مشہور شخصیت تھا اور جسے جانے بغیر ہی عمر اور زبیر اس پر فدا تھے۔
"بھلا مجھے کیوں نفرت ہوگی۔ ایک ایسے بندے سے جسے دوسری یا تیسری بار دیکھ رہی ہوں۔" تب اس نے کہا تھا۔
"یہ تو خود سے پوچھو رابیل احسان شاہ!" منیبہ کہہ کر چلی گئی تھی اور اسے خود سے پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ جانتی تھی کہ مائرہ' ابیک' فلک شاہ اور عمارہ سے نفرت کرتی ہے اور یہ نفرت اس نے رابیل میں بھی منتقل کردی تھی۔
اس نے ناب سے ہاتھ ہٹالیا اور بابا جان سے ملے بغیر ہی واپس مڑ گئی۔ ایک لمحہ کو اس کا جی چاہا تھا کہ وہ اندر جاکر ابیک سے کہے کہ وہ اس کو ناپسند نہیں کرتی۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ وہ یہ نہیں کہہ سکتی۔ کم از کم اس وقت نہیں۔ لیکن ایک دن وہ ضرور اسے بتائے گی کہ وہ اسے ناپسند نہیں کرتی۔
بلکہ۔۔۔

☼ ☼ ☼

مائرہ نہ جانے کتنی دیر سے لاؤنج میں ٹہل رہی تھیں۔ ٹہلتے ٹہلتے تھک جاتیں تو بیٹھ جاتیں۔

"یہ رابی کی بچی تو وہاں جا کر بیٹھ ہی گئی ہے۔ کیا کروں۔" تب ہی اندرونی دروازے پر دستک ہوئی۔ تیز تیز چلتے ہوئے انہوں نے جا کر دروازہ کھولا اور رابیل کو دیکھ کر اطمینان بھری سانس لی۔

"خیریت تھی ماما! آپ نے کیوں بلایا تھا؟ سر درد زیادہ تو نہیں ہو گیا؟" لاؤنج میں آ کر رابیل نے پوچھا تو مائرہ غصے سے بولیں۔

"تمہیں میری خیریت کی اتنی ہی فکر ہے۔ تب ہی پیغام ملتے ہی بھاگی چلی آئیں۔"

"ماما پلیز! اس طرح مت کہا کریں۔ آپ کیوں چاہتی ہیں کہ میں عمارہ پھپھو اور ان کی فیملی سے نہ ملوں، نہ بات کروں، عمارہ پھپھو بہت اچھی ہیں۔ انجی اتنی کیوٹ سی ہے۔ پہلی بار میں نے اسے دیکھا ہے اور انکل موی، کتنی زبردست پرسنالٹی ہے ان کی، اس عمر میں بھی ان کی شخصیت میں کتنی کشش ہے۔"

"بس کرو رابی! میں نے تمہیں ان کا قصیدہ پڑھنے کے لیے نہیں کہا۔"

"میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے۔ آپ کو عمارہ پھپھو کے خلاف ہی باتیں کرتے سنا ہے۔ آخر انہوں نے ایسا کیا، کیا ہے آپ کے ساتھ؟ آپ کو ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔"

رابیل صوفے پر بیٹھ گئی۔ مائرہ دکھ اور تاسف سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

"رابی! میرا منہ نہ کھلواؤ تم۔۔۔ ورنہ۔۔۔"

"ٹھیک ہے ماما! لیکن یہ جو آپ نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنا رکھی ہے نا، اس سے ہم سب ڈسٹرب ہو رہے ہیں۔"

"اچھا۔۔۔" مائرہ کی آنکھوں میں تمسخر نظر آیا۔

"عمارہ پھپھو اور موی انکل اس گھر میں نہیں آ سکتے۔ ان کی مجبوری ہے تو ہمیں ان کی مجبوری سے سمجھوتا کرنا چاہیے۔ گھر کے سب افراد اگر اس بات کو سمجھ رہے ہیں تو آپ بھی سمجھیں نا۔۔۔ پتا ہے انکل فلک شاہ مجھ سے کہہ رہے تھے۔"

"مت نام لو اس شخص کا میرے سامنے۔" مائرہ نے بمشکل اپنے غصے پر قابو پایا تھا۔ "اور اپنے باپ کے سامنے بھی مت ذکر کرنا اس کا۔"

رابیل نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا اور پھر خاموش ہو گئی۔ مائرہ کچھ دیر اسے دیکھتی رہیں۔ پھر اس کے پاس بیٹھ گئیں۔

"ضروری نہیں ہے رابی بیٹا! کہ ہر بات تمہیں بتائی جائے۔ ہم نے تمہیں حفصہ اور عادل کی خاطر وہاں جانے کی اجازت دی ہے تو یہ کافی ہے۔ انجی یا عمارہ کی فیملی سے پریت بڑھانے کی ضرورت نہیں ہے تمہیں۔"

رابیل خاموش رہی۔ وہ جانتی تھی کہ مائرہ سے کچھ کہنا بے کار ہے۔ "لیکن میں بابا جان سے ضرور پوچھوں گی کہ آخر ماما، پاپا اور انکل فلک شاہ میں کیا ناراضی اور جھگڑا ہے۔" یہ ضروری تھا کہ اسے حقیقت کا علم ہو۔ "میں بابا جان سے کہوں گی کہ وہ دونوں کے درمیان صلح کروا دیں اور پھر میں ابیک کو بتاؤں گی کہ میں اسے ناپسند نہیں کرتی۔ بلکہ۔۔۔"

لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہو کر معدوم ہو گئی۔

مائرہ جو اسے بغور دیکھ رہی تھیں۔ اس کی مسکراہٹ پر چونکیں انہوں نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے نرمی سے کہا۔

"رابی! میں نے تمہیں کسی بات پر غور کرنے کے لیے کہا تھا۔"

"کون سی بات ماما؟" رابیل نے بے دھیانی سے ان کی طرف دیکھا۔

"میں نے تمہیں ہمدان کے متعلق سوچنے کے لیے کہا تھا۔ دیکھو! وہ۔۔۔"

"ماما! میں آپ کو پہلے ہی بتا چکی ہوں کہ مجھے ہمدان سے شادی نہیں کرنا۔"

"ہاں۔۔۔ لیکن میں نے تمہیں کہا تھا کہ ایک بار پھر سوچنا۔"

"ہزار بار بھی سوچوں تو میرا جواب "نہ" ہی ہو گا۔ ماما! مجھے ہمدان سے شادی نہیں کرنا ہے بس۔"

"تو کیا کسی اور سے شادی کرو گی؟" مائرہ کو اپنے غصے

پر تو کبھی قابو نہیں رہا تھا۔

"اگر میں کہوں ہاں۔۔۔ تو پھر؟"

"کون ہے وہ؟"

مائرہ کو اپنی آواز خود دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

"وقت آنے پر بتا دوں گی۔"

رابیل نے اپنے بازو پر سے ان کا ہاتھ ہٹایا اور تیزی سے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ مائرہ صوفے پر ساکت بیٹھی اسے سیڑھیاں چڑھتے دیکھ رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"میرا یار کیسا ہے ابیک بیٹے؟"

کرنل شیر دل نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو ابیک نے، جو ٹیکسی کا لاک کھول رہا تھا، مڑ کر ان کی طرف دیکھا۔

"بابا بہت ڈپریس ہو رہے ہیں۔ کہہ رہے تھے کہ آپ کی طرف لے چلوں۔"

"ڈپریس تو ہو گا ہی نا۔ اس شہر میں آنا اس کے لیے کون سا آسان رہا ہو گا۔ اس شہر کی سڑکوں نے سیکڑوں بار اس کے قدم چومے ہوں گے۔ کیسے کیسے نہ دل مچلتا ہو گا اس کا کہ پہلے کی طرح وہ شانی کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر بے مقصد ان سڑکوں پر گھومے۔ آدھی رات کو اٹھ کر کافی پینے جائے۔ حق نواز کے ساتھ سڑکوں پر مارچ کرتے ہوئے پاکستان کی بقا کے لیے نعرے لگائے۔"

"ارے!" ابیک نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

"آپ تو بابا کی طرح باتیں کر رہے ہیں۔ بالکل یہ ہی کچھ بابا بھی محسوس کرتے ہیں۔"

"اس شہر نے جہاں میرے دوست کو بہت کچھ دیا۔ وہاں بہت کچھ چھین بھی لیا۔"

"آئیے نا انکل! اندر چل کر بیٹھتے ہیں۔"

"میں چلوں، تمہاری آنٹی کو بتا دوں فلک شاہ کے آنے کا۔ فارغ ہے کئی دنوں سے۔ ذرا کچھ مصروف ہو جائے گی کچن میں۔"

کرنل شیر دل وہیں سے واپس مڑ گئے ابیک نے صوفے پر بیٹھ کر جوتے اتارے اور ٹانگیں پھیلا کر صوفے کی پشت سے ٹیک لگائی اور آنکھیں موند لیں۔ اس کی بند آنکھوں کے سامنے اریب فاطمہ کا سراپا لہرانے لگا۔ اس کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ بکھیر گئی۔

"محبت پر اتنی کہانیاں لکھنے کے باوجود میں سچ میں نہیں جانتا تھا کہ محبت کیا ہوتی ہے اور یہ تو میں نے اب جانا ہے۔۔۔ پتا نہیں اریب فاطمہ کب واپس آئے گی۔ لگتا ہے جیسے اسے دیکھے ہوئے صدیاں ہی گزر گئی ہوں۔"

اس روز جب وہ "الریان" کے لونگ روم میں بیٹھا تھا اور عاشی نے آ کر خبر دی تھی کہ اریب فاطمہ جا رہی ہے تو وہ ایک دم چونکا تھا اور اس کے لبوں سے نکلا تھا۔

"کہاں۔۔۔ کہاں جا رہی ہے؟" اور پھر اپنی ہی بے اختیاری محسوس کر کے اس نے وہاں موجود سب لوگوں کی طرف چور نظروں سے دیکھا تھا۔ لیکن کسی کا دھیان اس کی طرف نہیں تھا۔ وہ سب حفصہ کے ولیمے کے ڈریس کے ڈیزائن پر ڈسکس کر رہے تھے اور ایسے میں کسی نے عاشی کی بات نہیں سنی تھی۔

وہ اس کے پاس ہی صوفے پر بیٹھ گئی تھی اور اسے بتا رہی تھی کہ اریب فاطمہ اپنے اماں، ابا سے ملنے گاؤں جا رہی ہے۔ ایک ہفتے کے لیے۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

مصباح خادم

وہ آج کل زور و شور سے اپنے بڑے بیٹے کے لیے رشتے کی تلاش میں سرگرداں تھی۔ اس کے بیٹے نے حال ہی میں ماسٹرز ان بزنس ایڈمنسٹریشن کی ڈگری گولڈ میڈل کے ساتھ حاصل کی تھی اور اب والد کے ساتھ ان کے کاروبار کو ترقی دینے میں مصروف تھا۔

ہر ماں کی طرح بیٹے کے اپنے پیروں پر کھڑے ہوتے ہی مہرین کے دل میں بھی اس کی شادی کا ارمان جاگ اٹھا تھا اور اسی ارمان کی تکمیل کے لیے وہ آج کل دن رات ایک کیے ہوئے تھی۔ مگر باوجود تلاش بسیار کے اسے ابھی تک کوئی لڑکی اپنے قابل اور ہونہار بیٹے کے لیے پسند نہیں آئی تھی۔

تب ہی اس کی ایک جاننے والی نے اسے ایک لڑکی کی تصویر دکھائی۔ معصومیت اور خوب صورتی کا دلکش امتزاج لیے وہ اسے پہلی ہی نظر میں بھاگئی تھی ۔۔۔ اور پھر انگریزی ادب میں ماسٹرز بھی کر رکھا تھا۔ جاننے والی نے بھی لڑکی اور اس کے گھرانے کی خوب تعریف بھی کی تھی۔ بقول اس کے خاصے مہذب اور رکھ رکھاؤ والے لوگ تھے۔

اسی مقصد کے لیے وہ آج اپنی اکلوتی بیٹی کے ساتھ ان کے گھر جارہی تھی۔ اگر معاملہ جم جاتا تو اپنے بیٹے کے ساتھ اس کی جوڑی اسے خوب جچتی نظر آرہی تھی۔

گاڑی محلے کی ایک تنگ سی گلی میں داخل ہوئی تو سڑک پر پڑے گڑھے سے لگنے والا جھٹکا اسے سوچوں کی آماجگاہ سے واپس کھینچ لایا۔ اس نے چونک کر شیشے کے پار نظر آتے گھروں پر نظر ڈالی۔ سفید پوشی کا بھرم لیے یہ ایک مڈل کلاس محلہ تھا۔ جس کے بارے میں اسے پہلے ہی آگاہ کر دیا گیا تھا۔ مگر اسے لڑکی اتنی پسند آئی تھی کہ اس چیز سے اسے کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔۔۔ اور ویسے بھی اس کے نزدیک متوسط طبقے سے ہونا اتنی قابل گرفت بات نہیں تھی۔ آخر کو وہ خود بھی تو اسی طبقے سے تعلق رکھتی تھی۔

"ممی! چلیں ۔۔۔" اس کی بیٹی نے اسے متوجہ کیا تو وہ ڈرائیور کے کھولے دروازے سے باہر نکل آئی۔

مطلوبہ گھر کا نقشہ بھی باقی گھر والوں سے مختلف نہیں تھا ۔۔۔ مگر دلوں کی وسعت نے باقی ہر کمی کو پس پشت ڈال دیا۔

ان لوگوں نے بہت پرتپاک انداز میں ان کا خیر مقدم کیا۔ گھر چھوٹا ضرور تھا۔ مگر قرینے سے کی گئی سیٹنگ کی وجہ سے کافی کھلا کھلا محسوس ہو رہا تھا۔ پردوں سے چھن چھن کر آتی روشنی میں چمکتی ہر چیز خواتین کی نفاست اور سلیقہ شعاری کا منہ بولتا ثبوت تھی ۔۔۔ لڑکی کی ماں کا انداز بھی خاص مہذب اور دھیما سا تھا۔ لڑکی چائے لے کر آئی تو وہ بھی اسے اپنی ماں کا ہی عکس لگی۔

رشتہ ہر لحاظ سے اسے پسند آگیا تھا۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ اس کا عندیہ میزبانوں کو دیتی، موٹر سائیکل کی تیز آواز نے اس سمیت سب کو اپنی جانب متوجہ کر لیا۔

"امی! ابو آگئے ہیں۔" لڑکی کی چھوٹی بہن نے اطلاع دی اور ساتھ ہی کوئی شخص ہاتھوں میں شاپرز لیے ٹی وی لاؤنج میں داخل ہوا۔

"یہ میرے شوہر ہیں ۔۔۔ عادل۔" خاتون کے رسم تعارف نبھانے پر اس نے مسکرا کر اس سمت دیکھا اور چونک گئی۔ پہچان لینا مقابل کے لیے بھی کچھ مشکل نہیں تھا۔

ماضی کے تند و تیز جھونکے نے ایک پل کے لیے دونوں کی سوچوں میں اودھم مچایا ۔۔۔ یادوں کی کتاب کے ورق الٹے۔ گزرا وقت کسی فلم کی طرح آنکھوں کی اسکرین پر جگمگایا۔ مگر صرف ایک پل کے لیے ۔۔۔ اور پھر سب کچھ نارمل ہو گیا۔

عادل شاپرز بیٹی کو پکڑاتے آگے بڑھا اور مصنوعی خوش اخلاقی سے بولا۔

"معافی چاہتا ہوں بیگم اخلاق! مجھے کچھ دیر ہو گئی۔ دراصل ایک دوست کے بیٹے کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا تو ایمرجنسی میں جانا پڑا۔"

"کوئی بات نہیں عادل صاحب! ہمیں بھی زیادہ دیر نہیں ہوئی آئے ہوئے۔" مہرین نے بھی اسی بناوٹی

خوش اخلاقی سے جواب دیا۔
ان دونوں کے انداز میں وہی مخصوص گریز تھا جو کسی اجنبی سے بات کرتے خود بخود لہجے میں آجاتا ہے۔ چہروں پر رسمی سی مسکراہٹ۔۔۔ انہیں دیکھ کر کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ وہ ماضی میں ایک دوسرے کے لیے کیا رہ چکے ہیں۔۔۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ کبھی وہ ایک دوسرے پر جان دیتے تھے۔ اس حد تک عشق میں پاگل ہو چکے تھے کہ ایک دوسرے کی خاطر گھر سے بھاگنے تک کے لیے تیار ہو گئے تھے۔

☼ ☼ ☼

مہرین ان دنوں ایف ایس سی کے سیکنڈ ایئر میں تھی جب عادل کے گھر والے ان کے بالکل سامنے والے مکان میں کرائے دار کی حیثیت سے شفٹ ہوئے۔ انہوں نے گھر پر میلاد رکھوایا۔ جس میں قریبی پڑوسی ہونے کے ناتے مہرین بھی اپنے گھر والوں سمیت مدعو تھی۔

اسی میلاد میں عادل نے پہلی بار مہرین کو دیکھا تھا اور اپنی حسن پرست فطرت سے مجبور ہو کر اس نازک حسینہ کو دل دے بیٹھا۔ بار بار خود پر پڑتی گہری نظروں کے ارتکاز نے مہرین کو بھی چونکنے پر مجبور کر دیا۔ لیکن اصل کہانی تب شروع ہوئی، جب ایک دن چھت پر چہل قدمی کے دوران اکیلا پا کر عادل نے ایک کاغذ پتھر پر لپیٹ کر اس کی طرف اچھالا۔ چھتوں کے درمیان ایک چھوٹی سی سڑک ہی تھی۔ لہٰذا پتھر نے بغیر کسی رکاوٹ کے ایک اچھے محافظ کی طرح کاغذ مہرین کے قدموں میں لا ڈالا۔ مہرین نے چونک کر سامنے والی چھت پر نگاہ کی۔

وہ اسی کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ ندا نے جھجکتے ہوئے کاغذ اٹھا لیا اور کھول کر دیکھا۔ جہاں خوب صورت لکھائی میں موتیوں جیسے لفظ محسن نقوی کی زبانی دل کی تمام حکایتیں بیان کر رہے تھے۔

تیرے خیال سے دامن بچا کے دیکھا ہے
دل و نظر کو بہت آزما کے دیکھا ہے
نشاط جاں کی قسم تو نہیں تو کچھ بھی نہیں
بہت دنوں تجھے ہم نے بھلا کے دیکھا ہے

اتنا خوب صورت اظہار۔۔۔ مہرین نے بے اختیار لرزتی پلکیں اٹھا کر دیکھا تو وہ اپنی مخصوص جان لیوا مسکراہٹ چہرے پر سجائے اور آنکھوں میں چمکتے ستاروں کا ایک جہان آباد کیے ہنوز اسی پر نظریں مرکوز کیے ہوئے تھا۔

مہرین کے دل کی دنیا اتھل پتھل ہونے لگی۔۔۔ اور اس میں اس کی خطا بھی کیا تھی۔ وہ ایسا تو ہرگز نہ تھا کہ نظر انداز کیا جاتا۔ اس کی شان دار شخصیت تو ہمیشہ سے ہی لڑکیوں کی توجہ کا مرکز رہی تھی اور وہ بھی تھی تو ایک عام سی لڑکی ہی ناں! پھر جب وہ خود اپنے تمام تر قاتل اسباب کے ساتھ اس کے سامنے جھک گیا تھا تو وہ کیسے نہ اس کے سحر میں گرفتار ہوتی۔ نتیجتاً" جوانی کے بے مہار جذبوں نے بچپن کی منگنی کو فراموش کر کے اسے عادل کے سنگ نئی راہوں کا مسافر بنا دیا۔

اور پھر تو یہ جیسے روز کا معمول ہی بن گیا۔ وہ دونوں گھر والوں سے نظریں بچا کر چھت پر آتے تو۔ کاغذ اور پنسل ہمراہ لانا کبھی نہیں بھولتے تھے۔

ان دنوں موبائل فون جیسی آفت کی، جو آج کل لڑکے لڑکیوں میں نام نہاد محبتیں پروان چڑھانے میں خاصی معاون ثابت ہوتی ہے، کسی کو خبر نہیں تھی۔ تار والا فون بھی کھاتے پیتے گھرانوں میں ہی پایا جاتا تھا۔ پھر اس میں پکڑے جانے کا بھی ڈر تھا۔ ایسے میں رابطے کا یہ طریقہ دونوں کو ہی بے حد پسند تھا۔ نہ جانے کتنی کتنی دیر پتھر کاغذوں کے پر لگائے یہاں سے وہاں اڑتے پھرتے۔۔۔ اور وہ باتیں بھی جو آنکھوں میں دیکھ کر کہنی مشکل لگتی تھیں، کاغذ پر اتار کر با آسانی ایک دوسرے تک پہنچا دی جاتی تھیں۔۔۔ پھر گھر والوں میں سے کسی کی صدا لگتی تو دونوں ہڑبڑا کر ایک دوسرے کو بھیجے گئے کاغذوں کے پرندے ہتھیلیوں کے پنجرے میں قید کرتے اور مسکراہٹ اچھالتے سیڑھیوں کی طرف بڑھ جاتے۔

ملاقات بھی کبھی کبھار ہو ہی جاتی تھی۔ عادل کی چھوٹی بہن بھی مہرین کے کالج میں فرسٹ ایئر کی طالبہ تھی۔۔۔ اور اسے لانے لے جانے کی تمام ذمہ داری عادل ہی کے سپرد تھی۔۔۔ مگر جب کبھی وہ چھٹی کرتی، تب بھی عادل کی اسکوٹر کالج کے باہر موجود ہوتی۔۔۔ اور اس دن بھی پچھلی سیٹ خالی نہیں ہوتی تھی۔ بس سواری بدل جاتی اور وہ دونوں ہوا سے باتیں کرتے کسی محفوظ پارک میں جا گھستے۔

جہاں عادل اسے اس کی من پسند چیزیں کھلاتا اور اپنی پرشوق نظروں کے جواب میں مہرین کا گلابی پڑتا چہرہ آنکھوں میں بسائے گھر واپس لوٹ آتا۔۔۔ مہرین پریکٹیکل کا بہانہ بنا کر گھر والوں کی سوالیہ نظروں کے معنی بدل دیتی۔

ایسے ہی ایک دن جب وہ پارک میں بیٹھے گول گپے کھا رہے تھے کہ عادل نے اچانک سوال کر دیا۔

"مہرین! تم شادی کے بعد موٹی تو نہیں ہو جاؤ گی؟"

"ہائیں! یہ کیسا سوال ہے؟" وہ گول گپے منہ میں ڈالنا بھول کر حیرت سے اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ وہ گہرا سانس بھرتے ہوئے اپنی الجھن بیان کرنے لگا۔

"ایکچوئلی۔۔۔ مجھے موٹاپے سے شدید نفرت ہے۔ موٹے لوگوں کو دیکھ کر مجھے نہ جانے کیوں عجیب سا خلجان ہونے لگتا ہے۔ میں نے کل تمہاری امی اور خالہ کو دیکھا تو ڈر گیا کہ کہیں تم بھی بعد میں۔۔۔"

مہیان نے جھجک کر بات ادھوری چھوڑ دی۔ اس کے چہرے سے جھانکتا خوف دیکھ کر مہرین کے لیے ہنسی روکنا مشکل ہو گئی۔ لیکن وہ اتنا سنجیدہ تھا کہ بمشکل اسے تسلی دینا ہی پڑی۔

"کمال کرتے ہیں آپ بھی عادل۔ اب ایسی بھی کوئی خطرناک بات نہیں ہے۔ یہ سچ ہے کہ میری نانی بہت موٹی تھیں اور میری امی اور خالہ ہو بہو ان ہی کا پرتو ہیں۔ لیکن میری ایک اور خالہ اور دونوں ماموں میرے نانا کی طرح بالکل اسمارٹ ہیں۔ اس لیے ضروری نہیں کہ میں بھی اپنی امی پر جاؤں۔۔۔ بلکہ لوگ تو کہتے ہیں کہ میں بالکل اپنے ابو جیسی ہوں اور پھر آپ خود بتائیں عادل! کہ کیا مجھے دیکھ کر کہیں سے آپ کو لگتا ہے کہ مستقبل قریب یا بعید میں میرے موٹے ہونے کے کوئی چانسز ہیں؟"

اس کے پوچھنے پر عادل نے سرتاپا اس کا جائزہ لیا اور تھوڑا سا مطمئن ہو گیا۔۔۔ لیکن مکمل طور پر نہیں۔۔۔

"پھر بھی مہرین! تم احتیاط کرنا۔ جیسے ہی موٹی ہونے لگو، فوراً" ڈائٹنگ شروع کر دینا اور ساتھ ہی سلمنگ سینٹر بھی جوائن کر لینا۔ لیکن موٹاپا نہیں پلیز۔" اس کے التجائیہ انداز پر اس بار مہرین اپنی ہنسی ضبط نہیں کر سکی۔

"اچھا بابا! بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔ ابھی تو کھانے دیں۔" اس نے شرارت سے عادل کا چہرہ دیکھتے ہوئے بڑا سا گول گپا اپنے منہ میں بھر لیا۔

☼ ☼ ☼

یہ کھیل نہ جانے ابھی اور کتنا عرصہ چلتا۔۔۔ اگر مہرین کے ایف ایس سی کے امتحان ختم ہوتے ہی اس کی خالہ اور متوقع ساس شادی کے لیے جلدی نہ مچا دیتیں۔ اس کے گھر والوں کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ لہٰذا انہوں نے رضامندی دے دی۔ یوں دونوں گھرانے خوشی خوشی شادی کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ مہرین۔ کی پریشانیوں میں اضافہ ہو گیا۔ رنگین تتلیوں کے خواب دیکھتے وہ اس خزاں کو تو بالکل ہی فراموش کر بیٹھی تھی۔ جو اس کے خوش رنگ سپنوں کو نگلنے کے لیے تیار بیٹھی تھی۔

اس نے ہڑبڑا کر عادل کو مدد کے لیے پکارا اور اسے جلد از جلد اپنے گھر والوں کو اس کے ہاں بھیجنے کے لیے کہا۔ اور ان ہی دنوں جب عادل کوشش کر رہا تھا۔ مہرین اپنی ماں کے خیالات جاننے ان کے پاس آ بیٹھی۔

"فرض کریں امی۔۔۔ اگر میرے لیے اخلاق سے بھی کہیں اچھے لڑکے کا رشتہ آ جائے، تو کیا آپ میری شادی خالہ کے ہاں سے توڑ دیں گی؟"

"ہرگز نہیں۔۔۔" انہوں نے برہم نظروں سے اس

کے بے تکے سوال پر گھورا۔

"چاہے وزیر اعظم ہی اپنے بیٹے کا رشتہ لے کر کیوں نہ آجائے، مجھے تو اپنی بہن کے آگے کچھ نہیں ہے۔۔۔ اور پھر اخلاق میں کمی کس چیز کی ہے؟ پڑھا لکھا ہے۔ اپنا کاروبار کرتا ہے۔ اس سے اچھا بھلا کون ہو گا؟"

ماں کے سخت اور بے لچک رویے نے مہرین کو خاصا مایوس کیا تھا۔

"لگتا ہے کافی محنت کرنی پڑے گی مجھے گھر والوں کو منانے کے لیے۔۔۔" وہ اسی سوچ میں غلطاں تھی۔ جب انہیں اچانک کوئی خیال آیا۔

"لیکن تم یہ کیوں پوچھ رہی تھیں؟"

"کچھ خاص نہیں امی! بس ایسے ہی۔" ماں کی مشکوک نظروں پر بمشکل سنبھلتے ہوئے اس نے عام سے انداز میں جواب دیا اور وہاں سے اٹھ گئی۔ کیونکہ جب تک عادل اپنے گھر والوں کو لے کر نہیں جاتا، وہ قبل از وقت کسی پر کچھ ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔

☼ ☼ ☼

مگر اس کی نوبت ہی نہ آسکی۔۔۔ عادل مہران کی امی کسی صورت ان کے گھر رشتہ لانے کے لیے تیار نہیں ہوئیں۔ مہرین کے اصرار پر بالآخر عادل نے انکشاف کر ہی دیا کہ اس کی منگنی بچپن سے اس کے ماموں زاد سے طے تھی اور اس کی ماں کسی صورت کسی اور لڑکی کو اپنی بھتیجی کی جگہ دینے کے لیے تیار نہیں تھیں۔

"پھر اب کیا کریں عادل! میں کسی صورت یہ شادی نہیں کرنا چاہتی۔۔۔" مہرین کو غصہ تو بہت آیا کہ عادل نے اتنی بڑی بات اب تک اس سے چھپا کر رکھی۔ جبکہ اس نے اپنی منگنی کا بہت شروع میں ہی اسے بتا دیا تھا۔ مگر خیر۔۔۔ یہ وقت غصہ دکھانے کا نہیں تھا۔ شادی میں فقط دو ہی ہفتے بچے تھے لہٰذا انہیں جلد از جلد کوئی حل ڈھونڈنا تھا۔ تب ہی مہرین نے کاغذ پر یہ سوال لکھ کر عادل کی طرف اچھالا۔ اس کے لفظوں سے بے بسی اور پریشانی ظاہر ہو رہی تھی۔ عادل نے کچھ دیر پر سوچ نظروں سے اسے دیکھا اور پھر گہرا سانس خارج کرتے ہوئے اپنا حتمی جواب لکھ بھیجا۔

"اتنے کم وقت میں مجھے تو اور کوئی راستہ سجھائی نہیں دیتا مہرین! سوائے اس کے کہ ہم دونوں گھر سے بھاگ چلیں۔ میرے لیے تو تمہاری جدائی کا تصور ہی ناقابل برداشت ہے۔ اس لیے مجھے سوچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ ہاں! اگر تمہاری محبت میرے ساتھ ان کٹھنائیوں میں جینے کی حوصلہ نہیں رکھتی۔۔۔ تو تم انکار کر سکتی ہو۔"

مہرین نے بے اختیار نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ ان دنوں یہ چہرہ ہی اسے زندگی کا عنوان لگا کرتا تھا۔ ایسا عنوان جس کے بغیر اس کی زندگی کی کتاب بے معنی تھی۔ ہر راستہ اسی ایک منزل کی طرف جاتا محسوس ہوتا تھا۔ جس کا نام عادل تھا۔۔۔ اور اس نام کے بغیر جینے کے تصور سے ہی جیسے اس کی سانسیں رکنے لگتی تھیں۔

اس لیے سب رشتے ناتے بھلا کر ایک لمحہ لگا تھا اسے سوچنے میں۔۔۔ اور فیصلہ ہو گیا۔

"میری محبت اتنی کمزور نہیں ہے عادل! کہ پہلے ہی امتحان میں ناکام ہو جائے۔ میرے لیے آپ کا ساتھ سب سے اہم ہے۔ باقی کٹھنائیاں تو خود ہی آسانی میں بدل جائیں گی۔ آپ صرف یہ بتائیں کہ چلنا کب ہے؟"

عادل نے بے ساختہ مسکرا کر اسے دیکھا اور ساری حکمت عملی لکھ کر ہوا کے سپرد کر دی۔

ان کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ اس لیے انہوں نے آج رات ہی نکلنے کا فیصلہ کیا اور سب کچھ طے کر کے رات ملنے کے وعدے کے ساتھ رخصت ہو گئے۔

مہرین کا معمول تھا کہ وہ چھت سے آنے کے بعد سب سے پہلے عادل کے لکھے ہوئے کاغذ جلا کر واش بیسن میں بہاتی۔ پھر کوئی اور کام کرتی تھی۔ لیکن اس دن وہ جیسے ہی کمرے میں آئی۔ اسے اپنے پیچھے آہٹ کا احساس ہوا۔ اس نے جلدی سے کاغذ دراز میں ڈال دیے۔ اسی وقت بھابھی کمرے میں داخل ہوئیں۔

"خالہ تمہیں شاپنگ پر ساتھ لے جانا چاہتی ہیں۔ تم تیار ہو جاؤ۔ وہ بالکل ریڈی ہیں۔ شادی، ولیمہ کا جوڑا تمہاری پسند سے لینا چاہتی ہیں۔"

ندا نے بہتیری آنا کانی کی۔ آج وہ کہیں جانے کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں تھی۔ مگر بھابھی نے اس کی ایک نہ سنی اور خالہ کے ساتھ بھیج کر ہی دم لیا۔

شام ڈھلنے تک جب وہ واپس نہ آئی تو امی نے بھابھی کو مہرین کے کمرے میں بیڈ کی سائیڈ دراز سے وہ لسٹ لانے کو کہا، جو انہوں نے دو دن پہلے ہی مہرین سے بنوائی تھی اور پھر عجلت میں اٹھنے کے سبب وہیں چھوڑ آئی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ وقت ضائع کرنے کے بجائے کچھ کارڈز ہی لکھ لیے جائیں۔

بھابھی نے جوں ہی کی دراز کھولی تو لسٹ کے بجائے عادل کے لکھے ہوئے کاغذ ان کے ہاتھ لگ گئے۔۔۔ جنہیں وہ جوں جوں پڑھتی گئیں، ان کی رنگت متغیر ہوتی گئی۔

اور پھر انہوں نے خاموشی سے وہ کاغذ لا کر اپنے شوہر اور ساس کے سامنے رکھ دیے۔ حقیقت جاننے کے بعد ان کے تو جیسے پیروں کے نیچے سے زمین ہی نکل گئی۔ لیکن ابھی وقت باقی تھا اور جب اللہ نے ہی ان کی عزت بچانے کا وسیلہ بنا دیا تھا تو وہ کیوں اپنے ہاتھوں اسے خراب کرتے۔ اس لیے عقل مند لوگوں کی طرح انہوں نے مہرین کو مار پیٹ کر اپنا تماشا بنوانے کے بجائے خالہ کے جاتے ہی رسانیت سے بات کی۔

دراز میں کاغذ غائب پا کر مہرین سمجھ گئی تھی کہ وہ لوگ سب جان چکے ہیں۔ مہرین خوب روئی دھوئی اور سب کی منتیں کیں کہ وہ یہ شادی کرنا نہیں چاہتی۔ جس کے جواب میں بھائی نے ایک زوردار تھپڑ رسید کر کے صرف ایک بات کہی۔

"اب اگر تمہارے حلق سے ایک لفظ بھی نکلا تو میں خود کو شوٹ کر لوں گا۔"

اور پھر وہ واقعی خاموش ہو گئی۔ کیونکہ بھائی کی لاش پر سے گزر کر اپنا گھر بسانے کا تو وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ لیکن اس دل کا کیا کرتی، جو کسی پل اسے سکون سے رہنے نہیں دیتا تھا۔

ہر پل یہ خیال بے چین رکھتا کہ عادل اس کے بارے میں کیا سوچتا ہو گا؟ اسے بزدل اور بے وفا سمجھتا ہو گا کہ اس نے عین وقت پر اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ وہ اپنی پوزیشن صاف کرنے چھت پر بھی نہیں جا سکتی تھی۔ کیونکہ اس واقعہ کے بعد گھر والوں کا رویہ اس کے ساتھ بہت سخت ہو گیا تھا اور شادی ہونے تک اسے اپنے کمرے اور ٹی وی لاؤنج کے علاوہ کہیں جانے کی اجازت نہیں تھی۔

ایسے میں اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کرے۔

لیکن یہ پریشانی بھی جلد ہی ختم ہو گئی۔ کاغذوں پر نام نہ ہونے کی وجہ سے کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ عادل کے لکھے ہیں۔ اس لیے اس نے اتفاقاً" امی اور بھابھی کو بات کرتے سن لیا۔۔۔ اور تب اسے پتا چلا کہ عادل نے تو اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں سوچا ہو گا۔ بلکہ وہ تو یہ بھی نہیں جانتا ہو گا کہ مہرین اس دن گھر سے نکلی بھی تھی یا نہیں۔۔۔

کیونکہ اسی رات اس کے والد سیڑھیوں سے گر گئے تھے۔ سر میں شدید چوٹ لگنے کی وجہ سے وہ لوگ ساری رات انہیں ہسپتال میں لے کر پھرتے رہے، جہاں بالآخر صبح ان کا انتقال ہو گیا تھا۔۔۔ اور پھر وہ لوگ انہیں لے کر اپنے آبائی گاؤں چلے گئے تھے۔ جہاں سے چالیسویں کے بعد ہی ان کی واپسی متوقع تھی۔

مہرین کی آخری امید بھی دم توڑ چکی تھی۔ اس نے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ کر اس سب کو قسمت کا لکھا سمجھ کر قبول کر لیا اور خاموشی سے رخصت ہو گئی۔

عادل جب واپس آیا تو مہرین کی شادی کا سن کر اس کا دل بھی اس محلے سے اچاٹ گیا اور وہ اپنے گھر والوں کو لے کر دوسرے شہر اپنے ماموں کے پاس چلا گیا۔ وہ اس کے والد کے انتقال کے بعد بہت اصرار سے ان سب کو اپنے پاس بلا رہے تھے۔

پھر وہ چار سال بعد ایک سرکاری اسکول میں ٹیچر

مقرر ہونے کے بعد اسی ماموں کی بیٹی اور اپنے بچپن کی منگیتر سے اس کی شادی ہو گئی۔ یوں دونوں اپنی اپنی زندگیوں میں مگن ہو گئے۔

اور آج جب اٹھائیس سال بعد دوبارہ ایک دوسرے کے مقابل آئے تو رنگین خواہشوں کی پٹی آنکھوں پر چڑھائے اور جوانی کے پرفشار جنوں کی رو میں بہہ کر ایک دوسرے کے لیے دنیا تیاگ دینے کا عہد کرنے والے مہرین اور عادل کی جگہ' اس جذباتی دور کو بہت پیچھے چھوڑ آنے والے دو بردبار اور عقل مند انسان بیٹھے تھے۔ جن کے لیے ان کی ترجیحات گزری عمر کی محبت سے کہیں زیادہ اہم تھیں۔

یا شاید اب تو ان کے دلوں میں اس محبت کی پرچھائیں بھی باقی نہیں رہی تھی ۔۔۔ اور آنکھیں جو کبھی ایک دوسرے کے خیال سے سوتے میں بھی چمک اٹھتی تھیں' آج اپنے اپنے نفع کا تخمینہ لگا رہی تھیں۔ عادل سنگل صوفے میں بمشکل سمائے مہرین کے بے ہنگم وجود کا جائزہ لے رہا تھا اور وہ اس کے گھر کا

اگر اس دن وہ اور عادل اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتے تو آج اس گھر میں عائشہ (عادل کی بیوی) کی جگہ وہ ہوتی۔ سسک سسک کر گھر کے خرچ پورے کرنے کی تگ و دو کرتے اور بچت کے چکر میں اپنی چھوٹی چھوٹی خواہشوں کو مارتے ہوئے کیسی زندگی گزار رہی ہوتی وہ۔۔۔؟

اس خیال کے آتے ہی وہ گھر جو کچھ دیر قبل اسے کھلا اور ہوادار لگ رہا تھا' اچانک ایک تاریک زنداں میں بدل گیا۔۔۔ جہاں اسے سانس لینے میں بھی گھٹن محسوس ہو رہی تھی۔ پھر وہ زیادہ وہاں رک نہیں سکی اور جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

کیسا رشتہ' کہاں کا رشتہ۔۔۔ ان دونوں کو ہی اپنی ذاتی زندگی بہت عزیز تھی۔ اس لیے عادل نے بھی اسے روکنے کی کوئی کوشش نہیں کی اور وہ بنا کسی سے کچھ کہے خاموشی سے رخصت ہو گئی۔

اپنی آرام دہ گاڑی میں بیٹھتے ہی مہرین نے کھڑکی کا شیشہ نیچے سرکایا اور ایک اطمینان بھرا سانس فضا میں خارج کرتے ہوئے سر سیٹ کی پشت سے ٹکا دیا۔

آج اسے صحیح معنوں میں احساس ہو رہا تھا کہ اس کے گھر والوں نے ان کے لیے کتنا صحیح فیصلہ کیا تھا۔ سچ تھا کہ عادل آج بھی بے حد ہینڈسم تھا اور اخلاق کبھی بھی ظاہری شخصیت میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ پر یقین تھی کہ اگر آج ایک بار پھر انتخاب کا اختیار اس کے ہاتھ میں دیا جاتا کہ وہ عادل اور اخلاق میں سے کسے چنے گی تو اس بار وہ بلا جھجک اخلاق کا ہاتھ تھام لیتی۔۔۔ کیونکہ جن سہولیات اور آسائشوں کا عادی اسے اخلاق نے بنا دیا تھا' اس نشے کے سامنے کسی کی ظاہری شخصیت اب اس کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ اس نے بے اختیار اس پاک ذات اور اپنے گھر والوں کا شکریہ ادا کیا۔۔۔ جو اس وقت اسے اس حماقت سے باز نہ رکھتے تو شاید ساری عمر کے پچھتاوے ان کا مقدر بن جاتے۔

دوسری طرف عادل بھی اسی قسم کے احساسات سے دوچار تھا۔ مہرین کا بے تحاشا پھیلا سراپا بار بار اس کی نگاہوں کے سامنے آ رہا تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ اگر اس دن وہ اپنے والد کی وجہ سے مجبور نہ ہو جاتا اور وہ حماقت کر بیٹھتا کہ جس کا وہ ارادہ کیے ہوئے تھا تو آج مہرین اس گھر میں یہاں سے وہاں بمشکل اپنا آپ سنبھالتی اس کی برداشت کا امتحان لے رہی ہوتی۔۔۔ اور وہ گھر آنے کے بجائے اپنے دوستوں میں بیٹھنا زیادہ پسند کرتا۔ مہرین ہو بہو اپنی ماں کی کاپی بن چکی تھی اور شاید ان کی بیٹیاں بھی کل کو۔۔۔ عادل نے بے اختیار جھرجھری لے کر خود کو اس تصور سے آزاد کرایا اور پروردگار کے بعد اپنے والد کا بھی شکریہ ادا کیا کہ جو دنیا سے جاتے جاتے بھی اپنی اولاد کا بھلا ہی کر گئے تھے۔

اس کے لیے تو اس کی اسمارٹ سی بیگم عائشہ ہی ٹھیک تھی۔ وہ جسے آج بھی لوگ اس کی بیٹیوں کی بڑی بہن سمجھ کر غلط فہمی کا شکار ہو جاتے تھے۔

عادل نے طمانیت سے عائشہ کو دیکھتے ہوئے چائے کی پیالی پکڑی۔۔۔ اور مزے سے گرم چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے چینل سرچ کرنے میں مصروف ہو گیا۔

پچھلے موسموں کا عشق

کسی متروک رستے پر

بہت دن بعد

کوئی چل کے آئے تو

بکھرتے خشک پتے پاؤں کے نیچے سسکتے ہیں

بتلاتے ہیں

یہ پچھلے موسموں کا عشق کیسا عشق ہوتا ہے

ستمبر کے مہینے سا

نہ اس میں گرم جوشی ہے

نہ اس میں سرد مہری ہے

نہ پا لینے کی خواہش ہے

نہ کھو دینے کا دھڑکا سا

یہ پچھلے موسموں کا عشق

جیسے رات کی بارش

جو چپکے سے برس جائے

زمین دل کو نم کر دے۔

طلعت اخلاق احمد

سوکھے ہونٹ، سلگتی آنکھیں، سرسوں جیسا رنگ
برسوں بعد وہ دیکھ کے مجھ کو رہ جائے گا دنگ

ماضی کا وہ لمحہ مجھ کو آج بھی خون رلائے
اکھڑی اکھڑی باتیں اس کی غیروں جیسے رنگ

دل کو تو پہلے ہی درد کی دیمک چاٹ گئی
روح کو بھی اب کھاتا جائے تنہائی کا زنگ

کیوں نہ اب اپنی چوڑیوں کو کرچی کرچی کر ڈالوں
دیکھی آج اک سندر ناری، پیارے پی کے سنگ

شبنم کوئی جو تجھ سے ہارے، جیت پہ مان نہ کرنا
جیت وہ ہو گی جب جیتو گی اپنے آپ سے جنگ

شبنم شکیل

اک ندی موج در موج پہلو بدلتی رہی
ایک کشتی بڑے دکھ رکھاؤ سے چلتی رہی

اک پرندہ ہوا آب و دانے کی خواہش میں گم
ایک ٹہنی کے دکھ میں ہوا ہاتھ ملتی رہی

اک ستارہ کہیں آسماں پر اُلجھتا رہا
ایک انگنائی میں رات بھر آگ جلتی رہی

اک مسافت مکمل ہوئی نیند ہی نیند میں
ایک سپنے میں دن کی تھکن پنکھ جھلتی رہی

اک دریچہ بلاتا رہا اپنی آغوش میں
ایک آوارگی گھر سے لے کر نکلتی رہی

اک نئی دُنیا کے خواب آنکھوں نے دیکھے بہت
ایک اظہار کی سعی میں عمر ڈھلتی رہی

جمال احسانی

پھولوں کے رنگ شوخ ہیں، دریا کمال ہے
اور اپنے آپ میں صحرا بھی کمال ہے

یہ زندگی بنامِ محبت، یہ کارِ عمر
ہم جیسے کر رہے ہیں، ہمارا کمال ہے

وہ جانتا ہے کھیل میں کردار کتنے ہیں
وہ جس نے داستان کو لکھا کمال ہے

اب شہر بس گیا ہے تو لوٹنے لگے ہیں سب
پہلے تو کہہ رہے تھے، نقشہ کمال ہے

چاہے کوئی چراغ جلائے، بجھا رکھے
اس سرپھری ہوا کا ہی سارا کمال ہے

سید کامی شاہ

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

"جس کی صبح اس حال میں ہوئی کہ اسے بدن میں عافیت اپنے بارے میں امن اور دن بھر کی خوراک حاصل ہو، اسے گویا پوری دُنیا جمع کر کے دے دی گئی۔"

فوائد و مسائل :-

1- جسے کوئی بیماری اور خوف نہ ہو اور دن بھر کی ضرورت کا سامان موجود ہو تو یہ بہت بڑی نعمت ہے۔
2- ہم زیادہ کی خواہش میں ان نعمتوں کی طرف توجہ نہیں کرتے جو ہمارے پاس موجود ہوتی ہیں جس کی وجہ سے دل میں شکر کا جذبہ نہیں پیدا ہوتا۔
3- جس شخص کے پاس ایک دن کی ضروریات موجود ہیں اسے اس دن کا شکر ادا کرنا چاہیے اور یہ امید رکھنی چاہیے کہ جب کل کا دن آئے گا تو اللہ اس کی ضروریات بھی مہیا فرما دے گا۔

عطریات ،

- کتاب کبھی اُدھار نہ دیں کیونکہ کوئی واپس نہیں کرتا۔ خود میری لائبریری میں صرف وہی کتابیں باقی ہیں جو لوگوں نے مجھے اُدھار دی تھیں۔

(اناطول فرانس)

- علم، مذہب اور آزادی باوجود بہترین نعمت ہونے کے نا اہل سوسائٹی میں بڑے خطرناک عناصر ہیں۔

کہکشاں ارجمند۔ کراچی

اقوالِ حکمت ،

- طاقت سے دشمن کے اوپر فتح پانا آدھی کامیابی ہے۔ اور محبت سے دشمن کے اوپر فتح پانا مکمل کامیابی ہے۔
- نقصان کیا ہے؟ وقت پر عمل کرنے سے چوک جانا۔

ایس آر قیصرانی۔ کوٹ قیصرانی

اعتراف ،

ایک عمر رسیدہ دیہاتی جوڑا پہلی بار شہر آیا۔ ایک فیشن ایبل علاقے سے گزرتے ہوئے بڑے میاں ہر راہ چلتی عورت کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے۔ آخر تنگ آ کر بڑی بی نے کہا۔

"افضل کے ابا! کچھ تو شرم کرو۔ کوئی دیکھے گا تو کیا سوچے گا۔ شاید یہی کہ تم نے زندگی میں کبھی عورت نہیں دیکھی۔؟"

بڑے میاں ایک طویل ٹھنڈی سانس لے کر بولے۔

"کوئی اور تو کیا سوچے گا۔ میں تو خود اس وقت یہی سوچ رہا ہوں۔"

ثمرہ، اقراء۔ کراچی

سطر سطر خوشبو ،

- وہ شخص اپنی قوم پر تباہی لاتا ہے جو کبھی بیچ نہیں بوتا، نہ کبھی اینٹ اٹھا کر اینٹ پر رکھتا ہے اور کبھی کپڑا بنتا ہے لیکن سیاست کو اپنا پیشہ بنا لیتا ہے۔
- صحیفے خشک ہو چکے ہیں اور قلم اٹھائے جا چکے ہیں جو کچھ قسمت میں لکھا ہے وہ درج ہو چکا اگر کوئی چیز قسمت کا لکھا ٹال سکتی ہے تو وہ ہے سچی لگن اور سچے دل سے کی ہوئی دُعا۔

٭ دل میں چیزوں کی محبت بیٹھ جائے تو وہاں دلوں کا مالک اٹھ جاتا ہے اور چیزوں کی محبت دل میں مستقل بس جائے تو اندھی دیواروں جیسی ہو جاتی ہے باقی عمر ان سے رہائی نہیں ملتی۔

٭ خواہشوں اور رشتوں میں ایک خوبی سانجھی ہوتی ہے یہ اکثر بے یقینی کے باعث اندر ہی اندر اپنے ہی دباؤ، اپنے ہی بوجھ، اپنی ہی سردی گرمی سے ٹوٹ جاتے ہیں۔

٭ پریشان ہونا انسان کے انسان ہونے کی دلیل ہے لیکن پریشان رہنا انسان کا اللہ پر یقین نہ ہونے کی دلیل ہے۔

رضوانہ شکیل راؤ۔ لودھراں

خوبیاں ٭

ایک شادی شدہ جوڑا وزن چیک کرنے والی مشین پر وزن چیک کر رہا تھا۔ مشین نے پرچی نکالی جس پر لکھا تھا۔

"آپ بہت خوبصورت ہیں۔ آپ کی عادتیں بہت اچھی ہیں۔ آپ بہت مخلص ہیں۔" اور وزن لکھا تھا اڑھائی من۔

بیوی بہت اترا کر بولی۔ "دیکھیے مشین کتنی اچھی ہے۔ خوبیاں میری اور وزن آپ کا بتا دیا۔"

کرن، بینش۔ کراچی

جام جمشید ٭

"جام جمشید" کی تلمیح فارسی سے اردو شاعری میں آئی ہے۔ کہتے ہیں۔ شاہ جمشید کا پیالہ اتنا بڑا تھا کہ بادشاہ کے سوا کوئی شخص اسے لبالب بھر کے پینے پر قادر نہیں تھا۔ اس پیالے میں علم نجوم کے حساب سے دائرے بنے ہوئے تھے۔ افسانوی دور کے شاہ ایران اسی پیالے میں بنے ہوئے نجوم کے دائروں کو دیکھ کر ستاروں کا حال بتایا کرتے تھے جس کو بعدازاں ــ افسانہ طرازوں نے افسانوی رنگ دے کر حال بتلانے والا "جہاں نما" کہہ کر عالمگیر شہرت دے دی۔

عائشہ۔ گوجرہ

دم واپسیں ٭

٭ انگلستان کے بادشاہ چارلس دوم کی موت بڑی تاثر انگیز تھی۔ وہ اسی طرح مرا جیسے ایک بادشاہ اور شریف زادے کو مرنا چاہیے۔ اس نے اپنے تیمارداروں اور درباریوں سے دم واپسیں پر کہا۔

"مرتے وقت میں نے بہت وقت لیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ حضرات مجھے معاف فرمائیں گے۔"

٭ گارڈنل رشلو سے اس کے آخری لمحوں میں پوچھا گیا۔

"آپ اپنے دشمنوں کو معاف کرتے ہیں؟"

اس نے جواب دیا "میرا کوئی دشمن نہیں۔ سب ملک کے دشمن ہیں۔"

٭ نپولین بھی اسی طرح مرا۔ جس طرح انسانوں کے کسی پیدائشی قائد کو مرنا چاہیے۔ اس کے آخری الفاظ یہ تھے۔

"فرانس... فوج... فوج کے جرنیل۔"

٭ مشہور فلسفی ہیلے نے، جو ایک نامور طبیب کی شہرت بھی رکھتا تھا، آخری لمحات میں اپنی نبض کا معائنہ کیا اور اپنے ایک معالج سے کہا۔

"اچھا بھائی! رخصت۔ اب اس نبض کی ضربات بند ہو گئی ہیں۔"

٭ لیگنی مشہور ریاضی دان تھا۔ اس نے اٹھارہویں صدی کے آخر میں جذر اور جذر الکعب کے بارے میں ایک مختصر اور آسان طریقہ رائج کیا تھا۔ موت کے وقت وہ بالکل بے سدھ تھا۔ اور اپنے دوستوں کو بھی نہیں پہچانتا تھا۔ یکایک ایک شخص نے جھک کر اس کے کان میں پوچھا۔

"لیگنی! ایک سو چالیس کا جذر کیا ہے؟"

لیگنی نے جواب دیا "بارہ۔"

اور اس کے بعد جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔

(جینے کا قرینہ۔ اندآندرے موروا)

مترجم: مختار صدیقی

وجہ ٭

بیوی نے ایک خبر پڑھنے کے بعد اخبار سے نظر ہٹا کر شرابی شوہر کی طرف دیکھا اور بولی۔

"ام الخبائث نے ایک اور انسان کی جان لے لی۔ ذرا یہ خبر پڑھو۔"

"کیماڑی سے ایک شخص منوڑہ کی سیر کے لیے لانچ میں بیٹھا۔ نشے میں ہونے کی وجہ سے وہ الٹی سیدھی حرکتیں کر رہا تھا۔ آخرکار سمندر میں گر پڑا اور ڈوب گیا۔ کوششوں کے باوجود اسے بچایا نہیں جا سکا۔ بدنصیب اگر شرابی نہ ہوتا تو آج زندہ ہوتا۔"

"سمندر میں گرنے تک وہ زندہ تھا نا؟" شوہر نے پوچھا۔

"ہاں۔" بیوی نے جواب دیا۔

"پانی میں گر کر ڈوبنے کے بعد مرا ہو گا۔" شوہر نے مزید تصدیق چاہی۔

"ہاں۔" بیوی کو تسلیم کرنا پڑا۔

"تو پھر یوں کہو نا کہ وہ پانی کی وجہ سے مرا۔ شراب کو کیوں الزام دے رہی ہو؟" شوہر نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

کامیاب محفل ٭

ناشتے کی میز پر اخبار دیکھتے ہوئے رمضان نے بیگم کو بتایا۔

"پرسوں رات والی محفل موسیقی کی رپورٹ اخبار میں پڑھ کر مجھے پتا چلا ہے کہ وہ کتنی کامیاب محفل تھی۔"

"جی ہاں۔ مجھے بھی اخبار پڑھ کر ہی پتا چلا ہے کہ ہم لوگ اس سے کتنے لطف اندوز ہوئے تھے۔" رمضان کی بیگم نے جواب دیا۔

ندا، فضہ۔ کراچی

بہادری ٭

کالج کی ٹیم بین الصوبائی تقریری مقابلے میں حصہ لینے جا رہی تھی۔ ٹیم میں شامل ایک مقرر نے جانے سے پہلے جوش کے عالم میں باتیں کرتے ہوئے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

"یہ تقریری مقابلہ نہیں ہے۔ یوں سمجھو یہ صوبے بھر کے نوجوانوں کے درمیان ذہانت کی جنگ ہے۔"

"بے شک...!" ایک کلاس فیلو نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "اور تمہاری بہادری دیکھو کہ ہتھیار کے بغیر ہی یہ جنگ لڑنے جا رہے ہو۔"

صائمہ جیمی۔ کراچی

آمریت اور جمہوریت ٭

آمریت میں تو صرف ایک نالائق سے دوچار ہونا پڑتا ہے لیکن جمہوریت میں نالائقوں کی پوری ٹیم وبال جان بن جاتی ہے۔

(ابن صفی)

سفید نسل ٭

سفید نسل کا خون جس میں بھی ہو، اس سے ہوشیار رہو، یہ خوامخواہ اپنا وقت ضائع نہیں کرتے۔

(ابن صفی)

عائشہ۔ گوجرہ

التجا ٭

بیگم کار لے کر روانہ ہونے لگیں تو شوہر نے التجائیہ لہجے میں کہا۔

"اگر تم محسوس کرو کہ گاڑی قابو سے باہر ہونے لگی ہے تو کم از کم اتنی کوشش ضرور کرنا کہ کسی سستی سی چیز کو مارنا۔"

شہد ٭

شہد واحد غذا ہے جو کبھی خراب نہیں ہوتی۔ فرعونوں کے مقبروں سے ملنے والے شہد کا تجزیہ کیا گیا تو ماہرین نے اسے قابل استعمال قرار دیا۔

ایک کلو شہد کے لیے مکھیاں چالیس لاکھ پھولوں کو چوستی ہیں اس کے لیے وہ جتنا سفر کرتی ہیں وہ دنیا کے گرد چار چکر لگانے سے زیادہ ہوتا ہے۔

خالدہ جیلانی

سیدہ حنا بخاری ______ حیدرآباد

میری خاموشی مسلسل کو
اک مسلسل گلہ سمجھ لو تم

یاسمین ظفر ______ لاہور

دِلوں میں فرق آجائے تو اتنا یاد رکھنا تم
دلیلیں، منتیں اور فلسفے بیکار جاتے ہیں

انیقہ انا ______ چکوال

وہ روز ہوتا گیا پاس میرے
لیکن پھر بھی دُوری ذرا سی تھی
محبت بانٹ دی اس نے زمانے میں لیکن
جو میرے حصے میں آئی وہ محبت ذرا سی تھی

مسکان شاہ ______ سگرالی

مجھے کیسے یقین آئے محبت تم بھی کرتے ہو
تمہیں جب بھی کبھی دیکھا خوش باش ہی دیکھا

فوزیہ زبیر ______ چشتیاں

وعدوں کے ساتھ ساتھ بہت دُور تک چلیں
تھامے تمہارا ہاتھ بہت دُور تک چلیں
بادل، ہوا، سراب، ستارے ہزار ہا
ہم لے کے کائنات بہت دُور تک چلیں

صدف عمران ______ کراچی

مسلسل دل کی بے چینی کو کیا کہتے ہیں دل والو
تمہیں معلوم ہو گا، مجھے تو آگہی کم ہے
اب اس کے بعد جسم وجاں کو جلانے سے بھی کیا حاصل
چراغوں میں لہو جلتا ہے پھر بھی روشنی کم ہے

شازیہ فاروق احمد ______ خان بیلہ محمد آباد

جسے بھی دوست سمجھا، دُشمن ایمان وجاں ٹھہرا
نہیں ہے دوستی جس سے اسی سے دشمنی کم ہے

رضوانہ شکیل راؤ ______ لودھراں

چلتی ہیں دل کے شہر میں یونہی حکومتیں
بس جو بھی اس نے کہہ دیا دستور ہو گیا

زوباریہ خالد ______ لاہور

کیا خوب ہوتا کہ یادیں ریت ہوتیں
مٹھی سے گرا دیتے، پاؤں سے اُڑا دیتے

مدیحہ ______ فیصل آباد

ملے اُلجھنوں سے فرصت تو ذرا دل سے پوچھ لینا
کیا فرصتوں میں ہی یاد کرنا محبت ہے

مقدسہ ______ فیصل آباد

کتاب عمر کا اتنا سا گوشوارہ ہے
تمہیں نکال کے دیکھا تو سب خسارہ ہے

صدیقہ، انیقہ ملک ______ سمندری

بہت ظلم ہے تیرے شہر کے لوگ
قتل کر کے پوچھتے ہیں یہ جنازہ کس کا ہے

صائمہ سلیم ______ کراچی

حرفِ تسلی تو ایک تکلف ہے
جس کا درد اسی کا درد، باقی سب تماشائی

فرحت غلام نبی ______ خانیوال

کوئی آفت اُترتی ہی نہیں اس واسطے مجھ پہ
میری ماں کی دُعا نے آسماں کو روک رکھا ہے

ثریا آصف ______ خانیوال

کی محبت تو سیاست کا چلن چھوڑ دیا
ہم اگر پیار نہ کرتے تو حکومت کرتے

تطہیر زیدی کی ڈائری سے

شاعری میں سنجانے کیسا جادو ہوتا ہے کہ جہاں لمبی لمبی تقریریں اپنا کام نہیں دکھا پاتیں، وہاں دو مصرعوں کا شعر گہرا تاثر چھوڑ جاتا ہے اور علامہ اقبال کی شاعری میں معنی کا ایک بحر بیکراں ہے۔ علامہ اقبال کی یہ غزل جو میری ڈائری کی زینت ہے، آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔

تسکین نہ ہو جس میں وہ راز بدل ڈالو
جو راز نہ رکھ پائے، ہم راز بدل ڈالو

تم نے بھی سُنی ہو گی بڑی عام کہاوت ہے
انجام کا ہو خطرہ، آغاز بدل ڈالو

پُرسوز دِلوں کو جو مسکان نہ دے پائے
سُر ہی نہ ملے جس میں وہ ساز بدل ڈالو

دشمن کے ارادوں کو ہے ظاہر اگر کرنا
تم کھیل وہی کھیلو، انداز بدل ڈالو

قرۃ العین خرم کی ڈائری سے

دُنیا میں کچھ محبتیں بہت بے غرض ہوتی ہیں
اُن میں جستجو کا سفر تو ہوتا ہے مگر وہ جسموں کے حصول اور طلب سے ماورا ہوتا ہے۔ ہمارے "اندر" بسنے والی محبت کا ہماری روح اور خدا کے سوا کوئی امین نہیں ہوتا۔

محسن نقوی کی یہ خوبصورت نظم سب محبت کرنے والوں کے نام۔

میں نے اس طور سے چاہا تجھے اکثر جاناں
جیسے مہتاب کو بے انت سمندر چاہے
جیسے سورج کی کرن سیپ کے دل میں اُترے
جیسے خوشبو کو ہوا رنگ سے ہٹ کر چاہے

جیسے پتھر کے کلیجے سے کرن پھوٹتی ہے
جیسے غنچے کھلے موسم سے حنا مانگتے ہیں
جیسے خوابوں میں خیالوں کی کماں ٹوٹتی ہے
جیسے بارش کی دُعا آبلہ پا مانگتے ہیں

میرا ہر خواب مرے سچ کی گواہی دے گا
وسعتِ دیدنے تجھ سے تری خواہش کی ہے
میری سوچوں میں کبھی دیکھ سراپا اپنا
میں نے دُنیا سے الگ تیری پرستش کی ہے

تجھ کو احساس ہی کب ہے کہ کسی درد کا داغ
آنکھ سے دل میں اُتر جائے تو کیا ہوتا ہے
تو کہ سیماب طبیعت ہے تجھے کیا معلوم
موسمِ ہجر ٹھہر جائے تو کیا ہوتا ہے

ڈاکٹر کومل ستار کی ڈائری سے

اک امید کسی روزن سے ٹھنڈی ہوا کا جھونکا اور کھلی یا بند آنکھوں کے خواب اور کچھ لوگ خواب دیکھنے اور دیکھنے کی دُھن میں اس قدر آگے نکل جاتے ہیں۔ کہ سُود و زیاں کا پتا ہی نہیں چلتا اور جب پتا چلتا

ہے تو خسارا مقدر میں لکھا جا چکا ہوتا ہے۔ احمد فراز کی نظم آپ کے نام۔

ہم خوابوں کے بیوپاری تھے
پر اس میں ہوا نقصان بڑا
کچھ بخت میں ڈھیروں کالک تھی
کچھ اب کے غضب کا کال پڑا
کچھ راکھ لیے جھولی میں اور سر پہ ساہوکار کھڑا
جب دھرتی صحرا صحرا تھی
ہم دریا دریا روئے تھے
ہاتھ کی ریکھائیں چپ تھیں
اور سُر سنگیت میں کھوئے تھے
تب ہم نے جیون کھیتی میں
کچھ خواب انوکھے بوئے تھے
کچھ خواب سجل مکانوں کے

کچھ بول بہت دیوانوں کے
کچھ لفظ جنہیں معنی نہ ملے
کچھ گیت شکستہ جانوں کے
کچھ پر پاگل پروانوں کے

ارم کمال کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر سلیم کوثر کی غزل جو میں بڑی محبتوں سے بہنوں کی نذر کر رہی ہوں۔

اس عالمِ حیرت و عبرت میں کچھ بھی تو سراب نہیں ہوتا
کوئی پسند مثال نہیں بنتی، کوئی لمحہ خواب نہیں بنتا

اک عمرِ نمو کی خواہش میں موسم کے جبر سہے تو کھلا
ہر خوشبو عام نہیں ہوتی، ہر پھول گلاب نہیں ہوتا

اس لمحۂ خیر و شر میں کہیں اک ساعت ایسی ہے جس میں
ہر بات گناہ نہیں ہوتی، سب کارِ ثواب نہیں ہوتا

میرے چاروں طرف آوازیں اور دیواریں پھیل گئیں لیکن
کب تیری یاد نہیں آتی اور جی بے تاب نہیں ہوتا

یہاں منظر سے پس منظر تک حیرانی ہی حیرانی ہے
کبھی اصل کا بھید نہیں کھلتا، کبھی سچا خواب نہیں ہوتا

کبھی عشق کرو اور پھر دیکھو اس آگ میں جلتے رہنے سے
کبھی دل پر آنچ نہیں آتی، کبھی رنگ خراب نہیں ہوتا

میری باتیں جیون سپنوں کی، میرے شعر امانت نسلوں کی
میں شاہ کے گیت نہیں گاتا، مجھ سے آداب نہیں ہوتا

صفیہ کوکب گوندل کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر یہ خوبصورت نظم اُن تمام اُداس لڑکیوں کے نام جو اپنے دل کی بات کبھی سے نہیں کہتیں اور اپنے حق کے لیے آواز اُٹھاتی ہیں۔ اخبار میں کشور ناہید کے کالم میں یہ نظم تحریر تھی۔ شاید ان کی اپنی ہے۔

اُداس لڑکیاں
اجل دریدہ و سحر زدہ
ستم نصیب آئینے کے آس پاس لڑکیاں
اُداس لڑکیاں
تمام رات آفتاب ان کے انتظار میں رُکا رہا کہ سو سکیں
تمام دن خزاں کی دُھوپ ان کے گھر سے دُور خیمہ زن رہی
کہ تیز روشنی سے مضطرب نہ ہوں
یہ زندگی کی ریل پر یس چلیں تو زنگ آئے گا
عدم نصیب عورتیں عدم کا راستہ بتائیں گی
سفر نصیب عورتیں واجل نشان عورتیں وعدم نژاد عورتیں
سو ایسا کیا ضرور ہے ان کے قتل کی سزا بھی قتلِ عمد ہے

سرورق کی شخصیت	
ماڈل	رانیہ
میک اپ	روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافر	موسیٰ رضا

نادرہ خاتون

خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
khawateendigest@hotmail.com

عائشہ فیاض۔۔۔ لاہور

جانے کتنے سارے مہینوں کے بعد آج "ہمارے نام" میں شرکت کا موقع مل پایا ہے۔ اللہ۔۔۔ اللہ ایسی خوش بختی اور ہم۔۔۔ بہرحال یہ جو اتنی ساری تاخیر ہوئی تو یقیناً" کچھ باعث تاخیر بھی تھا۔ اب ہم کوئی سید ضمیر جعفری تو نہ ہوئے جو اپنے سن پیدائش کو ہی باعث تاخیر گردانتے تھے۔ ہم ٹھہرے عائشہ فیاض 'ازلی سست' لاپروا اور ان سب کے ساتھ ساتھ۔۔۔ ایک بہو۔۔۔ ماں۔۔۔ ٹیوشن سینٹر اور اب ایک عدد جیٹھانی بھی۔ اپنی بہت معصوم اور پیاری سی دیورانی' مہرین وقاص کی (ویسے وہ اس دنیا کی واحد لڑکی ہوگی جسے اس کی جیٹھانی 'چندا' کہہ کر بلاتی ہے۔ ہے نا مینو۔) بہرحال ایک خاموش قاری کا رشتہ تو اس دوران ہمیشہ کی طرح قائم ہی رہا ہے آپ سب سے۔

اور اب باری ہے اس ماہ کے شمارے پر' ہمارے قیمتی تبصرے کے حق کی۔ جی جناب (مجھے حق ہے) نگہت سیما کی 'زمین کے آنسو' آج کے دور کے عمومی مسائل کو بڑے حقیقی انداز میں سامنے لا رہی ہے۔ اس لیے مجھے تو بہت پسند ہے۔ ہاں۔۔۔ مگر اس کی آخری قسط' بس اگلے ماہ آجائے گی۔ یہ پڑھ کر ہمیں کافی حیرت ہے۔ ہمارا خیال تھا کہ نگہت آپی خصوصاً" بلوچستان کے سلگتے مسائل پر تفصیلاً" ضرور لکھیں گی اسی کہانی میں۔

راشدہ رفعت کی تحریر۔۔۔ مئی کے الیکشن زدہ ماحول کی مناسبت سے کافی اچھی اور امید افزا لگی ہے۔

سمیرا حمید کی چھوٹی سی تحریر کا انجام ہمیں بہت خوب صورت لگا۔ ہاں۔۔۔ مگر افسانے کے عنوان پر اعتراض ضرور ہے۔ ان کی ہستیاں خاک نہیں ہوئی تھیں۔ حمیرا' بلکہ وہ دونوں تو خاک میں مل کر گل و گلزار ہوگئے۔ ایک دوسرے کے انتہائی مخلص' رفیق اور سچے قدر دان۔

فرحین اظفر نے بھی من کی آنکھیں کھولنے کا کہہ کر۔۔۔ ایک بڑا اچھا اور ضروری پیغام دیا ہے اور وہ بھی ہمارے مردوں کو۔ آمنہ ریاض کا ناول ابھی تک تو ان کی پچھلی تحریروں سا رنگ جمانے میں ایسا کامیاب نہیں ہے۔ لیکن ہمیں آمنہ سے ابھی تک بہت سا پیار ہے اور پیار کا رنگ تو سب سے گہرا ہوتا ہے نا۔

"پودینے کی چٹنی" اس افسانے کے انجام کا بالکل حقیقت ہونا ہی تو سچائی تھی اور سچائی کا کیا ہو کہ وہ تلخ ضرور ہوتی ہے۔ نزہت شبانہ حیدر نے شاید ماہ نور سے بڑی زیادتی کی ہے۔ اتنی جلدی اس کی جگہ حوریہ کو دے دی۔ ہمیں تو نہیں اچھا لگا یہ۔۔۔ بشریٰ احمد کا "جادو گرنی" تو بلاشبہ۔۔۔ اس شمارے کی جان تھا۔ ہر بیٹی جو کل بہو ہوگی' اس کا حوصلہ بڑھاتا ہوا۔ اللہ اور دعا پر ہمارا کھویا ہوا یقین کامل پھر سے بحال کرتی یہ تحریر سب بچیاں ضرور پڑھیں۔ اللہ جی آپ کو اور بھی بھاگ لگائیں بشریٰ جی! جلدی جلدی سارا رسالہ ختم کرکے رات گئے سب کے سونے کے بعد ہم مکمل سکون سے اپنے بستر میں لیٹ کر جس تحریر کا مزا لیتے ہیں' ہماری بیڈ ٹائم اسٹوری' جی ہاں اپنی بہت اچھی' عنیزہ سید کی تحریر اور کون بھلا۔ وہ لکھتی کہاں ہیں۔ سحر طاری کرتی ہیں۔ یہ بات صرف میں نہیں کہتی۔ چھوٹی بہن آمنہ کے خیالات بھی کچھ ایسے ہی ہیں۔ لاہوری میکے میں اس بار الیکشن کی گہما گہمی ہے۔ خدا کرے سب کے سب نتیجے میرے پیارے پاکستان کے لیے بہت ساری خیر اور خوشی لے کر آئیں۔ (آمین ثم آمین)

ج ۔ پیاری عائشہ! آپ کا مخصوص لفافہ اور تحریر دیکھ کر دل میں خوشی کی لہری اٹھی کہ عائشہ نے مدت بعد یاد کیا ہے یقیناً" بہت اچھا افسانہ یا ناولٹ بھیجا ہوگا۔ صرف خط دیکھ کر تھوڑی سی مایوسی ہوئی۔ لیکن یہ بھی خوشی کی بات ہے کہ کسی بھی حوالے سے سہی آپ نے ہمیں یاد کیا۔ خواتین ڈائجسٹ سے آپ کے تعلق کا آغاز بھی خط ہی تھا۔ جس کو پڑھ کر ہم نے آپ کو افسانے لکھنے کا مشورہ دیا تھا۔ یقیناً" خواتین ڈائجسٹ پر آپ کا پورا حق ہے۔ یہ تو بتائیے کہ قلم سے رشتہ کیوں توڑ رکھا ہے۔ ایک آدھ ماہ موڈ کا بہانا چل سکتا ہے۔ دو' تین ماہ فرصت اور ذمہ داریوں کی بات کی جاسکتی ہے اور اب تو پیاری سی دیورانی بھی ذمہ داریوں میں حصہ بٹانے آگئی ہے۔ پھر اتنی طویل خاموشی کیوں؟ فٹافٹ افسانہ یا ناولٹ لکھ کر بھجوائیں۔ آپ کی کمی ہمیں بے حد محسوس ہو رہی ہے اور یقیناً" قارئین کو بھی۔

فرحین اظفر۔۔۔ کراچی

میں نے یہ خط بطور خاص اپنی لکھاری بہن سائرہ رضا کی وجہ سے لکھا ہے۔ میں ان کے بارے میں چند الفاظ کہنا چاہتی ہوں۔ سائرہ رضا! پہلے تو آپ کو "یقین کامل" جیسا خوب صورت ناول لکھنے پر بہت مبارک باد۔ سائرہ' بلاشبہ رخسانہ نگار اور فائزہ افتخار کے بعد وہ رائٹر ہیں۔ جن کی تھوڑی سی تحریروں میں بھی میں نے بہت نیا پن دیکھا۔ یہاں پر نایاب جیلانی جیسی کم عمر مگر منجھی ہوئی رائٹر کا ذکر نہ کرنا ناانصافی ہوگی اور موضوعات کا تنوع افسانہ نگار' ایک سے بڑھ کر ایک کردار' فائزہ جی کے پاس تھا۔ سائرہ کے انداز میں ان ہی کی جھلک ہے۔

ج ۔ فرحین! آپ کی کہانی خواتین ڈائجسٹ میں شامل ہے۔ آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے سائرہ رضا تک پہنچا رہے ہیں۔

مدثرہ فردوس صدیقی۔۔۔ جہلم

ناولٹ میں سے "جادو گرنی" نے بہت متاثر کیا اور اللہ کی ذات پر توکل کو اور بھی مضبوط کردیا۔ "ماہ تمام" کی کہانی میں جو شفا کے کردار کا دوسرا رخ دکھایا گیا تو بہت دھچکا لگا اور باقی سب ناولٹ اور افسانے اچھے لگے۔ لیکن سب سے زیادہ "زمین کے آنسو" نے متاثر کیا۔ درحقیقت جب میں پاکستان دشمنوں کے بارے میں نگہت سیما کے الفاظ پڑھتی ہوں تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے میرے تخیل اور احساسات کو زبان مل گئی ہو۔

ج ۔ مدثرہ! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ ناولٹ ابھی پڑھا نہیں۔ اس لیے کوئی رائے دینے سے قاصر ہیں۔

سحر خان۔۔۔ کوئٹہ

جس طرح کوئی بے حد حسین' کوئی بے پناہ خوب صورت چہرہ آپ کو باندھ لیتا ہے۔ آپ کی قوت گویائی رہن رکھ لیتا ہے۔ بالکل اسی طرح تیس دن بعد بھی میں "یقین کامل" کی تعریف میں ایک لفظ بھی کہنے سے قاصر ہوں اور ناول کا ایک بہترین جملہ "جو دعا کرتا ہے وہ خدشہ نہیں پالتا" دوسرا جملہ "مائیں' بیٹیوں کو کوکھ میں ہی رکھیں" پورا ناول جملوں کی صورت قلم کی طرح ذہن میں چل رہا ہے۔ اب کون سا جملہ لکھوں جو بہترین ہو۔ پورا ناول ہی بہترین ہے۔ سائرہ رضا صاحبہ "برف کا موسم" اماں کا شفو اور "یقین کامل" آپ کے قلم کے وہ شاہکار جو ہمیشہ یاد رہیں گے۔ آپ کو بہت مبارک ہو۔ عنیزہ سید آپ کا نام ہی معتبر و معزز ہے کہ تعریف کے لیے چھوٹا سا لفظ بھی اس خوف کے زیر اثر رہتا ہے کہ کہیں جذبات میں آکر کوئی گستاخی نہ ہوجائے۔ "کوہ گراں تھے ہم" یقیناً" بے حد مقبول ہونے والا ہے اور آپ کی حقیقتاً" جو بات بے حد اچھی ہے۔ آپ کے ناولز میں غیر ضروری رومانس نہیں ہوتا۔ دوسری اچھی بلکہ بہترین بات آپ کا کوئی ناول یا ہمارا کوئی پسندیدہ کردار کبھی ٹیلی ویژن پہ نظر نہیں آئے گا۔ اللہ آپ کو بہت خوش رکھے۔ (آمین) سعدیہ عزیز صاحبہ آخر افسانوں پہ گزارہ کب تک ہو۔ کوئی بے حد گہرے معنی لیے طویل ناول ہوجائے۔ نعیمہ ناز سلطان صاحبہ مکمل ناول کا نام تخلیق بے حد مکمل تھا۔ نگہت سیما

صاحبہ "زمین کے آنسو" ابھی تک پڑھا نہیں۔ لیکن چھوٹی سی گزارش ہے ناول کو مزید طویل مت کیجیے گا۔ اگرچہ آپ کا موضوع نہایت توجہ کا حامل اور حساس ہے۔ مگر طوالت ہر بار پر اثر نہیں ہوا کرتی۔

ج ۔ پیاری سحر! سائرہ رضا اور دیگر مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جارہی ہے۔ "اماں کاشفو" سائرہ رضا کی نہیں سعدیہ عزیز آفریدی کی تحریر تھی۔

ایس عطاریہ۔۔۔ بھلوال ضلع سرگودھا

جون میں میرا خط چھپا تو میں بے حد خوش تھی۔ میں نے اپنے خط کے بارے میں اپنی امی کو بتایا تو وہ کہنے لگیں۔ "میری بیٹی تو خوشی سے پاگل ہوجائے گی" جون میں میری پیاری امی جان کی وفات ہوگئی۔ آپ لوگ سوچ بھی نہیں سکتے ہمارا سارا گھر بکھر کے رہ گیا۔ ایک دفعہ تو میرا دل دنیا کی تمام چیزوں سے اچاٹ ہوگیا۔ لیکن جب میں نے ثمینہ اکرم (کراچی) ان کے بیٹے معیز کی خبر پڑھی تو احساس ہوا کہ وہ ایک ماں تھیں۔ انہوں نے اپنا بیٹا وہ بھی جوان کھو دیا۔ تو مجھے بھی حوصلہ کرنا چاہیے۔ "زمین کے آنسو" کی تعریف نہ کروں تو یہ بڑی خود غرضی ہوگی۔ نہ جانے احمد رضا راہ راست پہ آئے گا یا نہیں۔ حورعین اریب فاطمہ کیا ایک شاہ کی بن پائے گی؟

ج عطاریہ! ہم آپ کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ ماں کا سایہ سر سے اٹھ جانا بہت بڑی محرومی ہے۔ لیکن صبر تو کرنا ہے کہ جو بھی بشر اس دنیا میں آیا ہے۔ اسے لوٹ کر جانا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صبر و جمیل سے نوازے اور والدہ کی مغفرت کرے۔ (آمین)

سندس۔۔۔ مانگا منڈی

"جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو" زبردست رہا۔ نگہت عبداللہ کا "میرے خواب لوٹا دو" بڑا زبردست جارہا ہے۔ اسٹوری کافی اچھی چل رہی ہے۔ نگہت سیما کا "زمین کے آنسو" بھی بہترین جارہا ہے۔ عنیزہ جی کی کیا بات ہے۔ جتنی تعریف کی جائے اتنی کم ہے۔ ناول پر کیا گرفت ہے' مزا آیا۔ مجھے سعد کا کردار بہت پسند ہے۔ بڑا نایاب کردار ہے۔ کہانی ایسے چل رہی ہے کہ کسی طرف بھی پلٹا کھا سکتی ہے اور مجھے آسیہ رزاقی کے ناول "خنجر کیوں نہ ملا" کی قیمت بھی بتادیں۔

ج ۔ سندس! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کا شکریہ۔ آسیہ رزاقی کا یہ ناول خواتین ڈائجسٹ میں شائع ہوا تھا۔ ابھی تک کتابی شکل میں نہیں آیا ہے۔ کہانی بھجوانے کے لیے ایڈریس وہی ہے۔ جس ایڈریس پر آپ نے خط بھجوایا ہے۔

شمائلہ نصیر عاجز۔۔۔ گاؤں کرپا اسلام آباد

کہتے ہیں نا' جسے کاٹنا مشکل ہو وہ بونا ہی نہیں چاہیے۔ (مگر پھر کھائیں گے کہاں سے) جیسے اب گندم کی کٹائی ہمارے سر پر آفت بن کر ٹوٹی۔ ایک تو گھر کے کام نے دن میں تارے دکھائے' ہم سے نازک مزاجوں کو وہیں رسالہ بھی دن بہ دن چھوٹتا رہا۔ حد جا کر ختم ہوئی سولہ مئی۔ پر بک ہا۔۔۔ اور رسالہ پکڑتے ہی ہم نے لہک لہک کر گایا "بڑی مشکل سے ہوا تیرا میرا ساتھ۔۔۔" فیضان خواجہ کا انٹرویو اچھا لگا۔ "جو رکے تو کوہ گراں تھے ہم" اس مرتبہ اتنی زبردست تھی کہ کیا کہوں۔ کھاری کی خوشی میں ہم خوش' البتہ سعدیہ کے بارے میں آپا رابعہ کی سوچ؟ چلو جی سعد تو لگتا ہے آپا رابعہ کا بیٹا ہوگا۔ عنیزہ سید آپ نے زبردست سے اوپر کی کہانی لکھی۔ جہاں تک بات ہو فیورٹ "زمین کے آنسو" کی تو۔۔۔ تو اتنا رونا آیا' جب کوئی گھر میں داخل ہوتا ہے تو کیا ہم نہیں دیکھتے کہ باہر سے آکر انارکی پھیلائی جارہی ہے اور ہم پڑے سو رہے ہیں۔ کون کہتا ہے نوجوان نسل مخلص نہیں۔ محب وطن نہیں۔ میں تو جب پاکستان نام ہی سنتی ہوں تو عقیدت سے پلکیں جھک جاتی ہیں۔ آنسوؤں سے آنکھیں بھر آتی ہیں۔ جان

چھوٹی چیز ہے وارنے کو اور شکر ایک شاہ نے کچھ تو پیش قدمی کی اور زمین کی کہانی زبردست' احمد رضا کو پلٹنا چاہیے۔ اس کے ماں' باپ اور بہن کا غم اپنا لگتا ہے۔ ہدایت دے (آمین) نگہت سیما آپ نے دل جیتا ہے۔ یہ کوئی چھوٹی بات نہیں۔ "میرے خواب لوٹا دو" یا ثمین پچھتائیں' پلٹیں۔ ویسے ہم کتنے عجیب ہیں۔ ہزاروں سال سے زمین ایک ہی رستے پر چکر کاٹ رہی ہے۔ ایک ہی کہانی چلتی آرہی ہے۔ غلطی' پچھتاوا' معافی' پلٹنا اور رکنا' ہم سامنے چلتی کہانی سے ہی سبق کیوں نہیں حاصل کرلیتے۔

ج ۔ شمائلہ! آپ کا خط پڑھ کر احسان دانش یاد آگئے۔ اپنی سوانح جہان دانش میں انہوں نے لکھا ہے۔ "میں نے پتھر ڈھوئے' راج مستری کا کام کیا' ہر طرح کی مزدوری کی' لیکن فصل کی کٹائی سے زیادہ مشکل کام کوئی نہیں پایا۔" اتنی سخت گرمی میں جلتے آسمان کے نیچے جب زمین سے انگارہ بنی ہوئی ہو فصل کی کٹائی آسان کام نہیں ہے۔ ہمارے محنت کش' جفاکش کسان بہت عظیم ہیں جو سخت محنت کرکے ملک کو اناج مہیا کرتے ہیں۔ کاش انہیں اس محنت کا پورا صلہ بھی دیا جائے۔ خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جارہی ہے۔ آپ کی کہانی ابھی پڑھی نہیں گئی ہے۔

کہکشاں صابر۔۔۔ کویت

خط لکھنے کی پہلی وجہ یہ ہے کہ یہاں خواتین کے پرچے بہت مشکل سے ملتے ہیں۔ مگر میں نے بھاگ دوڑ کی اور خریدے۔ سب سے پہلے خطوط کی جانب بڑھے اور اپنا خط نہ دیکھ کر آنکھوں کے پیالے آنسوؤں سے بھر گئے۔ مگر ضبط کا دامن نہ چھوڑا اور سارے سلسلے چھان مارے۔ مگر ہماری بھیجی ہوئی ایک چیز نہ ملی۔ بہت دکھ ہوا۔ امی سے ڈانٹ پڑی اور بہن' بھائیوں کا مذاق الگ۔۔۔ کیونکہ بھیجنے سے پہلے بہت یقین سے کہا تھا کہ لازمی چھپے گا۔ سب سے پہلے افسانے' ناولٹ اور مکمل ناول پڑھا' سب ہی اچھے تھے۔ "متاع جان" کی طرح بکواس تھیں۔ فروری کے شمارے میں صوفیہ بشیر کا ناول "توبہ" شائع ہوا۔ بہت ہی خوب صورت' الفاظ کا چناؤ عمدہ تھا۔ "ساری بھول ہماری" بھی گریٹ تھا۔

ج ۔ پیاری کہکشاں! آپ نے ہمیں اتنی دور سے یاد کیا بہت شکریہ۔ ہمیں افسوس ہے کہ آپ کا خط تاخیر سے موصول ہونے کی بنا پر شامل نہ ہوسکا۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

شفق راجپوت۔۔۔ گوجرہ

میں جس کہانی کی وجہ سے خط لکھ رہی ہوں وہ ہے "کوہ گراں تھے ہم" مجھے تو اس ناول کے ہر کردار سے محبت ہوگئی ہے۔ سعد سلطان اف۔۔۔ کیا کریکٹر بنا ڈالا ہے آپ نے۔ اس کے علاوہ خواتین میں شائع ہونے والی ہر کہانی زبردست اور اصلاحی ہوتی ہے۔ "زمین کے آنسو" بہت اچھی اور ناقابل فراموش کہانی ہے۔

ج ۔ شفق! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ عنیزہ سید اور نگہت سیما تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جارہی ہے۔ بہت مختصر خط لکھا۔ صرف دو کہانیوں پر تبصرہ' آئندہ تفصیلی تبصرہ کے ساتھ شرکت کیجیے گا۔

عفت سعید۔۔۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ

ماڈل تو کبھی کبھار ہی سرورق پر خوب صورت ہوتی ہے۔ بات ہوجائے عنیزہ سید کے شاہکار "کوہ گراں تھے ہم" کی۔ اس ناول کی ہر سطر پر نیا انکشاف' لفظ لفظ میں اتنی گہرائی کہ پڑھنے والا دنگ رہ جائے۔ نگہت سیما کے ناول "زمین کے آنسو" کی اگلے ماہ آخری قسط حیران کر گئی۔ اتنی جلدی اینڈ۔ چلیں جی آخری قسط پڑھ کر قیاس آرائی کریں گے۔ اتنے سارے کردار آپس میں کیسے مل گئے۔ نگہت عبداللہ کا خوب صورت ناول "میرے خواب لوٹا دو" بہت خوب صورتی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ فرحین اظفر کا افسانہ "من کی آنکھیں" بہت خوب صورت تحریر۔ آج کل بہت کم لوگ ہیں جو اعتبار کے قابل ہوتے ہیں۔ کسی پر اندھا اعتبار کرنے کا دور نہیں رہا۔ جب کوئی اعتبار کو ٹھیس پہنچاتا ہے تو بہت دکھ ہوتا ہے۔ آمنہ ریاض کا ناولٹ ماہ تمام اچھا ناولٹ۔ راشدہ رفعت کا ناولٹ بہت خوب

صورت تحریر' نزہت شبانہ حیدر کا مکمل ناول بہت پیارا۔ بشریٰ احمد کا ناولٹ بہت خوب۔ افسانے سب ہی اچھے تھے۔

ج ۔ پیاری عفت! خواتین ڈائجسٹ کی محفل میں خوش آمدید۔ ہمیں خط مل جاتے ہیں۔ لیکن تاخیر سے موصول ہونے کی بنا پر شامل نہیں ہوپاتے ہیں۔ ممکن ہے آپ کا خط بھی تاخیر سے موصول ہوا ہو۔ نگہت سیما کے ناول میں آپ کا خیال صحیح ثابت ہوا۔ اس ماہ آخری قسط نہیں ہے۔

سارہ' مریم' طوبیٰ' کرن ایشاع۔۔۔ سنجر پور

خواتین کے تمام سلسلے اچھے ہیں۔ جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ خواتین میں جتنے بھی ناول چل رہے ہیں

زبردست ہیں۔ خاص طور پر "زمین کے آنسو" تو بہت زبردست ناول ہے۔ رفعت سراج، ماہا ملک، در ثمین بلال، فائزہ افتخار اور نایاب جیلانی سے کچھ لکھوائیں۔ پلیز۔ در ثمین بلال کی کہانی اذان شاہ اور عینا والی پہ کون سے ڈائجسٹ میں کب شائع ہوئی تھی۔ اس کہانی کا نام کیا ہے۔

ج ۔ سارہ، مریم، طوبیٰ، کرن اور ایشاع خواتین کی محفل میں خوش آمدید۔ خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ آپ نے در ثمین بلال کی جس کہانی کے متعلق پوچھا ہے وہ ہمیں یاد نہیں ہے۔ ممکن ہے قارئین میں سے کسی کو یاد ہو۔ اگر کسی قاری بہن نے خط لکھا تو ہم شائع کردیں گے۔ مبارک باد کے پیغام کے لیے معذرت، خواتین ڈائجسٹ کا یہ سلسلہ مبارک بادی کے پیغامات کے لیے نہیں ہے۔ ان صفحات میں صرف خواتین ڈائجسٹ کی تحریروں کے بارے میں تبصرہ شائع کیا جاتا ہے۔

آمنہ شبیر راجہ۔۔۔ کراچی

میں نویں جماعت میں تھی جب پہلی بار خواتین ڈائجسٹ پڑھا۔ اب میں نے بی اے کرلیا ہے اور اب میں نے تین، چار کہانیاں لکھ رکھی ہیں۔ خواتین ڈائجسٹ نے بہت سے رائٹر پیدا کیے ہیں۔ میں چاہتی ہوں مجھے بھی خواتین ڈائجسٹ کی سپورٹ ملے۔

ج پیاری آمنہ! آپ نے کہانیاں لکھ کر اپنے پاس رکھی ہیں، ہمیں بھجوادیں، قابل اشاعت ہوئیں تو ضرور شائع ہوں گی۔ بھجوانے کا پتا یہ ہے۔ خواتین ڈائجسٹ۔۔۔ اردو بازار کراچی۔

سونیا ظریف خان۔۔۔ تحصیل و ضلع گجرات

بہت عرصے سے چھائی خاموشی کو توڑنا ہی پڑا۔ یہ انسانی نفسیات ہے کہ جو آپ کا آئیڈیل ہے۔ آپ اس میں ذرا بھر خامی بھی دیکھنا نہیں چاہتے۔ پرفیکشن ہی پرفیکشن چاہیے ہوتی ہے۔ عرصہ دراز سے خواتین و شعاع کی خاموش قاری ہوں۔ ہر ماہنامہ کا مطالعہ کیا۔ لیکن نگاہ انتخاب خواتین اور شعاع پر ٹھہری۔ گھر والوں کی ناپسندیدگی کے باوجود ان کے ساتھ رشتہ اٹوٹ رہا۔ یہ ہمیں بہت عزیز ہیں۔ بہت کچھ سیکھا، سمجھا، عمل کیا، لیکن کچھ عرصہ وقت سے ان میں کہانیوں سے متعلقہ بہت سی تبدیلیاں رونما ہورہی ہیں جو ہمیں مس فٹ محسوس ہوئی ہیں۔ وہ انفرادیت کم ہوتی نظر آئی ہے۔ سلسلے وار ناولز کے علاوہ مکمل ناول اور کچھ ناولٹ نے انفرادیت کو ضرب پہنچائی۔ پہلے ان رسالوں میں حقیقت نظر آتی تھی جو اب مصنوعی پن میں ڈھلتے جارہی ہے۔ بہت ہی تکلیف ہوتی ہے۔ نئے آنے والے رائٹرز اچھا لکھ رہے ہیں۔ لیکن کہیں کچھ کمی نظر آتی ہے۔

ج ۔ پیاری سونیا! خواتین اور شعاع کے لیے آپ کی محبت کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔ آپ نے کمی محسوس کی تو ہمیں خط لکھا۔ لیکن اچھا ہوتا کہ آپ ان تحریروں کی بھی نشاندہی کردیتیں جو حقیقت سے دور مصنوعی پن کی طرف لے جارہی ہیں۔ اس وقت ہمارے ہاں خواتین میں جو سلسلہ وار تحریریں ہیں وہ نگہت سیما، عنیزہ سید، آمنہ ریاض اور نگہت عبداللہ کی ہیں۔ ان تحریروں کے علاوہ بھی ان مصنفین نے اب تک جو کچھ لکھا ہے، وہ حقائق پر مبنی ہے۔ اس کے علاوہ پچھلے ماہ آمنہ ریاض، بشریٰ احمد، راشدہ رفعت، سمیرا حمید، سدرۃ المنتہیٰ، سارہ ادریس اور فرحین اظفر کی تحریریں تھیں اور ہمارا خیال ہے یہ "تقریباً" تمام تحریریں کسی نہ کسی حوالے سے زندگی کے حقیقی پہلو سے روشناس کراتی تھیں۔

انیس خالق۔۔۔ داجل

میرا چھوٹا بھائی ممتاز انجم بڑے شوق سے خواتین ڈائجسٹ کا مطالعہ کرتا تھا، میں اپنے بھائی کے مطالعے سے بہت متاثر ہوئی اور میرے اندر بھی مطالعے کا جذبہ پیدا ہوا۔ ہم ایک معزز اور شریف گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لیے عورتوں کو باہر نہیں جانے دیتے۔ میں اللہ پاک کے سامنے دعا گو ہوں کہ اللہ پاک خواتین رسالے کے تمام لکھاریوں کو دن دگنی اور رات چوگنی ترقی نصیب فرمائے۔

ج۔ پیاری انیس! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ قبول کریں، لیکن اتنے مختصر خط میں مزہ نہیں آیا۔ آئندہ تفصیلی تبصرے کے ساتھ شرکت کیجیے گا۔

سیدہ تطہیر زیدی۔۔۔ کراچی

مئی کا شمارہ اس سال کے تمام شماروں میں آگے رہا، ہر تحریر قابل تعریف اور بے مثال ہے سب سے پہلے سمیرا حمید کا افسانہ پڑھا شوکت جیسے ذہنی مریض اور شکی لوگوں کی جگہ صرف پاگل خانہ ہے ایسے لوگ نہ خود خوش رہتے ہیں نہ رہنے دیتے ہیں۔ سارا ادریس کا افسانہ بھی مزے دار تھا، میری بہن کو بہت پسند آیا "ہائے بے چاری ماہم" انہوں نے پڑھ کر بڑے افسوس سے تبصرہ کیا۔ سدرہ اور فرحین کا افسانہ بھی بہترین تھا شکر ہے امجد نے بروقت اس کی آنکھیں کھول دیں۔ اب آتی ہوں ناولٹ کی طرف۔ "گھر تو آخر اپنا ہے" واہ بھئی واہ۔ ہنس ہنس کر برا حال تھا۔ خیر مجھے خط لکھنے پر جس کہانی نے مجبور کیا وہ "جادو گرنی" ہے۔ بشریٰ احمد صاحبہ کو تو سلام ہو میرا موضوع کا حق ادا کردیا انہوں نے۔ حقیقت ہے کہ شہربانو جیسے صاف دل و دماغ کے لوگوں کو تنگ کیا جائے تو اللہ اس دنیا میں ہی سزا دے دیا کرتا ہے۔ اختتام شاندار تھا۔ نگہت عبداللہ اچھا لکھتی ہیں۔ "میرے خواب" میں یاسمین کا ماضی پڑھ کر حیرت ہوئی۔ شکر ہے ماں زندہ ہے ورنہ پچھتاوا رہ جاتا۔ اریبہ بیگم کے دل پر شمشیریں چلنے لگیں اب کہانی میں لطف آئے گا۔ ایک کہانی کافی دن پہلے پڑھی تھی۔ اس کے کردار تھے اظہر اور شیمل اگر کسی قاری بہن کو یاد تو اس کے مصنف اور میگزین کا نام بتادیں۔

ج۔ تطہیر! کہانی ضرور بھجوائیں۔ تعلیمی ڈاکومنٹس کی ضرورت نہیں ہے۔ کہانی اچھی ہوئی تو ضرور شائع ہوگی، جو پرانے لوگ آج کل لکھ رہے ہیں، کبھی یہ بھی نئے تھے۔ ادارہ خواتین کے ذریعے ان کی صلاحیتیں سامنے آئیں جو نئے نام سامنے آرہے ہیں۔ ان شاء اللہ ایک دن بڑے نام ہوں گے۔ خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کی لیے شکریہ۔

ماریہ سندس۔۔۔ چکوال

ناول "میرے خواب لوٹا دو" بہت ہی خوب صورتی سے آگے بڑھ رہا ہے، مگر اتنی چھوٹی سی قسط، پلیز کچھ تو قسط کو لمبی کردیں۔

"کوہ گراں تھے ہم" یہ اسٹوری بھی بہت اچھی ہے۔ ضرور "سعد سلطان" کا اور آپا رابعہ کا کوئی گہرا تعلق ہے۔ "زمین کے آنسو" اب جاکر احمد رضا کو عقل آرہی ہے۔ آخری قسط میں جو بھی ہو، بس احمد رضا کو اس گندگی سے نکال کر اس کے والدین سے ضرور ملوادیں۔

"ہم سادہ ہی ایسے تھے" کچھ خاص اچھا نہیں لگا۔ "معذرت" کے ساتھ۔ "تقریباً" ہر بار ڈائجسٹ میں وہ کہانی شائع ہوتی ہے جس میں بہو سیدھی سادھی اور مظلوم ہوتی ہے اور ساس، نند ظالم، جب کہ آج کے دور میں تو بہو بہت چالاک ہوتی ہے اس کی چالاکی کے آگے تو ساس، نند کی چالاکی کچھ بھی نہیں ہوتی۔

افسانوں میں "سمیرا حمید" پہلے نمبر پر ہیں اور باقی سب افسانے اچھے تھے۔ "مریم عزیز" سے درخواست ہے کہ کوئی اچھا سا ناول لکھیں، ان کے ناول، ناولٹ بہت اچھے لگتے ہیں۔ "مریم عزیز" اور "نبیلہ عزیز" کے چند ناول، ناولٹ کے نام بتادیں اور کیا یہ کتابی شکل میں موجود ہیں۔

ج۔ پیاری ماریہ! ہم آپ سے متفق نہیں ہیں۔ آج کا دور ہو یا پرانا دور نہ ساس میں خرابی ہوتی ہے نہ بہو بری ہوتی ہے۔ ہر انسان اپنی فطرت پر ہوتا ہے کچھ لوگ کشادہ دل اور محبت کرنے والے ہوتے ہیں اور کچھ تنگ دل اور حاسد۔ اور تنگ دل، حاسد لوگ جس روپ میں بھی ہوں۔ خراب ہوتے ہیں۔ آپ کا تفصیلی تبصرہ اچھا لگا۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جارہی ہے۔ مریم عزیز کا ناولٹ کا مجموعہ دل کے موسم اور نبیلہ عزیز کا ناول کوئی ایسا اہل دل ہو کتابی شکل میں آچکا ہے۔ کتابوں کے بارے میں کوئی بھی تفصیل جاننے کے لیے اس نمبر پر فون کرلیں۔ یہ مکتبہ عمران ڈائجسٹ، کا نمبر ہے۔ 021-32216361

11 مئی

مسز ہدایت، مردان

11 مئی کی شب ہم نے اپنے، شوہر جی ہدایت صاحب اور بچوں کے لیے نئے کپڑے الماری سے نکالے۔ جوتے بھی ساتھ رکھے۔ تاکہ صبح سویرے گاؤں یعنی سسرالی حلقے میں پہنچ کر تعمیر پاکستان میں اپنا حصہ ڈال دیں۔ جب سے انتخابات کی گہما گہمی شروع ہوئی تھی۔ ہم نے اپنا قومی شناختی ڈھونڈ ڈھانڈ کرا پنے پرس میں رکھ لیا تھا۔ پہلی دفعہ ووٹ ڈالنے کی خوشی اپنی جگہ۔ لیکن ہم انتخابات کی تیاری کو تحریک پاکستان اور خود کو تحریک پاکستان کی نامور مجاہدہ سمجھتے رہے۔

11 مئی کی صبح ہدایت اور بچوں کے ناشتا کرنے کے بعد خود ناشتا کرنے لگے تھے کہ ٹی وی اینکو نے کہا۔ "پہلے ووٹ کاسٹ کریں۔ ناشتہ بعد میں کیجیے" اس درخواست کو ہم نے سر آنکھوں پر قبول کیا کہ آج قوت اخوت عوام کا خاص طور پر مظاہرہ کرنا تھا۔

گاڑی میں بیٹھ گئے۔ خود کو تسلی دی کہ گاؤں پہنچ کر دس بجے تک ووٹ ڈالنے کے بعد ناشتا کریں گے۔ لیکن آدھے راستے میں معدہ نے دہائی دی کہ خالی پیٹ قطار میں کیسے کھڑے ہوں گے۔ جبکہ ہمارا تو بلڈ پریشر بھی جلدی گرنے لگتا ہے۔ لہٰذا ایک سی این جی اسٹیشن پر جوس اور کیک لے کر مطلوبہ توانائی حاصل کی۔

مردان سے گاؤں کالوخان جانے کے لیے دو راستے ہیں۔ ایک مردان صوابی مصروف روڈ جو آبادی کے درمیان گزرتا ہے جبکہ دوسری سرسبز کھیتوں کے درمیان پکی سڑک جسے بائی روڈ کہتے ہیں، عام حالات میں ہم اس کھیتوں والی سڑک کا انتخاب کرتے ہیں۔ لیکن آج آبادی والے راستے کو چنا۔ تاکہ راستے میں لوگوں کا جوش و خروش اور پولنگ اسٹیشنوں کا حال بھی معلوم ہو۔

اور واقعی ووٹروں کی لمبی قطاریں دیکھ کر دل خوشی سے لبریز ہو گیا۔ آج کے دن ہمیں منٹو صاحب کے افسانے کا "استاد منگو" بطور خاص یاد آیا۔ جو نئے قانون کا نفاذ دیکھنے کے لیے لاہور کی سڑکوں پر نکلا تھا۔

گاؤں پہنچ کر اپنی نند کرن اور بابی (میری ساس) سے کہا کہ "ابھی ووٹ ڈالنے چلتے ہیں۔"

لیکن انہوں نے کہا کہ "لنچ اور نماز ظہر کے بعد چلیں گے۔"

دل بجھ گیا۔ لیکن کہا کچھ نہیں کہ آج خوشی اور مسرت کے دن ہمیں کسی سے اختلاف نہیں کرنا تھا۔ البتہ ووٹ سب کو اپنی مرضی سے دینا تھا۔

چائے پینے کے بعد ہم کچن میں چلے گئے۔ بابی نے چاول بھگو دیے تھے اور گوشت چولہے پر چڑھا کر آٹا گوندھ رہی تھیں۔

میرا دل ووٹ ڈالنے سے پہلے کسی کام کے لیے راضی نہیں تھا۔ پھر بھی ان سے پوچھ لیا کہ "میرے کرنے کا کوئی کام ہو تو بتا دیں۔" جواب میں انہوں نے صرف مسکرا کر ہماری طرف دیکھا اور ہم یعنی ان کی ذہین اور سمجھ دار بہو ان کا جواب سمجھ گئی۔ جو یہ تھا کہ چوبیس افراد کا لنچ تیار کرنا ہے اور پوچھ رہی ہو کہ۔۔۔؟

ویسے اگر تمام ساس اور بہوئیں اس انداز گفتگو کو اپنا لیں تو سمجھو انقلاب آہی گیا۔

چوبیس افراد کے اس خاندان کے سربراہ میرے سسر ہیں۔ اللہ ان کو سلامت رکھے، ان کی چار چھوٹی اولادیں دوسری بیوی یعنی میری موجودہ ساس سے ہیں اور تین شادی شدہ بیٹے، ان کی بیویاں اور ہر ایک کے چار، چار بچے۔

مرد حضرات ووٹ ڈال کر آگئے۔ کھانے کے لیے دسترخوان بڑے کمرے میں بچھایا جس پر خاندان کے تمام افراد نے مل کر کھانا کھایا۔

سیاسی طور پر تمام افراد خانہ چار پارٹیوں میں تقسیم تھے۔ کھانے کے بعد خواتین کا قافلہ اپنی اور ملکی تقدیر بدلنے کے لیے پولنگ اسٹیشن روانہ ہوا۔ قریب پہنچ کر اپنے اوپر آیت الکرسی دم کی۔ تاکہ کسی قسم کی دہشت گردی سے محفوظ رہیں۔

گرلز ہائی اسکول کے سات کمروں میں پولنگ پوائنٹ تھے۔ جبکہ گراؤنڈ میں عورتوں کا جم غفیر تھا۔ اٹھارہ سال کی لڑکیوں سے لے کر لاٹھی ٹیکتی اماّئیں، سب کی سب صبح کے بجائے دو بجے کے بعد آئی تھیں۔ ووٹرز لسٹ کہیں آویزاں نہیں تھی۔ سب عورتیں ایک ایک کمرے میں جا کر اپنا نام لسٹ میں دیکھ رہی تھیں۔ جبکہ لسٹ پولنگ ایجنٹوں کے قبضے میں تھی۔ آخر کار چوتھے کمرے میں اپنے نام اور ووٹ کی تصدیق کی۔ لیکن رش کے باعث پولنگ عملے تک پہنچنا مشکل تھا۔ عورتوں نے عملے کو گھیرے میں لے لیا تھا اور سب اپنی باری کے لیے شور مچا رہی تھیں۔ یوں لگ رہا تھا کہ شہد کی مکھیاں اپنے چھتے پر بیٹھی بھنبھنا رہی ہیں۔

عورتوں کے اس جمگھٹے میں گھسنا ہم نے خلاف تہذیب سمجھا اور نسبتاً خالی جگہ پر اسٹول پر بیٹھ کر اپنی باری کا انتظار کرنے لگے۔

دروازے میں پولیس کا سپاہی تماشا دیکھنے کھڑا تھا اور مزید عورتیں اندر آرہی تھیں۔ ہم نے تعلیم یافتہ ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے دوسروں کو لائن بنانے کی ترغیب دی اور خود پہل کرتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔ لیکن نہ ہمارے پیچھے کوئی کھڑی ہوئی۔ نہ کسی نے آگے کھڑے ہو کر ساتھ دیا۔ ہمیں اپنے آپ پر بہت ترس آیا اور خفت مٹانے کے لیے اپنی پانچ گز سے بنی صوابی کی مخصوص چادر سے پسینہ پونچھنے لگے اور دوبارہ بیٹھ گئے۔

چار بج چکے تھے، عورتوں کا رش یقیناً "توقع سے بڑھ کر تھا اور اسٹاف کم۔ شدید گرمی اور پینے کا پانی ندارد۔ ووٹرز عورتوں کا جوش خروش، بدتمیزی، گالم گلوچ اور دھکم پیل میں تبدیل ہو گیا۔ ہوائی فائرنگ ہوئی۔ مردوں کے جھگڑنے کی آوازوں اور پھر مردوں کے خواتین والے حصے میں داخل ہونے سے خوف و ہراس پھیل گیا۔ کسی نے آرمی کے پہنچنے کی افواہ پھیلائی۔ شور و غوغا بڑھنے لگا۔ ہم اپنی ساتھی خواتین کے ساتھ دیوار کی ساتھ کھڑے رہے اور حالات مزید خراب ہونے کی صورت میں "خود کو شہید جمہوریت" تصور کرنے لگے۔

پولنگ روک دی گئی۔ بیلٹ باکس اٹھا لیے گئے۔ جھگڑے کی کوئی وجہ معلوم نہ ہو سکی۔ ہمارا سارا جوش، ولولہ آنسوؤں میں بہنے کو تیار تھا۔ انقلابی دل یہ سوچ کر ہلکان ہو رہا تھا کہ ہمارے اور تقریباً "دو ہزار مزید عورتوں کے ووٹ ڈالے بغیر انقلاب اور تبدیلی کیونکر ممکن ہے؟

آنکھوں میں آنسو بھرے، مردہ قدموں سے گھر کو روانہ ہوئے۔ پولنگ اسٹیشن پر آخری نظر ڈالتے ہوئے دل نے دہائی دی کہ۔۔۔

"بہت بے آبرو ہو کر تیرے کوچے سے ہم نکلے"

اب گھر پہنچ کر بچہ پارٹی یعنی بغیر شناختی کارڈ کے نوجوانوں کا سامنا کیسے کیا جائے۔ جنہوں نے ہمیں اپنا نمائندہ مان کر ووٹ ڈالنے بھیجا تھا۔ سب کی اپنی اپنی پارٹی تھی۔ لیکن ہم نے دو نفل پڑھ کر اللہ سے رہنمائی مانگی تھی کہ اس نشان پر ٹھپہ لگا سکیں۔ جس سے پاکستان کی بہتری ہو۔

گھر پہنچ کر ہم نے بوکھلاہٹ میں کہا کہ ہم ووٹ ڈال کے آئے ہیں۔ جبکہ اصل اطلاع ہم سے پہلے گھر پہنچی تھی۔

سب نے آگے بڑھ کر ہمارا انگوٹھا دیکھا۔ جس پر سیاہی کا نشان موجود نہیں تھا۔ "انگوٹھا دکھائی" کی اس رسم کے اختتام پر نوجوانوں کے ساتھ مردوں نے بھی خوب مذاق اڑایا کہ "نکلی تھیں تقدیر بدلنے اور ایک ووٹ نہ ڈال سکیں۔"

اب اس میں ہمارا کیا قصور؟ قصور تو ہمیشہ دوسروں کا ہوتا ہے۔ پھر بھی خود سے عہد کیا کہ جو بھی ہو، آئندہ صبح سویرے ووٹ کے لیے جائیں گے۔

خبریں وبریں

تبصرہ نشاط

نمک

معروف اداکارہ وینا ملک کو اگر پاکستانی شوبز کی تاریخ کی سب سے متنازعہ اداکارہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ محمد آصف کے ساتھ وینا ملک کا جھگڑا آپ کو یاد ہو گا ہی۔ محمد آصف سے گہری دوستی اور پھر علیحدگی کے بعد وینا ملک نے محمد آصف پر میچ فکسنگ کے الزامات لگائے تھے۔ اسی الزام کے تحت آئی سی سی نے محمد آصف پر کرکٹ کھیلنے پر پابندی لگادی تھی۔ وینا ملک نے عالمی میڈیا کے سامنے محمد آصف کے بھارتی بکی دھیرج دکشت کے ساتھ گہرے تعلقات کا الزام عاید کیا تھا۔ تاہم اتنا عرصہ گزرنے کے بعد اب یہ الزام اس وقت غلط ثابت ہوا، جب بھارت نے آئی پی ایل میں اسپاٹ فکسنگ کے حوالے سے تحقیقات کیں۔ اس ضمن میں دھیرج دکشت کے بارے میں انکشاف ہوا ہے کہ وہ بکی نہیں، بلکہ ایک اسپورٹس فوٹوگرافر ہیں۔ ان تحقیقات میں دھیرج دکشت نے اب انکشاف کیا ہے کہ انہوں نے وینا ملک پر ستر کروڑ روپے ہرجانے کا دعوا دائر کر دیا تھا۔ تاہم وینا ملک نے ان سے معافی مانگ لی۔ وینا ملک کا کہنا ہے کہ دھیرج دکشت کو بکی سمجھنے میں ان کا کوئی دوش نہیں۔ کیونکہ انہوں نے محمد آصف کی دوستی کے عرصے میں دیکھا تھا کہ دھیرج اکثر محمد آصف کو میسج کرتے تھے۔ وینا نے آصف سے پوچھا کہ یہ کس کا نمبر ہے۔ اس پر آصف نے ہی انہیں بتایا تھا کہ یہ ایک بکی کا نمبر ہے۔

اور وینا جی اتنی سادہ نکلیں کہ انہوں نے یہ بھی نہ سوچا کہ آصف ایک مشہور کرکٹر سہی، مگر ہیں تو ایک کم عمر جذباتی نوجوان ہی نا۔ جو صنف مخالف پر رعب ڈالنے کے لیے بھی ایسا کہہ سکتے ہیں۔ جس کا مقصد محض یہ جتانا ہو کہ "دیکھو! میں کتنا بڑا کرکٹر ہوں کہ ٹیم کی فتح و شکست کا دارومدار مجھ ہی پر ہے۔ جب ہی تو بکیز مجھ سے رابطہ کرتے ہیں۔" اور تو اور وینا نے میسجز پڑھنے کی زحمت بھی نہ کی (پڑھنا آتا تو پڑھتیں نا!) انہوں نے آصف کی بات کا یقین کرلیا۔۔۔ اور ان سے جھگڑے کے بعد دنیا کو بھی یقین کرادیا۔

دھیرج دکشت چونکہ بھارتی ہیں۔ ان کے اس معاملے میں ملوث ہونے سے بھارت کا وقار مجروح ہو رہا تھا۔۔۔ اور وینا جی ابھی پتا نہیں کتنے عرصے تک بھارتی نمک کھانا چاہتی ہیں۔ لہٰذا انہوں نے دھیرج دکشت سے تو معافی مانگ لی۔ مگر پاکستان اور محمد آصف کا کیا؟ (کہتے ہیں، پاکستان میں دنیا کی سب سے بڑی نمک کی کان موجود ہے۔۔۔ تو وینا جی! کیا اتنی بڑی کان کے نمک میں ذرا سی بھی تاثیر نہیں؟)

حقیقت

کہا جاتا ہے کہ ذرائع ابلاغ کے ادارے رائے عامہ کی تشکیل کرتے ہیں۔ وہ جو چاہیں، خواص و عوام کو بھی باور کرادیں۔

عالمی میڈیا مغربی اقوام عالم کے اشارے پر ایک عرصے سے مسلمانوں کو دہشت گرد قرار دینے پر مصر ہے۔ (بدقسمتی سے ہمارا میڈیا بھی اس کارِ بد میں شریک ہے) تاہم زور و شور سے جاری اس مہم کے باوجود بھی کبھی نہ کبھی حقیقت اس جھوٹ کا پردہ چاک کرکے نمایاں ہو ہی جاتی ہے۔ (وہ بھی خود ان گوروں ہی کے ہاتھوں۔)

گوانتاناموجیل امریکا کی وہ بدنام زمانہ جیل ہے، جسے 9/11 کے واقعے کے بعد مسلمانوں سے بھر دیا گیا اور پھر ان قیدیوں کو ظلم و ستم کے کوہ گراں تلے دبا دیا گیا۔ اسی جیل کے ایک سابق گارڈ ٹیری ہولڈ بروکس نے وہاں موجود قیدیوں کے کردار سے متاثر ہو کر اسلام قبول کرلیا ہے۔ (سبحان اللہ) ٹیری ہولڈ اس جیل میں 2003ء سے تعینات تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ انہیں واضح طور پر ہدایت کی گئی تھی کہ ان قیدیوں کے ساتھ جانوروں کا سا سلوک کرنا ہے۔ انہیں ہر دو گھنٹے بعد ایک سیل سے دوسرے سیل میں منتقل کرنا ہے۔ ٹیری کا کہنا ہے کہ وہ خود اس کام سے اکثر جھنجلا جاتے تھے۔ تاہم مسلمان قیدیوں نے ہمیشہ صبر و استقامت کا مظاہرہ کیا۔ وہ ہر وقت قرآن پاک کا مطالعہ کرتے اور دیگر عبادات میں مشغول رہتے۔ ٹیری اس پر حیران ہوتے کہ اتنے ظلم و ستم کے باوجود یہ اتنے پرسکون کیوں ہیں۔ آخر انہوں نے قیدیوں سے دریافت کیا تو انہوں نے کہا کہ "خدائے واحد و یکتا پر یقین کامل ہمیں کوئی شکوہ کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔" ٹیری نے اس بات کو ڈھکوسلہ سمجھا۔ انہوں نے راتوں کو قیدیوں کی گفتگو ریکارڈ کی۔ یہ سوچ کر کہ اس وقت ضرور یہ لوگ دہشت گردی کے منصوبے بناتے ہوں گے۔ مگر ٹیری کی یہ سوچ بھی غلط ثابت ہوئی۔ کیونکہ اس وقت بھی وہ لوگ مذہب، سیاسیات اور فلسفے پر ہی گفتگو کرتے۔ پھر ٹیری کے دل میں اس دین اور اس کتاب کا مطالعہ کرنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ ان کے مطالبے پر ایک قیدی نے انہیں قرآن پاک کا انگریزی ترجمہ مطالعے کے لیے دیا۔ ٹیری کا کہنا ہے کہ "میں نے قرآن پاک کے مطالعے سے قبل عیسائیت، یہودیت، بدھ مت اور ہندو ازم کا مطالعہ کر رکھا تھا۔ مگر قرآن پاک کے مطالعے سے مجھے احساس ہوا کہ یہ کتاب تحریر کرنا کسی انسان کے بس کی بات نہیں۔" چنانچہ ٹیری نے اسلام قبول کرلیا۔ ان کا اسلامی نام مصطفیٰ عبداللہ ہے۔

(اگر گوانتاناموجیل کے محافظین کو قیدیوں سے جانوروں کا سا سلوک کرنے کی ہدایت ہے تو پھر تو انہیں قیدیوں کے ساتھ بہت اچھا سلوک کرنا چاہیے۔ کیونکہ گوروں اور جانوروں کی محبت کوئی ڈھکی چھپی بات کہاں۔ اکثر گوروں نے تو اپنے پالتو جانوروں کے

نام جائیدادیں تک منتقل کردی ہیں۔ اوہ! ہاں..... یہ محبت و سلوک وہ اپنے "پالتو" جانوروں کے ساتھ کرتے ہوں گے۔ مگر اس وقت تک، جب تک وہ "پالتو" رہتے ہوں۔ مغربی اقوام عالم اسلام سے خوف زدہ ہیں۔ اسی لیے وہ اسلام کو دہشت گردی کا مذہب باور کرانے پر تلے ہوئے ہیں۔ وہ طاقت اور جنگ کے زور پر اسلام اور مسلمانوں کو ختم کرنے کے درپے ہیں۔ تاہم اسلام اتنی ہی تیزی سے مزید پھیل رہا ہے۔ کیونکہ

ناوک سے، نہ خنجر سے، نہ شمشیر سے بڑھا ہے
اسلام تو اخلاق پیمبر سے بڑھا ہے۔)

کچھ اِدھر اُدھر سے

☆ 28 مئی..... ایک یادگار دن

میں ایوان صدر میں جناب رفیق تارڑ کے پریس سیکریٹری کے طور پر تعینات تھا۔ بھارت کے دھماکوں کے ایک آدھ دن بعد ہی وزیراعظم نواز شریف صدر تارڑ سے ملنے آئے اور طے کرلیا کہ بھارت کو اس کے سکہ رائج الوقت میں ہی جواب دیا جائے گا۔ باقی سب کہانیاں ہیں کہ کس نے کیا کہا۔

ہمارے دوستوں سمیت امریکا اور یورپی ممالک کا دباؤ آیا۔ اس سے کئی گنا شدید جس کے سامنے "میں کسی سے ڈرتا ورتا نہیں" نے دو منٹ میں گھٹنے ٹیک دیے تھے۔ پھر رال ٹپکانے والے لالچ بھی دیے تھے۔ اہل دانش بھی تقسیم ہوگئے۔ مسلح افواج کے تین سربراہوں میں سے ایک نے کھل کر ساتھ دیا۔ ایک نے مخالفت کی اور ایک گومگو میں رہے۔

یہ ایک کٹھن فیصلہ تھا۔ لیکن اول و آخر وزیراعظم نواز شریف کا اپنا فیصلہ تھا۔ جو بھارتی دھماکوں کے بعد چند گھنٹوں کے اندر اندر ہو گیا تھا۔

(عرفان صدیقی۔ نقش خیال)

☆ مجھے چاغی کا وہ ان پڑھ بلوچ سردار یاد آجاتا ہے جو ہمارے "دانش وروں" کی باتیں سنتا تو غصے سے کھول اٹھتا۔ کہتا "ان دانش وروں کی آنکھیں نہیں ہیں۔ جس بنگلہ دیش کے ہزاروں باورچی بلوچستان کے اس ریگستانی علاقے میں تین ہزار ماہانہ پر نوکری کر رہے ہوں، ہم سے خوش حال کیسے ہو سکتا ہے۔" وہ بولتا چلا جاتا۔ "بنگلہ دیش بننے سے پہلے کیا کبھی اتنے باورچی یہاں آئے تھے؟ کیا ان کی عورتیں اسمگل ہو کر بکتی تھیں؟ آج ہر پشتون پانچ لاکھ روپیہ ولور (پشتونوں کے ہاں دلہن کے لیے جو رقم دی جاتی ہے) نہیں دے سکتا، بیس ہزار میں بنگالی عورت خرید کر شادی کر رہا ہے۔ کیا 1971ء سے پہلے کوئی بنگالی عورت ایسے بکی تھی۔ اگر وہ بنگالی اتنے خوش حال ہو گئے ہیں تو ہمارے ہاں باورچی کیوں ہو گئے؟"

(اوریا مقبول جان۔ حرف راز)

دلچسپ انکشاف

☆ جب سے ڈکٹیٹر جنرل مشرف وطن لوٹا ہے۔ وہ کبھی ماضی کی طرح ٹائی اور سوٹ میں نظر نہیں آیا۔ اس کے بارے میں یہ دلچسپ انکشاف کیا گیا۔ مشرف قبرص میں مقیم اسلام کے صوفی نقش بندی سلسلے کے لیڈر شیخ ناظم القبرصی سے دعائیں لینے کے بعد پاکستان آئے۔ شیخ ناظم نے ان کے پاکستان جانے کی حوصلہ افزائی کی اور کہا مشرف دہلی تک تمام مسلمانوں کا حکمراں بن جائے گا۔ اس کے ساتھ انہوں نے عمامہ بھی دیا اور کہا۔ "ٹائی کا استعمال ترک کردیں۔ ٹائی کفر کی علامت ہے۔" جس کے بعد مشرف نے کبھی ٹائی استعمال نہیں کی۔

☆ کبھی کبھی میرے بچے کنفیوژ ہو جاتے ہیں کہ وہ ہندو ہیں یا مسلمان۔ چونکہ ان کی ماں ہندو ہے اور گھر میں اپنے دھرم کی باقاعدہ پریکٹس کرتی ہے۔ جبکہ اس گھر میں میں اور میری بہن لالہ رخ مسلمان ہیں۔

(شاہ رخ خان کی پریشانی)

☆

روشن حرف وہ سارے

سمیعہ لیاقت علی سندھو

(1) میں ہوں سب کی سمیعہ اور کیوٹ فاطمہ کی "میا"۔ آپ نے شعر کہا ہے، اس لیے شعر ہی لکھ رہی ہوں، ورنہ ہماری نوک زبان پر تو پورے پورے دیوان مچلتے رہتے ہیں۔

اپنی ناکامی کا ایک یہ بھی سبب ہے فراز
تیرے عشق میں تری چاہ میں تری راہ میں
چیز جو مانگتے ہیں سب سے جدا مانگتے ہیں
کبھی دل دیا، کبھی جان دی، کبھی سر دیا
یا پھر!

کچھ درد پنہاں، کچھ فکر جہاں، کچھ شرم خطا، کچھ خوف سزا
اک بوجھ اٹھائے پھرتی ہوں اور بوجھ بھی کتنا بھاری ہے

ہمارا حلقہ احباب اتنا وسیع ہے کہ ہر جگہ کوئی نہ کوئی جاننے والا نکل ہی آتا ہے۔ انہی جاننے والوں کی کرم فرمائیوں سے تنگ آکر کالج میں میری فرینڈ ثمرہ نے بڑا چبا چبا کر بے ساختہ کہا تھا۔

بزم کی بزم تیری جاننے والی نکلی
ہم تو یہ سمجھے تھے فقط ہم سے شناسائی ہے

اور پھر غصے سے گروپ سے واک آؤٹ کر گئی۔ کیا کریں جی! مشہور ہی بڑے ہیں۔ یا پھر میری بھانجی عائشہ، جو ہے تو ابھی صرف فائیو کلاس میں، لیکن خود کو ہمیشہ ڈاکٹر عائشہ اعجاز چوہدری کہلوانا پسند کرتی ہے۔ کبھی کبھی بڑی ترنگ میں تنگ کرنے کے لیے پڑھتی ہے۔

دیکھو بچو! سمیعہ آئی
بلی بلی آنکھوں والی
چھوٹے چھوٹے بالوں والی
پھینی پھینی ناک والی

آگے نہیں لکھنا جی کہ..... کبھی غصہ کرتے ہیں اور کبھی انجوائے۔

"نصیر ترابی" کی یہ اداس، افسردہ سی غزل جسے "قرۃ العین بلوچ" کی پرسوز آواز نے چار چاند لگا دیے ہیں۔ ایف ایم پر سنی تب سے اب تک ہماری فیورٹ غزل بن چکی ہے۔

وہ ہم سفر تھا، مگر اس سے ہم نوائی نہ تھی
کہ دھوپ چھاؤں کا عالم رہا، جدائی نہ تھی
عداوتیں تھیں، تغافل تھا، رنجشیں تھیں مگر
بچھڑنے والے میں سب کچھ تھا، بے وفائی نہ تھی
بچھڑتے وقت ان آنکھوں میں تھی ہماری غزل
غزل بھی وہ جو کسی کو ابھی سنائی نہ تھی
کبھی یہ حال کہ دونوں میں یک دلی تھی بہت
کبھی یہ مرحلہ جیسے کہ آشنائی نہ تھی
محبتوں کا سفر اس طرح بھی گزرا تھا
شکستہ دل تھے مسافر، شکستہ پائی نہ تھی

(4) روایتی شاعری میں سے میرا انتخاب غلام محمد قاصر کی یہ لافانی غزل جنہوں نے جو بھی لکھا کیا خوب لکھا۔

گیسو گیسو بھٹکی خوشبو، عارض عارض ٹھہرا رنگ
جانے کس کو ڈھونڈ رہے ہیں اندھی خوشبو بہرا رنگ
ٹوٹ گئی وہ دست فلک میں تھی جو کمان قوس قزح
آخر ابر آوارہ پر کب تک رہتا دہرا رنگ
سورج لاکھ ہو نازاں کرنوں کے طوفان تھمتے ہی
شام شفق میں بھر جائے گی مایوسی کا گہرا رنگ
کون اس کو دنیا کی نمائش گاہ میں آویزاں کرتا
جس تصویر کی قسمت میں تھے دوہرے نقش اکہرا رنگ
صحن چمن ہے ایک عدالت، پتے ضامن، خار وکیل
منصف گل چیں، شاہد خوش بو، مجرم پھول، کٹہرا رنگ

☆

آپ کا باورچی خانہ

سمیعہ سہیل

باورچی خانہ گھر کا وہ حصہ ہے جس سے اس گھر میں بسنے والی عورت کے سلیقے' قرینے اور صفائی کا پتا لگایا جاتا ہے۔ کوئی عورت بغیر باورچی خانے کے مکمل ہی نہیں میری نظر میں۔

(1) کھانا پکاتے ہوئے میں سب سے زیادہ گھر والوں کی پسند' ان کی طبیعت اور ان کے موڈ کا خاص خیال رکھتی ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ ان کے لیے ان کی پسند کے مطابق نئے نئے تجربے بھی کرتی رہتی ہوں۔ سب سے زیادہ مجھے اس بات کا خیال رہتا ہے کہ میں کھانے کو اس طرح پکاؤں کہ اس کی غذائیت کسی طرح ضائع نہ ہو۔ نہ ہی سبزیاں بہت زیادہ پکی ہوں اور نہ ہی گوشت میں سے ہیک آئے۔ چاول اچھی طرح چن کر اور دھو کر ڈالے گئے ہو اور تیل بھی ضرورت کے حساب سے ڈالا جائے۔ کیوں کہ انہی چیزوں کا خیال رکھ کے ہم کھانوں کی بھرپور غذائیت حاصل کر سکتے ہیں۔

(2) گھر میں اگر اچانک مہمان آجائیں تو میں بجائے گھبرانے کے اور بھی زیادہ خوش ہو جاتی ہوں۔ کیوں کہ میرے اکثر کام جیسے کہ ادرک' لہسن کا پسا ہونا' سموسوں یا رول کا پہلے سے فریزر میں ہونا' چٹنی' اچار کا پہلے سے موجود ہونا اور سینڈوچ اسٹفنگ بھی پہلے سے ہمیشہ بنے ہوئے ہوتے ہیں تو پھر گھبرانا کیسا؟ اور پھر مہمان تو آتے ہی اپنا رزق لے کر ہیں۔

اور ان چھوٹے موٹے کاموں کے پہلے سے ہو جانے کی وجہ سے آپ مہمانوں کو بھی ٹائم دے پاتے ہیں اور ٹیبل بھی منٹوں میں سج جاتی ہے' لیکن اگر پھر بھی کبھی ایسا ہو اور پہلے سے کوئی انتظام نہ ہو تو میں ایک ڈش لکھ رہی ہوں' جو تقریباً" بیس سے پچیس منٹ میں تیار ہو جائے گی۔

دم کی چکن

چکن	آدھا کلو (ونگز یا پھر چھوٹی بوٹیاں)
ادرک لہسن کا پیسٹ	دو ٹیبل اسپون
سویا سوس	ایک ٹیبل اسپون
چلی سوس	ایک ٹیبل اسپون
سرکہ	ایک ٹیبل اسپون
کالی مرچ	ایک چائے کا چمچہ
گرم مسالا	ایک چائے کا چمچہ
چاٹ مسالا	ایک چائے کا چمچہ
ہری مرچ	ایک عدد (باریک کٹی ہوئی)
ہرا دھنیا	تھوڑا سا کترا ہوا
پیاز	ایک عدد (چوپ ہوئی ہو)

ایک پتیلی میں پانی لیں اور اس میں چکن اور باقی تمام اشیا ڈال کر چکن کو درمیانی آنچ پر ڈھکن ڈھک کر ابالنے رکھ دیں۔ جب تک کہ پانی خشک نہ ہو جائے۔ لیکن جلنا نہیں چاہیے پھر اس چکن میں کوئلے کا دم دے لیں۔

یہ ڈش بہت لذیذ ہے اور اسے ابلے ہوئے چاولوں کے ساتھ اور روٹی دونوں کے ساتھ کھایا جا سکتا ہے۔ آپ چاہیں تو چکن کی بوٹیوں کو ریشہ ریشہ کر کے سینڈوچ اور بن میں بھی استعمال کر سکتی ہیں۔

(3) کچن واقعی عورت کی سلیقہ مندی کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ کیوں کہ اس سے ہی آپ کی صفائی اور سلیقے کا پتا لگتا ہے۔ میں کچن کی صفائی کا خاص خیال رکھتی ہوں۔ کیوں کہ کچن کے صاف نہ ہونے سے دس بیماریاں جنم لیتی ہیں۔ کچن میں کام کرنے' کھانا پکانے کے بعد میں سب سے پہلے اوون اور سلیب صاف کرتی ہوں۔ کیوں کہ اکثر کھانا پکاتے وقت کچھ نہ کچھ

گر جاتا ہے اور اسی وجہ سے لال بیگ پیدا ہوتے ہیں۔ پھر آخر میں ڈیٹول کا پونچھا لگا کر کچرے کے ڈبے کا ڈھکن بند کر دیتی ہوں۔ تاکہ وہاں رات کو ہمارے سونے کے بعد کیڑے مکوڑوں کی دعوت نہ چلے۔

(4) صبح کا ناشتا ہم سب کے لیے بہت ضروری ہے اور وہ ہمیشہ صحت بخش اور غذائیت سے بھرپور چیزوں پر مشتمل ہونا چاہیے۔ جس کا میں خیال رکھتے ہوئے ہمیشہ طرح طرح کی چیزیں ٹرائی کرتی رہتی ہوں۔ کبھی کسٹرڈ' کبھی سینڈوچ' کبھی میٹھے سموسے تو کبھی کسی نہ کسی قسم کا حلوہ۔ ہم لوگ انڈے آلو کا سالن اور آملیٹ بھی پراٹھوں سے تناول فرماتے ہیں۔ لیکن اتوار کے ناشتے کی بات ہی اور ہوتی ہے۔ میں اکثر و بیشتر گاجر کے موسم میں گاجر کی کھیر بناتی ہوں۔ جو کہ میرے گھر والوں کو بہت پسند ہے اس کی ترکیب لکھ رہی ہوں۔ امید ہے کہ آپ کو بھی ضرور پسند آئے گی۔

گاجر کی کھیر

گاجر	چار عدد بڑی (کدوکش کی ہوئی)
چھوٹی الائچی	چار عدد
دودھ	ڈیڑھ کلو
چاول	ایک کپ بھر کر
بادام	دس عدد
کھوپرا پسا ہوا	ایک چائے کا چمچہ
کریم یا بالائی	دو چمچے بھر کر
چینی	آدھا کپ

ترکیب:

رات کو پہلے سے چاول پانی میں بھگو کر فریج میں رکھ دیں۔ اگلی صبح اسے اسی پانی میں ابال لیں۔ ایک الگ پتیلی میں دودھ کو کریم یا بالائی اور الائچی ڈال کر ابالنے کے لیے رکھ دیں۔ جب اس میں ایک دو ابال آجائیں اور وہ تھوڑا کم ہونا شروع ہو جائے تو اس میں کدوکش کی ہوئی گاجریں ڈال دیں۔ گاجر کے نرم ہونے تک وقفے وقفے سے چمچ چلاتی رہیں۔ پھر اس میں ابلے ہوئے چاول اور کھوپرا ڈال دیں اور اور یاد رکھیں کہ ابلے ہوئے چاولوں کو اگر آپ بلینڈر میں بلینڈ کریں گی تو اس کا مزا اور بھی دوبالا ہو جائے گا۔ اسے اتنا پکائیں کہ سب چیزیں یک جان ہو جائیں۔ پھر اسے ڈش میں نکال کر بادام اور کھوپرے سے سجا دیں۔ آپ اسے پراٹھے' پوری یا پھر ایسے ہی چمچے سے بھی کھا سکتے ہیں یہ آپ کے گھر کے ہر فرد کو ضرور پسند آئے گی۔

(5) ہمارے گھر باہر کھانے کا فیشن بہت کم ہے۔ پھر بھی اگر کبھی کسی خاص موقع پر باہر چلے جائیں تو چائنیز ڈشز کو ہی کھانا پسند کرتے ہیں۔

(6) کھانے اور موسم کا تو آپس میں بہت گہرا تعلق ہے اور آپ کا یہی دل چاہ رہا ہوتا ہے کہ موسم کی مناسبت سے کھانے کھائے جائیں۔ جیسے بارش میں پکوڑے اور جلیبی' گرمیوں میں کڑھی چاول' پیاز اور ٹماٹر کی چٹنی کے ساتھ اور سردیوں میں پائے' ساگ وہ بھی مکئی کی روٹی کے ساتھ۔ میں بھی موسم کو ہمیشہ دھیان میں رکھ کر ہی کھانا پکاتی ہوں۔

(7) اچھا کھانا پکانے کے لیے' بہت تھوڑی سی محنت' تھوڑے سے پیار اور تھوڑے سے خلوص کی ضرورت ہوتی ہے اور ان سب چیزوں کے ساتھ اگر "ذکر الٰہی" بھی شامل ہو جائے تو کھانا اچھا نہ پکے' ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ میں خود انہی چیزوں کی قائل ہوں اور ہمیشہ تعریف سنتی ہوں۔ آپ بھی آزما کر دیکھ لیں۔

(8) جہاں تک کچن کی ٹپ کا تعلق ہے تو بس یہی ٹپ ہے کہ جب بھی کچن میں کھانا پکائیں ہمیشہ اپنا موڈ اچھا رکھیں اور ساتھ ساتھ ذکر بھی کرتی رہیں۔ اس سے کھانا تو اچھا پکے گا ہی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس میں برکت بھی ہو گی۔ یعنی اللہ بھی راضی اور گھر والے بھی خوش۔

اور اس کے ساتھ ساتھ اگر آپ چینی کے ڈبے میں ایک دو لونگ ڈال دیں تو چینی میں کبھی چیونٹیاں نہیں ہوں گی۔ اسی طرح اگر آپ تمام کیبنٹ میں خاکی کاغذ یعنی براؤن پیپر بچھا دیں گی تو کبھی لال بیگ نہیں آئیں گے۔

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

سوجی کی ٹکیہ

اجزا:

اجزا	مقدار
آٹا	ایک کپ
سوجی	آدھا کپ
گڑ	آدھا کلو
چار مغز	تین کھانے کے چمچے
انڈا	ایک عدد
کھویا	آدھا کپ
گھی	ایک کپ

ترکیب:

سوجی کو گھی میں بھون کر سنہری کرلیں۔ آٹا شامل کر کے مزید پانچ منٹ بھونیں' پھر گڑ (پیس کر) ڈال دیں۔ کھویا کو انڈے میں پھینٹ کر یکجان کریں پھر اسے بھی چار مغز کے ساتھ سوجی میں ملا کر اچھی طرح بھونیں۔ ایک بڑی تھالی کو گھی لگا کر چکنا کریں اور اس آمیزے کو اس پر پھیلا دیں۔ ٹھنڈا ہو جائے تو گول شیپ میں کاٹ لیں۔ ہر ٹکیہ پر چار مغز پھول کے انداز میں رکھ کر دبا دیں۔ مزے دار اور جلد تیار ہو جانے والی ایک منفرد ڈش حاضر ہے۔

وائٹ قورمہ

اجزا:

اجزا	مقدار
چکن	ایک کلو
دہی	ایک کپ
پیاز	چار عدد
لہسن ادرک پیسٹ	دو چائے کے چمچے
پسی سفید مرچ	ڈیڑھ چائے کا چمچہ
سبز الائچی	چھ دانے

اجزا	مقدار
لونگ	چھ دانے
ثابت سیاہ مرچ	چند دانے
دار چینی	دو ٹکڑے
تیز پات	ایک پتا
پسی جائفل جاوتری	دو چٹکی
کیوڑہ	دو کھانے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب:

تیل گرم کر کے سارا ثابت گرم مسالا ڈال دیں۔ پیاز کو ابال کر پیس لیں پھر لہسن ادرک پیسٹ کے ساتھ گوشت بھی شامل کر کے بھونیں۔ تھوڑی دیر بھوننے کے بعد دہی' سفید مرچ اور نمک ڈال دیں۔ دہی کا پانی خشک ہو جائے اور گوشت گل جائے تو کیوڑے کے ساتھ جائفل اور جاوتری ڈال کر ہلکا سا مکس کریں اور دس منٹ کے لیے دم پر رکھ دیں۔ شیرمال کے ساتھ پیش کریں۔

مینگو لسی

اجزا:

اجزا	مقدار
بڑے آم	چار عدد
دہی	ایک پاؤ
دودھ	ایک پاؤ
چینی	آدھا کپ
پودینہ	چند پتے
نمک	ایک چٹکی

ترکیب:

آم چھیل کر ٹکڑے کاٹ لیں اور گٹھلیاں نکال دیں۔ بلینڈر میں آم' دودھ' دہی' چینی اور نمک ڈال کر بلینڈ کریں۔ برف ڈال کر ایک بار پھر بلینڈ کرلیں۔ گلاس میں نکال کر پودینے کے پتوں سے سجاوٹ کر کے پیش کریں۔

چکن میکرونی

اجزا:

اجزا	مقدار
چکن بون لیس	ایک کپ
ابلے ہوئے مٹر	ایک کپ
ابلی ہوئی میکرونی	ایک کپ
میدہ	دو چائے کے چمچے
مکھن	ایک کھانے کا چمچہ
سفید پسی مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
کریم	تین کھانے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب:

دو کھانے کے چمچے تیل گرم کر کے لہسن چوپ کر کے ڈالیں پھر چکن ڈال کر تھوڑی دیر تک فرائی کریں اور الگ نکال کر رکھ لیں۔ اسی تیل میں مکھن اور میدہ ڈال کر اچھی طرح مکس کریں۔ میدہ ہلکا سنہری ہو جائے تو نمک اور سفید مرچ ڈال دیں۔ مسلسل چمچہ ہلاتے رہیں۔ گاڑھا ہو جائے تو چولہا بند کردیں۔ کریم' چکن' مٹر اور میکرونی ڈال کر ہلکے ہاتھ سے مکس کریں اور پیش کریں۔

عدنان

نفسیاتی ازدواجی الجھنیں

ایک بہت بڑا دولت مند جو اپنی بد مزاجی کے لیے مشہور تھا' ایک مرتبہ کسی خانقاہ کے ایک بزرگ کے پاس ان کی دعائیں حاصل کرنے کی غرض سے گیا۔ ان بزرگ نے جیسے ہی اسے ـــ خانقاہ میں داخل ہوتے دیکھا۔ یکایک اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے ایک بند کھڑکی کے پاس لے گئے جس کے شیشوں کے ذریعہ بیرونی سڑک کا منظر دکھائی دیتا تھا۔

"مجھے بتاؤ کہ تم ان شیشوں کے ذریعے کیا دیکھتے ہو؟" بزرگ نے اس دولت مند سے پوچھا۔

"ان شیشوں کے ذریعہ مجھے باہر سڑک پر چلتے پھرتے آدمی دکھائی دے رہے ہیں۔" اس نے کسی قدر حیرانی کے ساتھ جواب دیا۔

اس پر وہ بزرگ اس دولت مند آدمی کا ہاتھ پکڑ کر ایک بڑے آئینے کے سامنے لے گئے۔

"اب تم کیا دیکھتے ہو؟" اس نے سوال کیا۔

"اب میں خود اپنے آپ کو دیکھ رہا ہوں۔" دولت مند نے جواب دیا۔

"میاں صاحب زادے اب میں تم سے اپنے ان دونوں سوالات کی وضاحت کروں گا۔ یہ کھڑکی اور یہ آئینہ دونوں ہی شیشے کے بنے ہوئے ہیں' صرف فرق یہ ہے کہ آئینے کی پشت پر چاندی کا ملمع چڑھایا ہوا ہے۔ جب تم سادہ شیشے کے ذریعے دیکھتے ہو تو تمہیں دوسرے آدمی نظر آتے ہیں لیکن جب تم اس چاندی کا ملمع چڑھے ہوئے شیشے کے ذریعے دیکھتے ہو تو تمہیں اپنی ہی صورت نظر آتی ہے اور دوسرے آدمی دکھائی نہیں دیتے۔ افسوس کہ اس چاندی کے ملمع نے تمہاری نظروں سے دوسرے آدمیوں کو بالکل اوجھل کر دیا ہے۔"

ان بزرگ کا آخری جملہ نہایت ہی تاکیدی لہجہ میں تھا۔

یہ واقعہ ہے کہ جو لوگ خوش حال اور دولت مند ہیں' وہ صرف اپنے ہی آرام و آسائش پر نظر رکھتے ہیں حالانکہ یہ ٹھیک نہیں ہے۔ زندگی کی حقیقی خوشی دوسروں کو خوشی دے کر حاصل ہوتی ہے۔ ہماری زندگی کی اچھی اور درست قدریں چاندی کے اس ملمع نے بالکل تبدیل کر کے رکھ دی ہیں۔ ہر شخص حصول دولت کے لیے اس قدر اندھا ہو کر بھاگا چلا جا رہا ہے کہ اسے اپنے اردگرد کا مطلق خیال نہیں ہے۔ آج ہماری زندگی کا اصل مقصد صرف پیسہ حاصل کرنا رہ گیا ہے خواہ وہ کسی بھی طریقہ سے ہو' جائز' ناجائز کی تفریق مٹ کر رہ گئی ہے۔

☼ ☼ ☼
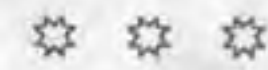
رہامس ـــ کراچی

یہ بہن لکھتی ہیں "مجھے اپنی زندگی بہت بھیانک لگتی ہے' میرا دل چاہتا ہے میں مرجاؤں۔ دنیا سے الگ جی رہی ہوں ۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ اپنے اردگرد موجود دیواروں سے سر ٹکراتے ٹکراتے ایک دن میں فنا ہو جاؤں گی۔ تنہائی و یاسیت کی دیواریں...... نفرتوں کی دیواریں۔"

نہایت کم عمری میں انہیں ماں داغ مفارقت دے گئیں۔ اب یہ اکیلی گھر کی تمام ذمہ داریوں سے نبرد آزما ہیں' پرائیویٹ پڑھائی کا سلسلہ بھی جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ان حالات میں زندگی میں ایک شخص کی آمد نے طوفان کھڑا کر دیا...... وہ تو چلا گیا لیکن یہ ٹوٹے خوابوں کی کرچیاں سمیٹنے کی کوشش میں لہولہان ہیں۔

ج۔ اچھی بہن! سب سے پہلی بات تو یہ قدرت نے آپ کو تخلیقی صلاحیت سے نوازا ہے جو بلاشبہ قدرت کا بہترین عطیہ ہے۔ آپ کاغذ قلم سنبھالیں اور کہانیاں لکھیں۔ زندگی جو آپ کو مختلف تجربات سے روشناس کرا رہی ہے ہو سکتا ہے اس

کے پس پردہ قدرت کا یہی منشا ہو۔ آپ کا طرز تحریر خوب صورت بھی ہے اور مربوط بھی ـــ کہانیاں لکھیں اور خواتین ڈائجسٹ کے لیے بھجوائیں تو اس کالم کا حوالہ ضرور دیں۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ خود کو معتبر کیسے کریں اور ادھورے پن سے نجات کی کیا سبیل ہو ـــ تو اس کا جواب ہے کہ اپنی صفائی میں کچھ کہنے کے بجائے اپنے عمل سے اپنی معتبری ثابت کریں۔ آپ اپنی جگہ سچی ہیں تو ایک دن اعتبار ضرور پالیں گی۔

آپ کا مسئلہ نہ غیر اہم ہے اور نہ حقیقت سے دور اور بچکانہ۔ آپ تو قابل ستائش ہیں کہ اتنی ذمہ داریوں کو نبھانے کے ساتھ تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رکھے ہوئے ہیں۔ وہ شخص چلا گیا اس کے بارے میں سوچنے کے بجائے قدرت نے جو آپ کو صلاحیت دی ہے اسے دنیا سے منوائیں۔ ویسے بھی اتنی کم عمر میں کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا آج آپ جس کو بہت اچھا سمجھ رہی ہیں۔ ہو سکتا ہے کل وہ آپ کو بہت عام سا لگے وہ آپ کا ہوا تو واپس آجائے گا ورنہ دل کو تسلی دے لیجیے گا کہ وہ آپ کا تھا ہی نہیں۔

ابھی آپ بہت کم عمر ہیں۔ زندگی میں آپ کے لیے بہت سے روشن امکانات ہیں۔ پھر یہ مایوسی کیوں....؟ تھوڑا انتظار کریں۔ قدرت آپ کی مدد ضرور کرے گی (ان شاء اللہ)

ایک بہن ـــ کراچی

1۔ میں ماضی کی پرانی' تلخ باتوں اور یادوں کو بھلا کر حال میں خوش رہنا چاہتی ہوں۔ حال میں جینا چاہتی ہوں جب میں کسی بات پہ (اپنے شوہر کی یا ان کے حوالے سے) خوش ہوتی ہوں تو کوئی پرانی بات ان کی (جس طرح لڑکپن میں چھوٹے موٹے افیئرز ہوتے ہیں) یاد آتی ہے پھر میں اس بات کو سوچ کر اداس ہو جاتی ہوں "ان کا موڈ بھی خراب کر دیتی ہوں۔

2۔ لوگوں سے نظر ملا کر اعتماد کے ساتھ بات کیسے کی جاتی ہے؟ صاف واضح بات جس میں کوئی جھجک' لڑکھڑاہٹ نہ ہو اپنے سے چھوٹوں اور برابر والوں سے نظر ملا کر بات کرنا چاہتی ہوں۔

ج۔ ماضی کو وہ لوگ زیادہ یاد کرتے ہیں جو حال کی طرف سے مایوس ہوتے ہیں اور جنہیں مستقبل میں کوئی امید نظر نہیں آتی۔

آپ نے اپنے موجودہ حالات کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ کیا آپ اپنے حالات سے غیر مطمئن اور مایوس ہیں؟ اگر آپ کے حالات اچھے نہیں ہیں تو ان سے فرار کے بجائے انہیں بہتر بنانے کی کوشش کریں۔ ماضی کی تکلیف دہ باتوں کو بھلانے کے لیے اپنے ذہن میں درج ذیل نکات کو بار بار دہرائیں۔

(1) ماضی کے تمام دکھ' تکلیفیں' پچھتاوا میں نے ذہن سے نکال دیا ہے۔

(2) جن لوگوں نے مجھے تکلیف دی ہے میں نے ان سب کو معاف کر دیا ہے۔

(3) مجھے اللہ پر پورا بھروسا ہے وہ مہربان ہے وہ میرے لیے بہتر کرے گا۔

ان پوائنٹ کو بار بار دہرانے سے آپ خود کو بہتر محسوس کریں گی اور ماضی کی یادوں سے نکل آئیں گی۔

اپنے ذہن میں ماضی کی خوشگوار باتیں دہرائیں۔ ذہن کو مصروف رکھیں۔ ایسی کتابیں پڑھیں جن سے ذہن میں روشنی پیدا ہو اور اچھے مقاصد کی طرف رہنمائی ملے۔

کسی سے بات کرتے ہوئے جھجک کی سب سے بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ آپ خود کو دوسروں سے کمتر سمجھتے ہیں۔ اپنے ذہن سے یہ بات نکال دیں کہ آپ دوسروں سے کم تر ہیں۔ دوسروں کی خوبیوں کو ضرور تسلیم کریں لیکن یہ بھی سوچیں کہ آپ بھی کچھ خوبیوں کی مالک ہیں۔ اگر وہ آپ سے زیادہ کامیاب' خوش حال اور پڑھے لکھے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ ان سے کمتر ہیں۔ قدرت نے کچھ چیزیں آپ کو بھی عطا کی ہیں۔ اپنا مطالعہ بڑھائیں اور کوشش کریں کہ آپ کی گفتگو کے جملے مختصر ہوں۔ تاکہ آپ ان کی اچھی طرح ادائیگی کر سکیں۔

آپ کی تحریر سے اندازہ ہوتا ہے آپ ایک سمجھ دار اور ذہین خاتون ہیں۔ تھوڑی سی کوشش سے یقیناً اپنی خامیوں پر قابو پا سکتی ہیں۔

☼

امت الصبور

بیوٹی بکس

اریبہ۔۔۔ کراچی

1 ۔ باجی! کیل ' مہاسوں ' جھائیوں اور جھریوں میں کیا فرق ہے؟ بلیک ہیڈز ختم کرنے کے لیے بھی کچھ بتائیں۔

2 ۔ کیا ایک ہی دن میں الگ الگ پھلوں کے چھلکے لگا سکتے ہیں۔

3 ۔ بادی چیزیں کسے کہتے ہیں اور اس میں کون کون سی چیزیں شامل ہوتی ہیں؟ اگر انسان چکنی چیزیں ' کھٹی مسالے والی چیزیں ' میٹھا ' چائے سب چھوڑ دے ' موٹاپے اور پیٹ کے بڑھنے کے ڈر سے تو پھر کھانے کے لیے کیا بچے گا؟

4 ۔ فی الحال گرمیاں ہیں تو گرمیوں کے حوالے سے ہی کہیں گے کہ پورے دن کے لیے ایک مکمل ٹریٹمنٹ بتادیں۔ میڈیکیٹڈ صابن کون سا ہوتا ہے اور کہاں سے ملے گا؟

ج ۔ چہرے پر سیاہ رنگ کے ہلکے ہلکے دھبے سے نظر آتے ہیں۔ یہ جھائیاں ہوتی ہیں۔

مہاسے بھرے ہوئے دانے سے ہوتے ہیں۔ جن میں اکثر پیپ بھی پڑ جاتی ہے۔ جو دبانے سے نکلتی ہے۔ ایک خاص عمر کے بعد جلد کے مرجھانے کی وجہ سے جو سلوٹیں سی پڑ جاتی ہیں ' انہیں جھریاں کہتے ہیں۔

جلد کے مساموں میں جو میل بھر جاتا ہے ' اسے کیل کہتے ہیں کیل نمودار ہونے کی بڑی وجہ جلد کی صحیح طریقہ سے صفائی نہ ہونا ہے۔ آپ ایک بڑے برتن میں کھولتا ہوا پانی لیں۔ چہرے کو تولیہ سے اس طرح ڈھانپیں کہ برتن تولیہ کے اندر ہو۔ دس منٹ تک چہرے کو بھاپ دیں۔ پھر کیل نرم ہونے پر دبا کر نکال لیں اور چہرے پر اسٹرنجنٹ لگائیں اگر اسٹرنجنٹ دستیاب نہ ہو تو لیموں کا عرق لگائیں۔

2 ۔ آپ ایک دن میں یہ تمام چیزیں لگا سکتی ہیں۔ لگانے کے بعد اس وقت تک بات نہ کریں ' جب تک چہرہ خشک ہونے کے بعد دھو نہ لیں۔

3 ۔ بادی چیزیں وہ ہوتی ہیں ' جو دیر ہضم ہوتی ہیں اور گیس پیدا کرتی ہیں۔ پھل نہیں خرید سکتیں تو سبزیاں استعمال کریں۔ ٹماٹر ' گاجر ' کھیرا ' ککڑی ایسی سبزیاں ہیں ' جو کچی بھی کھا سکتے ہیں۔

وزن کم کرنے کے لیے پرہیزی کھانا ضروری نہیں ہے۔

آپ درج ذیل مشوروں پر عمل کرکے ایک ہفتہ میں دو پونڈ وزن کم کرسکتی ہیں۔

1 ۔ پوری نیند لیں۔ کم از کم آٹھ گھنٹے سوئیں۔ شوگر ' ہائی بلڈ پریشر ' ڈپریشن کے عوارض عموماً" کم سونے سے واقع ہوتے ہیں۔

جسم میں ہارمونز کا توازن بھی پوری نیند لینے سے درست ہو جاتا ہے۔

2 ۔ پانی زیادہ پئیں۔ کھانے سے پندرہ منٹ قبل ایک گلاس پانی ضرور پئیں۔ دن بھر میں کم از کم بارہ گلاس پانی پئیں۔

3 ۔ دن کا آغاز بیس منٹ کی واک سے کریں۔ کوشش کریں کہ زیادہ سے زیادہ حرکت میں رہیں۔ نماز پنجگانہ کی پابندی کریں۔

4 ۔ کھانے پر توجہ دیں۔ نشاستہ دار خوراک ' چکنی اور تلی ہوئی اشیا مکھن ' مارجرین چھوٹا اور بڑا گوشت ' کولڈ ڈرنکس ' شربت ' مٹھائیاں ' جنک فوڈ اور شکر کا استعمال کم سے کم کریں۔

5 ۔ ان چیزوں کا استعمال بڑھا دیں۔ بغیر چکنائی کی دودھ ' چکنائی کا دودھ ' ناریل کا پانی ' اسٹرابری ' کارن فلیکس دلیہ ' شہد ' پیاز ' لہسن ' کالی مرچ ' زیتون کا تیل ' لیموں سبزیاں ' پھل ابلی ہوئی چکن ' بغیر چھنے آٹے کی روٹی یا ڈبل روٹی۔

نمک اور شکر کا کم سے کم استعمال کریں۔

بالوں میں آپ وہ تیل لگائیں ' جو آپ کو موافق آتا ہو۔ اسی طرح شیمپو بھی اپنے بالوں کے حساب سے استعمال کریں۔

بال سیاہ کرنے کے لیے آپ ایک مٹھی آملہ ایک پیالی پانی میں بھگو دیں۔ پھر پیس کر سر میں لگائیں۔ آدھا گھنٹہ لگا رہنے دیں پھر بال دھولیں۔ بال سیاہ ہو جائیں گے۔

✲